رجسٹرڈ نمبر اے ۱۵۷ جنوری ۱۹۳۷ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتبی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا، اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے، جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں، اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح گئی ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کیگئی ہے کہ انھیں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے صحیح عقائد لکھے جائیں،

پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت عبادات کی تفصیل و تشریح اور اُن کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں تے، تقطیع خورد عہ و سے، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، للعہ، تقطیع خورد سعہ، وعہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں سے، سے، تقطیع خورد سعہ، وعہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں عہ، للعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۳۹ | ماہ شوال المکرم ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۷ء | عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

۱۹۳۲ء سے **معارف** کا بائیسواں سال شروع ہوا، ہندوستان کی ناموافق آب و ہوا میں جہاں ہر سال سیکڑوں رسالے پیدا ہوتے اور مرتے ہیں، معارف جیسے بے لطف رسالہ کا اتنے دنوں جی جانا اس کی بڑی کامیابی ہے، لوگ شعر و سخن کے چٹخارے، ادب لطیف کے آب و نمک اور بے معنی عبارت آرائی کے مزے کے خوگر ہو گئے ہیں، اس حال میں اگر کچھ ایسے قدردان بھی ہوں جو معارف کے دسترخوان کے روکھے پھیکے کھانوں کو پسند کریں، تو یہ اس کے مہمانوں کا حسن اخلاق ہے،

دار المصنفین نے اپنی بائیس برس کی زندگی میں **سیرۃ نبوی** کی پانچ ضخیم جلدوں، اور دوسری بعض تالیفات کو چھوڑ کر جو اس کے سلسلہ سے باہر ہیں ہر علم و فن کی پچاس، اور سلسلہ سے باہر کی کتابوں کو ملا کر ستر کتابیں شائع کی ہیں، یہ فلسفہ، ادب، تاریخ، سوانح اور دوسرے متفرق مضمونوں پر ہیں،

مولانا **شبلیؒ** مرحوم جب شعر العجم لکھ رہے تھے تو ان کو خیال بھی نہ تھا کہ وہ اتنی مقبول ہوگی کہ ایک طرف انگلستان کا سب سے بڑا مستشرق اس سے فائدہ اٹھائے گا، اور دوسری طرف ایران و عجم کے مشتاق اس سے بہرہ مند ہونگے، شعر العجم کی دو پہلی جلدوں کے فارسی ترجمے پہلے نکل چکے تھے، اب کابل کی مجلس ادبی کی طرف سے اس کی تیسری جلد کا فارسی ترجمہ شائع ہوا ہے، اس کے فارسی مترجم سرور خاں گویا خو

فارسی ادبیات کے ذوق شناس ہیں، اس لئے اس کا ترجمہ بھی بہت اچھا ہوا ہے، امید ہے کہ "اس قند ہندی سے ایران و کابل کے طوطیان سخن "شکر شکنی" کا لطف اٹھائیں گے،
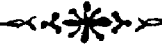
اب افغانستان بھی تالیف و تصنیف کے نئے طرز سے آشنا ہو رہا ہے، اس سلسلہ کی سب سے تازہ مثال حکیم سنائی ہے، جس کو خلیل اللہ خاں خلیلی نے تالیف کیا ہے، اور جس میں حکیم موصوف کے سوانح، تصنیفات اور معاصرین کی تحقیق کی ہے، عمدہ ٹائپ میں اچھے کاغذ پر صفائی کے ساتھ چھپی ہے،

دو برس پہلے ایران میں فردوسی کی جو یادگار رسم منائی گئی تھی، اس میں ہندوستان اور کابل کے بعض اہل علم شریک ہوئے تھے، ان میں سے کئی دوستوں کی زبانی یہ سنا کہ خاکسار کی کتاب خیام کی قدر یورپ کے مستشرقوں اور ایران کے ادیبوں نے یکساں کی، اور فرمائش کی گئی کہ اس کا فارسی ترجمہ جلد شائع کیا جائے، اس کے لئے تقاضا تو ایک سال سے تھا، مگر دوبارہ نظرثانی اور ترمیم و اضافہ کے خیال سے ابھی تک تعمیل نہیں کی گئی، گذشتہ رمضان کی فرصت اس "بادہ خوار" کے سوانح پر نظرثانی کے نذر ہوئی جس نے سرخوش ہو کر کہا تھا،

ماہ رمضان برفت و شوال آمد ہنگام نشاط و عیش و قوال آمد

تصحیح اور اضافہ کے بعد اب یہ نسخہ کابل بھیجا جا رہا ہے، امید ہے کہ جلد اس کا ترجمہ طبع ہو کر نیشاپور تک پہنچ جائے جس کو صاحب سوانح اپنے قافلہ عمر کا گذرگاہ سمجھتا تھا،

اب ہندوستان میں بھی خوبصورت ٹائپ میں فارسی کتابوں کی چھپائی کا کام ترقی کر رہا ہے، کئی سال ہوئے کہ سخنوران ایران دلی کے جامعہ پریس میں چھپی تھی، اب بمبئی (بھنڈی بازار) میں آغا شرف الدین

نے عربی و فارسی کے ٹائپ کا جو مطبع قائم کیا ہے، اس میں مولانا جامی کی سلامان و ابسال نہبت صاف اور خوشخط
خدہ کاغذ پر چھپی ہے، قیمت فی جلد عہ و قیمت مجلد مطلا ہے،

سلطان محمد تغلق کے بعد مصر کے بھائیوں کو سب سے پہلی دفعہ اپنے ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کا خیال آیا ہے، مصر کے نوجوان مسلمانوں کی انجمن (جمعیۃ الشبان المسلمین) کی طرف سے ہندوستان کے تعلیمی و مذہبی حالات کی تحقیق کے لئے ایک وفد اس مہینہ یہاں آیا ہے، یہ وفد ایک صدر اور چند ممبروں پر مشتمل ہے، صدر حضرت علامہ ابراہیم جبالی، اور ممبر شیخ عبدالوہاب نجار اور شیخ محمد عدوی وغیرہ ہیں جمعیت کے رئیس ڈاکٹر عبدالحمید سعید کا خط آیا ہے کہ ان بزرگوں کو ہندوستان کے علمی و تعلیمی و مذہبی حالات کے مطالعہ کا موقع دیا جائے اور اتحاد اسلامی کی اس فرصت سے فائدہ اٹھایا جائے۔

ایک روسی پروفیسر ڈاکٹر ذکی ولیدی نے روسی زبان میں اس موضوع پر کہ مشرقی اور مغربی فضلا مل کر کس طرح اسلامی علوم کی تحقیقات کو ترقی دیسکتے ہیں ایک مضمون لکھا ہے، بھوپال سے ایک دوست نے اسکا اقتباس اصل روسی اور انگریزی کے ترجمہ کیساتھ بھیجا ہے جسکو آپ آیندہ تلخیص میں پڑھیں گے،

اس مضمون میں پہلے سر سید اور مولانا شبلی کا نام ہے اور اسکے بعد ہمارے دوست ڈاکٹر حمید اللہ (جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن) کا ذکر ہے جنکے ان مقالوں پر جو فرانسیسی میں انھوں نے لکھے تھے، بہت تعریف کیساتھ یہ اظہار خیال کیا ہے کہ مذہبی جمعیت کیساتھ اسکی تحقیق کا معیار بہت اونچا ہے، ہم اپنے دوست کو انکی اس کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں، اور ان مسلمان یورپ زدہ علمی ڈاکٹروں کے لئے نمونہ پیش کرتے ہیں، جو اپنی کامیابی کا ذریعہ علماے یورپ کی تحقیقات کی اندھی تقلید کو سمجھتے ہیں۔

مقالات

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں طاہر مرحوم،

"نواب سید محمد علی حسن خاں مرحوم کی وفات سے جو صدمہ علم و فن کو پہنچا ہے، وہ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں، مرحوم نے اپنے والد ماجد کی جو مفصل سوانح عمری مآثر صدیقی کے نام سے لکھی ہے، اس کا آخیر حصہ اون کی اولاد اور اولاد کی اولاد کے حال میں لکھا تھا، اس حصہ کے اون کی یہ خود نوشت سوانحعمری شائع کیجا رہی ہے،

اس میں بہت سے واقعات ایسے ہیں، جو ذاتی حیثیت رکھتے ہیں، مگر اس بنا پر کہ ہر عہد ماضی کا قلم بند ہو کر محفوظ ہو جاتا تاریخ کی ایک خدمت ہے، اسلئے ان کو اپنی جگہ پر قائم رکھا جاتا ہے"

چونکہ والاجاہ مرحوم کے سلسلۂ اولاد میں یہ عاصی پر معاصی، راقم الحروف بھی داخل ہے، اس لحاظ سے کچھ نہ کچھ اپنے حالِ پر ملال کے روزنامۂ سیاہ کا دفتر بھی کھولنا ہے، مگر حیران ہوں کہ لکھوں تو کیا لکھوں، اور بیان کروں تو کیا بیان کروں،

نہ شگوفہ ام نہ برگم نہ درخت سایہ دارم   ہمہ حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

حقیقت حال تو یہ ہے کہ جب میں اپنی عدم صلاحیت، تہیدستی علم و عمل، بے بضاعتی نقد و نظر، تہی وسیہ کاری، خود رفتگی و خود فراموشی پر غور کرتا ہوں، اور ساتھ ہی اکو جب اپنے انتساب ظاہری و نسبی پر نظر ڈالتا ہوں، جو جلیل القدر اسلاف کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر منتہی ہوتا ہے، تو میرے رنج و انفعال کی کوئی حد باقی نہیں رہتی، اور اس خیال سے کہ خدائے عزوجل کا یہ ارشاد لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح کہیں مجھ پر بروز جزا صادق نہ آئے، میرا دل لرز جاتا ہے، اور وحشت دل سے مضطرب ہو کر بے اختیار پکار اٹھتا ہوں،

چو پرسش گنہم روز حشر خواہد بود، تمسکات گناہان خلق پارہ کنند،

اللہ تعالیٰ اپنے کلام پاک میں فرماتا ہے بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ و لو القی معاذیرہ جو علم انسان کو اپنے نفس کا ہوتا ہے وہ یقین ہے، اور جو علم غیر کو ہوتا ہے، وہ ایک ظن خیر یا ظن شر سے زیادہ نہیں ہوتا، و لا تزکی علی اللہ احدا ھو اعلم من اتقی، یہ ایک ایسی حقیقت واضحہ ہے جس میں ذرا شک و شبہہ کی گنجایش نہیں، با ایں ہمہ میں نے اعزہ و احباب کے اصرار سے مجبور ہو کر حتی الوسع بلا کم و کاست عرض حال کرنے کی کوشش کی ہے، اور اپنے دل کو یوں تسلی دے کر سمجھا لیا ہے کہ اگر میرے اس افسانہ لا طائل اور داستان حسرت و حرمان سے میرے اعزہ و احباب اور ناظرین کو بجز انقباض خاطر اور تکدر طبع کچھ حاصل نہ ہو گا، تو کم سے کم سبق عبرت و بصیرت و استغفار و انابت تو حاصل ہو گا ع

من نہ کردم شما حذر بکنید،

اگر چمنستان فضل و کمال اور بہارستان علم و ہنر کی گلگشت سے دل کو سرور و فرحت اور وجد و حال پیدا نہ ہو گا، تو بے کمالی، اور بے ہنری کی برگ ریزی و پژمردگی اور گلشن فضل و کمال کی بربادی و ویرانی ملاحظہ کرنے سے بازیچۂ روزگار کی نیرنگ سازیوں کا اور دنیائے ناپائدار کی بے ثباتیوں کا سماں تو آنکھوں کے سامنے پھر جائے گا،

بر رشتہ گرہ می فگنم گر نہ کشایم، بیکار نسیم گر روش کار ندانم،

ولادت، واقعہ یہ ہے کہ اس کوچہ گرد عزتکدہ ہستی، ناآشنائے علم و عمل ناشناس اوضاع زمان، سرگشتہ وادی عصیان و طغیان الموسوم بہ علی المکنی بہ ابی نصر المتخلص بہ تسلیم و طاہر نے چہارم ربیع الثانی ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۶ء روز پنجشنبہ وقت نیم شب خواب عدم سے اس ظلمت کدۂ شہود اور دار فنا میں بمقام بھوپال آنکھ کھولی اور اپنے آپ کو ایک عجیب حال میں پایا، سب کچھ دیکھا، اور کچھ نہ دیکھا، سب کچھ سنا، اور کچھ نہ سنا ع

ہمہ خندان بدند و من گریان،

تا نظر بر چمن وضع جہاں وا کردم ستمے بود کہ بر دیدۂ بینا کردم،
نہ چمن بوئے بقا داشت نہ گل رنگ وفا حیرت آلودہ بہر سوئے نظر ہا کردم

والا جاہ مرحوم اس نمود بے بود سراپا ننگ و عار کی نسبت محبت پدری کے جوش مسرت میں اپنے فرحات قلبی اور دلی امیدوں کو کتاب اتحاف النبلاء المتقین میں ان الفاظ کیساتھ ظاہر فرماتے ہیں

"سعادت آثار ی لطف طبیعت، ذکائے مناسب و حرکات لطیفہ و رقت قلب و بشاشت چہرہ ہمراہ دارد، حق تعالی را امید دارم کہ از برکات اسمی با جمیع از محدثین و فقہا رکہ باین نام نامور اند، بمراتب علیا، از علم و عمل در دنیا و دین فائز گردد، چہ دعاہاست کہ برائے او و برائے برادر کلان او در حرمین محترمین حرسہما اللہ تعالی نہ کردہ ام و قبول و اجابت را راجی بودہ ام،

یارب این اخترم قمر گردد، بلکہ خورشید باختر گردد،
متحلی بہر حمیدہ شود، صاحب خصلت گزیدہ شود،
نور سنت منورش دارد ظلمت بدعتش نیازارد،
یک سر موئے بر قتش نبود کہ شریعت مزینش نبود،

یاد عمرش در از در طاعت کہ رود بر درِ تو ہر ساعت،

اختر طالعم بہ شامِ امید مایۂ انبساط چون مہِ عید

ہر چند کہ میں اپنی ذات میں بجز شامتِ اعمال و زلّاتِ اقدام باللہ العظیم کوئی ایک صفت ان صفاتِ مذکورہ میں سے اور کوئی ایک وجہ وجوہِ مزیت و فضیلت میں سے نہیں پاتا، اِنَّ النَّفسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْءِ، لیکن حضرت والد محترم مرحوم و مغفور کی تمنّاہائے قلبی و دعاہائے صبحگاہی کا اتنا اثر دنیا میں ضرور پاتا ہوں کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے علوم کتاب و سنت اور فنونِ دانش و حکمت کا ذوق آشنا بنایا ہے، اور ارباب علم و معرفت اور اہلِ کمال کی محبت میرے دل میں ڈالکر مجکو ان کی خدمت و اتباع کا شوق بخشا ہے، اور دولت و ثروتِ دنیوی کا بھی کچھ حصہ عطا فرما کر ہنوز بجز اپنی بارگاہ لم یزلی کے مجھ کو کسی دنیادار کے دولت کدہ جاہ و حشمت کا آستاں بوس نہیں بنایا، ولعل اللّٰہ یحدث بعد ذٰلک امرًا،

ما عجز دشمنیم و حریفان زبوں طلب اے خون ما بہ گردنِ طبعِ غیور ما،

ساتھ ہی اسکے کسی قدر غناے نفس اور آزادیِ طبع مرحمت فرما کر ابناے زمان کی خوشامد و احسان کے بارِ گراں سے سبکدوش اور محفوظ و مصئون رکھا،

روزگارے است کہ از غایت بیداد درو نیست ممکن کہ کسے با سر و ساماں باشد

چشمِ نیکی ز کہ داریم بہ عہدے کہ درو گر کسے بد نہ کند غایتِ احساں باشد

خداے ارحم الراحمین کے فضل و رحمت سے امیدوار ہوں کہ جس طرح اس نے حضرت والد مرحوم کی دعاہاے مخلصانہ کو کچھ نہ کچھ شرفِ قبولیت عطا فرما کر مجکو دنیا میں اپنے انعام و اکرام سے بالکل محروم رکھنا پسند نہیں کیا، اسی طرح وہ ان دعاؤں کو میرے دمِ واپسیں جب کہ کل تعلقاتِ مادی اور اعمالِ دنیوی منقطع ہو جاتے ہیں، سرمایۂ نجاتِ آخرت کرے، وباللّٰہ التوفیق والیہ المرجع والمآب

گر گرسنہ عام شد رفت زہ ہائے غذا　　ور بہ محل حکم شد دہ کہ چہا دیدنی است

ولادت کے ساتویں روز معمول اہلِ اسلام کے مطابق میرا عقیقہ ہوا، نواب سکندر بیگم صاحبہ خلد نشین نے بروز ولادت پانچ عدد مہر طلائی، اور بروز عقیقہ شریکِ تقریبِ مذکور ہو کر ایک عدد مہر طلائی والا جاہ مرحوم کو مرحمت فرمائی،

والد مرحوم نے اپنی کتاب ابقار المنن میں جن واقعات کا اظہار میرے بیانِ ولادت کے ذیل میں کیا ہے، اگرچہ ان کے نقل کرنے میں میرا دل تامل کرتا ہے کیونکہ ان میں بظاہر ایک قسم کے استحسانِ نفس کا شائبہ لازم آتا ہے، بایں ہمہ چونکہ میں اپنی ذات میں واقعۃً ایک بات بھی ایسی نہیں پاتا، جس پر مجکو استحسان کا وہم و گمان بھی ہو سکے، اس لئے میں حضرت والد محترم کے ان کلماتِ محبت آیات کو محض ان کے خلوص شفقت کی ایک دیرینہ یادگار، اور اپنے حق میں ایک طرح کی دعاے خیر تصور کرکے بر سبیل الشئی بالشئی یذکر، یہاں نقل کرتا ہوں وہ لکھتے ہیں:-

"میری اولاد میں فرزند صغیر باعتبار دنیا کے سب سے زیادہ خوش نصیب ہے، جس دن سے وہ پیدا ہوا، مجھ پر ابوابِ فتوح مفتوح ہونے لگے، اور ہر طرف سے اسباب جاہ و ثروت نے ہجوم کیا، سرکار عالیہ بھی اسی کو دوست رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ اس کو اس آیت کا مصداق کرے، وآتیناہ فی الدنیا حسنۃ وانہ فی الآخرۃ لمن الصالحین"

میں کہتا ہوں کہ اگر فی الواقع ایسا ہوا تو صاف ظاہر ہے، کہ یہ ایک حسنِ اتفاق ہے، اس میں میری پیدائش، اور میری ذات کو مطلق کوئی دخل نہیں، اس وقت مجھ کو عہدِ رسالت کا ایک واقعہ یاد آیا، حضور سرور کائنات (فداہ ابی و امی) کے صاحبزادہ حضرت ابراہیمؑ نے جس روز وفات پائی، اسی روز اتفاق سے سورج گرہن واقع ہوا، بعض لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ آپ کے فرزند دلبند

کے حادثۂ وفات کا ملاءِ اعلیٰ پر بھی اثر پڑا، یہ سورج گرہن اسی کا نتیجہ ہے، یہ خبر جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پہنچی، تو آپ نے صحابہ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا، کہ تم لوگ آگاہ ہو جاؤ، کہ کسوف وخسوف کو کسی کی مرگ وزیست سے کوئی تعلق نہیں، یہ دونوں کسوف وخسوف تو آیۃ من آیات اللہ ہیں،

اللہ اکبر جب فرزند رسولِ خدا کی ذاتِ قدسی صفات کو نظامِ کائنات اور ظہورِ واقعاتِ فطرت میں کوئی دخل نہ ہو، تو ہم جیسے سراپا نامہ سیاہ لوگوں کا وجود کس شمار وقطار میں ہے،

بہر تقدیر جیسا کہ عام قاعدہ ہے، روزِ ولادت سے بدو شعور تک میرا زمانۂ طفولیت کنارِ شفقتِ مادری میں بسر ہوا، مگر اس طرح کہ تمام دنیا کے حالات سے بے خبر فریب خوردہ چشم و نظر نگار خانہ ہستی کے تماشائے جمال میں حیران و مضطر، نہ اپنے آغاز کا علم نہ انجام کی خبر،

طفلی و دامانِ مادر خوش بہشتے بودہ است تا بپائے خود روان گشتیم و سرگردان شدیم

کاش اس بہشت کی نعمتوں اور دلفریب لذتوں کی قدر و قیمت ہی کا اسوقت کچھ احساس و ادراک ہوتا، مگر ایسے نصیب کہاں تھے، وہ تو ایک خوابِ نوشین تھا جو چشم زدن میں صبح ہوتے ہی ختم ہو گیا، آنکھ کھلی تو آفتاب سر پر تھا، اور دھوپ کی تپش و تمازت اور اس کی گرم گرم لپٹوں سے دل و دماغ آتشکدۂ آذر بنا ہوا تھا، جب اوس کی یاد آجاتی ہے، تو دل پر ایک عجیب حسرت انگیز و اضطراب آمیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے، اور دل پہلو کے اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتا ہے، ع

می خندم و می گریم چون طفل بخواب اندر

عالمِ بے خبری طرفہ بہارے بود است حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم،

مکتب نشینی، اس کے بعد گہوارۂ طفولیت سے قدم باہر نکالنے کا وقت آیا، پانچویں شعبان ۱۲۸۷ھ کو جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی، تو طریقۂ قدیم کے مطابق رئیسۂ عالیہ خلد مکان نواب شاہجہان بیگم صاحبہ نور اللہ مرقدہا کے شوکت محل پر تقریب مکتب نشینی کی محفل منعقد ہوئی، میرے نانا منشی جمال الدین

خان بہادر مرحوم مدار المہام ریاست، اور مولانا مولوی عبدالقیوم صاحب مرحوم جد مولینا محمد اسحاق صاحب مہاجر دہلوی کے داماد تھے، اور اعیان و علمائے پائے تخت شریک محفل تھے،

میری تعلیم ابتداءً سے نصاب مروجہ ہند کے مطابق نہیں ہوئی، اولاً حافظ پیر محمد صاحب مرحوم سے قرآن مجید ناظرہ پڑھا، پھر اپنے نانا مدار المہام صاحب بہادر مرحوم سے ترجمۂ قرآن کریم کے چند سبق پڑھے فارسی کی ابتدائی کتابیں مولوی خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم سے (جو بھوپال میں معلمی کیا کرتے تھے،) پڑھیں، اسی اثناء میں مولینا مولوی محمد احسن صاحب مرحوم بلگرامی مولف کتاب ارمغان فرہنگ و کارنامۂ فرہنگ و اسرار احسن وغیرہ کا غلغلۂ شہرت حضرت والد مرحوم کے سمع مبارک تک پہنچا، فی الحقیقت مولوی صاحب ممدوح فن تعلیم کے موجد اور استاذ کل اور نظم و نثر فارسی کے ماہر کامل تھے، اور شاعر گر کے لقب سے مشہور تھے، یہ ان کی عالمگیر شہرت ہی کی تاثیر تھی، کہ حضرت والد مرحوم نے ان کو حیدرآباد دکن سے خاص میری تعلیم کے لئے طلب کیا، اور جب ان کی محیر العقول بے نظیر قدرت فن تعلیم میں ظاہر ہوئی، تو رئیسہ عالیہ نے بھی ان کو اپنے تلمذ کا شرف بخشا، اور ان کے ادب و احترام اور قدر افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، ہندوستان میں ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، بہار و بنگال سے لیکر حیدرآباد دکن تک ان کے شاگرد پھیلے ہوئے تھے، حکیم محمد اسحاق حاذق موہانی مرحوم جن کا فارسی نعتیہ دیوان مدیح نعت کے نام سے چھپ کر شائع ہوچکا ہے، اور محبوب شیر صاحب صولت مرحوم عظیم آبادی جن کا فارسی کلام دیوان صولت کے نام سے طبع ہو کر مشتہر ہوچکا ہے، ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے،

میں نے کتب فارسی کی تکمیل مولانا ممدوح ہی سے کی، گلستاں بوستاں سکندر نامہ اُن سے بالاستیعاب پڑھا، قصائد عرفی سہ نثر ظہوری شبنم شاداب، رسائل طغرا، قصائد خاقانی رسالہ عبد الواسع ہانسوی کا متفرق طور پر ان سے درس لیا، کوئی کتاب ایک جزو دو جزو پڑھی، اور کوئی کتاب محض اپنے زور مطالعہ اور کتب لغت و مصطلحات کی مدد سے ان کو پڑھکر سنائی، بقیہ تمام درسی اور

کتابیں ہوں گی، جن کو اوّل سے آخر تک میں نے ایک بار نہ پڑھا ہو، بلکہ بعض کا ذو دو چار چار بار مطالعہ کیا، اسی دوران تعلیم میں مولانا کے فیض صحبت سے خود بخود میری طبیعت میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا، ابتداء عمر سے مجھ کو فارسی زبان کے ساتھ (جو اپنی عذوبت و لطافت میں مشہور خاص و عام ہے) شیفتگی رہی، مجھکو خوب یاد ہے، کہ میں نے بیس پچیس برس کی عمر تک کبھی کوئی نظم یا نثر سوائے فارسی کے اردو میں نہیں لکھی، البتہ تذکرۂ شعراے اردو کے جمع و ترتیب کے وقت جو بزم سخن کے نام سے موسوم ہے، میں نے چند اشعار بضرورت اردو میں لکھے تھے،

صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں میزان الصرف منشعب، پنج گنج، زبدہ، فریری، نحو میر، ہدایت النحو، شرح مأتہ عامل، کافیہ، شرح جامی دو چار ورق، مولانا سلامت اللہ صاحب مرحوم جیراجپوری اور مولینا مولوی الٰہی بخش صاحب مرحوم مؤلف تحفۂ شاہجہانی سے پڑھیں،

صدر العلماء مولانا مولوی سید ذو الفقار احمد صاحب مرحوم، مولانا مولوی حافظ عبد العزیز صاحب مرحوم بھوپالی، مولانا مولوی عبد الرشید صاحب مرحوم شوپانی کشمیری، مولینا مولوی عبد الباری صاحب مرحوم سسوانی، مولینا مولوی بدیع الزمان صاحب مرحوم لکھنوی سے مختصرات ادب و تاریخ اور بعض کتب حدیث اور قصائد عربیہ کا اکتساب کیا، اور بعض دواوین کتب سنت و تصوّف و رقاق اور مؤلفات والا جاہ مرحوم کو خود حضرت والد محترم سے سبقاً سبقاً پڑھا، مثلاً بلوغ المرام، مشکوٰۃ المصابیح، بخاری شریف کا کچھ حصہ، غنیۃ الطالبین، بغیۃ الرائد، ریاض المرتاض، حظیرۃ القدس، دررالبہیہ وغیرہ، حکیم مولوی علی حسین صاحب مرحوم بنگالی سے منطق کے چند ابتدائی رسائل پڑھے، مولینا مولوی حکیم محمد اسحاق صاحب مرحوم لکھنوی (جو ممتاز الدولہ ابو تراب میر عبد الحیٔ خاں صاحب مرحوم و مغفور کے عم بزرگ تھے،) اور حکیم علیم الدین خاں مرحوم اور حکیم عبد العلی صاحب مرحوم لکھنوی سے بعض کتب طبیہ کا اکتساب کیا، حکیم معز الدین خاں مرحوم ریاست بھوپال میں افسر الاطباء تھے، اور حکیم عبد العلی صاحب مرحوم لکھنوی جو مشہور اذکیا و علمائے لکھنؤ میں

سے تھے، وہ بھی ریاست بھوپال میں افسر الاطبا، کے معزز منصب پر فائز رہے تھے، انگریزی زبان کی بھی چند ابتدائی کتابیں یعنی ریڈر وغیرہ حضرت والد محترم کی حکم سے بادل ناخواستہ مختلف اوقات میں ماسٹر منشی حسین خان مرحوم اور ماسٹر فیاض الدین صاحب سے پڑھیں، اور بعض کتابیں انگریزی زبان کی محض تفنناً والاجاہ مرحوم کی وفات کے بعد بھی بطور خود ماسٹر عبد الرحمن صاحب بی اے علیگ اور ماسٹر بہاری لال صاحب سے پڑھیں، مگر دلبستگی انگریزی تعلیم کے ساتھ کسی طرح نہ ہو سکی، چند ماہ کے بعد یہ شغلہ چھوٹ گیا، دل برداشتگی کا بڑا سبب عام طور پر ملکی بد مذاقی اور عدم احتیاج تھی، اس کے علاوہ اس زمانہ میں کوئی سوسائٹی بھی بھوپال میں ایسی موجود نہ تھی جس کر سبب سے تعلیم انگریزی سے دلچسپی اور اسکی طرف کشش پیدا ہوتی،

اسی دوران تعلیم میں فنون سپہ گری اور شہسواری کی تعلیم بھی جاری رہی، غلام محبوب خانصاحب مرحوم سے (جو کارخانجات ریاست کے مہتمم تھے،) شہسواری کی، اور سید امیر علی صاحب مرحوم سے بانک بنوٹ اور فنون سپہ گری کی تعلیم پائی، حضرت والد مرحوم اپنی کتاب تاج المکلل میں اسی امر کی طرف تلمیح کرکے صفحہ ۳۰۰ میں لکھتے ہیں،

"وقرأ مختصرات العلوم بالفارسية والعربية الى شرح الكافية للجامي واخذ عن جماعة من اعيان بلدة وغيرهم الواردين بها يقرء فى هذه الايام كتاب جامع الصغير للسيوطى وتحصيل سائر الحديث له يد طولى فى الفروسية وركوب الخيل وهمته فى تحسين الزي وتجميل الهيئة وتنظيف الدار والمجالس وايثار شان الامارة"

مگر سچ یہ ہے کہ ایک فن بھی درجۂ تکمیل تک نہیں پہونچا، اور جو کچھ سیکھا، اور جتنا سیکھا، اس کا بڑا حصہ عالم تغافل اور بے نیازی کے نذر ہو گیا، یہ وہ وقت تھا کہ کبھی مرغزار علوم کی گلگشت کا ولولہ دل میں

اٹھتا تھا، اور کبھی فنون سپہ گری کے میدان میں جولانی دکھانے کی خواہش پیدا ہوتی تھی، کبھی دل ایک علم و فن کی طرف مائل ہوتا تھا، اور پھر کچھ دنوں کے بعد کسی دوسرے علم و فن کی طرف رجحان خاطر بڑھ جاتا تھا،

صرفت زمانا فی فنون عدیدۃ ۔۔۔ وافرغت جهدی والجنون فنون

ولما تجلی الامر انکشف الغطا ۔۔۔ تبین لی ان الفنون جنون

گر خوشہ چین زلفم و گہ دانہ دزد خال ۔۔۔ چوں مور قحط دیدہ بہ خرمن فتادہ ام

اسباب نامساعد کا تعلیم میں حائل ہونا

قطع نظر اس کے سوءِ اتفاق سے اس زمانہ میں کچھ اسباب ناموافق اس قسم کے میرے گرد و پیش جمع ہو گئے تھے، جن کی وجہ سے حضرت والد محترم کو میری تعلیم کی جانب سے ایک گونہ مایوسی پیدا ہو گئی تھی، اولاً تو میں پیدائشی نحیف الجثہ واقع ہوا ہوں، اسکے علاوہ زمانہ طفولیت سے میری صحت کبھی اچھی نہیں رہی، دردِ سر و نوازل وغیرہ کی شکایت کا کچھ نہ کچھ سلسلہ بچپن سے برابر قائم رہا، اگر دو چار مہینے اچھا بھی رہتا تھا، تو آٹھ دس مہینے بیمار پڑا رہا کرتا تھا ع

زہے بخت مریض غم عیادت کو جو آتے ہیں ۔۔۔ یہ سر رنجور بالش تھا، یہ تن بیمار بستر تھا

اس حالت کا اقتضاء تو یہ تھا، کہ مجھکو ایک حرف بھی نہ آتا، مگر ساتھ ہی اس کے خوش قسمتی سے کچھ اسباب مساعد بھی ایسے موجود تھے، جن کی وجہ سے میری تعلیم میں کسی قدر سہولت پیدا ہو گئی تھی، مجتوب سے زیادہ فائدہ میری والدۂ ماجدہ کی علمی قابلیت اور ان کی پاکبازی اور دینداری سے پہنچا، اور حضرت والد محترم کے فیض تربیت و صحبت نے مجھکو ورطۂ جہالت اور ہاویۂ ضلالت سے نکلنے میں بہت بڑی مدد دی اور مولانا مولوی محمد احسن صاحب بلگرامی جیسے فرد کامل اور شفیق استاد کے بے نظیر طریقۂ تعلیم نے مجھ پر اکتساب علم کا راستہ بہت کچھ آسان کر دیا،

(باقی)

شاہجہاں کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب رفیق دار المصنفین

شاہجہاں کی نادرۂ کار تعمیری یادگاریں اس کے ذوق کی نفاست اور لطافت کی بین دلیل ہیں، اسکی تمام تکوینی قوتیں فنون لطیفہ کی اسی شاخ پر صرف ہوئیں، اگر ہم بابر کی ذہنی نقش آرائیاں اسکی تزک بابری میں، ہمایوں کی تخئیل آرائیاں اس کے شعر و شاعری میں، اکبر کی علمی فیاضیاں اس کے دربار کی ہنر پرور فضا میں اور جہانگیر کی رنگینیاں اسکی تزک جہانگیری میں پاتے ہیں، تو شاہجہاں کے ذہن کی پرکاریاں، اس کے تخت طاؤس، قلعہ معلّی اور روضۂ تاج کے نقش و نگار سے عیاں ہیں، اسلئے یہ امر موجب تعجب نہیں کہ اس نے اپنے باپ یا اپنے لڑکوں دارا اور اورنگ زیب کی طرح کوئی علمی یادگار نہیں چھوڑی، اس کے دماغ کی گل افشانی کاغذ کے صفحات کے بجائے دیوان خاص اور دیوان عام کی دیواروں پر ہوئی، اس کا حسن ذوق علم و ادب کے بجائے جامع مسجد دہلی کی تعمیری ندرت و نفاست میں ظاہر ہوا، اس نے محبت کا ترانہ شعر و شاعری میں نہیں بلکہ تاج میں منظوم کیا،

اسکو بابر، ہمایوں اور جہانگیر کی طرح علمی انہماک نہ تھا، اس لئے ان کی طرح کوئی علمی تصنیف نہیں چھوڑی، لیکن پھر بھی اس کے ذوق علمی کا صفحہ دلچسپیوں سے خالی نہیں، اس کے دربار کی علمی فضا، پھر دارا شکوہ، جہاں آرا، مراد اور اورنگ زیب کی اعلیٰ تعلیم و تربیت اسکے ذوق سلیم کی شہادت ہے،

وہ جب چار برس، چار مہینے اور چار روز کا ہوا تو خاندانی روایات کے مطابق پڑھنے کے لئے بٹھایا گیا، قاسم بیگ تبریزی، حکیم دوائی گیلانی، شیخ ابو الخیر (برادر علامی ابو الفضل) اور وجیہ الدین گجراتی تعلیم کے لئے مقرر ہوئے، ان باکمال استادوں کی زیر نگرانی شہزادہ خرم نے علوم و فنون کی تکمیل کی خطاطی میں اسکو بڑی مہارت تھی، محمد صالح کنبو لاہوری شاہجہاں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

"بسے بر نیامد کہ بتفصیل تحصیل فصول ابواب دانش نمودہ در جمیع فنون فضائل و دقائق نکتہ فہمی بأعلی درجات کمال رسانید، و در عرض اندک مایہ مدتے بے آنکہ کار بطول کشد، ہیولائے خط نیز صورت درست پذیرفتہ تختہ مشق از ریختہ قلم مشکین رقمش چوں صفحۂ رخسار نوخطان بحسن خط زینت گرفت[1]"

ان استادوں میں حکیم دوائی گیلانی کی سعی و محنت زیادہ بار آور تھی، چنانچہ شاہجہاں کہا کرتا تھا

"فی الحقیقت حکیم دوائی آموزگار ماست، و حق تعلیم او برما از استادان دیگر بیش است[2]"

تاتار خاں جسکو ترکی لغت کی واقفیت میں اعلیٰ کمال حاصل تھا، شہزادہ کی ترکی زبان کی تعلیم کے لئے مامور تھا[3] یوں تو اس نے شروع ہی سے اکبر کی سب سے پہلی بیوی خدیجۃ الزمانی رقیہ سلطان بیگم بنت ہندال مرزا کی زیر نگرانی پرورش پائی[4] جو خالص ترکی زبان بولا کرتی تھی، مگر شاہجہاں کو ترکی بولنے کی کبھی مشق نہیں ہوئی، جہانگیر کہا کرتا تھا، کہ اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ خرم میں کیا عیب ہے تو میں کہوں کہ وہ ترکی زبان نہیں جانتا ہے[5]، وہ ہندوستانی زبان سے بھی واقف تھا،

شاہجہاں نے کوئی تصنیف اور نہ رقعات کا مجموعہ چھوڑا، اسلئے اسکی علمی لیاقت کا اندازہ کرنا مشکل ہے، لیکن شاہجہاں نامہ میں اس کا ایک رقعہ منقول ہے، جو اس نے تخت نشینی کے بعد دست خاص

---

[1] عمل صالح الموسوم بہ شاہجہاں نامہ از محمد صالح کنبو، جلد اول ص۳۱، [2] ایضاً ص۳۲، [3] ایضاً ص۳۲، [4] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول ص۹۱، [5] تزک جہانگیری، [6] بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری جلد اول ص۱۱۳،

سے لکھکر آصف خاں یمین الدولہ کے پاس بھیجا، رقعہ حسب ذیل ہے:-

"دانائے رموز سلطنت عظمیٰ، واقف اسرار خلافت کبریٰ، سرخیل یکرنگان وفادار، سلالۂ یکجہتان حق گذار، کارفرمائے سیف وقلم، مدبر امور عالم، زبدۂ خوانین عالیشان، قدوۂ امرائے بلند مکان، عضد الخلافت یمین الدولہ، عموی بجان برابر آصف خاں، در امان حضرت ملک منان بودہ بدانند، کہ در چہارم گھڑی روز مبارک دوشنبہ بست وپنجم بہمن ماہ موافق ہشتم جمادی الثانی سنہ ہزار وسی وہفت ہجری بمبارکی وفیروزی در دار الخلافت اکبرآباد جلوس میمنت مانوس بر تخت سلطنت وسریر خلافت واقع شدہ، وبدستوری کہ معروض داشتہ بودند، لقب را شہاب الدین قرار دادیم، چنانچہ نام مبارک ما را بعنوان شہاب الدین صاحبقران ثانی شاہجہاں بادشاہ غازی در خطبہ کہ دریں روز بلند آوازہ گردانیدند، ولطح نمودند، وسکہ بہمیں نام مبارک زدہ شد،

للہ الحمد کہ آن نقش کہ خاطر میخواست

آمد آخر زپس پردۂ تقدیر برون

امیدواریم کہ اللہ تعالیٰ بادشاہ کل ہندوستان را کہ بمحض کرم خود بما عنایت نمودہ بر بادشاہ شادشما کہ شریک غالب ایں دولت ابد مبارک گرداند، وروز بروز فتوحات تازہ ونصرت ہائے بے اندازہ نصیب ما شود وشما ہم بعمر طبیعی رسیدہ از دولت ما دولت ہائے عظیم یابید، خدمت پرستخان آخر روز جمعہ رسید وعرضہ داشت شما راگذرانید، وبعرض رسانید، کہ مقرر نمودہ آمد، کہ روز پنجشنبہ بست ویکم ماہ بہمن از آنجا روانہ شوید، وروز جمعہ

۱؎ شاہجہاں نامہ از محمد صالح کنبوہ ص۲۹۲، وبادشاہ نامہ جلد اول از عبد الحمید لاہوری ص۸۵، شاہجہاں کے بعض اور رقعات بھی نظر سے گذرے، لیکن علمی حیثیت سے وہ بلند نہیں ہیں،

چہار دہم ماہ اسفندارمذ بملازمت ما مشرف گردید این معنی چوں ولالت بزبان می نمود کہ زمان دریافت ملازمت نزدیک رسیدہ خوشحال شدیم، قرارداد این معنی کہ پادشاہزادہ کامگار برخوردار را ہمراہ بیاوردید، و خواجہ ابوالحسن را در لاہور بگذارید متضمن افتادہ کہ در روز مبارک جلوس میمنت مانوس پوشیدہ بودیم براے آں عضد الخلافہ فرستادیم ہر چند کہ ہر چہ بآں عمو عنایت فرمائیم زیادہ ازاں گنجائش دارد، اما بالفعل منصب ہشت ہزاری ذات و ہشت ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ عنایت نمودیم، وسوائے آں بندر لاہری رابطریق انعام مرحمت فرمودیم، ایں عنایت ہاے ما بر شما مبارک باشد"

اس عبارت میں جہانگیر کی تزک کی رنگینی اور روانی اور نہ عالمگیر کے رقعات کی سلاست اور برجستگی ہے لیکن پھر بھی اس کا کاتب کوئی معمولی استعداد کا آدمی نہیں معلوم ہوتا،

ایک اور فرمان سے اس کی علمی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے، ایک بار کا ذکر ہے کہ شاہجہانی سفرا، عراق گئے، تو خلیفہ سلطان کے وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے تہافت الفلاسفہ میں قدم علم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے مسئلہ میں شیخ ابونصر فارابی اور بوعلی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے، ؟ شاہجہانی سفرا ہندوستان اور سلطنت تیموریہ کے فضل وکمال کے وقار کو قائم رکھنا ضروری سمجھتے تھے، اسلئے انھوں نے شاہجہان کو اطلاع کیا، شاہجہان نے اپنے وزیر نواب سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھکر پیش کریں، کہ عراق کو بھیجا جائے، چنانچہ سعد اللہ خاں نے ایک فرمان صادر کیا، جس میں لکھا، کہ

"بکرتن مریداں حکم شد کہ بآں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند بنگارد، و برآں آرد کہ ان افادت و افاضت مرتبت رادریں مسائل مختصر جامع مفیدے کہ مستجمع کلمات

تحکمات حکما و تاویلات علما، و وجہ تکفیر اسلامیین و اقوال ملیین، و مباحثات و مناظرات شکوک و شبہات و ازالات و احتجاجات و اسولہ و اجوبہ و غایت تدقیقات و نہایت تحقیقات و اصل کلام در ہر باب و اساس سخن در ہر جواب و آن چہ دران نظر یافتہ باشند و برہان بران قائم شدہ باشد، و احاطۂ مسائل متعلقہ بمطلب علم از حصولی و حضوری بود و علم و عین عالم و عین معلوم است، یا غیر، و تعلق آن بجزئیات بوجہ کلی است یا بوجہ جزئی، و تحریر آنکہ کلیۃ و جزئیہ معلوم تابع مدرک و یا تابع مدرک است و نسبۃ الواجب جزئی ست یا نہ، و بیان آنکہ ادراک تعقلی است، نہ احساسی، ..... الخ"

ایک صاحب نظر کا خیال ہے کہ یہ جملے شاہجہاں کے بتائے ہوئے تھے، چنانچہ عبارت ہذا پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ "شاہجہاں کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے، کہ اس نے اس مسئلہ میں جن امور پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اسکو چند جملوں میں ادا کر دیا" آگے چل کر پھر لکھتے ہیں، کہ "سعد اللہ خان کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے، لیکن شاہجہاں کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے، کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اسکو سمجھ سکتا ہے"[1]

شاہجہاں کی علمی لیاقت کا حال ان حکیمانہ اور عالمانہ باتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے، جو وہ اپنے درباریوں سے کہا کرتا تھا، ایک بار اہل دربار نے کہا کہ ایک صوبہ کا دیوان اپنی ریاست کے اظہار اور جزرسی کے لئے لوگوں کے حق میں سختیاں کرتا ہے، اسکے جواب میں شاہجہاں نے جو نکتہ آفرین باتیں کہیں، وہ ایک ہمعصر مؤرخ کے الفاظ میں سننے کے لائق ہیں،

"و بست و نہم ماہ کہ دانشوران و سخن سنجان پائے تخت ہمایوں بخت در انجمن حضور سراسر نور برطبق دستور معہود سعادت بار دریافتہ شرف قرار داشتند، و از ہر جا سخن سر شدہ از ہر

---

[1] دیکھو معارف نمبر ۴ جلد ۱۰،

گفت و گو در میان بود اتفاقاً بتقریب ذکر روش سلوک یکے از متصدیان شغل دیوانی صوبجات مذکور شد کہ آن و شعار معاملہ بغایت عرصۂ کار بر مردم تنگ کردہ و مہمات سخت گرفتہ، آنحضرت فرمودند کہ ایں معنی موافق آئین کارگذاری نیست، چہ سخت گرفتن کارہا و تنگ کردن ساحت امور باعث آن می شود کہ سستی و فتور در اساس پیشرفت کارہا افتد و عرصۂ ملک بر فتنہ و فتنہ گران فراخ گردد، چنانچہ در عہدِ ولایت حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ باوجودانکہ حضرت خلیفۂ حق و امام مطلق بودہ بر وفق قول حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ کارفرمائے برحق و باحق بودند، اصلا کار موافق مدعاے آنحضرت پیش نرفت، چہ آنحضرت در ہیچ امرے از امور دنیا و دین دقیقہ واری تجویز مساہلہ نفرمودہ یک لمحہ مسامحہ روا نمی داشتند، و اہلِ دنیا کہ نقطہ مقابلِ دین و طرف آخرت بل فی نفسہا باطل مطلق است، طالبان ... بشتافتند و تحریک سلسلۂ فساد نمودہ فتنہا برانگیختند،،[1]

اسی اثنا میں سید جلال بخاری نے شاہجہان کے ایک ارشاد عالی کا حوالہ دیا کہ دنیا دو پاؤں پر قائم ہے ایک حق دوسرا باطل لیکن اس نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ حق پر قائم ہو، اس پر شاہجہان نے جو تقریر کی، وہ بہت ہی بصیرت افروز ہے، عمل صالح میں ہے کہ

حضرت بادشاہ حقائق آگاہ کہ طبع اقدس دقیقہ رس آنحضرت بکار فرمای حدت ناخن دریافت از ہیچ نکتہ بے تفتیش نمی گذرد، فرمودند کہ دریں مقام جائے ایستادگی خرد است ازیں کلام فیض نظام چناں لازم می آید کہ از وقت آنحضرت گرفتہ تا مبدء فطرت ابوالبشر علیہ السلام احیاناً پائے باطل نیز درمیان بودہ باشد، و حاشا کہ آنحضرت را ازاں کلام ایں معنی منظور بود، دریں وقت چندے از فیض یابان حضور پر نور آن را بتاویلات دور دور

[1] عمل صالح جلد دوم، ص ۲۳۲،

در اظہار نمودند، چنانچہ ہیچ کدام دلنشین وخاطر ایشان نیامد ودر آخر کار خود فرمودند که

که این کلام را بریں وجہ تاویل باید نمود، که در عہد برکت آئین حضرت خادم النبیین ما

برحق محض بوده پیش رفتن امور دران حال بنا بر آں بوده که بمیامن وجود مسعود آں

موئید بتائید آسمانی اہل آنزمان راستی ودرستی وحق پژوہی وحقیقت طلبی دیگر داشتند

ودلہاے ہمگنان درآن محل باوجود صفوت جبلی وصفای فطرت از پرتو صیقل مواعظ ونصائح

آنحضرت جلا وصفائی کلی پذیرفتہ خلاف حق وصدق بران قرار نمی گرفت بلکہ بطلان وناصواب

دران راہ نمی یافت، لہذا تنسیق امور بر وفق نفس الامر میسر می شد وحق مطلق کما ینبغی از

پیش می رفت، وبریں قیاس در زمان حضرت خلفاے راشدین که بمقتضاے قرب عہد

رسالت معاینہ مانند ساعت بعد از غروب آفتاب که بتاثیر پرتو آں دمی چند اثر فروغ

باقیست ورفتہ رفتہ بظلمت می گراید، بواطن اہل آنزمان نیز ہنوز از یمن تاثیر نیر اعظم

اوج نبوت نورانی بوده زنگ غفلت برآن دست نیافتہ بود، وچوں بتدریج احوال

زمانیان دگرگون شده، یکبارگی بعد مطلق از عہد آنحضرت درمابین اتفاق افتاد وزنگار

ظلمت بر قلوب ابناے روزگار استیلا گرفت، چنانچہ کار بجاے رسید که ظلمت پیشگاں

ظلمت سرشت اطفاے نور وجود خلیفہ برحق اعنی حضرت ذوالنورین نمودند، در خلال

این حال خلل درمیان استقامت حق وحقیقت راہ یافتہ اقامت دنیا برپاے حق دست

نداد، وازیں رو حضرت امیر را این معنی که مطلوب آنحضرت افتاده بود میسر نہ شد وقرار

داد خاطر عاطر آں سرور حق پرور صورت نہ بست چوں ایں توجیہ وجیہ بسبب تدقیق

آنحضرت رونمود ہمگنان از برکت غور وخوض آں خسرو عقیدت اندیش دقیقہ یاب

بکنہ ایں دقیقہ رسیدند وباتفاق کلمہ اقرار نمودند که ایں کلام را بہتر ازیں تاویلے

نمی توان کرد[1]"

ایک اور علمی مجلس میں شاہجہاں کی نکتہ آفرینیاں ملاحظہ ہوں:-

"چہارم آذر کہ محفل ارم آئین، بوجود دانشوران ہر کشور محفوف بود و ہر یک بقدر مبلغ علم خود در سائر ابواب ہر فن سخنے می گفت، و بادشاہ حکیم مشرب حکمت پژوہ کہ پیوستہ در پے تحقیق و تفتیش لوامع حِکَم و جوامع کلم اند در ہر باب مدخل نمودہ، از ہر در گفتگو می فرمودند، تا سر رشتہ سخن باحوالِ ملوک حکما، و اوضاع حکما ملوک کشید، دریں اثنا یمین الدولہ کہ ارسطوے عہد و آصف سلیمان زمان است مبالغہ ستایش و ثنائے سکندر بدیں مبلغ رسانید، کہ دریں مدت متمادی ہیچ فردی از افراد ذوی العقول بر قول و فعل آن بادشاہ راست گفتار و درست کردار گرفت نمودہ، بل مبادی راہ دخل نپیمودہ حضرت خلافت مرتبت فرمودند، کہ چوں نبوت سکندر فیلقوس رومی بدرجہ ثبوت نہ رسیدہ و بنا بر قول محققین ائمہ تاریخ اسکندر ذوی القرنین دیگر ست مارا بر ستوری ادب دو سخن بر گفتار و کردار اوست، نخست آنکہ بجوابِ رسول دارا در باب طلب بیضہاے طلا کہ پدرش فیلقوس ہر سالہ برسم خراج می داد چنیں گفت، ع

شد آں مرغ کو خایۂ زریں نہاد،

چنانچہ در تواریخ معتبرہ و کتب اخبار و سیر مذکور است و در افواہ و السنہ بر سبیل تواتر مشہور و ایں سخن نسبت بہ پدر کمال سوء ادب دارد، چہ ماکیان جانوریست بغایت فرومایہ و مع ہذا بیضہ نہادن مستلزم انوثیت، دومین ترک طریقہ حزم و احتیاط نمودن و در لباس رسالت بہ مجلس نوشابہ رفتن، و ایں شیوہ از طریقہ خردمنداں دور است،

---

[1] عمل صالح جلد دوم ۲۲۴،

چہ دانا از تکلف امرے کہ پشیمانی بار آورد و چارہ پذیر نباشد ہرگز نمی نماید، حاضران مجلس

بشگرانۂ اتفاق پوشیدن خلعت وجود در عہد سعادت مہد این بادشاہ زبان بسپاس

جہاں آفرین کشودہ آنگاہ فراخور فسحت دستگاہ سخن ستایش این سخنان حکمت آمیز در سلک

دعاے از دیاد دین و دولت بجا آورند"[1]

شاہجہاں اپنے گوناگوں مشاغل کے باوجود روزانہ کتابوں کا مطالعہ جاری رکھتا تھا، جب تمام

کاموں سے فارغ ہو کر رات کو سونے جاتا، تو اس کے مقربانِ خاص پردہ کے پیچھے سے کتابیں پڑھتے

تھے، جو زیادہ تر انبیا، اولیا، وسلاطین کی سوانحِ عمریاں اور تاریخیں ہوتیں، وہ ظفر نامہ اور واقعات

بابری کو بہت پسند کرتا تھا،[2]

اس کا خاندان خود علم و ادب کا گہوارہ تھا،[3] اس کے دربار میں علمی وقار و شوکت دیرینہ روایات

کیساتھ قائم رہی، وہ اہلِ علم و فضل کو کن نظروں سے دیکھا کرتا تھا، یہ ذیل کے پند و نصائح سے معلوم

ہوگا جو اس نے بیاضِ خاص میں لکھ رکھی تھیں،

"روندادن بمردم بد، نرنجیدن بعدم حصول مقصد، نرنجانیدن مردم خوب مزاج

دخواستن بکمال احتیاج صحبت داشتن با اہل معاد و جستجو کردن قابلان باستعداد، باز ندادن

پیش خود بمردم جہاں، دادن بارباب استحقاق بقدر توفیق پیش از سوال، کرم داشتن

اہل فضل، معروف نمودن مزاج بعدل میل نکردن باقوال غیر عقائد بے تجسس نمودن

از احوالِ متوکلان بے مکان غنیمت دانستن وجود یگانگان کہ بیگانہ از خلق باشند، پیش داشتن

جمیکہ مصالح امور دنیا و عقبی بودند"

---

[1] عمل صالح حصہ اول ص ۵۱۰، ۵۱۱، [2] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۱۵۳، [3] شاہجہاں کی اولاد کی علم نوازی کا حال ہم تیموری شہزادوں اور شہزادیوں کے علمی ذوق کے سلسلے میں لکھینگے،

یہ نکات علمی اور عملی حیثیت سے کسقدر بصیرت افروز ہیں، عالمگیر نے ان کو شاہجہان کی بیاض سے نقل کر کے اپنے فرزند عالیجاہ شاہزادہ معظم کو ازروے نصیحت لکھ بھیجا تھا[1]

شعراء | شاہی دربار میں شعراء و فضلاء کی ایک کثیر تعداد تھی، جو شاہجہان کے جود و سخا سے فیضیاب ہوا کرتی تھی، لطف اللہ مہندس[2] نے جو دارا شکوہ کے مقربانِ خاص میں تھا، شاہجہانی شعراء کے نام مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کئے ہیں،

وحید دہر امانی بن مہابت خان	وے بخان زمان است شہرۂ دوران
دگر یگانہ ظفر خان تخلص احسن	ربودہ گوے سخن از سخنوراں درفن
دگر وحید زمن آشنا عنایت خان	بود بجر سخن آشنا عنایت خان
دگر وحید زمن شادمان غم پرور	بیانِ شادی و غم در کلام او مضمر
دگر سخنور کشمیر محسن فانی است	بقاے نام وے از دولتِ سخندانی است
مہ سپہر سیادت یگانہ میر عماد	کہ بود در غزل و مدح و مثنوی استاد
لبیب عصر محمد حسین آشوب است	سخنورے کہ سخنہاش جملہ مرغوب است
دگر وحید زمان ست طالبا ے کلیم	کہ شعر او ید بیضا است نزد طبع سلیم
دگر فرید جہان قدسی محمد خان	بعہد شاہجہان گو ربود از اقران
الٰہی ہمدانی است در سخن استاد	سخنورے است کہ داد سخنوری می داد
لبیب از منہ الٰہی نخوانده ہیچ کتاب	ز فیض حق شده مفتوح بر رخش صد باب

---

[1] وقائع عالمگیری مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی، [2] لطف اللہ مہندس کے مزید حالات کے لئے دیکھو مضمون تاج محل، اور لال قلعہ کے معمار، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی معارف فروری و مارچ و اپریل ۱۹۳۶ء،

دگر وحید زمین باقیاتِ ترانۂ او | خوش شست ہچو غزلہائے عاشقانۂ او

فصیح از منہ فتحا کہ چوں غزل می گفت | چو عندلیب غزلخواں در و گہری سفت[1]

اس چمنستانِ شعراء کا گل سرسبد ابو طالب کلیم تھا، کلیم کاشان کا رہنے والا تھا، جہانگیر کے عہدِ حکومت میں ہندوستان آیا، لیکن ۱۰۲۸ھ میں وطن واپس چلا گیا، پھر ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار میں ملک الشعراء طالب آملی کے مقابلہ میں اسکو فروغ نہ ہوا، لیکن شاہجہاں کے عہد میں کلیم کا کلام شعلۂ طور بن کر چمکا، شاہجہاں کے دربار سے ملک الشعراء کا خطاب ملا، ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہاں نے ایک کروڑ روپیہ کی لاگت سے تخت طاؤس تیار کرایا، اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی، تو کلیم نے ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

خجستہ مقدم نوروز غرۂ شوال | نشاندہ اند چہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہجہاں کو یہ قصیدہ اس قدر پسند آیا، کہ کلیم کو اس کے صلہ میں روپے کے برابر تلوایا، جو ۵۰۰۰ تولے وزن میں آئے،[2] اور اسکو عطا کئے[3] ۱۰۴۶ھ میں جشن وزن شمسی کے موقع پر شاہی خزانہ سے کلیم کو کچھ اشعار کے صلہ میں ایک ہزار روپیہ ملے[4] ۱۰۴۹ھ میں کلیم شاہجہاں کے ساتھ کشمیر گیا، اس جگہ کی دلآویزیوں اور رنگینیوں کو دیکھ کر وہاں کا فریفتہ ہو گیا، بادشاہ سے وہاں قیام کی اجازت چاہی، جو منظور ہوئی، یہیں بیٹھ کر فتوحاتِ شاہی منظوم کرتا تھا، جس کے لئے کلیم کو سالانہ وظیفہ ملتا تھا، ۱۰۵۵ھ میں شاہجہاں پھر کشمیر گیا، تو کلیم نے تہنیت کا قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کے انعام میں خلعت اور دو سو اشرفیاں پائیں، شاہجہاں جب واپس ہونے لگا، تو کلیم نے پھر ایک قصیدہ کہا، اور دوسو

---

[1] دیکھو مضمون ہذا و فہرست کتب خانہ شاہ اودھ از ڈاکٹر اسپرنگر صفحہ ۱۱۶، [2] بادشاہ نامہ حصہ دوم صفحہ ... نیز ماثر الکرام دفتر ثانی، از غلام علی آزاد بلگرامی ص ۸۷، مطبع مفید عام آگرہ و شعر العجم حصہ سوم از مولینا شبلی ص ۲۰۰، [3] بادشاہ نامہ جلد اول صفحہ ۱۴۴

اشرفیاں بھی انعام میں ملیں،[۱]

کلیم کا مدِمقابل شاعر حاجی محمد جان **قدسی** تھا، مشہد کا رہنے والا تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تعلیم پا کر ہندوستان آیا، خواجہ عبد اللہ خان بن خواجہ ہارون کی مدح میں جو ہفت ہزاری منصب کا شاہجہانی امیر تھا، ایک قصیدہ کہا، عبد اللہ خاں سفر میں جا رہا تھا، اسی حالت میں قدسی نے قصیدہ پڑھا، عبد اللہ خاں اس قصیدہ سے اسقدر متاثر اور محظوظ ہوا، کہ اپنی مسند سے اٹھ گیا، اور اسکو اپنی جگہ پر بٹھایا، پھر باہر نکل کر اپنا خیمہ اس کے تمام متعلقات اور لشکر کے تمام جانور انعام میں اسکے حوالہ کر دیے[۲]

۱۰۴۲ھ میں شاہجہاں کی خدمت میں حاضر ہوا، اور ایک قصیدہ کہا جس کا مطلع یہ تھا،

اے قلم بر خود ببال از شادی و بکشا زباں — در ثنائے قبلۂ دیں ثانیِ صاحبقراں[۳]

اس صلہ میں شاہجہاں نے قدسی کے منہ کو سات دفعہ جواہرات سے بھرا،[۴] اور اسکو دربار سے منسلک کر لیا، جہاں اسکو روزانہ وظیفہ ملا کرتا تھا، آگے چل کر ملک الشعراء ہوا، ۱۰۴۵ھ میں اُس نے جشنِ نوروز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا، جو شاہجہاں نے بہت پسند کیا، اس کے انعام میں اسکو روپے میں تلوایا، جو طالب کلیم کے وزن کی طرح ۵۵۰۰ ہوئے[۵] ۱۰۴۹ھ میں قدسی کو کچھ اشعار کے صلہ میں سو اشرفیاں مرحمت ہوئیں، جہاں آرا بیگم کی صحت یابی کے موقع پر قدسی نے ایک قصیدہ کہا، تو شاہجہاں نے دو ہزار روپے عطا کئے،[۶]

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد دوم ص ۹۴، نیز شعر العجم حصہ سوم و مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۰۰۰۔ [۲] مرأۃ الخیال ص ۱۳۷، [۳] عمل صالح حصہ دوم ص ۵۰۰ پر پورا قصیدہ منقول ہے، [۴] مرأۃ الخیال ص ۱۳۷، [۵] بادشاہ نامہ جلد اول حصہ دوم ۲۴۲، [۶] عمل صالح حصہ دوم ص ۱۸۳، شیر خان مرأۃ الخیال میں لکھتا ہے کہ حاجی محمد جان قصیدۂ رنگین در مدح صاحبقران ثانی گفتہ بعرض رسانید پادشاہ اقسام جواہر قیمتی طلبیدہ فرمود تا ہفت بار دہانش ازان پر کردند معلوم نہیں کونسے موقع پر یہ قصیدہ کہا گیا تھا

قدسی کا انتقال ۱۰۵۶ھ میں ہوا، طالب کلیم نے ایک مرثیہ لکھا، جس کے ایک ترکیب بند سے تاریخ نکلتی تھی، ع

دور از ان بلبل قدسی چمنم زندان شد
۱۰۵۶

احسن، مرزا احسن اللہ نام اور احسن تخلص تھا، خواجہ ابو الحسن تربیتی کا لڑکا تھا، خواجہ ابو الحسن خراسان سے اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، شاہزادہ دانیال اور دکن کا وزیر مقرر ہوا، جہانگیر کے زمانہ میں وزارت کے عہدۂ اعلیٰ پر مامور رہا، شاہجہاں کے زمانہ میں ششش ہزاری و شش ہزار سوار کا منصب اور کشمیر کا علاقہ عطا ہوا[1]، باپ کے مرنے کے بعد احسن اللہ عنایت شاہانہ سے مستفیض ہوا، کشمیر میں باپ کا جانشین ہوا، ظفر خاں خطاب ملا، ظفر خاں نہایت فیاض اور قدر دان علم و فن تھا، خود ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا، مرزا صائب کا شاگرد تھا، مگر اس کے کلام پر استادانہ نکتہ چینیاں کرتا تھا، مرزا صائب اس کی سخندانی کا بہت مداح تھا[2]، وہ صاحب دیوان بھی تھا[3]،

آشنا، مرزا محمد طاہر نام، عنایت خاں شاہی خطاب، اور آشنا تخلص تھا، ظفر خاں کا لڑکا تھا، شاعری کا ذوق باپ سے وراثت میں پایا تھا، شاہجہاں کا ندیم خاص تھا[4]، اسکے عہد کی تیس سالہ تاریخ بھی لکھی[5]، شاہجہاں کی طرف سے اسکو ہزار و پانصدی کا منصب عطا ہوا تھا[6]،

باقیائی، شاہجہانی دربار کا ایک مقبول شاعر تھا، ۱۰۶۶ھ میں جشن نوروز کی تہنیت میں ایک قصیدہ کہا جس کے صلہ میں شاہجہاں نے اسکو روپیہ میں تلوایا، جو ۵ ہزار کے برابر ہوا[7]،

---

[1] مآثر الامرا حصہ اول ص ۴۳۷، [2] شعر العجم حصہ سوم، [3] مآثر الکرام ص ۹۵، [4] ایلیٹ جلد ہفتم ص ۷۳، [5] ر[6] مآثر الامرا جلد ۲ ص ۷۶۲ [7] عمل صالح میں باقیائی کے بارے میں ہے: "سخنور سے طبع روان دارد، و در تصنیف و تالیف نغمات بروش موسیقی یونانی و فرس بے نہایت ماہر است و تصانیف خود را کہ بر وفق ریختہ طرز امیر خسرو و نغمہ ہوش ربا سے ہندی آمیختہ لفظ نوبت مرغوب و مطبوع مسامع و طبائع افتادہ" حصہ دوم ص ۲۳۰،

لطف اللہ کے گن ئے ہوئے شعرا رمیں امانی ابن مہابت خاں، شادماں، فانی، قضا و، آشوب، الٰہی
لی، امی، محوی کے حالات میری نظر سے مختلف تذکروں میں نہیں گذرے،

ان کے علاوہ بہت سے اور شعرار بارگاہ شاہجہانی سے منسلک تھے، ان میں سب سے پہلے مرزا
ب پر نظر پڑتی ہے، جس کے بارے میں مولینا شبلی کا خیال ہے، کہ ایران میں شاعری رودکی سے شروع
ئی، اور مرزا صائب پر ختم ہوگئی" میرزا صائب کا مولد تبریز تھا تعلیم و تربیت اصفہان میں حاصل کی جہانگیر کے
عہد میں ہندوستان آیا، خواجہ ابوالحسن تربتی کی فیاضیوں سے سیراب ہوا، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا، تو
تاریخی قطعہ لکھ کر بارہ ہزار روپیے صلے میں حاصل کئے،

شاہجہاں کی طرف سے مرزا صائب کو ہزاری منصب اور مستعد خاں کا خطاب بھی ملا تھا، میرزا صائب
علق زیادہ تر خواجہ ظفر خاں احسن کے ساتھ رہا، جس کی مدح میں اس نے متعدد قصائد لکھے، میرزا کو اکی
اسی پر ناز تھا، ۱۰۴۲ھ میں صائب مشہد مقدس کی زیارت کو جانا چاہتا تھا، تو شاہجہاں نے زاد سفر کے لئے
پنجہزار روپیے عنایت کئے،[1]

شیدا، ایک بہت ہی ذہین رسا شاعر تھا، بدیہہ گوئی میں کمال رکھتا تھا، حاجی محمد خاں قدسی
لے ایک قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر اعتراض کیا، جو بہت مقبول ہوا، طالب آملی اور میر الٰہی کی ہجو کہی، ہجو گوئی
میں بڑی مہارت رکھتا تھا، پہلے عبد الرحیم خانخاناں کی زر پاشیوں سے سیراب ہوتا رہا، پھر شہزادہ
شہریار کے آستانہ کا جبیں سا ہوا، آخر میں شاہجہاں کے دربار میں باریابی حاصل کی، ایک بار شاہجہاں
کے حضور میں ایک مطلع پڑھا،

چیست دانی بادۂ گلگوں مصفا جوہرے حسن را پرورد گارے عشق را پیغمبرے

---

[1] مرزا صائب کے حالات اور شاعری کی تفصیل کے لئے دیکھو شعر العجم حصہ سوم اور مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۹۹-۱۰۰

اس شعر کو سُن کر شاہجہان بہت ہی غضب ناک ہوا، حکم دیا، کہ اس کو فوراً شہر بدر کر دیا جائے لیکن شیدا نے فوراً معذرت میں ایک قطعہ لکھا، اور اپنی برأت کیلئے جامی کا مندرجہ ذیل شعر استشہاد میں پیش کیا،

ازمرا می دو بار قلقل مے، پیش جامی بہ از چہار قل است،

شاہجہان کا غصہ فرو ہوگیا[1]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے، چندر بھان برہمن جو دارا شکوہ کا میر منشی تھا، عاشقانہ اور صوفیانہ اشعار اچھے کہتا تھا، شاہزادہ داراشکوہ کے مزاج میں اسکو بہت دخل تھا، ایک بار شاہزادہ موصوف نے بارگاہ شاہی میں برہمن کے ایک شعر کی تعریف کی، اور شاہجہان سے بھی سننے کی درخواست کی، برہمن طلب کیا گیا، تو اس نے شعر عرض کیا کہ

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار، بہ کعبہ بردم و بازش برہمن آوردم،

شاہجہان کو یہ بیت سن کر غصہ آیا، مگر سعد اللہ خاں وزیر اعظم نے عرض کیا، کہ گیتی پناہ، حضرت شیخ سعدی چار سو برس پہلے اس کے جواب میں فرما گئے ہیں کہ

خر عیسیٰ اگر بہ مکہ رود، چوں بیاید ہنوز خر باشد،

شاہجہان ہنس پڑا،[2]

میر الٰہی و میر یحییٰ کاشی بھی شاہجہانی دربار سے تعلق رکھتے تھے، میر الٰہی اصفہان سے آکر شاہی دربار میں ملازم ہوئے، ۱۰۶۳ھ میں انتقال ہوا، تو غنی کشمیری نے یہ تاریخ کہی ع:-

برد الٰہی ز جہان گوے سخن،

۱۰۵۸ھ میں جب دار الخلافہ شاہجہان آباد کی تعمیر ساٹھ لاکھ روپیہ کے خرچ سے تکمیل ہوئی، تو میر یحییٰ

---

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۸۳، و مرآۃ الخیال ص ۹۴-۹۵، [2] مخزن الغرائب قلمی نسخہ دار المصنفین، [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۸۵،

نے یہ تاریخ کہی ع

شد شاہجہان آباد از شاہجہان آباد،
۱۰۵۸ھ

شاہجہان نے ایک ہزار روپیہ انعام میں دئیے، اور ایک موقع پر شاہجہان نے اکو سو اشرفیاں بطور انعام عنایت کی تھیں،[1]

میر رضی بن میر ابوتراب دانش رضوی مشہدی کو شاہجہانی دربار میں باریابی حاصل تھی ۱۰۶۵ھ میں شاہجہاں کی مدح میں ایک قصیدہ کہا جسکا مطلع یہ تھا،

بخواں بلند کہ تفسیر آیہ کرم است | خطے کہ از کف دست مبارکش پیداست

شاہجہاں نے اس پر دو ہزار روپے عنایت کئے،[2]

مسیح حکیم رکنا کاشی، ایک "عیسیٰ نفس" شاعر تھا، جو اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، جہانگیر کے دربار سے بھی منسلک رہا، شاہجہاں کی تخت نشینی کے موقع پر یہ تاریخ کہی،

بادشاہ زمانہ شاہجہاں | خرم و شاد و کامراں باشد
بہر سال جلوس او گفتم | در جہاں باد تا جہاں باشد

شاہجہان نے اس صلہ میں دو ہزار روپئے عطا کئے، ۱۰۴۱ھ میں مشہد مقدس کی زیارت کو گیا، تو رخصت کرتے وقت شاہجہاں نے خلعت اور پانچ ہزار روپئے دیئے،[3]

دو اور شاعر قابل ذکر ہیں،

میرزا حسن رفیع قزوین کا رہنے والا تھا، ۱۰۴۵ھ میں ہندوستان آیا، شاہجہاں کے دربار میں باریابی ہوئی، تو خلعت اور تین ہزار روپئے ملے، اور شاہی ملازموں میں داخل کر لیا

۱؎ ماثر الامرا جلد سوم ص ۴۶۹، ۲؎ ماثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۰۹، ۳؎ ماثر الکرام ۔۔۔ دفتر ثانی، ۴؎ ۔۔۔

سنہ میں جشن وزن کے موقع پر ایک قصیدۂ تہنیت کہا تو ہزار روپیہ انعام ملا[1]
میر صیدی طہرانی، اصفہان سے ہندوستان آیا، اور شاہی دربار میں ملازم ہو کر شاہجہان
پاشیوں سے سیراب ہوا، سنہ میں ایک قصیدۂ تہنیت کہا جس کا مطلع یہ تھا،

زہے جہان خدا را سپہر عدل و کرم
بزیر سایۂ قدر تو نیست اعظم،

ں نے اس کے صلہ میں ہزار روپئے دیئے[2]،

عبد الحمید لاہوری نے شاہجہانی دربار کے ایک اور شاعر سعیدا سے گیلانی المخاطب
ل خان کا ذکر کیا ہے، وہ اس کی شاعری کا بہت مداح ہے[3]، سعیدا نے شاہجہانی جلوس
یخ اس مصرع سے نکالی،

جلوس شاہجہاں دادہ زیب ملت و دین

شاہجہاں کی زرپاشیوں اور علم نوازیوں کے سلسلہ میں ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے
لدولہ نے تربہت کے دو برہمنوں کو دربار میں پیش کر کے عرض کیا، کہ یہ دونوں دس
ی بیتیں جو دس شاعروں نے تازہ کہی ہوں، اور کسی نے نہ سنی ہوں ایک بار سنکر
لیتے ہیں، اور اسی وزن اور مضمون میں دس شعر فی البدیہہ کہدیتے ہیں، امتحان ہوا تو
بت ہوا، شاہجہاں نے دونوں کو خلعت اور ہزار ہزار روپئے انعام میں دیئے[4]،

---

[1] ماثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۰۰،
[2] ثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۱۱،
[3] ا کے کلام کے نمونے بادشاہ نامہ جلد اول ص ۵۷ ۳ پر ملاحظہ ہوں،
[4] دشاہ نامہ حصہ اول ص ۲۶۹،

مسلمان اور جبر و مقابلہ

از

مولوی محمد یوسف صاحب عمری رفیق دار المصنفین

جبر و مقابلہ علم ریاضی کی ایک شاخ ہے جسمیں علامتون کے ذریعہ سے مقدارون سے بحث کیجاتی ہی، یہ علامتیں عام طور سے حروف تہجی ہوتی ہیں، اوران کی قیمت ایک مثال میں اول سے آخر تک ایک ہی رہتی ہی،

جبر کے لغوی معنی ٹوٹی ہوئی ہڈی کے باندھنے کے ہیں، اور لفظ مقابلہ مفاعلہ کے باب سے ہی، جس کے معنی ایک دوسری کی طرف متوجہ ہونے کے ہیں، لیکن ان دونون لفظوں کے اصطلاحی معنی یہ ہیں، کہ معادلات کے ایک جملہ میں ناقص کی تکمیل کرکے وہی مقدار دوسرے جملہ میں بڑھا دیجائے اور ایک جنس کی ناقص مقدار کو زائد مقدار میں سے گھٹایا جائے، چنانچہ نجم الدین خان انہی اصطلاحی معنون کو یوں بیان کرتے ہین،

طرفے کہ در و است حرف الا تکمیل کن و مثل آن را،
بر طرف دگر فزودن کن اے جبر در مصطلح است نام این جبر
ہنگام معادلہ تو بشناس، افتد اگر این کہ بعض اجناس
با وصف تجانس از سویت، در ہر طرف اند بے مزیت،
باید کہ ز ہر دو سو برانی، نامش تو مقابلہ بخوانی،

مثلاً: $۵\text{ب}^{۲} - ۶\text{ب} + ۲ = ۴\text{ب}^{۲} + ۷$

اس مثال کے پہلے جملہ میں ۶ب ناقص ہے، اسلئے اسکی تکمیل کرکے یہی مقدار اس کے دوسرے جملہ میں بڑھا دیجائیگی، اسی کا نام جبر ہے، چنانچہ مذکورہ شکل حسب ذیل شکل مین تبدیل ہوجائیگی،

$۵\text{ب}^{۲} + ۲ = ۴\text{ب}^{۲} + ۶\text{ب} + ۷$

اب اس میں ۵ب²، ۴ب² اور ۲، ۷ ایک جنس کی مقدارین ہین، اسلئے ۴ب² کو ۵ب² میں سے اور ۲ کو ۷ میں سے گھٹا دیا جائے گا، اسی کا نام مقابلہ ہے، تو مذکورہ صورت حسب ذیل صورت میں تبدیل ہوجائے گی،

$\text{ب}^{۲} = ۶\text{ب} + ۵$

شروع میں اس علم کا نام "الجبر والمقابلہ" تھا، لیکن رفتہ رفتہ دوسرا لفظ متروک ہوگیا، اور اب یوروپین زبانون مین "الجبر والمقابلہ" کی بجائے صرف الجبرا (Algebra) بولا جاتا ہے،

اس فن کا موجد کون ہے؟ قطعی طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اس علم کو کس نے ایجاد کیا؟ البتہ اتنا ضرور ہے، کہ ولادتِ مسیح سے ایکہزار سات سو سال پہلے ہی اسکی ابتدا ہوچکی تھی، گو اس پر فن کا اطلاق نہیں ہوسکتا، مگر اسکی بنیاد اسی زمانہ میں پڑچکی تھی،[1]

یونانی و ہندی تصنیفات، اسلام سے پہلے یونانیوں میں دو شخصون نے اس پر مستقل کتابین لکھین، ایک ابرخس ہے، جو ۱۴۶ ق م میں نہایت مشہور ریاضی دان گنا جاتا ہے، اس کی کتاب کا ترجمہ ابوالوفا محمد بن محمد حاسب المتوفی ۳۸۸ھ نے کیا، اور اس کی جابجا اصلاح کی، نیز اس نے اس کی شرح بھی لکھی تھی، اور دعووں کو براہینِ ہندسہ سے ثابت کیا تھا،[2]

---

[1] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا جلد اول ص ۶۱۶، کالم ۱، [2] فہرست ابن الندیم ص ۲۷۶،

ابرخس کے بعد ذیوفنطس الموجود فی ۳۵۰ء نے اس علم پر ایک مشہور کتاب لکھی، اصل کتاب جو ایک مقدمہ اور بارہ رسالوں پر مشتمل تھی، آج ناپید ہے، مگر اس کے ابتدائی چھ رسالوں کا لاطینی ترجمہ موجود ہے، جس کو ۱۵۷۵ء میں اکسیلنڈر (XYLANDER) نے بیسل (BASEL) سے شائع کیا ہے[1]

اس کتاب کا عربی ترجمہ سب سے پہلے قسطا بن لوقا بعلبکی نے کیا تھا، جو معتضد باللہ (۲۷۹ھ/۸۹۲ء – ۲۸۹ھ ۲۹۵ھ/۹۰۲ء) کے زمانہ میں تھا[2] بعد میں ابوالوفا البوزجانی المتوفی ۳۸۸ھ نے اس کی اصلاح کی، اور اوس کی شرح لکھی تھی[3]

ہندوستان میں سب سے پہلے آریہ بھٹ نے چھٹی صدی عیسوی مین آریہ بھٹیم کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کا تیسرا باب علم حساب پر ہے[4] بیرونی نے براہم سدھانتا کے ابواب کا تذکرہ کیا ہو جسکا ایک باب جبر و مقابلہ پر ہو[5]

اسی طرح اسلام کے بعد ۱۱۵۰ء میں مشہور ہندوستانی ریاضی دان حکیم بھاسکر اچاریہ نے خاص جبر و مقابلہ پر ایک مستقل کتاب بیج گنت کے نام سے لکھی جس کا ترجمہ فارسی میں عطاء اللہ رشیدی ابن نادر العصر احمد نے ۱۰۴۴ھ میں شاہجہان کی تخت نشینی کے آٹھویں سال کیا تھا، فارسی ترجمہ کے قلمی نسخے کتب خانہ، برٹش میوزیم لندن اور کتب خانہ میونخ میں ہیں[6] اس کا ایک اور نسخہ ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں بھی ہو جو میری نظر سے گذرا ہو،

اب یہ سوال کہ آیا ہندوؤں نے اس علم کو یونانیوں سے حاصل کیا، یا یونانیوں نے ہندوؤں

---

[1] انسائیکلوپیڈیا، جلد اول صفحہ ۶۰۰ کالم ۱، [2] عیون الانباء فی طبقات الاطباء جزو اول ص۲۴۴، [3] فہرست ابن الندیم ص۲۶۶، [4] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول ص۶۱۱ کالم ۱، [5] کتاب الہند ص۶۰، [6] فہرست مخطوطات فارسی کتبخانہ برٹش میوزیم لندن ص۴۵۴، و کتبخانہ میونخ ص۱۳۶۔

سے لیا، ابھی تک محل نظر ہے، اس میں شک نہیں کہ ایک زمانہ سے ہندوستان اور یونان کے درمیان تجارتی آمد و رفت کا سلسلہ قائم تھا، اور یہ طبعی بات ہے کہ تجارتی چیزوں کے تبادلہ کے ساتھ خیالات کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے، اس لئے بہت ممکن ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہو،

لیکن اگر یونانیوں اور ہندؤوں کی کتابوں کا موازنہ کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں نے اس علم کو یونانیوں سے بھی آگے بڑھا دیا تھا، ہندو ریاضی دانوں نے دو درجی مساوات کے دو جذر کو تسلیم کر لیا تھا، غیر معین مساواتوں کے حل کرنے کا عام قاعدہ بھی انھوں نے دریافت کر لیا تھا، یونانی ان سے ناواقف تھے،[۱]

مسلمانوں کا جبر و مقابلہ، جب مسلمانوں کا زمانہ آیا، تو ان کو وراثت اور تجارت وغیرہ کے مسائل حل کرنے کے لئے اس فن کے حاصل کرنے کی ضرورت پڑی، مسلمانوں میں سب سے پہلی کتاب جو اس فن پر لکھی گئی،[۲] وہ خلیفہ مامون کے درباری منجم محمد بن موسیٰ خوارزمی کی "المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ" ہے، جس کو فریڈرک روزن نے ۱۸۳۱ء میں انگریزی ترجمہ اور مقدمہ کے ساتھ لندن سے چھاپ کر شائع کیا ہے،

اصل کتاب سے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا ماخذ کیا ہے، ؟ یوں تو منصور باللہ کے زمانہ ہی سے علم حساب کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہونا شروع ہو گیا تھا، مگر صریحی طور پر یہ نہیں معلوم کہ خوارزمی کے پہلے خاص جبر و مقابلہ کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا تھا یا نہیں،

اب تک اس علم کی جتنی کتابوں کا پتہ لگا ہے، وہ سب کی سب خوارزمی کے بعد عربی میں ترجمہ ہوئی

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا ص ۶۱۰، کالم ۲، [۲] کشف الظنون جلد اوّل ص ۳۰۹، و مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۳۰،

ہیں، ذیوفنطس کی کتاب کا ترجمہ قسطا بن لوقا بعلبکی نے کیا، جو خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں تھا، براہم سدھانتا کا ترجمہ البیرونی نے کیا جس کا زمانہ پانچویں صدی ہجری کے نصف اوّل کا ہے[1]،

بہت ممکن ہے کہ خوارزمی کے پہلے اس فن کی کسی کتاب کا عربی میں ترجمہ کیا گیا ہو، اور ہمیں معلوم نہ ہو، یا اس نے دربار کے یونانی اور ہندی علماء سے استفاضہ کیا ہو، پھر یہ کتاب لکھی ہو،

بہرحال خوارزمی کی یہ کتاب اسقدر مقبول ہوئی، کہ برسوں تک مشرق و مغرب کے مدارس میں درس کے طور پر پڑھائی جانے لگی، بعد کے آنے والوں نے اس کو اپنا ماخذ بنایا، اور اس کی شرح در شرح لکھی، بارھویں صدی عیسوی میں رابرٹ آف چسٹر نے لاطینی میں اس کا ترجمہ کیا تھا[2]، اور ایک زمانہ تک مدارس یورپ کے نصاب میں داخل رہی، اور اہل یورپ نے اسی پر اپنے آیندہ جبر و مقابلہ کی بنیاد کھڑی کی ہے،

مضامین کتاب۔ اس کتاب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے بہتر معلوم ہوتا ہے، کہ اسکے مضامین پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے،

شروع میں ایک مختصر دیباچہ ہے، جس میں یہ بیان کیا ہے، کہ مامون کے اشارے سے اس نے یہ کتاب لکھی، تاکہ لوگوں کو وراثت، تجارت، بٹوارے اور دیگر معاملات کے حل کرنے میں آسانی ہو،

پھر یہ بتایا ہے کہ جبر و مقابلہ کی بنیاد تین چیزوں پر ہے، جذور اموال اعداد، جذور جمع ہے جذر کی، جذر کے لغوی معنی جڑ کے ہیں، جس کو ہم انگریزی میں (ROOT) کہتے ہیں، اور اس کی تعریف یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو فی نفسہ مضروب ہو، اور اموال مال کی جمع ہے، اور اس کو انگریزی میں (SQUARE) کہتے ہیں، اب دارالترجمہ عثمانیہ نے مال کی بجائے لفظ مربع استعمال کیا ہے، یعنی جذر کو جذر میں ضرب دینے سے جو حاصل ہو، اس کو مال یا مربع کہتے ہیں،

[1] عیون الانباء فی طبقات الاطباء جزء اول ص ۲۴۴، کتاب الہند ص ۶۴، [2] تاریخ ریاضیات از اسمتھ،

انہی تینوں کے معادلات سے چھ شکلیں پیدا ہوتی ہیں، جو حسب ذیل ہیں،

۱- مال جو جذور کے معادل ہو، جیسے ب^۲ = ۵ ب

۲- مال جو عدد " " " " ب^۲ = ۹

۳- جذور جو عدد " " " " ب = ۳

۴- مال اور جذور جو عدد کے معادل ہوں " ب^۲ + ۱۰ب = ۳۹

۵- مال اور عدد جو جذور " " " " ب^۲ + ۲۱ = ۱۰ب

۶- جذور اور عدد جو مال " " " " ۳ب + ۴ = ب^۲

اگلی تین شکلوں کو مفردات کہا جاتا ہے، اسلئے کہ معادلات کا ہر جملہ مفرد ہے، اور پچھلی تین شکلوں کو مقترنات میں شامل کیا جاتا ہے، کیونکہ معادلات کا ایک جملہ دو چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے،

خوارزمی نے مذکورۂ بالا چھ شکلوں کے حل کرنے کے کلیہ قواعد بتائے ہیں اور ہندسی اشکال سے اپنے دعوے کی صحت پر دلیلیں دی ہیں، پھر ضرب، جمع، تفریق اور تقسیم کی تشریح شامل کیا تھا کی ہے اور مشق کے طور پر مختلف سوالات دیکر ان کے جوابات کی تشریح کر دی ہے،

اس کے بعد معاملات کا ایک چھوٹا سا باب باندھا ہے، پھر مساحت کا ایک باب ہے جس میں مثلث متساوی الاضلاع، دائرہ، قوس، مکعب، مخروط مثلث، مخروط مربع، مخروط مدوّر، مربعات قائمۃ الزوایا متساویۃ الاضلاع، مربعات مختلفۃ الاضلاع قائمۃ الزوایا، مربعات معینہ مختلفۃ الزوایا، مربعات مشبہ بالمعینہ، مربعات مختلفۃ الاضلاع والزوایا، مثلثات قائمہ، مثلثات حادہ، مثلثات منفرجہ اور عمود مخروط وغیرہ کی مساحت کے وہی قاعدے بتائے ہیں، جو آج عام طور سے مستعمل ہیں،

اس کے بعد کتاب الوصایا ہے، جس میں وصیت کی کثرت سے مختلف مثالیں دی ہیں اور

ان کے حل کرنے کے طریقے شرح و بسط کیسا تھ بیان کئے ہیں،

اخیر میں مسائل وراثت کے تعلق سے دور کے مسائل ہیں، اور انہی پر کتاب ختم ہو جاتی ہے،

یہ متوسط تقطیع کے ایک سو بائیس صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے، اس پر ایک نظر ڈالنے سے اسکی حسب ذیل خصوصیات نظر آئیں گی،

۱۔ عبارت آسان اور طرز بیان سلیس اور سہل ہے، اور مسائل کو اس قدر صاف اور واضح بیان کیا ہے، کہ ان کے سمجھنے میں کوئی دقت نہیں واقع ہوتی، بخلاف برہم گپت کے کہ اس میں مسائل واضح طور پر نہیں بیان کئے گئے ہیں، اسلئے اسکے سمجھنے میں کافی دقت ہوتی ہے،

۲۔ تمام اصطلاحیں عربی کی اختیار کی ہیں، غیر زبان کی ایک اصطلاح بھی اس میں نہیں پائی جاتی،

مضامین کے لحاظ سے گو خوارزمی جمع، ضرب، تفریق تقسیم، مساوات مفرد مساوات درجۂ دوم سے آگے نہیں بڑھا ہے، مگر اس کے بتائے ہوئے قواعد، ہندو ریاضی دانوں کے بتائے ہوئے قواعد سے مختلف ہیں، اس کے علاوہ خوارزمی کے قواعد بہت آسان، جلد سمجھ میں آنے والے اور واضح ہیں، ہندو ریاضی دانوں کے قواعد میں یہ بات نہیں، ان کے قواعد خوارزمی کے قواعد کے مقابلہ میں پیچیدہ اور مشکل ہیں،

اس لئے یہ قیاس میں آتا ہے کہ جہانتک حل مسائل کے قواعد کا تعلق ہے، وہ تمام تر خوارزمی کے دماغ کی پیداوار ہیں،

یونانیوں کے اصول بھی کچھ زیادہ کارآمد نہ تھے، اسلئے عربوں نے خود اپنی طرف سے حل مسائل کے اصول بنائے، فاضل عیسائی عالم جرجی زیدان کا یہ کہنا بجا ہے کہ

"اہل عرب جبرو مقابلہ میں بھی سبقت لے گئے، ان لوگوں نے دو کتابیں یونانی سے لے

فن کی عربی میں ترجمہ کی تھیں، لیکن جب اس میں ان لوگوں نے زیادہ غور و فکر کیا تو معلوم ہوا کہ جو اصول ان کتابوں میں بیان کئے گئے ہیں، وہ اعتبار کے قابل نہیں، اسلئے خود ان لوگوں نے جبر و مقابلہ کے اصول بنائے[1]"

فریڈرک روزن یونان و ہندوستان کے جبر و مقابلہ کے ساتھ خوارزمی کے جبر و مقابلہ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، :-

"وہ علم جو محمد بن موسیٰ نے اس ہماری پیش نظر کتاب میں بیان کیا ہے، وہ مساوات درجہ دوم اور ان چند مسائل سے جو (AFFECTED SQUARE) سے تعلق رکھتے ہیں، آگے نہیں بڑھا ہے، ان تمام مسائل کے حل کرنے میں وہ انہی اصول کی پیروی کرتا ہے، جو ذیوفنطس نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں[2] یا ہند ریاضی دانوں نے (گو وہ غیر الفہم ہی کیوں نہ ہوں) بیان کئے ہیں[3]،

یہ ممکن نہیں ہے کہ اس نے ذیوفنطس کی کتاب سے یہ اصول لئے، کیونکہ چوتھی صدی ہجری کے نصف تک عربوں کو اس کتاب کا کچھ علم نہیں تھا، یہانتک کہ ابوالوفا بوزجانی نے اس کو عربی میں نقل کیا[4]، یہ بہت ممکن ہے کہ عربوں نے جبر و مقابلہ کا ابتدائی فن ہندوؤں سے لیا ہو جنہوں نے عربوں کو کسور اعشاریہ اور دیگر حساب و نجوم کے ضروری معلومات و نکات بتائے تھے،

---

[1] علوم عرب مصنفہ جرجی زیدان مترجمہ حافظ اسلم صفحہ ۲۲، [2] ذیوفنطس مسئلہ ۳۲ و ۳۳ [3] لیلاوتی ص ۲۹، بیج گنت مترجمہ مسٹر کولبروک ص ۳۴، [4] قیری Casiri Bibl. Arab. Esc. ar. 1-433 Colebrooke's Dissertation &c P. lxxii

فن کے لحاظ سے گو خوارزمی ہندو ریاضی دانوں کی منت کا زیر بار رہی کیونکہ نہ ہوتا ہم
اصول و مسائل کی تشریح و توضیح میں وہ بالکل آزاد نظر آتا ہے، کم از کم اوس نے
اپنے اصول کی تشریح میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ ایک حد تک ہندو ریاضی دانوں
کے طریقوں سے بالکل مختلف ہے، بھاسکرا، اور برہم گپتا صرف بنیادی اصول بتا دیتے
ہیں، اور ان کی صحت پر کوئی دلیل نہیں دیتے، اور ان اصول کا تعلق طلبہ کے فہم و ادراک
کی بجائے ان کے حافظہ سے ہوتا ہو،

خوارزمی اپنے اصول کو ایک سادہ نثر میں بیان کرتا ہے، پھر ہندسی اشکال سے ان
اصول کی صحت کے دلائل دیتا ہے، ہندو ریاضی دان نسبتہً بہت کم مثالیں دیتے ہیں
اور بھاری بھرکم الفاظ سے صرف ضروری اصول بیان کر دیتے ہیں، لیکن عرب ان
کے برخلاف مثالیں کثرت سے دیتے ہیں، اور طرز بیان ایسا سہل اور سلیس اختیار کرتے
ہیں، کہ اس سے مسائل آسانی سے نمایاں ہو جاتے ہیں،

ہندو ریاضی دان مسائل کے حل کرنے میں صرف نتیجہ اور نیچ کے ضروری طریقوں
([illegible]) کو بیان کرتے ہیں، بلکن ایک عرب ہر مسئلہ کی تشریح کا طریقہ
پورے طور پر بیان کرتا ہے، اس کی نظر ہمیشہ معادلات کے دونوں طرف رہتی ہے
گویا وہ ترازو کی ڈنڈی کے دونوں طرف کو دیکھ رہا ہو، وہ بتاتا ہو، کہ معادلات کے
ایک طرف کچھ ردوبدل کرنے سے کس طرح دوسری طرف بھی ردوبدل واقع ہوتا ہے[1]

خوارزمی کے بعد سند بن علی یہودی، ابو کامل شجاع بن اسلم اور ابو یوسف المصیصی وغیرہ نے اس
فن پر مستقل کتابیں لکھیں[2]، جن میں ابو کامل کی کتاب ترتیب اور طرز بیان کے لحاظ سے بہت بہتر تھی،

---

[1] مقدمہ انگریزی کتاب المختصر فی حساب الجبر والمقابلہ صفحہ ۔ [2] فہرست ابن الندیم ص ۲۸۲ و ۲۹۲،

بعض نے مثلاً عبد اللہ بن حسن صیدنانی، سنان بن فتح، اور ابو الوفا نے خوارزمی کی کتاب کی، اور اصطخری المتوفی ۳۰۸ھ اور علی بن احمد العمرانی المتوفی ۳۴۴ھ نے ابو کامل کی کتاب کی شرح لکھی[1]، مگر ابو الوفا کے علاوہ کسی نے خوارزمی کی کتاب کے مضامین سے آگے قدم نہیں بڑھایا، ابو الوفا نے مساوات درجۂ چہارم کو ہندسی اشکال کے ذریعہ حل کیا[2]،

ابھی تک کسی نے کعبی مساوات کے حل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی، البتہ ماہانی الموجود فی سنہ ۲۶۰ھ نے کعبی مساوات کی تین مخصوص[3] شکلوں کو حل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن غور و فکر کے بعد بھی وہ جب حل نہ کر سکا، تو اس نے یہ یقین کر لیا، کہ ان کا حل ناممکن ہے،

اس کے بعد ابو جعفر الخازن پیدا ہوا، اور اس نے ان تین مخصوص شکلوں کو قطوع مخروطیہ کے ذریعہ حل کیا[4]،

ابو الجود محمد بن لیث جو ابو ریحان بیرونی المتوفی سنہ ۴۴۰ھ کا معاصر تھا، اور ابو علی بن ہیثم، (المتوفی بین سنہ ۴۴۶ھ و سنہ ۴۵۴ھ) نے کعبی مساوات کی دیگر چند شکلوں کو حل کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے کسی میں کامیابی حاصل کی اور کسی میں غلطی کی جس کی بعد میں خیام نے اصلاح کی[5]،

پانچویں صدی ہجری میں خیام پیدا ہوا، اور وہ ابتدا ہی سے اس فن پر غور و فکر کرنے لگا، اور کافی غور و خوض کے بعد مساوات مفرد، مساوات درجہ دوم، اور کعبی مساوات کی پچیس شکلیں نکالیں، اور ان تمام کو ہندسہ کے ذریعہ حل کیا، اور رسالۃ فی براہین الجبر والمقابلہ کے نام سے ایک

---

[1] فہرست ابن الندیم ص ۲۷۰ و ۲۹۲ و ۲۹۳، [2] انسائیکلوپیڈیا، برٹانیکا طبع یازدہم جلد اول ص ۶۱۸، کالم ۱، [3] وہ تین مخصوص شکلیں یہ ہیں، (۱) کعب اور مال جو عدد کے معادل ہوں، (۲) کعب اور عدد جو مال کے معادل ہوں، (۳) مال اور عدد جو کعب کے معادل ہوں [4] براہین الجبر والمقابلہ للخیام ص ۲، [5] ایضاً ص ۳۳ و ۳۴،

چھوٹا سا رسالہ لکھا، جسکو ایف ویکپے (F. WEOPCKE) نے فرنچ ترجمہ اور مقدمہ کے ساتھ باریک ٹائپ کے باون صفحوں میں پیرس سے ۱۸۵۱ء میں شائع کیا ہی،

خیام کے مقدمہ سے معلوم ہوتا ہی، کہ خوارزمی وغیرہ کی کتابیں اس کو نہیں ملیں، متاخرین میں ماہانی، ابو جعفر الخازن، ابو الجود محمد بن لیث، ابو علی بن ہیثم، اور ابو سہل قوہی وغیرہ کے نام گناتا ہے،

اس رسالہ کے صفحہ صفحہ سے ہویدا ہے، کہ اس نے کافی جانفشانی اور محنت و کوشش سے یہ رسالہ لکھا ہے، پچیس شکلوں میں سے چھ شکلیں تو اوپر گذر چکی ہیں، باقی انیس شکلیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں،

۱- کعب جو اموال کے معادل ہو، جیسے ب^{۳} = ۴ ب^{۲}،

۲- کعب جو جذور 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} = ۱۶ ب،

۳- کعب جو عدد 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} = ۶۴

۴- کعب اور مال جو جذور کے معادل ہوں 〃 ب^{۳} + ب^{۲} = ۲۰ ب

۵- کعب اور جذور جو اموال 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} + ۴ ب = ۵ ب^{۲}،

۶- جذور اور اموال جو کعب 〃 〃 〃 〃 ب^{۲} + ۱۲ ب = ب^{۳}،

۷- کعب اور جذور جو عدد 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} + ۵ ب = ۸۴،

۸- کعب اور عدد جو جذور 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} + ۱۶ = ۲۰ ب

۹- کعب اور مال جو عدد 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} + ۲ ب^{۲} = ۹۶

۱۰- کعب اور عدد جو اموال 〃 〃 〃 〃 ب^{۳} + ۳۲ = ۶ ب^{۲}

۱۱- عدد اور اموال جو کعب 〃 〃 〃 〃 ۳۲ + ۲ ب^{۲} = ب^{۳}،

۱۲- عدد اور جذور جو کعب کے معادل ہوں جیسے، $۲۴ + ۱۰ب = ب^{۳}$

۱۳- کعب اور مال اور جذور جو عدد کے معادل ہون جیسے، $ب^{۳} + ب^{۲} + ۲ب = ۱۸۸$،

۱۴- کعب اور مال اور عدد جو جذور " " " " ، $ب^{۳} + ۳ب^{۲} + ۸ = ۳۰ب$،

۱۵- کعب اور جذور اور عدد جو مال " " " " ، $ب^{۳} + ۱۲ب + ۱۶ = ۸ب^{۲}$،

۱۶- کعب جو جذور اور مال اور عدد " " " " ، $ب^{۳} = ۶ب + ۲ب^{۲} + ۸$

۱۷- کعب اور مال جو جذور اور عدد " " " " ، $ب^{۳} + ۲ب^{۲} = ۱۶ب + ۳۲$

۱۸- کعب اور جذور جو مال اور عدد " " " " ، $ب^{۳} + ۱۰ب = ۶ب^{۲} + ۸$

۱۹- کعب اور عدد جو جذور اور مال " " " " ، $ب^{۳} + ۲۰ = ۵ب + ۴ب^{۲}$

ان انیس شکلوں میں سے پہلی تین شکلیں خیام کے پہلے ہی جبر و مقابلہ کے ذریعہ حل کر دی گئی تھیں، خیام کا کارنامہ یہ ہے، کہ اس نے ان پر ہندسی اشکال سے دلیلیں قائم کین،

تیسری شکل کے متعلق خیام نے لکھا ہے، کہ کعب کا جذر صرف استقرار اور تتبع سے معلوم ہو سکتا ہے، ورنہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی کلی قاعدہ نہیں ہے[1]، اسی طرح مربع کے جذر کے متعلق بھی اس نے یہی خیال ظاہر کیا ہے، لیکن ان دونوں کے جذر کے معلوم کرنے کا ایک کلیہ قاعدہ موجود ہے، اور یہ خیام سے پہلے کے لوگون کو معلوم تھا، مسلمانوں میں ابوالوفا، المتوفی ۳۸۸ھ نے کعب کے جذر کو معلوم کرنے کا قاعدہ دریافت کر لیا تھا[2] مشہور ہندی ریاضی دان حکیم بھاسکر انے بھی لیلاوتی مین ان کے قاعدے ذکر کئے ہین[3]،

نویں، دسویں اور گیارھویں شکل کو ابو جعفر الخازن نے قطوع مخروطیہ کے ذریعہ حل کر دیا تھا، خیام نے ان کے علاوہ باقی اشکال کو جبر و مقابلہ کے ذریعہ نہیں بلکہ ہندسہ سے حل کر دیا،

---

[1] براہین الجبر و المقابلہ ص۷، [2] تاریخ الحکماء قفطی ص۱۹۰، [3] لیلاوتی، ص۱۳ و ۱۹،

اس کے بعد مشرق میں کوئی صاحب دماغ ایسا نہیں پیدا ہوا، جو جبر و مقابلہ کے ذریعہ کعبی مساوات کو حل کرتا، شپیو فرو (Scipione del Ferro) المتوفی ۱۵۲۶ء نے جبر و مقابلہ کے ذریعہ کعبی مساوات کے حل کرنے کی کوشش کی، بیان کیا جاتا ہے، کہ اس نے اپنے شاگرد انٹونیو میری فلاریڈا اس کو اسکے حل کرنے کا قاعدہ بتا دیا تھا، آخر ۱۵۳۰ء میں نکولس نے اس کے حل کرنے کا قاعدہ دریافت کیا، اور اطالیہ بھر میں اسکو شائع کرایا[۱]۔

اندلس۔ یہ تو مشرق کی حالت تھی، اب بغداد سے کوسوں دور مغرب میں قرطبہ پر نظر ڈالئے، تو معلوم ہوگا کہ وہاں بھی خلفاے بنی امیہ قرطبہ کو علوم و فنون کا گہوارہ بنا رہے تھے،

خلیفہ الحکم ثانی جو ۳۵۰ھ میں تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا، علم کا بہت بڑا قدر داں تھا، اس نے اپنے باپ کے زمانہ ہی سے مشرقی ممالک کی بیش بہا اور نادر کتابیں منگوانی شروع کیں، اور اپنی وفات تک اتنا بڑا ذخیرۂ کتب فراہم کر لیا، کہ خلفاے عباسیہ کے اس علمی سرمایہ کی ہمسری کرنے لگا جس کو انھوں نے مدت مدید میں جمع کیا تھا،

الحکم کے اس انتہائی شغف علمی نے لوگوں میں قدماء کی تصانیف پڑھنے پڑھانے کی پرجوش تحریک پیدا کر دی، اس کے علمی شغف کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ جب اوس نے ۳۶۶ھ میں انتقال کیا، تو اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ جلدیں کتابوں کی موجود تھیں،

الحکم نے علماء کی قدر دانی اور ہمت افزائی میں اتنی ہی یا اس سے زیادہ بلند حوصلگی دکھائی جتنی مامون نے بغداد میں دکھائی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا، کہ چند دنوں میں اندلس میں بڑے بڑے علماء پیدا ہوگئے جنھوں نے ہر فن میں بیش بہا اور قیمتی تصنیفات یادگار چھوڑیں،

اندلس کا سب سے بڑا ماہر ریاضی مسلمہ بن احمد ابو القاسم المعروف بالمجریطی ہے، جسکو قفطی نے

---

[۱] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول صفحہ ۶۱۱ کالم ۲،

امام الریاضیین کے لقب سے یاد کیا ہے، یہ علم الافلاک اور حرکات نجوم کا بہت بڑا ماہر تھا، اس نے علم الحساب میں ایک کتاب بھی لکھی تھی، اور محمد بن موسیٰ خوارزمی کی زیچ کے ساتھ اسکو بہت شغف تھا اسی نے اسکی فارسی تاریخ کو عربی تاریخ میں بدل دیا تھا، مجریطی نے ۳۹۸ھ میں وفات پائی[1]

اس کے بعد جابر بن افلح پیدا ہوا جس نے خاصکر فن جبر و مقابلہ میں عظیم الشان شہرت پائی یہانتک کہ یورپ میں ایک زمانہ تک جبر و مقابلہ کا موجد اسی کو سمجھا جاتا تھا، اور فن کا نام اس کے نام سے منسوب خیال کیا جاتا تھا[2]،

پھر آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ابوعبداللہ محمد بن عمر بن محمد المعروف بابن بدر پیدا ہوا، اور اس نے ۷۴۴ھ میں اس فن پر ایک مختصر رسالہ لکھا جسکو یوسف شانچاش پیریز (Jose, Sanchez Perez) نے ۱۹۱۶ء میں اپنے ترجمہ اور مقدمہ کیساتھ میڈرڈ سے شائع کیا ہے،

اس کتاب کا اصلی نام "کتاب فیہ اختصار الجبر والمقابلۃ" ہے، اس میں ابن بدر نے وہی مطالب بیان کئے ہیں، جو محمد بن موسیٰ خوارزمی نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ تمام مسائل پر جبر و مقابلہ کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے، اور اصول کی صحت پر ہندسہ سے دلیلیں نہیں دی ہیں، مساحت کا باب بھی حذف کر دیا ہے،

ابن خلدون المتوفی ۸۰۸ھ کے ایک جملہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اسکے زمانہ تک اندلس میں جبر و مقابلہ کی صرف چھ شکلیں رائج تھیں، کیونکہ اس نے لکھا ہے، کہ

"ہم کو معلوم ہوا ہے کہ مشرق کے بعض ائمہ ریاضی نے معاملات کو چھ شکلوں سے آگے بڑھا کر اور تک پہنچا دیا ہے، اور تمام کے حل کرنے کے قواعد دریافت کرکے ہندسہ سے ان پر دلیلیں دی ہیں"[3]

[1] اخبار الحکماء للقفطی صفحہ ۲۱۴، [2] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا جلد اول صفحہ ۶۱۶ کالم ۱، [3] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۲۵

اس سے یہ بھی پتہ چلتا ہو کہ خیام کا رسالہ اس کی نظر سے نہیں گذرا تھا، متاخرین کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خیام کے بعد غالبًا کوئی عالی دماغ ایسا نہیں پیدا ہوا، جو اس فن کو اور ترقی دیتا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فلسفہ، کلام، منطق، ہیئت اور اقلیدس نے تمام مسلمانوں کے دماغوں کو اپنی طرف مبذول کر لیا تھا، یہ فنون مسلمانوں کو اتنے دلچسپ نظر آئے کہ ہر ایک شخص انہی فنون میں تصنیف و تالیف کرنے لگا، ورنہ یہ علم بھی ان کے ہاتھوں دیگر علوم کی طرح اوج کمال پر پہنچ جاتا،

نسخۂ گوئے چوگان

موجودہ

کتبخانہ حبیب گنج،

از جناب عبدالغفور صاحب بی اے، آنرز لندن، ایم اے، ایم ایس سی علیگ

فنِ خوشنویسی مسلمانوں میں تعلیم کا ضروری جزو خیال کیا جاتا تھا، جس طرح مصری رسم الخط ہیروغلافی اور چینی رسم الخط فنِ مصوری سے ملتے جلتے تھے، اور بسا اوقات ان کو تصویروں کے حاشیہ یا جزئیات کی زیب وزینت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، اسی طریق پر نسخ اور خط نستعلیق بھی ایرانی مصوروں کے لئے ایک کا آمد جزو ثابت ہوتے تھے، مکتبوں میں بھی بچوں کو شروع سے ہی خوشنویسی کی مشق کرائی جاتی تھی، اور اوائل عمر سے ہی انکو خطاطی کے شہ پاروں سے روشناس کرایا جاتا تھا، تاکہ ان میں ادبی اور فنونِ لطیفہ کا صحیح مذاق پیدا ہو، گلستاں میں ایک بادشاہ کا ذکر ہے، کہ اس نے اپنے بیٹے کو مکتب میں بھیجا، تو ایک لوحِ سیمیں جس پر ایک مصرعہ فارسی خوشخط لکھا ہوا تھا، اس کے ہمراہ بھیجی،

پادشاہے پسر بمکتب داد، لوحِ سیمیش در کنار نہاد،

بر سرِ لوحِ او نوشتہ بزر جورِ استاد بہ ز مہرِ پدر،

اسلامی حکمراں نہ صرف فنِ خطاطی کے قدرداں تھے، بلکہ خود بھی اس فن شریفہ کی مشق کرتے تھے، غلام خاندان کے سلطان ناصر الدین اور اورنگ زیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ تو بدست خود قرآن کریم کی کتابت کرتے تھے، بابر کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ مولینا حبیب الرحمن خانصاحب نے سنایا،

موصوف کو فنِ خوشنویسی سے بے حد شغف اور تاریخِ خطاطان سے بہت دلچسپی ہے، ان کے ہاں ظرف

فنِ خطاطی کے متعدد شہ پارے موجود ہیں، بلکہ وہ خود اس کے بہترین نقادہیں،

بابر تزک بابری میں ۹۳۵ھ کے حالات میں لکھتا ہے کہ شاہی لشکر سکندر پور بہار میں پڑا تھا کہ

نمازِ تراویح کے بعد گھنگور گھٹا اٹھی، اور طوفانِ باد و باراں سے بہت سی قناتیں اکھڑ کر زمین پر گرگئیں،

لکھتا ہے کہ میں اسوقت وصلیوں پر مشق کر رہا تھا، اور کچھ کتابیں ارد گرد منتشر پڑی ہوئی تھیں،

اتنے میں خیمہ گر گیا، اگرچہ بفضلِ ایزدی میں تو سلامت رہا، مگر وصلیان اور کتابیں بھیگ گئیں، کتب بینی

کا عشق ملاحظہ ہو، کہ اسی وقت ان سب آب زدہ کتابوں کو اونی کپڑے میں رکھا اور اس پر قالین

ڈال دیا اور ساری رات جاگ کر کاٹی، شمعیں اور آگ جلا کر کتابوں اور وصلیوں کو سکھلایا، تب اطمینان ہوا،

مغل بادشاہ مشہور خطاطین کی کتابوں اور کتبوں کو بہت شوق سے خریدتے تھے، اور بسا اوقات

ان کو دستِ خاص سے شاہی کتب خانے میں داخل کرتے تھے، پروفیسر شیرانی صاحب کے پاس جو

نسخہ گلستاں کا یاقوت کے نسخے سے منقول ہے، اس پر جہانگیر کی اپنی تحریر ہے، شاہجہان تو اس فن کا

خاص قدردان تھا، میر عماد کے قتل کے بعد جب اس کا عزیز شاگرد عبد الرشید دیلمی ہندوستان پہنچا تو

اس نے بڑی عزت افزائی سے دربار میں رکھا، میر عماد الحسینی کے کتبوں کی تو شاہجہان نے اتنی قدر

کی کہ شاید ہی کسی اور نے کی ہو، اور جو شخص بھی اس نادر العصر استاد کی کوئی چیز پیشکش میں دیتا تھا

تو کم از کم ایک صدی منصب پاتا تھا،

بادشاہ کے علاوہ امرا، و وزرا خود قدرداں بھی تھے اور بعض اچھے خوشنویس بھی کتب خانہ

حبیب گنج کے نوادر میں سے ایک عربی مناجات بھی ہے، جو ابو الحسن آصف خاں برادرِ نورجہاں اور

شاہجہاں کے خسر کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، خط نستعلیق میں ہے، اور خاصہ اچھا ہے، مولینا غلام احمد

مصنف تذکرۂ خوشنویساں نے میر فتح اللہ شیرازی، عبد الرحیم خانخاناں، ٹوڈرمل، زین خاں کوکہ

اور شاہزادوں میں سے خسرو، پرویز، خرم اور داراشکوہ کو طبقۂ خوشنویسان میں شمار کیا ہے،

ملا میر علی سرآمد خطاطان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی مثنوی گوئے وچوگاں، فن خطاطی اور مصوری کے لحاظ سے کتبخانہ حبیب گنج کی بہترین کتاب ہے گوئے وچوگان ملا عارفی ہراتی کی سب سے مشہور تصنیف ہی مصنف نے اس کتاب کو سلطان جہانیاں محمد بن مرزا بایسنقر کے نام معنون کیا ہے، جو پہلے تو حاکم عراق رہا، پھر فارس پر قابض ہوگیا، اگرچہ کتاب کا مضمون تصوف ہے، مگر تمام تشبیہات اور استعارے گوئے وچوگاں کے کھیل سے لئے گئے ہیں، جسکو آج کل پولو کہتے ہیں، جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاہزادہ خود گوئے وچوگاں کا بہت شوقین تھا، عارفی نے اشعار میں اس کا اشارہ بھی کیا ہے خود سلطان کے والد مرزا بایسنقر کی نسبت بابر تزک میں لکھتا ہے کہ وہ نستعلیق خوب لکھتا تھا، اور فن مصوری میں بھی طاق تھا، شاعر مثنوی کے ضمن میں لکھتا ہے، کہ میں نے اسکو دو ہفتے میں لکھا تھا، اور گوئے خود اس کا تاریخی نام ہوا، جس سے ۸۴۲ھ تاریخ نکلتی ہے، اسی سلسلے میں لکھتا ہے کہ اسوقت میری عمر پچاس سال کی تھی، اور بادشاہ نے ایک گھوڑا اور ایک ہزار دینار انعام میں دیئے، ملا عارفی سلمان ثانی کے نام سے مشہور تھے، جامی علیہ الرحمہ نے ان کا ذکر اپنی کتاب بہارستان میں کیا ہے، شہر ہرات میں ۸۵۳ھ میں وفات پائی،

گوئے وچوگاں ۱۹۳۱ء میں لندن سے گرین شیلڈ نے شائع کی ہے،

حبیب گنج کے نسخہ کے کاتب ملا میر علی ہیں، یہ سادات ہرات میں سے تھے، اور خط نستعلیق کے مشہور مشاق مولانا سلطان علی مشہدی کے شاگرد تھے، فن خطاطی کیساتھ عربی فارسی وشاعری میں بھی مہارت تامہ رکھتے تھے، کچھ عرصہ بخارا میں بھی قیام کیا، بہت مدت تک عبد اللہ خان اوزبک ہمعصر اکبر اعظم کے دربار میں رہے، کہا جاتا ہے کہ مومن خان پسر عبد اللہ خاں کے استاد تھے، مولانا غلام محمد ہفت قلمی اپنے تذکرہ خوشنویسان میں لکھتے ہیں، کہ جو کتاب ومرقع لکھتے تھے، اسکی تاریخ کتابت خود

کتے تھے، اور اپنے ہاتھ سے کھتے تھے، ایک مرقع (جو جہانگیر بادشاہ نے نہایت شوق سے مرتب کیا تھا) کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوتا تھا، کہ ایک باغ ہے عالم بہار میں، اس پر میر علی کے ہاتھ کی سند بھی درج تھی، ملا میر علی کی تصنیفات میں قواعد خطوط سبعہ منظوم، رسم الخطا در خط و سواد ہیں، وفات غالباً ۹۵۱ھ میں ہوئی[1]، شاہجہاں میر علی الکاتب کا بڑا مداح تھا، اور بعینہ جیسے جہانگیر نے تزک میں تحریر لکھا ہے، کہ میں ایک کاتب کا قلم دوسرے سے تمیز کر لیتا ہوں، شاہجہاں کی قدر شناس نگاہ بھی فی الفور ملا میر علی کے خط کو جانچ لیتی تھی، شش رسالہ سعدی کے اس نسخہ پر جو بانکی پور میں ہے، شاہجہان نے بدست خاص لکھا ہے کہ یہ نسخہ درحقیقت ملا میر علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، مگر کسی نے کاٹ کر اس کے بیٹے کا نام لکھ دیا ہے، کتب خانہ حبیب گنج میں اس ماہر فن خطاط کی تین یادگاریں ہیں، ایک تو مثنوی گوئے و چوگان دوسرے ایک کتبہ جسکی پشت پر جہانگیر کے دربار کے مصور منصور نادر الزمانی کے ہاتھ کا گل سوسن بنا ہوا ہے، تیسرے ایک اور کتبہ ہے،

گوئے چوگان کیا بلحاظ کتابت اور کیا بلحاظ مصوری اور گلکاری ایک نادر الوجود اور عظیم الشان نسخہ ہے، یہ کتاب دو شاہی خزانوں میں رہ چکی ہے، عالمگیر کے سنہ جلوس کے اکتیسویں سال بابت مال غنیمت فتح گولکنڈہ شاہان مغلیہ کے خزانے میں منتقل ہوئی، لوح کتاب سے پہلے کے ورق میں مفصلۂ ذیل عبارت لکھی ہے، "کتاب گوئے و چوگاں در ایام کمال استاد الکتاب ملا میر علی بابت فتح گولکنڈہ در سال سی و یکم جلوس اقبال تحویل سہیل نمودہ شد، عدد اوراق سی و سہ و قیمت دو ہزار روپیہ چہار صد و نود و دو اشعار"

میر علی الکاتب کے قلم سے خاتمہ پر حسب ذیل عبارت درج ہے، "کتبہ علی الحسینی الکاتب سنی اوائل شہر ربیع الاول سنہ ست و عشرین و تسعمائۃ"

[1] تذکرۂ ذکر احباب،

چونکہ تذکرہ و تذکرۂ احباب کی رو سے ملا میر علی نے سنہ ۹۵۱ھ میں بعمر ہفتاد سال وفات پائی اسلئے اس نسخہ کی کتابت کے وقت ان کی عمر ۶۵ سال ہو گی، اسی لئے اس کو ان کے کمال فن کا ایک نمونہ لکھا گیا ہے، کتاب پر ایک مہر قابل خان خانہ زاد عالمگیر کی، ایک عہد شاہ عالم کی اور ایک نواب ضیاء الدین خاں کی ہے، ان کے علاوہ متعدد مواہیر مختلف زمانوں کی ہیں، کچھ عرض دیدہ ہیں، جس سے یہ مراد ہے کہ یہ کتاب شاہی جائزہ میں اتنی مرتبہ لائی گئی، لوح کتاب سے پہلے کے اوراق کے مطالعہ سے ایک دلچسپ بات یہ مترشح ہوتی ہے، کہ فن خطاطی کے شہ پاروں کی قدر و قیمت عہدِ عالمگیری میں کس طرح گھٹتی بڑھتی رہی ہے، یہی بے نظیر نسخہ جو فتح گولکنڈہ کے وقت دو ہزار روپیہ کی قیمت کا تھا سنہ ۱۱۹۶ھ میں ۲۱۰ روپیہ کا رہ گیا، سنہ ۱۲۶۴ھ میں قیمت بڑھکر ۲۵۰ روپیہ ہو گئی، اور آجکل تو اسکی قیمت یقیناً بہت زیادہ ہو گی، زمانہ کے الٹ پھیر سے یہ نسخہ ایک مشہور و معروف ریاست کے کتب خانہ میں جا پہنچا، جہاں کے حکمراں نے اس کو ایک خیر خواہ ریاست کو عطا کر دیا، اور اس سے مولوی صاحب نے خرید کر کتب خانہ حبیب گنج میں داخل کیا،

یہ نسخہ نہ صرف فن خطاطی کا بہترین نمونہ ہے، بلکہ مصوری کے لحاظ سے بھی کچھ کم اہم نہیں ہے، کل کتاب اک گلستاں ہے، جس پر موسم بہار آیا ہوا ہے، قلم جلی، کاغذ زرافشاں، عنوان لاجوردی، طلائی مینا کار، ہر ورق کا حاشیہ رنگ اور انداز میں دوسرے حاشیہ سے مختلف اور تزئین و آرائش میں بڑھ چڑھکر ہے، عبارت عنوان باب کہیں سپیدہ یعنی موتی کے سفیدے سے لکھی ہوئی، اور کہیں شنجرفی، ہر باب کے خاتمہ پر ترنج مینا کار طلائی، درمیان کے صفحوں پر بھی اکثر جگہ بہت نفیس اور مختلف الوان مینا کاری کی گئی ہے،

سب سے دلچسپ چیز دو تصویریں ہیں، ایک تو مکہ معظمہ کی، دوسری مدینہ منورہ کی، ان کے علاوہ دو رنگین باغوں کے نقشے ہیں، ان میں سے تین تو اپنی قسم کے نادر الوجود نمونے ہیں، حرمین شریفین کے

اتنے عتیق اور خوبصورت نقشے بہت کم دیکھنے میں آئے ہوں گے، نقشے کے ہر جزو کو بے حد احتیاط اور نفاست سے بنایا گیا ہے، باغوں میں سے ایک نقشہ اپنی قسم کا نرالا ہی ہے، اس میں چار درخت پھلوں سے لدے ہوئے دکھائے گئے ہیں، منصور نادر الزمانی کے گل سوسن کی طرح یہ درختان بابرگ و بار بھی ایرانی مصوری کا ایک خاص پہلو ظاہر کرتے ہیں، جس پر آج تک بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، چوتھی تصویر الحاقی اور بعد کی لگائی ہوئی معلوم ہوتی ہے،

سنہ کتابت کے لحاظ سے بھی گوے و چوگان کا یہ نسخہ اہمیت رکھتا ہے، یہ نسخہ ۹۲۶ھ یعنی مصنف کی وفات کے ۴، سال بعد لکھا گیا ہے، عجائب خانہ لندن کے نسخے پر کوئی سنہ کتابت درج نہیں ہے، اور غالباً وہ اس کے بعد کا ہوگا، اسلئے قدامت کے لحاظ سے بھی یہ نسخہ عتیقیات میں شامل کرنے کے قابل ہے،

ملّا میر علی کا ایک اور کتبہ بھی کتب خانے کی زینت ہے، جس پر چار ترکی مصرعے تحریر کئے گئے ہیں، وصلی زرّیں طلا کار رنگا رنگ گل کاری، تین حاشیے، اور ان میں سے ہر ایک مینا کار گلکار اور طلائی حاشیہ سوئم چند اشعار فارسی خفی قلم میں اسکی پشت پر ایک تصویر گل سوسن کی ہے، جس پر عمل بندۂ درگاہ نادر العصری منصور نقاش جہانگیر شاہی لکھا ہوا ہے، منصور دربار جہانگیر کا مشہور و معروف مصوّر تھا، اور آجکل بالعموم اسکے قلم سے جانوروں اور پرندوں کی تصویریں ملتی ہیں، مگر یہ فخر اس کتب خانے کو ہی حاصل ہوا، کہ منصور کی قلم کے پھول پہلی دفعہ دنیائے نقاشی کے سامنے پیش کئے گئے، مسٹر ہنتہ آئی سی ایس جنکو ہندوستانی مصوّری سے شغف ہے، اور وہ اس پر کئی بسوط کتابیں بھی لکھ چکے ہیں، مصوری کے اعلیٰ نمونوں کی تلاش میں حبیب گنج گئے تھے، اور منصور کے اس شہ پارہ پر انھوں نے فن مصوّری کے رسالہ روپم کلکتہ میں ایک مضمون بھی لکھا تھا، اس تصویر میں گل سوسن کو تین حالتوں میں دکھایا گیا ہے، ایک کلی، دوسرا نیم باز، تیسرا پورا کھلا ہوا پھول مع پتیوں کے، یہ تصویر کچھ جہانگیر کے دربار ہی کے لئے

ہاتھی، جس شوق اور دلچسپی سے جہانگیر اپنی تزک میں پھولوں کا ذکر کرتا ہے، اس سے یہی اندازہ
کیا جاسکتا ہے، کہ اسکے منظور نظر مصور نے گلہائے رنگین کی مصوری سے دربار کو ضرور ایک تحفۂ باغ
دیا ہوگا، مگر زمانہ کی غارتگریوں کی وجہ سے صرف یہی تصویر اس صناع کے کمال کی یادگار رہگئی
ہے، مصور نے جاندار اشیاء کا تخیل اس تصویر میں بھی نہیں چھوڑا، دو تیتریاں نہایت لطافت سے بنائی
گئی ہیں، ایک نیلی اور دوسری ملگجی، پھولوں کی مصوری کا رواج اسوقت ایران میں بھی تھا، بلوشے
کی کتاب مسلمان پینٹنگ میں ایک گل نرگس شفیع عباسی کی قلم سے ہے، تیتریاں اس میں بھی موجود ہیں،
مضمون بالا میں گوئے و چوگان اور کتبے کی جزئیات اور تفصیلات اگرچہ ذاتی مشاہدہ کی بنا
پر ہیں، مگر اس میں بہت سا حصہ مولوی صاحب کی خود تیار کردہ فہرست کتب خانہ سے لیا گیا ہے،
فہرست کے عنوانات ان کے خود ایجاد کردہ ہیں، اور اب تک میرے محدود تجربے میں تو کسی مشرقی
کتب خانے کی ایسی فہرست نہیں گذری، جسکی روح اتنی مشرقی ہو، اور جس کے عنوانات منتخب کرنے
میں اسلامی علوم و فنون لطیفہ کا اسقدر لحاظ رکھا گیا ہو، مولوی صاحب موصوف نے جو کچھ بھی کتاب کے
قرطاس، خطاطی، جلد سازی، کتابت کی بابت لکھدیا ہے، وہ اس پر آخری اور حتمی رائے ہے، میں نے
اپنے مختصر قیام حبیب گنج میں ان کی ذات بابرکات سے بہت کچھ سیکھا ہے،

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں
رہتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولینا ابوظفر صاحب
ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات
کو متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ بلا تفریق مذہب
و ملت معلوم ہوجائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت ۱۲ر

کتاب تقویم الابدان

از

جناب مولوی عبد اللہ صاحب چغتائی

ستمبر ۱۹۳۶ء کے معارف میں جناب سید سلیمان صاحب ندوی نے ایک مضمون بعنوان "سفر گجرات کی چند یادگاریں" حوالۂ قلم کیا ہے، جس سے بہت سے امور پر مفید معلومات کا اضافہ ہوا ہے، جہاں انکلیشور کا ذکر کیا ہے، وہاں لکھتے ہیں :-

"عربی کتابوں میں سے سب سے نادر چیز یہاں قدیم طب کی ایک کتاب تقویم الادویہ ہے، اس کا سال کتابت سنہ [illegible]ھ نسخہ بخط عربی شیرۂ خرما سے لکھا ہوا ہے، اور اب تک اچھی حالت میں ہے"

منجملہ اور کتابوں کے یہ کتاب بھی مجھے دسمبر ۱۹۲۳ء میں اپنے مخلص دوست سید سراج الدین ناگا میاں کے ہمراہ ان کے عزیز جناب سید حیدر علی انعامدار صاحب کے ہاں دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا، اس وقت اس سے کچھ یادداشتیں میں نقل کر لی تھیں، میرے خیال میں قبلہ سید سلیمان صاحب نے اسے بادی النظر میں کوئی اہمیت نہیں دی[1]، یہ کتاب مصنف اور نفس کتاب کی حیثیت سے بہت اہم معلوم ہوتی ہے، عبارت ذیل اس کے سرورق پر عمدہ خط نسخ میں درج ہے :-

"کتاب تقویم الابدان واسباب کل مرض وعلامته ورتبه یحیی بن عیسی جزلة رحمة الله تعالی لجمیع المومنین وصاحبه وکاتبه الفقیر

---

[1] معارف :- یہ بدگمانی آپ کو کیسے ہوئی،

الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفر ذنبہ الملتمس باذیال فضلہ واحسانہ

حمید بن عمر بن عبد الجبار الوبرقینی کتبہ لنفسہ فی سنۃ ثمان

وثمانین وخمس مائۃ "

اس مختصر عبارت سے ہمیں اس کتاب کا نام تقویم الابدان الخ، اسکے مصنف کا نام یحیی بن عیسی ابن جزلہ اور کاتب کے نام اور تاریخ کتابت کی اطلاع ملتی ہے، جب ہم اس تالیف اور اسکے مصنف کی دوسری کتب تاریخ حکما میں تلاش کرتے ہیں، توسب سے پہلے ہماری نظر حال ہی کی شائع شدہ تتمہ صوان الحکمۃ از پروفیسر محمد شفیع پر پڑتی ہے، اگرچہ اس کے شائع ہونے سے ہماری معلومات میں بہت مفید اضافہ ہوا ہے، مگر افسوس کہ اس میں یحیی بن عیسی جزلہ اور اسکی تصنیف کا ذکر نہیں ہے، لیکن اخبار العلماء باخبار الحکما قفطی میں ذیل کے الفاظ میں دونوں کا ذکر ملتا ہے، (مطبوعہ مصر ص ۲۴۹-۲۵۰)

" (یحیی بن عیسی بن جزلہ) ابو علی الطبیب البغدادی النصرانی نے اپنے معاصرین اطبار نصاری کرخ سے علم طب کو پڑھا، اس نے علم منطق پڑھنے کا ارادہ کیا لیکن ان نصاری میں اسوقت کوئی اس درجہ کا نہ تھا، شیخ معتزلہ ابو علی ابن الولید نے اسی موقع پر ذکر کیا ہے، اور اس کی توصیف بیان کی ہے، کہ وہ علم الکلام کا عالم تھا، الفاظ منطقیہ جو منطق کے پڑھنے والوں کے لئے ضروری ہیں، ان کی معرفت سے واقف تھا، ابن الولید اسکو دعوتِ اسلام دیتا رہا، دلالاتِ واضحہ کی شرح کرتا رہا، اور براہین کو بیان کرتا رہا یہانتک کہ اُسنے قبول کر لیا، اور مشرف باسلام ہوا، قاضی القضاۃ قاضی ابو عبد اللہ الدامغانی اسکے اسلام کی خبر سنکر بہت خوش ہوئی اس نے طب میں ان کی خدمت کی تھی جس کی وجہ سے اس نے بہت بڑا درجہ حاصل کیا، وہ بغیر اجرت کے کام کرتا تھا، اور بغیر معاوضہ کے ادویات دیتا تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا، تو اس نے اپنی کتب کو مشہد امام ابو حنیفہ میں وقف کر دیا، چنانچہ ابن جزلہ کا انتقال ۴۹۳ھ میں ہوا "

اس کی مشہور تصانیف میں سے کتاب المنہاج فی الاغذیہ، کتاب الادویہ، اور کتاب تقویم الابدان

مجدول ہیں؛

ان متذکرہ بالا تالیفات ابن جزلہ میں سے اخیر کتاب تقویم الابدان وہی ہے، جو اس وقت

انگلیشور میں موجود ہے،

کشف الظنون میں اسی تاریخ کا ذکر یوں ملتا ہے:۔

"تقویم الابدان فی تدابیر الانسان" فی الطب لابی حسن علی بحیی بن عیسی

بن جزلہ المطبب البغدادی المتوفی سنہ ۴۹۳ مجلداً، اولہ:۔ الحمد

للہ الذی خلق فسوی الخ صنفہ مجدولاً کالتقویم النجوم للمقتدی

بامر اللہ العباسی وجعل مواضع الاجتماع والاستقبال قسمۃ الامراض الخ

شکر کا مقام ہے کہ ابن جزلہ اور اس کی تالیف دونوں کے حالات ہمکو تقویم الابدان میں

میسر آگئے، مگر کشف الظنون کے بیان میں اور قفطی کے نام کتاب اور تاریخ وفات میں کچھ تھوڑا سا

فرق ہے، میرا خیال ہے کہ حاجی خلیفہ کے زمانہ میں یا تو اس کو یہی اطلاع میسر آئی، یا طباعت کی غلطی

ہے، بہرحال زیادہ صحیح نسخہ انگلیشور کا ہے، جو کشف الظنون سے کئی صدی قبل اور مولف کے قریب

ایک صدی بعد کا ہے،

آخر میں ایک بات کی طرف توجہ دلانی ضروری معلوم ہوتی ہے، کہ ہندوستان بھر میں یہ حصہ

گجرات ایسا ہے، کہ جہاں ابھی تک بخ کے طور پر ایسے قدیم کتب خانے ہیں جہاں بے شمار علمی نوادر

موجود ہیں، میں نے اپنی آنکھوں سے کھمبائت دھولقہ، چمپانیرا اور سومنات وغیرہ میں دیکھے ہیں، جن

پر مستقل مضامین لکھے جاسکتے ہیں، اور یہی حصے زیادہ تر قدیم تمدن اسلامی سے مملو ہیں،

معارف:۔ ابن جزلہ کا حال ابن ابی اصیبعہ نے اپنی کتاب طبقات الاطباء میں بھی لکھا ہے جس

کا ترجمہ یہ ہے :-

ابن جزلہ کا پورا نام یحییٰ بن عیسیٰ بن علی بن جزلہ ہے، مقتدی بامر اللہ کے زمانہ میں تھا، اپنی بہت سی تصنیفات اُسنے مقتدی کے نام سے منسوب کیں، فن طب اور اسکے عمل میں مشہور تھا، ابو الحسن سعید بن ہبۃ اللہ کا شاگرد تھا، فن ادب پر بھی اس کی نظر تھی، نہایت اچھا خوشنویس تھا، میں نے اس کے قلم کی لکھی ہوئی خود اس کی اور دوسروں کی متعدد تصانیف دیکھی ہیں جو اسکے فن خطاطی کے کمال پر دلالت کرتی ہیں، مذہبًا نصرانی تھا، پھر مسلمان ہو گیا، اور نصاریٰ کے رد میں ایک رسالہ لکھ کر الیا القس کے پاس بھیجا، اس کی متعدد تصانیف ہیں، کتاب[۱] تقویم الابدان، منہاج[۲] البیان فیما یستعملہ الانسان، (یہ دونوں کتابیں مقتدی کے لئے لکھی تھیں)، کتاب[۳] الاشارۃ فی تلخیص العبارۃ، کتاب تقویم الابدان کی تلخیص، ما[۴] یستعمل من القوانین الطبیۃ فی تدبیر الصحۃ وحفظ البدن ایک[۵] رسالہ طب کی مدح شرع سے اس کی موافقت اور ان لوگوں کے رد میں جو شرعی حیثیت سے اس پر طعن کرتے ہیں، ایک[۶] رسالہ نصاریٰ کے رد میں جسے ۴۶۶ھ میں الیا القس کے پاس بھیجا تھا (طبقات الاطبا، جلد اول ص۲۵۵)

تلخیص و تبصرہ

جمہوریۂ روس

روس میں جو تبدیلیاں حال میں ہوئی ہیں، اُن پر کارل راڈک (Karl Radek) کا ایک مضمون رسالہ ورلڈ ریویو (اکتوبر ۳۶ء) میں شائع ہوا ہے، مقالہ نگار اسوقت روس کا سب سے زیادہ ممتاز صحافی خیال کیا جاتا ہی، اور وہ اس کمیٹی کا ممبر بھی رہ چکا ہے، جس نے اسٹالن کی صدارت میں سویٹ روس کا جدید دستور مرتب کیا ہے، کارل راڈک کی ذمہ دار شخصیت کے لحاظ سے ہم اس کے مضمون کی تلخیص ذیل میں درج کرتے ہیں:۔

روس کے نئے دستور کا مسودہ جو اسوقت جمہور کے سامنے بحث و مباحثہ اور اظہار رائے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے، دراصل ان تغیرات کا ترجمان ہے، جو سنین گذشتہ میں روس میں رونما ہوئے ہیں، مجوزہ دستور کی اہمیت کا اندازہ انہی تغیرات کو پیش نظر رکھنے سے ہو سکتا ہے،

یہ تغیرات کیا ہیں،؟ پہلا تغیر یہ ہے کہ ایک زراعتی ملک صنعتی ملک بن گیا ہے، بالکل جدید بنیاد پر فنِ صنعت و حرفت کی ایک عظیم الشان عمارت کھڑی ہو گئی ہے، صرف یہی نہیں کہ کارخانوں میں مزدوروں کی تعداد زیادہ ہو گئی ہے، اور ان کی استعداد فنی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے، بلکہ جو چیز سب سے زیادہ اہم ہی وہ یہ ہے کہ صنعتی پیداوار زراعتی پیداوار سے بڑھ گئی ہے، اس صنعتی ترقی سے نہ صرف مزدوروں کی حالت روز بروز بہتر ہوتی جا رہی ہے، بلکہ زبردست زراعتی ترقی کے وسائل بھی فراہم ہو گئے ہیں،

یہ اسی کا نتیجہ ہے، کہ حکومت کی طرف سے غلہ اور مویشیوں کی پیداوار کے لئے بڑے بڑے مرکز قائم کردیے گئے ہیں، اور کسانوں کی بڑی اکثریت نے بڑے پیمانہ پر زراعت کرنے کے فوائد کو سمجھ کر متحدہ معیشت کو عملی شکل دیدی ہے، اگر یہ بات پیشِ نظر رکھی جائے، کہ زمین اور کارخانوں کی مالک حکومت ہے، تو ان تبدیلیوں کا حاصل یہ نکلتا ہے، کہ زراعت ایک اشتراکی صنعت بنادی گئی ہے،

دیہاتوں میں نہایت پیچیدہ مشینوں کو رائج کرنا، بجلی اور ریڈیو کو جاری کرنا، کسانوں کی ایک بڑی تعداد کو جدید ترین آلات کے استعمال کی تعلیم دینا، جدید حالاتِ زندگی، تیز تعلیمی نظام اور اخبارات کی تعداد میں زبردست ترقی کی وجہ سے دیہاتوں میں تہذیب و تمدن کا ترقی پذیر ہونا، ان تمام باتوں نے کارخانوں کے مزدوروں، اور مشترکہ مزرعوں کے کسانوں کو متحد کرکے ایک رشتہ میں منسلک کردیا ہے،

ان اقتصادی اور اجتماعی تغیرات نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی تبدیلیاں پیدا کردی ہیں، چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کے طبقہ میں ایک جدید تعلیم یافتہ جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو لاکھوں کی تعداد میں ہے، اور انقلاب سے نہایت شدت کے ساتھ وابستہ ہے، اقتصادی عہدے مثلاً انجینیری، کاریگری، منیجری وغیرہ اور سرکاری عہدے اسی طبقہ کے افراد سے پُر ہیں، یہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ انقلاب کی پیداوار ہے، لیکن دور زاریت کا قدیم تعلیم یافتہ طبقہ بھی گذشتہ اٹھارہ سال کے حالات و واقعات کو سمجھنے سے قاصر نہیں رہا، اس نے نہ صرف یہ دیکھ لیا، کہ سوویٹ حکومت کو زیروزبر کرنے کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، بلکہ یہ بھی دیکھ لیا، کہ موجودہ نظام حکومت میں روس کی مادی اور تمدنی حالت روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے، اس نے محسوس کرلیا ہے کہ اجتماعی ترقی کے لئے سائنس صد درجہ معین ہے، اور حکومت سائنس کی ترقی میں حتی الامکان پوری کوشش کررہی ہے، چنانچہ قدیم تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت مزدوروں اور کسانوں سے

قریب تر آگئی ہے،

صنعتی ترقی کے باعث سویٹ حکومت نے ان طبقوں کو بھی شاہراہ ترقی پر لا کھڑا کر دیا ہے جو زاریت کے دور میں پست حالت میں پڑے ہوئے تھے، چنانچہ کوہ قاف، وسط ایشیا اور سائبریا میں صنعت و حرفت کو بہت کچھ ترقی دی گئی ہے، مثلاً باکو میں تیل کے کارخانے اور وسط ایشیا میں آبپاشی کی ترقی اور پارچہ بافی کے بڑے بڑے کارخانے اس امر کا کافی ثبوت ہیں، کہ سویٹ حکومت نے دورِ سابق کی پست اقوام کی تمدنی سطح کتنی بلند کر دی ہے،

جدید دستور انہی واقعات سے نتائج اخذ کرتا ہے، بولشویک لوگوں نے طبقۂ ادنیٰ کی آمریت کو ہمیشہ عوام ہی کی حکومت سے تعبیر کیا، تاہم ابتدا میں اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ سوسائٹی کے ان طبقوں کو عارضی طور پر جمہوری حقوق سے محروم کر دیا جائے جو انقلاب میں سب کچھ کھو بیٹھنے کی وجہ سے اشتراکیت کے قیام کی ضرور مخالفت کرتے، دوسرے یہ کہ چونکہ اشتراکیت کے لئے جد و جہد کا ابھی آغاز ہی تھا، اور نتائجِ انقلاب کے ظاہر ہونے تک شدید دشواریوں پر قابو پانا ضروری تھا، اسلئے کسانوں کی ایک معتدبہ جماعت کا تذبذب ناگزیر تھا، لہذا اشتراکیت کی تحریک کو مستقل راستہ پر لگا دینے کے لئے ضرورت تھی کہ مزدوروں کے طبقہ کو جو اشتراکی نظام کا حامی اور مددگار تھا، سویٹ انتخابات میں کچھ خاص حقوق دیدیئے جائیں، لیکن اب نہ تو اس کی ضرورت باقی رہ گئی ہے، کہ پہلے جو طبقہ جائداد کا مالک تھا، اس کو انتخابی حقوق سے محروم کیا جائے اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ مزدور پیشہ جماعت کو مخصوص انتخابی مراعات عطا کی جائیں، شہر کے متوسط طبقہ کے لوگ مثلاً تاجر وغیرہ اور سابق زمیندار جو اب سویٹ روس میں باقی رہ گئے ہیں، ان کی تعداد بہت کم ہے، اور وہ ایک طویل مدت سے اجرت پر کام کر رہے ہیں،

آبادی کی بڑی اکثریت مختلف مذہبی فرقوں کے پادریوں کے اثر سے نکل گئی ہے، اور مذہبی

پران پادریوں کا اقتدار باقی نہیں رہا، کولکس ( ) کا متوسط طبقہ جو سرمایہ دار کسانوں کا طبقہ تھا، اور ایک کثیر تعداد پر مشتمل تھا ختم ہو چکا ہے، اور اسے از سر نو تعلیم دی گئی ہے، انقلاب کے خلاف جو اندرونی قوتیں کام کر رہی تھیں، ان کا خاتمہ کر دیا گیا ہے، لیکن اشتراکیت جس کی فتح و کامرانی آج مسلم ہے، اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لے رہی ہے، حقوقِ انتخاب سب کو دیدئے گئے ہیں، اس کی وجہ سے مواقع سب کے لئے یکساں ہیں، اور وہ لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو کبھی دوسروں کو اپنا آلۂ منفعت بنائے ہوئے تھے، ان حقوق سے وہی لوگ محروم ہیں، جنکے طرزِ عمل کو عدالت نے سوسائٹی کے مفاد کے لئے مضر قرار دیا ہو،

اس میں شبہ نہیں کہ مشترکہ مزرعوں کے کسان بھی مزدور پیشہ جماعت کی طرح صنعتی ترقی کے خواہشمند ہیں، وہ سرخ فوج کو بھی زیادہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں، جس میں زیادہ تر انھی کے لڑکے شامل ہیں، یہ لوگ سویٹ حکومت اور اشتراکی نظام کے ایسے زبردست حامی ہیں، کہ اشتراکیت کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچے گا، اگر کسانوں کو رائے دہندگی کے بالکل وہی حقوق دیئے جائیں، جو مزدوروں کو حاصل ہیں، اس میں بھی شبہ نہیں کہ مزدوروں کے تعلیم یافتہ طبقہ کی اکثریت اشتراکیت کو مضبوط کرنا چاہتی ہے، کیونکہ اشتراکیت اُنکی فلاح و بہبود کا بہت زیادہ خیال کرتی ہے، اور اسکے دور میں سائنس کو ہر سال ترقی ہو رہی ہے،

تمام باشندوں کو جن کی عمریں اٹھارہ سال سے کم نہیں ہیں، رائے دہندگی کا حق دیدیا گیا ہے، اور وہ ہر چھوٹے بڑے عہدوں کے انتخاب میں رائے دیسکتے ہیں، پریس کی آزادی، تقریر و اجتماع کی آزادی، جلوس و مظاہرہ کی آزادی، ٹریڈ یونین کوا پریٹیو سائنٹفک اور اسی قسم کی دوسری سوسائٹیوں کے قائم کرنے کی آزادی، اس جمہوریت کے بنیادی عناصر ہیں، جدید دستور نے سویٹ یونین کے انتخابی عہدوں کے لئے امیدوار پیش کرنے کا حق صرف کمیونسٹ پارٹی کی انجمنوں ہی کو نہیں، بلکہ جمہور کی

تمام انجمنوں کو دیدیا ہے،

انقلاب کے ابتدائی زمانہ میں چونکہ حالات تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے، اس لئے قوانین بھی جلد جلد شائع کئے گئے، اور تبدیل ہوتے رہے، لیکن اب جب کہ بنیادی مسائل طے ہوچکے ہیں، ضرورت ہے، کہ اس صنعتی ملک کے پیچیدہ اقتصادی حالات کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب قوانین مرتب کئے جائیں، اس دستور کی روسے مجلس قانون ساز صرف دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی، ایک مجلسِ اتحاد (Council of the Union) اور دوسرے مجلسِ اقوام (Council of Nationalities) مجلسِ اتحاد میں ہر شخص کو مساوی طور پر براہ راست رائے دینے کا حق حاصل ہوگا، مجلسِ اقوام کے ارکان مختلف قومی جمہوریتوں کے نمائندے ہوں گے، قوانین صرف انہی دونوں ایوانوں کے فیصلہ سے وضع ہوسکیں گے،

"ع ز"

امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کا مسئلہ

امریکہ کے ماہرین تعلیم کے سامنے اس وقت یہ مسئلہ زیر بحث ہے، کہ ریاست ہائے متحدہ کا موجودہ تعلیمی نظام کہاں تک مناسب ہے، اور اعلیٰ تعلیم کے نصاب میں اصلاح و ترمیم کی کس حد تک گنجایش ہے، اس مسئلہ میں ماہرین کی دو مخالف جماعتیں قائم ہوگئی ہیں، اور درجنوں کتابیں موافقت اور مخالفت میں لکھی جاچکی ہیں، ایک طرف وہ لوگ ہیں، جن کا خیال ہے، کہ امریکن یونیورسٹیوں میں فنی (VOCATIONAL) تعلیم پر اس قدر زور دیا جانے لگا ہے، کہ اب وہ مختلف پیشوں اور تجارتوں کی تعلیم گاہیں ہوکر رہ گئی ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں، کہ یونیورسٹیوں میں خالص عقلی اور علمی تعلیم دی جائے، دوسری طرف اکثریت ان لوگوں کی ہے، جو موجودہ نظام تعلیم کے حامی ہیں، اس بنا پر کہ یہ نظام قوم کے لئے مفید اور کارآمد ہے،

اس دوسری جماعت میں سب سے زیادہ ممتاز شخصیت ڈاکٹر وہائٹ ہیڈ (Alfred North Whitehead) کی ہے، جو ہارورڈ یونیورسٹی کے شہرۂ آفاق اُستاذِ فلسفہ ہیں، موصوف کی رائے ہے، کہ اگر یونیورسٹیاں فنی تعلیم میں ذرا بھی تخفیف کر دیگی، تو یہ ان کے لئے حد درجہ مضرت رساں ہوگا،

اصلاح کے حامیون میں پہلا نام ڈاکٹر ہچنس (Robert Hutchins) صدر شکاگو یونیورسٹی کا ہے، ان کے نزدیک یونیورسٹی کی تعلیم میں مابعد الطبیعیات (Metaphysics) کو اساس قرار دینا چاہئے یعنی تمام علوم کے بنیادی اصولوں کی تعلیم دینی چاہئے، تاکہ علم کی تمام مختلف شاخوں میں ربط و اتحاد پیدا ہو سکے، اسکے لئے ان کے خیال میں یہ ضروری ہے، کہ کالج کے نصاب میں جو مضامین خالصًا کسی پیشہ یا فن سے تعلق رکھتے ہیں، وہ نکال دیئے جائیں، کیونکہ کلی علوم کا باہمی اختلاف و تغایر تعلیمی انتشار کا سب سے بڑا سبب ہے،

اسوقت تک یونیورسٹیون میں تعلیم تین مختلف طریقوں سے دیجاتی رہی ہے:۔ (۱) مذکورۂ بالا مابعد الطبیعیاتی طریقہ (۲) دینی طریقہ (۳) افادی طریقہ، جس پر امریکہ کے موجودہ تعلیمی نظام کی بنیاد ہے، ڈاکٹر موصوف کی رائے ہے، کہ آج افادی طریقہ کے بجائے جو طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ صرف مابعد الطبیعیاتی طریقہ ہے، کیونکہ دینی طریقۂ تعلیم کے لئے ضروری ہے کہ اُس مذہب پر لوگ عام طور پر قوی اعتقاد بھی رکھتے ہوں، قرونِ وسطیٰ کی یورپین یونیورسٹیوں کی بنیاد دینی طریقہ پر تھی، آج بھی مسلمانوں اور یہودیوں کا تعلیمی نظام اسی دینی طریقہ پر قائم اور کامیاب ہے، کیونکہ ان کے طلبہ اپنے مذہبی اصولوں کے اب بھی پابند ہین،

ڈاکٹر ہچنس کے نزدیک مستقبل کے لئے بہترین یونیورسٹی جو ہو سکتی ہے، اسکا خاکہ یہ ہے:۔

۱- کالج کے موجودہ چار سالہ نصاب سے ابتدائی دو سال خارج کر دیئے جائیں، اور انھیں ہائی اسکول کے آخری دو سالوں میں شامل کرکے ایک طرح کا جونیر کالج (junior College)

قائم کردیا جائے،

۲- اعلیٰ تعلیم کے لئے کالج کا نصاب تین سال کا کردیا جائے، پہلے مابعد الطبیعیات کی تعلیم دیجائے تاکہ تمام علوم کے بنیادی اصول ذہن نشین ہو جائیں پھر علوم عمرانیہ کی جو انسانوں کے باہمی تعلقات سے بحث کرتے ہیں، پھر اُن علوم کی جن کا تعلق انسان اور فطرت سے ہے تعلیم میں اس بات پر ہمیشہ نظر رکھی جائے، کہ ان تینوں قسم کے علوم کا تعلق ایک دوسرے کیسا تھ کیا ہے؛

۳- اس نصاب سے فنی اور تجارتی تعلیم یک قلم خارج کر دیجائے، مختلف پیشوں اور تجارتوں کیلئے مخصوص تعلیم گاہیں، علٰحدہ قائم کیجائیں،

ڈاکٹر موصوف موجودہ امریکن یونیورسٹی کو ایک انسائیکلوپیڈیا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:-

"انسائیکلوپیڈیا میں بہت سے حقائق ہیں، لیکن اسکی وحدت صرف اس کی ابجدی ترتیب میں ہے، موجودہ یونیورسٹی کا حال بھی ایسا ہی ہے، اس میں آرٹ (Art) سے لیکر حیوانیات (Zoology) تک مختلف شعبے ہوتے ہیں، لیکن نہ تو طلبہ اور نہ خود اساتذہ یہ جانتے کہ کسی ایک شعبہ میں ایک حقیقت کا تعلق دوسری حقیقت سے کیا ہے، یا ایک شعبہ کے حقائق کا تعلق دوسرے شعبہ کے حقائق سے کیا ہو سکتا ہے" موصوف لکھتے ہیں، کہ ہماری تعلیمی نظام میں عملی فنون کا زور ہر جگہ نظر آرہا ہے، اسکا نتیجہ بھی ظاہر ہے یعنی ہلکا پن اور سطحیت" امریکہ کی ایک یونیورسٹی نے موٹر چلانے کا فن چندروز ہوئے نصاب میں داخل کر لیا ہے، اخباروں میں یہ اطلاع بھی آچکی ہے کہ پبلک اسکولوں کے نصاب میں سائکل چلانے کا فن داخل ہونے والا ہے، اس کے لئے کوشش کیجارہی ہے، ڈاکٹر ہچنس کے نزدیک مستقبل کی یونیورسٹی تمامتر علمی اور عقلی یونیورسٹی ہوگی فنی اور تجارتی تعلیم اس میں نہ دیجائیگی، ان کا عقیدہ ہے کہ یونیورسٹی کا تعلق تخیل (Thought) سے ہے، اور اسمیں قدیم یا موجودہ زمانہ کی معلومات کو جمع کرنا ایک بے معنی سی بات ہے، بجز اس صورت کے کہ ان معلومات سے مقدمات کا کام لیا جائے، اور اصولوں کی تشریح و تصدیق میں ان سے مدد ملے، (ل - ڈ)

جراثیم اور انکی عالمگیری کا امکان،

جراثیم میں بھی افزایش نسل ہوتی رہتی ہے لیکن توالد و تناسل کے طریقہ سے نہیں بلکہ اس طرح کہ وہ ٹکڑے ہو کر ایک کے دو ہو جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان میں فطری تبدیلی بھی واقع ہوتی رہتی ہے، ان تبدیلیوں کو منازلِ ارتقا سے تعبیر کر سکتے ہیں، سائنٹفک تحقیقات سے اب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ جراثیم اپنی فطرت بدلتے رہتے ہیں، اسکی ایک واضح مثال چیچک کے جرثومہ کی ہے، ایک زمانہ میں چیچک نہایت مہلک بیماری تھی لیکن جہان تک انگلستان کا تعلق ہے، جس جرثومہ سے بیماری پیدا ہوتی ہے، اس کی سمیت میں اب بہت کچھ تخفیف ہو گئی ہے، اور انگلستان کی چیچک بہ نسبت پہلے کے بہت ہلکی ہو گئی ہے، شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ خود لوگوں کے اندر مرض کا مقابلہ کرنے کی قوت زیادہ پیدا ہو گئی ہے، یعنی تبدیلی انسانوں میں ہوئی ہے نہ کہ جراثیم میں، لیکن یہ صحیح نہیں، مشرق کی چیچک اب بھی ویسی ہی شدید ہے، جیسی پہلے تھی، اور جب وہاں کا کوئی مریض بندرگاہ کے ڈاکٹروں سے بچکر انگلستان میں داخل ہو جاتا ہے تو تعدیہ کا خطرہ ویسا ہی رہتا ہے، جیسا پہلے تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان کی چیچک کے جراثیم ہی میں کوئی تبدیلی واقع ہو گئی ہے، لیکن اگر تبدیلی کے ذریعہ بعض جراثیم کی سمیت میں تخفیف ہو سکتی ہے، تو یہ بھی ممکن ہے کہ بعض دوسرے جراثیم کی سمیت میں اضافہ ہو جائے، ایک جرم کی اوسط زندگی تقریباً بیس منٹ ہوتی ہے، اسکے بعد وہ ٹکڑے ہو کر دو ہو جاتا ہے، اس حساب سے ۲۴ گھنٹوں میں بہتر پشتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور تبدیلی کیلئے بہت کچھ موقع رہتا ہے، اگر اس تبدیلی سے سمیت میں زیادتی ہو جائے، تو دنیا کے لئے خطرہ کا امکان بھی بڑھ جائیگا، ہوائی جہازوں کی وجہ سے بیماریوں کے پھیلنے کا اندیشہ بڑھتا جاتا ہے، اور خطرہ ہے کہ جو بیماریاں ابھی کسی ایک مقام میں پائی جاتی ہیں، وہ جلد دوسرے حصوں میں بھی پھیل جائیں گی، مثلاً زرد بخار جو اس وقت مغربی افریقہ کی سب سے بڑی وبا ہے، اور ملیریا سے دس گنا زیادہ خطرناک ہے، ہوائی جہازوں کے ذریعہ اپنی مدتِ تعدیہ یعنی چار یا پانچ روز کے اندر آسانی سے ایشیا پہنچ سکتا ہے جو ابتک اس وبا سے بالکل محفوظ ہے،

"ع ز" (ج - ل - و)

اخبارِ علمیہ

دماغی امراض کا نفسیاتی علاج

عہدِ حاضر میں سائنس کی ترقی نے جو نئے علوم و فنون پیدا کر دیئے ہیں، ان میں ایک علم سائکی ایٹری (Psychiatry) کا بھی ہے یعنی دماغی امراض کا نفسیاتی علاج، اس قسم کے علاج کے لئے اب مستقل ادارے قائم ہو گئے ہیں، اور وہ اپنے طریق علاج میں کامیاب ہو رہے ہیں، نومبر ۱۹۳۶ء میں واشنگٹن اسکول آف سائکی ایٹری امریکہ کے ماہرِ فن ڈاکٹر ہیڈلے (Ernest Hadley) نے اپنے چند دلچسپ تجربات بیان کر کے بعض ایسے لوگوں کی طرف سے متنبہ کر دیا ہے جن سے بظاہر کوئی خطرہ نہیں معلوم ہوتا لیکن جو کسی وقت قتل کے مرتکب ثابت ہو سکتے ہیں، ڈاکٹر صاحب موصوف کا مشورہ ہے کہ جو لوگ بہت مسکین اور متحمل مزاج دکھائی دیتے ہیں، ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہئے، کیونکہ ممکن ہے کہ ان کے اندر دشمنی کے جذبات پوشیدہ ہوں، اور وہ کسی وقت رونما ہو کر ارتکاب قتل کا باعث بنجائیں چنانچہ موصوف نے ایک عورت کا حال بیان کیا، جو بظاہر نہایت فرمانبردار تھی، اور جس نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اپنی بیمار لیکن سخت گیر ماں کی خدمت میں صرف کر دیا تھا، ماں کی خدمت میں وہ اس طرح لگی رہتی تھی، کہ اٹھارہ سال سے کسی سینما اور تھیٹر وغیرہ میں بھی تفریح کے لئے نہیں گئی تھی، پہلے کچھ دنوں وہ اتوار کو گرجا چلی جاتی تھی، مگر بعد کو وہاں کا جانا بھی موقوف کر دیا، اور دن رات ماں ہی کی خدمت میں مصروف رہنے لگی لیکن ایک روز وہ دفعۃً بھڑک اٹھی، اور ایک کلہاڑی لے کر اپنی ماں کے سر

ایسی ماری کہ قریب وہیں ٹھنڈی ہوگئی، اسی طرح ایک دوسری عورت تھی جس کی ماں نے بچپن ہی سے اُسے گھر کی دیکھ بھال میں لگا رکھا تھا، اور وہ تمام دن خانگی امور میں مصروف رہتی تھی، ایک مدت کے بعد اس جذبہ سے مغلوب ہونے لگی، کہ اُسے اپنی ماں کو قتل کر دینا چاہئے، لیکن قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادہ کی تکمیل کرے، وہ ڈاکٹر کے پاس چلی گئی، اور نفسیاتی شفاخانہ میں داخل ہوگئی، ڈاکٹر ہیڈلے کی رائے ہے، کہ اس قسم کی دبی ہوئی نفرت دراصل بچپن ہی میں پیدا ہو جاتی ہے، اور اندر ہی اندر غیر شعوری طور پر پرورش پاتی رہتی ہے، ہوسکتا ہے کہ بچہ شروع ہی سے اپنی ماں یا دائیوں سے نفرت کرنے لگے، اگر کسی وجہ سے ماں بچہ کی طرف جیسی چاہئے، توجہ نہیں کرتی، تو بچہ اسے فوراً محسوس کر لیتا ہے، اور اس بے توجہی کے جواب میں دودھ یا کھانے سے انکار کر دیتا ہے، کبھی کبھی اس بیزاری کا اثر بڑے ہونے کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اور غیر متوقع اوقات میں ظاہر ہو جاتا ہے،

بڑوں کے دلوں میں اس قسم کی بیزاریاں جو قائم ہو چکی ہیں، ان کا رفع کرنا تو محال ہے، لیکن بچوں کی اصلاح کی بہت کچھ توقع ہے، خصوصاً اگر والدین یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں، کہ ان کی بیزاریوں کے حقیقی اسباب کیا ہیں، ڈاکٹر موصوف کا تجربہ ہے کہ بچوں کی اصلاح میں سختی کو دخل دینے سے نتیجہ خراب نکلتا ہے، مثلاً اگر کوئی بچہ جھوٹ بولتا ہے تو اُسے جھڑکنا نہیں چاہئے، کیونکہ ایسا کرنے سے وہ اپنے والدین سے نفرت کرنے لگتا ہے، بلکہ نرمی کے ساتھ جھوٹ بولنے کی بُرائی اسے سمجھا دینی چاہئے، اگر وہ کھاتا نہیں تو جھڑکنے سے اور نہ کھائے گا، بہتر یہ ہے کہ اگر ممکن ہو تو نہ کھانے کا سبب معلوم کیا جائے، اسی طرح ہر بات میں نرمی کیساتھ اصلاح کی کوشش کی جائے،

دنیاے جدید کی قدامت

گذشتہ موسم گرما میں ریاستہاے متحدہ امریکہ میں نیو مکسیکو کے قریب ایک نہایت عظیم الشان جانور

ڈھانچہ زمین کھود کر نکالا گیا ہے، گردن کے زیرین حصہ نیز دونوں پہلوؤں میں تیر کی نکلی پھل پیوست تھے، یہ پھل اسی قسم کے تھے، جس قسم کے زمانۂ قبل تاریخ کے شکاری استعمال کرتے تھے، اور باوجود ہزاروں برس مٹی میں دبے رہنے کے نئے پھل کی طرح تیز تھے، ماہرینِ اثریات نے معائنہ کے بعد فیصلہ کیا، کہ یہ ڈھانچہ عہد تیخ کے ہاتھی کا ہے، جو موجودہ زمانہ کے ہاتھی سے کہیں زیادہ بڑا ہوتا تھا، اب سے بیس ہزار سال پہلے یہ ہاتھی شمالی نصف کرہ کے تمام برّاعظموں میں پھرا کرتے تھے، اور عہدِ حجری میں یورپ کے باشندے ان کا شکار کیا کرتے تھے، چنانچہ فرانس میں بعض پہاڑی غاروں کے اندر انکی تصویریں بھی دیواروں میں کھدی ہوئی اب تک ملتی ہیں، ان کی پیٹھ پر کوہان تھے، دانت گھومے ہوئے تھے، اور جسم پر بڑے بڑے بال تھے، عہدِ تیخ کے گذرنے پر یورپ اور ایشیا کے یہ ہاتھی شمال کی طرف چلے گئے، اور سائبریا میں قیام پذیر ہوگئے، ان میں سے بے شمار وہاں کے برفانی دلدلوں میں پھنس کر جم گئے، اب دس ہزار سال کے بعد بعض وقتاً فوقتاً برف کھود کھود کر نکالے جارہے ہیں، اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ جس حال میں وہ دلدلوں میں دھنسے تھے ٹھیک اسی حال میں اب تک محفوظ ہیں، ان کی کھال، بال، گوشت، یہاں تک کہ پیٹ میں جو غذا اسوقت تک ہضم نہیں ہوئی تھی، وہ بھی بدستور باقی ہے، اتنا ہی نہیں، بلکہ منہ کے اندر میوا ار، گھاس اور جھاڑیوں کے جو تنکے تھے، وہ بھی اسی طرح موجود ہیں، سائبریا کے کسان ان ہاتھیوں کے جسم سے سُرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹ کر کتوں کو کھلاتے ہیں، زمانہ قدیم سے سائبریا کے ہاتھی دانت کی تجارت چین اور یورپ سے بہت زیادہ ہوتی رہی ہے، شمالی روس کے دلدلوں میں سیکڑوں آدمی برف کھود کر ان ہاتھیوں کے دانت نکالتے رہتے ہیں، لیکن چند سال قبل تک امریکہ میں ان ہاتھیوں کا سُراغ نہیں ملا تھا، کئی سال سے ان کے ڈھانچے جنوبی مغربی امریکہ میں ملنے لگے ہیں، پھر بھی ماہرینِ اثریات کو توقع نہ تھی کہ ہزاروں برس پہلے انسان بھی امریکہ میں آباد تھے، لیکن نیومکسیکو کے جدید اکتشاف نے اب یہ قطعی طور پر ثابت

کردیا کہ امریکہ میں انسانی آبادی اسوقت بھی موجود تھی، جب یہ جنگلی ہاتھی وہاں بکثرت پائے جاتے تھے جس ہاتھی کا ڈھانچہ نیو میکسیکو میں برآمد ہوا ہے اسکے زمانہ کا تخمینہ اب سے دس پندرہ ہزار سال قبل کیا جاتا ہے،

موسم اور غیر معمولی ذہانت کا باہمی تعلق۔

امریکہ کی نیشنل اکاڈمی آف سائنس (National Academy of Sciences) کے ششماہی اجلاس میں جو نومبر ۱۹۳۶ء میں شکاگو یونیورسٹی میں منعقد ہوا تھا، ڈاکٹر ولیم پیٹرسن نے ایک عجیب و غریب نظریہ پیش کیا، وہ یہ کہ غیر معمولی ذہانت اور موسمی کیفیت کے درمیان کوئی قوی تعلق ہے۔ موصوف نے امریکہ کے پچیس ہزار ممتاز آدمیوں کی سوانح عمریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے نیز پاگلوں اور مجرموں کے حالاتِ زندگی پر بھی نظر رکھی ہے، ان کے جمع کردہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ جن بچوں کا حمل سال کے نصف اول میں قرار پایا تھا، ان کی دماغی قوت بہ نسبت دوسرے بچوں کے عموماً زیادہ تھی، اور انہی کی تعداد میں وہ لوگ جو غیر معمولی طور پر ذہین تھے، یا جن کا دماغی توازن درست نہ تھا، زیادہ تر ہوئے تھے، اس قاعدہ کو ریاستہائے متحدہ امریکہ کے اکتیس صدور پر منطبق کر کے ڈاکٹر موصوف نے دیکھا کہ ان میں سے چھبیس کے حمل سال کے ابتدائی سات مہینوں میں قرار پائے تھے، اور صرف پانچ کے بقیہ پانچ مہینوں میں ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ ذہانت اور ذکاوت کا تعلق نہ سیاروں سے ہے اور نہ دوسرے مخفی اثرات سے، بلکہ تمام تر موسم سے ہے، شمالی نصف کرہ میں سال کا نصف اول طوفانی زمانہ ہوتا ہے اور موسمی کیفیت کا اثر اُن بچوں پر بہت زیادہ پڑتا ہے جن کے حمل اس زمانہ میں قرار پاتے ہیں، برخلاف اس کے جن بچوں کے حمل سال کے نصف آخر میں قرار پاتے ہیں جو نسبتہً پرسکون اور غیر طوفانی زمانہ ہوتا ہے، وہ عموماً خاموش اور دماغی اور جسمانی دونوں قوتوں کے لحاظ سے اوسط درجہ کے ہوتے ہیں،

"م ع ز"

ادبیات

یادگار داغ،

از حضرت متین مچھلی شہری یادگار داغ دہلوی

کون اسیر دام محبت تیرا اے صیاد نہیں
بلبل و قمری کو کیا کہئے سرو کوئی آزاد نہیں

آنکھوں میں آنسو بھی نہیں اب آہ نہیں فریاد نہیں
محو ہوں تیری یاد میں ایسا گویا تو بھی یاد نہیں

گلشن ہو یا کنج قفس مرغ چمن دل شاد نہیں
پھول ستمگر منہ نہیں کرتے خوش ظالم صیاد نہیں

خیر غلط اقرار محبت اچھا وعدہ نباہ کا جھوٹ
دل کا لینا بھول گئے کیا وہ بھی تم کو یاد نہیں

کیا کیا ان کو یاد نہیں ہے صرف مجھی کو بھول گئے
مجھ کو سب کچھ بھول گیا ہے انکے سوا کچھ یاد نہیں

وہ کوڑی کا مال نہیں ہے سمجھو شیشہ خالی ہو
پتھر کہئے دل وہ کیا ہے جس میں بتوں کی یاد نہیں

حاصل زیست جسے کہئے وہ تجھ پر مر مٹنا ہے
خاک ہے تیرے کوچہ میں مٹی جس کی برباد نہیں

عشق و جنوں میں ہمت شرط ہے دو دو قصے شاہد ہیں
ہستی کچھ صحرا کی نہیں ہے کوہ کی کچھ بنیاد نہیں

یاد کیا ہو مجھکو ایسی کوئی گھڑی ہے یاد تمھیں،
بھول گیا ہوں تمکو ایسا لمحہ مجھ کو یاد نہیں،

یاس میں تم سے آس نہیں تو کیا مطلب ہے عالم سے
دل کی بستی اجڑ گئی تو دنیا بھی آباد نہیں،

میں تو متین اللہ سے ہر دم ایک صنم کا طالب ہوں
فرماتے ہیں حضرت زاہد تجھکو خدا کی یاد نہیں،

پیامِ بشیر

از جناب محمد بشیر صاحب بی اے ایل ایل بی ہڈ ماسٹر شبلی جارج ہائی اسکول

نورِ صباحِ اصل ہو، شمعِ شبِ مجاز بن — کعبۂ ذوق شوق ہو، قبلۂ حسن و ناز بن،

شکوۂ ناز تا بکے، پیکرِ حسن و ناز بن — برقِ نظارہ سوز ہو، چشمِ نظارہ ساز بن،

ساغر و گل میں کچھ نہیں، لالہ و گل میں کچھ نہیں — روحِ شرابِ ناب ہو، بوئے چمن طراز بن

دردِ شفا فروش ہو، داغِ جہاں فروز ہو، — نالۂ قلب سوز ہو، آہِ جگر گداز بن

دل کو یونہی لہو نکر، ذلتِ آرزو نکر — راز کی جستجو نہ کر، پردہ کشائے راز بن

عقل کا اعتبار کیا، عشق پہ اعتماد کر، — یا رہو حیلہ جو اگر، تو بھی بہانہ باز بن

آہ بشیر تا بکے مطرب و نغمہ کی ہوس،

کون و مکاں بھی جھوم جائیں تو وہ صدائے ساز بن،

آہنگِ تپش

از جناب پروفیسر تپش امرسن کالج، ملتان،

یہ نقشِ داغِ معصیت ہے، یا تاثیرِ میخانہ — مری توبہ کے ہر ٹکڑے پہ ہے تصویرِ میخانہ

کہیں واعظ بہک آیا نہ ہو مسجد کے دھوکے میں — کوئی کھڑکا رہا ہے دیکھنا زنجیرِ میخانہ

ابھی ساغر بکف حوریں چلی آتی ہیں جنت سے — لگا کر دیکھ زاہد سرمۂ تسخیرِ میخانہ

نہ جھونکو میری مشتِ خاک کو بنیادِ کعبہ میں — اسے رہنے دو یہ ہے حاصلِ تعمیرِ میخانہ

کہاں میں اور کہاں یہ بادہ پیمائی لبِ کوثر — سفینہ بخششوں کا بن گئی تحریرِ میخانہ

مری ہو حق تو نے رنگِ قلقلِ مینا بدل ڈالا — مرے سجدوں سے کعبہ تک بڑھی توقیرِ میخانہ

وہاں دعوے خدائی کے یہاں بندگی بھی جبّہ — وہ قسمت خانقاہوں کی یہ ہے تقدیرِ میخانہ

تپش آتے ہی بزمِ وعظ میں گھبرا کے کیوں اٹھے

اترتا ہے کہیں یوں نشۂ تقریرِ میخانہ

جامِ صہبائی

جناب عبدالسمیع صاحب پال آثر صہبائی ایم اے ایل ایل بی،

دے! بادۂ شوق کا مجھے ساغر دے — اپنی ہی تجلیات مجھ میں بھر دے!

بنکر غمِ عشق تو سما جا مجھ میں، ! — میں فانی ہوں مجھ کو جاودانی کر دے! ۱

عصیاں سے کے نہ داغ دل سے دھوئے تونے — اپنے ہی بلند رتبے کھوئے تونے!

بگڑا نہ کسی کا کچھ بدی سے تیری، — ہاں اپنے ہی حق میں کانٹے بوئے تونے! ۲

ہونے دے دل و جگر کا خوں ہونے دے — افلاک کی یورشیں فزوں ہونے دے

کٹتا ہے جو سر ترا تو کٹ جائے آخر — پرحق کا علم نہ سرنگوں ہونے دے ۳

نیکی کا ہے گر ثمر تو ہے میرے لئے — عصیاں کا ہے کچھ ضرر تو ہے میرے لئے

اللہ کی ذات پر ہے کیا اس کا اثر — یہ عقدۂ خیر و شر تو ہے میرے لئے ۴

ہنگامۂ شوکتِ شہی سے نہ ڈرو، — بزمِ جم و شانِ قیصری سے نہ ڈرو

یوں عمر بسر ہو اس صنم خانے میں — سب تم سے ڈریں پہ تم کسی سے نہ ڈرو ۵

اے غرقِ نشاط و عیش! اے بادہ پرست! — ہر کیف و سرور کا ہے انجام شکست

سرمستیِ عشق جاودانی ہے آثر — ہیں بے خبرِ خمارِ مستانِ الست ۶

گذشتہ ششماہی کے رسائل واخبارات پر گذشتہ پرچوں میں ریویو ہوتا رہا ہے، جو باقی رہ گئے تھے یا بعد میں نکلے، وہ حسب ذیل ہیں :-

رسائل، **کائنات** (ماہانہ) مرتبہ جناب شوکت تھانوی و فدا احمد صاحب عباسی تقطیع ۲۰×۳۰

حجم ۴۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت سالانہ للعہ، فی پرچہ ۶ر پتہ مرشد آباد پبلس لکھنؤ،

آجکل رسائل کی کمی نہیں، آئے دن رنگ برنگ کے رسائل نکلتے رہتے ہیں، لیکن سنجیدہ اور مفید مقصد رکھنے والے رسائل کی تعداد بہت کم ہے، ایسی حالت میں کائنات کا اجرار ایک مفید اضافہ ہے، عام علمی اور ادبی مقاصد کے ساتھ اس کا سب سے بڑا مقصد اس الحاد، بے دینی اور بے شرمی اور بے حیائی، بلکہ بدمذاقی کا تدارک ہے جو آجکل آزادی خیال اور آرٹ کے نام کو پھیلائی جارہی ہے، اگرچہ یہ شے بالکل نظر انداز کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لیکن کچھ بہت زیادہ قابلِ اعتنا بھی نہیں، کہ یہ ان کے نقیبوں کے نزدیک بھی مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ آج کل کے کم مایہ ادب فروشوں نے محض عوام کو اپنی متاعِ کاسد کی طرف متوجہ کرنے کے لئے ان مقبول خیالات کو وسیلہ بنایا ہے، بہت ممکن ہے، کل ان کی جگہ کوئی دوسرا چالو مال پیش کیا جانے لگے، تاہم کائنات کے مقاصد کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہیں، ابھی اسکو عرصۂ وجود پر آئے ہوئے، صرف دو ہی مہینے ہوئے ہیں، لیکن رفتار سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ بہت جلد سنجیدہ رسائل کی صف میں ایک ممتاز جگہ حاصل کرلے گا،

عارف (ماہانہ) مرتبہ مولوی عبد الرحمن صاحب شوق، تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ نفیس، کتابت و طباعت پاکیزہ قیمت سالانہ عہ فی پرچہ: - ۲ر پتہ - دفتر عارف بل روڈ لاہور،

یہ رسالہ کئی مہینوں سے لاہور سے نکل رہا ہے، ظاہری نفاست و پاکیزگی میں بہت کم رسائل اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اس کا خاص مقصد مسلمانوں کو مغربی معاشرت کے مسرفانہ مصارف سے بچانا ہے لیکن مضامین مذہبی اخلاقی ادبی ہر قسم کے ہوتے ہیں، مذہبی اور اخلاقی پہلو غالب ہے، قرآنی احکام اور احادیث نبوی کی تشریح التزام کے ساتھ ہوتی ہے، بزرگان سلف کے مختصر حالات بھی اکثر ہوتے ہیں، لیکن مضامین کا معیار ابھی اور بلند کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ظاہر اور باطن میں مناسبت پیدا ہو جائے،

کہکشاں، مرتبہ سید کاظم صاحب دہلوی ادیب عالم تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ عہ، دوسالے سے ہے، پتہ: - دفتر کہکشاں گلی شاہ تارا، دہلی،

کہکشاں دہلی سے نکلتا ہے، اگرچہ صورۃً کم رو ہے لیکن معناً ادب و افسانے کا دلچسپ مجموعہ ہے، شروع میں اشخاص، طبقات اور جماعتوں کے نام منظوم پیامات ہوتے ہیں، "پھر گل و ریحان" کے ماتحت مختلف مسائل پر اظہار خیال ہوتا ہے، پھر خریداروں کے سوالات اور اس کے جوابات درج ہوتے ہیں، اڈیٹوریل میں اسلامی ممالک کی خبریں ہوتی ہیں، غرض یہ رسالہ مختلف قسم کے معلومات کا دلچسپ مجموعہ ہے،

دُرِّ یتیم (ماہانہ) مرتبہ محمد رشید خانصاحب تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۴۴ صفحات کاغذ کتابت و طباعت نہایت معمولی، قیمت عہ، پتہ: دفتر انجمن یتیم خانہ، اڈہ ہوکو در جالندھر،

یہ رسالہ جالندھر کے اسلامی یتیم خانہ کی جانب نکلتا ہے، مضامین عموماً مذہبی اور اخلاقی ہوتے ہین، کبھی کبھی سبق آموز تاریخی واقعات اور اخلاقی افسانے بھی نظر آتے ہیں، اسکی آمدنی یتیم خانہ پر صرف ہوتی ہے، اسلئے اسکی خریداری ہم خرما و ہم ثواب ہے،

اخبارات | **ناخدا** (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی خلیل احمد صاحب فاضل دینیات، تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت مرقوم نہیں ہے، پتہ:- مولوی گنج لکھنؤ

یہ اخبار عرصہ سے لکھنؤ سے نکل رہا ہے، ہمارے پاس حال میں ریویو کے لئے آیا ہے، ہفتہ وار اخبارات میں سے خاصہ اخبار ہے، ہفتہ بھر کی سیاسی خبروں کا خلاصہ دیتا ہے، قابلِ توجہ واقعات پر تبصرہ ہوتا ہے، کبھی کبھی بعض مفید مضامین بھی ہوتے ہیں،

الہلال (ہفتہ میں دو مرتبہ) مرتبہ مولوی سید یحییٰ حسن صاحب ندوی و عبد الرحمٰن صاحب عثمانی، تقطیع ۲۶×۲۰/۲ ضخامت ۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ، ششماہی عاز فی پرچہ - پتہ مراد پور بانکی پور پٹنہ،

الہلال حال ہی میں پٹنہ سے طلوع ہوا ہے، عام اخباری زبان میں اس کا مقصد مذہب ملت اور ملک و قوم کی خدمت ہے، ابھی اس کے چند ہی نمبر نکلے ہین، ان سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اگر یہ موسمی نہ ہوا، تو بہار کے اخبارات میں اچھی جگہ حاصل کرلے گا، لیکن رنگ بالکل موسمی معلوم ہوتا ہے،

مجاہد (ہفتہ میں دوبار) مرتبہ شاہد احمد زماں صاحب تقطیع ۲۶×۲۰/۲ ضخامت متعین نہیں معلوم ہوتی، کم سے کم چار صفحات ہوتے ہیں، سالانہ قیمت مرقوم نہیں، مقامی اخبار ہے، پتہ گلی نمبر ۳۰، مکان نمبر ۲۳۱، رنگون،

ہندوستانی کے مرکز سے دور رنگون میں ہندوستانی زبان کا خاصہ مذاق ہے، اور یہاں سے متعدد اچھے اخبارات و رسائل نکلتے ہیں، حال میں مجاہد صفت آرا ہوا ہے، ظاہری اور معنوی

معنوی لحاظ سے قدر افزائی کا مستحق ہے، اخباری خبروں کے علاوہ کبھی کبھی مفید مضامین بھی نظر آتے ہیں، امید ہے

کہ مجاہد بریلی مسلمانوں کی مفید خدمت انجام دیگا،

علیگ (ہفتہ وار) مرتبہ مولینا سعید انصاری و ضیا ؤ احمد صاحب انصاری (علیگ) تقطیع $\frac{22\times18}{4}$

ضخامت ۸ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ مقامی عہ/ بیرونجات کے لئے عہ/

پتہ:۔ دفتر علیگ، علی گڈھ،

علیگ برادری کے لئے ایک ایسے سنجیدہ اخبار کی ضرورت تھی، جو ایک طرف انمیں رشتہ اتحاد و اتفاق کا وسیلہ ہو، اور دوسری طرف ارباب مسلم یونیورسٹی کے کانوں تک اپنی آواز پہنچا سکے، اور ان کو موجودہ ضروریات کے مطابق صحیح مشورہ دیسکے، علیگ کے افتتاحیہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ مسلمانوں کی اس واحد درسگاہ کو اسکی قدیم روایات اور پرانے ڈھرے سے بلند اور مسلمانوں کے موجودہ مقتضیات کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے، اگرچہ یہ اخبار بلحاظ ضخامت کمتر ہے، لیکن بقیمت بہتر ہے، امید ہو کہ مولینا سعید انصاری کے ہاتھوں علیگ برادری اور مسلم یونیورسٹی دونوں کی مفید خدمت انجام دے گا،

مومن گزٹ (ہفتہ وار) مرتبہ مولوی ابو عزز کریا صاحب بھاگلپوری، تقطیع $\frac{22\times29}{4}$

ضخامت ۱۶ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ سے ششماہی، عہ/

پتہ:۔ مشن روڈ، کانپور،

مومن گزٹ آل انڈیا مومن کانفرنس کا آرگن ہے، اس کے مقاصد اس کے انتساب سے ظاہر ہیں، ان مقاصد کے ساتھ وہ اپنے ناظرین کے لئے ضروری سیاسی خبروں کا خلاصہ اور عام معلومات اور دلچسپی کے لئے مفید مذہبی اور تاریخی مضامین بھی پیش کرتا ہے،

(م)

مطبوعات جدیدہ

خاتم سلیمانی، مولفہ جناب مولینا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی، تقطیع اوسط، ضخامت ۵۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت دو روپیہ، علاوہ محصولڈاک پتہ خانقاہ سلیمانیہ، پھلواری شریف، پٹنہ،

دورِ گذشتہ کے علماء میں مولینا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بڑی جامع الحیثیات اور اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے منفرد شان رکھتی تھی، ان کی ساری زندگی ارشاد و ہدایت اور ملک و ملت کی خدمت میں گذری، اس لئے ان کی سوانح عمری کی بڑی ضرورت تھی، اس فرض کو ان کے لائق فرزند مولینا شاہ غلام حسنین صاحب ندوی نے پورا کیا، اور خاتم سلیمانی کے نام سے ان کی مبسوط سوانح عمری مرتب کی، جو چار حصوں پر منقسم ہے، پہلے حصہ میں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ذاتی حالات، عادات و خصائل اشغالِ زندگی، اور ملکی و مذہبی خدمات کا ذکر ہے، اگرچہ آپ کا اصل کام ارشاد و ہدایت تھا، لیکن آپ کے ہمہ گیر جذبۂ خدمت کی وجہ سے ہندوستان کی کوئی اسلامی تحریک ایسی نہ تھی جس میں آپ کا دستِ اعانت شامل نہ ہو، علی گڈھ کالج، ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم لیگ، ندوۃ العلماء، مسلم یونیورسٹی، طبی کانفرنس، خدامِ کعبہ، مؤتمر الاسلام، خدام الحرمین، بزم صوفیہ، انجمن حمایت اسلام لاہور، غرض اسوقت سے لیکر آپ کی وفات تک، کوئی اسلامی تحریک اور کوئی ادارہ ایسا نہ تھا، جو آپ کے فیض سے محروم رہا ہو، اور یہ فیض ہندوستان کے تمام حصوں میں یکساں جاری تھا، دوسرے حصہ میں مختلف انجمنوں اور جماعتوں کے ان تعزیتی جلسوں کی روداد اور اخباروں کے تعزیتی نوٹس ہیں جو آپ کی وفات پر لکھے گئے، تیسرے حصہ میں اشخاص کے تعزیتی خطوط

کی نقلیں ہیں، چوتھے حصہ میں آپ کے ملفوظات یعنی وہ مختلف تاریخی واقعات، مذہبی عقائد و خیالات صوفیانہ لطائف و نکات اور دوسرے مختلف النوع معلومات ہیں جو آپ کی زبان سے نکلے، اس کتاب سے شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جامع حیثیات اور مقبول شخصیت کا پورا اندازہ ہوتا ہے، کہ آپ کس طرح مختلف بلکہ متضاد جماعتوں میں یکساں مقبول تھے، امید ہے، کہ آپ کی مقبولیت کی طرح آپ کے سوانح حیات کو بھی قبول عام حاصل ہوگا،

سبل السلام مولفہ جناب مولینا محب النبی مصطفےٰ احسن صاحب علوی ایم اے تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۹۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت معمولی، پتہ :۔ خیالی گنج لکھنؤ،

کاکوری کے خانوادۂ تصوف کے ایک بزرگ نے حضرت علی مرتضیٰ کی ایک مبسوط سوانحعمری لکھی ہے جس کا پہلا حصہ احسن الانتخاب کئی سال ہوئے شائع ہوا تھا، اس کتاب میں حضرت علیؓ کے مناقب بیان کرنے اور ان کی محبت میں اتنے غلو سے کام لیا گیا ہے، کہ کتاب مذکور مناقب علیؓ کے بجائے مثالب صحابہ بنگئی ہو حتی کہ حضرات شیخین بھی تفضیلیت کی زد سے نہیں بچ سکے، اور امیر معاویہؓ پر تو کوئی تبرا باقی نہیں ہے، چونکہ یہ کتاب ایک مدعیِ تسنن کے قلم سے نکلی تھی، اس لئے مولینا مصطفیٰ حسن صاحب نے اسکے گمراہ کن عقائد و خیالات کی تردید میں فصل الخطاب لکھی، اس کے جواب میں رفع الحجاب لکھی گئی، اب مولانا مصطفےٰ احسن صاحب نے اس کے جواب میں سبل السلام لکھی ہے، اس سلسلہ کی کتابوں میں سبل السلام کے علاوہ اور کوئی کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری ہے، لیکن احسن الانتخاب کی شہرت حد تواتر تک پہونچ چکی ہے، پھر سبل السلام میں اس کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں، نیز اس کی تنقید اور اور جوابات سے معلوم ہوتا ہے، کہ احسن الانتخاب اور رفع الحجاب کا معیار اور تحقیقی پایہ نہایت پست ہے اصول نقد کو بالکل فراموش کر دیا گیا ہے، روایت و درایت کا مطلق کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا ہے، اپنے منشا و مقصد کے مطابق جو رطب و یابس مل گیا ہے، اسے بلاتامل قبول کر لیا گیا ہے بعض نہایت ادنیٰ درجہ کی کتابوں سے

کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، ان اصولی نقائص کے علاوہ جا بجا تدلیس و تلبیس، غلط منقولات اور الحاق و اضافوں سے بھی کام لیا گیا ہے، سبل السلام میں ان تمام نقائص کی پردہ دری کی گئی ہے، اور غلط یا کم از کم گمراہ کن بیانات کو صحیح روشنی میں پیش کیا گیا ہے، جن لوگوں نے اس سلسلہ کی کوئی کتاب دیکھی ہے، ان کے لئے سبل السلام دیکھنا ضروری ہے،

مختصر تاریخ ادب اردو، مولفہ سید اعجاز حسین صاحب اعجاز ایم اے لکچرار اردو الہ آباد یونیورسٹی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ سپید، کتابت و طباعت روشن قیمت عہ غالباً مصنف سے اوپر کے پتہ سے ملیگی،

ہندوستانی زبان کی تاریخ اور اس کے ادب کی تنقید پر اب بہت کتابیں ہو گئی ہیں، اور نئی تحقیقاتوں اور نئے اکتشافات سے بہت سے نئے معلومات کا اضافہ ہو گیا ہے جو پرانی کتابوں میں نہیں مل سکتے، لیکن اب تک جو کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ یا مطول ہیں یا کسی خاص پہلو سے متعلق ہیں، "مختصر تاریخ" میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اختصار اور جامعیت کے ساتھ ان سب کا خلاصہ کر لیا گیا ہے اور دورِ حاضر کے متعدد ممتاز شعرار اور ادیبوں کے حالات اور ان کے ادب کے نمونے بڑھائے گئے ہیں، جو دوسری کتابوں میں نہیں مل سکتے، انتخاب میں بڑی فیاضی اور فراخدلی، اور تنقید میں بڑی رواداری اور وسیع المشربی سے کام لیا گیا ہے، لوگوں کی دلآزاری کا خصوصیت کیساتھ زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے، یہ کتاب کالج کے طلبہ کے لئے خاص طور سے زیادہ مفید ہے، اس سے اجمالی طور سے ہندوستانی زبان کی پوری تاریخ ذہن میں آجاتی ہے،

تمدنِ عتیق، مولفہ جناب ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم اے، و محمد عطار الرحمن صاحب بی اے، اساتذہ شعبہ کلیہ سٹی کالج حیدر آباد دکن تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۳ صفحات کاغذ کتابت و طباعت نہایت عمدہ قیمت مصور سے ۲ غیر مصور عہ پتہ منیجر بک ڈپو سٹی کالج حیدر آباد دکن،

ہماری زبان میں عہدِ عتیق کی تاریخ پر بہت کم کتابیں ہیں، تمدنِ عتیق میں لائق مؤلفین نے آغاز آفرینش سے لیکر بخت نصرؔ تک کے مختصر حالات جمع کر دیئے ہیں، ابتدائی ابواب میں تخلیقِ عالم کی سرگذشت ہے، کہ کس طرح زمین بنی، اور پھر بتدریج اس پر کیسے زندگی، اور پھر انسانی زندگی کا ظہور ہوا، پھر قدیم وجدید، عہد حجری کے انسانوں کے حالات، ان میں تخیلات وعقائد کی ابتداء، اور تحریر کا آغاز ہے، پھر تمدن کے ابتدائی دوروں میں ہندوستان سامرستانؔ اور مصرؔ کے حالات، اور یہاں کے باشندوں کے مذہبی اور ادبی رجحانات، ان کے علوم وفنون طبقاتی نظام کاروباری زندگی، قوانین اور اقتدار شاہی کی تاریخ ہے، پھر مصرؔ قدیم کی تاریخ، اور قدیم آشوری کلدانی اور عبرانی حکومتوں کے عروج وزوال، سیاسی انقلابات اور جنگ وجدال کی سرگذشت ہے، گو یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت مختصر ہے تاہم اس کے پڑھنے سے سرسری اور اجمالی حالات ذہن میں آجاتے ہیں، زبان کہیں کہیں کھٹکتی ہے،

البرہان التحقیق الاظہر فی فضائل الصدّیق والعمر } مولفہ جناب غلام یٰسین خاں صاحب قائم خانی جمعدار رسالہ آصفجاہی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں، پتہ محلہ کمو کھرواڑی اندرون بلدہ حیدرآباد دکن،

مؤلف نے اس رسالہ میں اہلِ سنت کی حدیث کی کتابوں سے شیخین کی فضیلت میں اہل بیت کرام کی روایات اور شیعوں کی معتبر کتابوں اور ان کے ائمہ اور اکابر کے اقوال سے صحابۂ کرام اور حضرات شیخین کے فضائل جمع کئے ہیں، ہر روایت کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے، ترجمہ کی زبان پرانی ہے، البتہ والعمر کی عربی ترکیب نئی ہے،

(م)

عدد ۲	ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۷ء	جلد ۳۹

مضامین

شذرات

دکن کا جشنِ سیمین

یہ رسالہ جب آپ کے ہاتھون میں پہنچے گا تو اعلیٰ حضرت سلطان العلوم حضور پر نور فرمانروائے کشورِ دکن دام برہ خلد اللہ ملکہ کا جشنِ سیمیں ممالکِ محروسہ اور بیرون ممالک میں شروع ہو چکا ہوگا، اعلحضرت کے دورِ حکومت کو فرمانروایانِ آصفیہ کے درمیان وہی امتیاز ہو جو خلیفہ مامون الرشید کے عہد کو خلفائے عباسیہ کے درمیان، علوم و فنون کی اشاعت، تعلیم کی ترقی، عمارات کی تعمیر، دفاتر کی تنظیم، نظم و نسق کی درستی، رعایا کی خیر خواہی اور ان کی بھلائی کی مفید تجویزین عہدِ عثمانی کے خاص برکات ہین،

—·—

یہ بھی عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ عین اُس وقت جب حضور کے بست و پنج سالہ عہدِ حکومت کا جشن منایا جانے والا تھا دولت آصفیہ کا پرچم ایک نئے ملک پر جو تقریبًا اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا، پھر لہرانے لگا، یہ مصالحانہ فتح اعلیٰ حضرت کے ناخنِ تدبیر اور وزرائے آصفیہ کے حسنِ سعی سے حاصل ہوئی ہے، لیکن اس سلطنت کے سیاسی حدود سے وسیع تر اُس کے علمی و تعلیمی حدود ہیں، جو ہمالیہ کی چوٹیون سے لیکر بحرِ شور کے کنارون تک پھیلے ہیں،

—·—

اس جشنِ سیمیں کے ابرِ گہربار کے چند سیمین چھینٹے دار المصنفین کے دامن تک بھی پہنچے ہین، اعلیٰ حضرت نے پانچ برس کے لئے دار المصنفین کی دو سو ماہوار کی مزید امداد منظور فرمائی ہے، اور گذشتہ دو برس چند مہینوں کی رقم چھ ہزار چھ سو پچاس روپیے محکمۂ امورِ مذہبی کے ذریعہ سے دار المصنفین کو عطا کر دی گئی ہے، دار المصنفین ہر چند دکن سے دور ہے
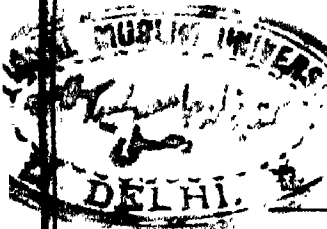
مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کی سیرابی دکن ہی کے چشمۂ حیات سے ہے،

الٰہی تا جہاں باشد نگہدار ایں جہانباں دا

نظام الملک آصفجاہ عثمان علی خاں را

گذشتہ ۱۶-۱۷-۱۰ جنوری ۱۹۳۶ء کو لکھنؤ کی نمائشگاہ میں ہندوستانی اکاڈیمی کی ادبی کانفرنس کے جلسے ہوئے، حسب دستور پہلا اجلاس اردو و ہندی کا مشترک تھا، جس میں صدارتی خطبے پڑھے گئے، اور باقی دنوں میں اردو اور ہندی کے الگ الگ جلسے ہوئے جن میں مضمون پڑھ کر سنائے گئے، اردو حصہ میں سید سجاد حیدر صاحب نے ہندوستان کیلئے رومن خط کی تجویز پیش کی، اور پروفیسر مہیش پرشاد نے مرزا غالب کے سہرے پر مجنون گورکھپوری نے کلام آسی پر، مولوی احمد مکرم صاحب اعظمی نے اردو اور ہندی بھائی چارہ پر، مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی نے مرزا جہانگیر کے مقبرہ پر، مرزا محمد عسکری صاحب نے فسانۂ آزاد پر، ڈاکٹر آغا مہدی حسن (آگرہ یونیورسٹی) نے ہندوستان میں تاریخ نویسی پر، اور مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے اکبر الٰہ آبادی کی معاشرتی شاعری پر محققانہ اور دلچسپ مضمون پڑھ کر سنائے، عثمانیہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی، دہلی یونیورسٹی، آگرہ یونیورسٹی، مسلم یونیورسٹی، ہندو یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اور پٹنہ یونیورسٹی کے نمائندے شریک تھے،

ہندی اور اردو کے آسان لکھے اور بولے جانے پر سر تیج بہادر سپرو، اور صدر اردو کانفرنس اور بہت سے مقررون نے زور دیا، لیکن ہر ایک تقریر کا توڑ اس پر تھا کہ جبتک ہندو مسلمانون کے دل نہیں ملین گے، زبان ایک نہیں ہو سکتی، لیکن سوال یہ ہے کہ دل کیونکر ملین؟ پالٹیکس میں انکی علحدگی تو کھلی ہوئی ہے لیکن انتہا یہ ہو کہ جس ادبی کانفرنس کے ذریعہ ہم ان کو ایک کرنا چاہتے ہیں اس میں بھی دونوں مل کر نہیں بیٹھے، اردو اور ہندی کے بہت سے ادیب یہاں جمع تھے، مگر دونوں دو خیموں میں تھے، ایک نے دوسرے کی صورت تک نہ دیکھی، اور ایک دوسرے کی سننا اور سمجھنا تو بعد کی چیز ہے، کیا یہ حد درجہ افسوسناک نہیں!

جب پچھلے پرچہ میں شعرالعجم جلد سوم کے فارسی ترجمہ کی جو خبر دی گئی تھی اس سلسلہ میں یہ مزید تفصیل معلوم ہوئی ہے کہ جلد اول دوم وسوم وپنجم کا فارسی ترجمہ کابل میں، اور جلد چہارم کا مع رسالہ کتبخانہ اسکندریہ کے ایران میں ہوا ہے، اس طرح کتاب کی پوری جلدوں کے ترجمے کابل و ایران نے مل کر پورے کر دیئے ہیں،

اردو کی یہ خوش قسمتی کیا کم ہے کہ اس زبان کی تصانیف کے فارسی اور ترکی میں ترجمے ہوں، اس سلسلہ کی نئی کڑی شمس العلماء آزاد مرحوم کی کتاب سخندانِ فارس کا فارسی ترجمہ ہے، یہ ترجمہ ملک الشعرائے افغانستان قاری عبداللہ خان کے قلم کا رہینِ منت ہے،

یہ کتنے افسوس کی بات تھی کہ تاریخ ابن خلدون جیسی اہم کتاب کا کوئی صحیح اور مکمل اڈیشن شائع نہیں ہوا تھا، جو مطبوعہ نسخہ ہاتھوں میں ہے وہ جابجا سے ناقص اور سقیم ہے، اس سلسلہ میں معارف میں بھی ایک تحریر چھپی تھی، اب یہ خبر مسرت کیساتھ معلوم ہوئی ہے کہ آجکل اس کے ایک نئے صحیح اور مکمل نسخہ کی تیاری عمل میں آرہی ہے، مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخہ سے جو اس نے سلطانِ مغرب کو ہدیہ دیا تھا، اور جو کتبخانہ قرویہ واقع فاس (مراکش) میں موجود تھا، اور قسطنطنیہ کے مصور نسخہ سے جو دارالکتب مصریہ میں تھا، اور احمد تیمور پاشا مرحوم اور احمد زکی پاشا مرحوم کے نسخوں سے مقابلہ کرکے نیا نسخہ تیار کیا گیا ہے، چنانچہ موجودہ مطبوعہ تیسری جلد کے صـ۲۲ سے ۶۰ صفحے ناقص پائے گئے جو اضافہ کئے گئے، اطمینان کی مزید بات یہ ہے کہ امیر شکیب ارسلان نے اس پر حواشی اور تعلیقات لکھے ہیں، اور نئے اسلوب سے متعدد فہرستیں اس میں شامل کی گئی ہیں،

یہ نسخہ چودہ جلدوں میں مکمل ہوگا، اور ایک ایک جلد کرکے شائع ہوگا، ہر جلد میں قریب قریب پانچسو صفحے ہونگے، اور ہر جلد کی قیمت چار روپیہ ہوگی، اور ہندوستان میں مکتبہ عربیہ اورینٹ ہوٹ بلڈنگ کرافٹ مارکٹ بمبئی سے ملے گی،

مقالات

خطبۂ صدارت

ہندوستانی اکاڈیمی اردو کانفرنس لکھنؤ

منعقدہ ۱۶، ۱۷ جنوری ۱۹۳۷ء

لکھنؤ سے نسبت: شرفائے علم و ادب! کرمفرمائی کا ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی اس علمی و ادبی مجلس میں ایک حقیر کو پائین سے اٹھا کر صدر میں بٹھایا، آپ کی اس ذرہ نوازی کی قدر اور بڑھ جاتی ہو جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مجھے اس اعزاز کی دولت اس سرزمین میں بخشی گئی ہے، جو ہمیشہ سے علم و ادب کا گہوارہ اور بڑے بڑے ادیبوں اور عالموں کا مرکز ہے، خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں، لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش و تمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم و تربیت ہوئی، اور اسی کی آب و ہوا میں میرا علمی و ادبی نشو و نما ہوا، اسلئے اس سرزمین کا ہر گوشہ، میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے،

مفارقت کے داغ: خوشی اور غم توام ہیں، اس خوشی کے موقع پر ان چند دوستوں کی یاد آتی ہے، جو اس سال ہم کو اپنی دائمی مفارقت کا داغ دے گئے، اور جو خود اس بزم ادب کے رکن رکین اور باعث تزئین تھے، منشی پریم چند کا ماتم اسوقت تک رہے گا، جب تک ہماری زبان میں ان کی کہانیوں کا ایک ورق بھی باقی ہے، وہ ہمارے ملک کے دیہاتیوں کے دل اور زبان تھے، دیہات کے

دکھ درد کو انکا دل جو محسوس کرتا تھا، وہ ان کے قلم کی زبان سے ادا ہوتا تھا، سادہ فقرے، بے تکلف بیان، لیکن درد اور تاثیر میں ڈوبی ہوئی کہانی، اونکا قلم ہمارے پرانے کیر کٹر اور قومی آن بان کا سچا قدر دان تھا،

اصغر مرحوم کی یاد دل سے کوئی کیونکر بھلائے، گو اُن کے جسم خاکی کا وطن گونڈا تھا، مگر اونکی شاعرانہ مقبولیت کا وطن اعظم گڈھ تھا، اسی ویرانہ سے ان کی شہرت کی بو نکل کر ملک کے چمن زاروں تک پہنچی یہیں انکا پہلا دیوان مرتب ہوا، وہیں ان کے شاعرانہ امتیازات کے جوہر کھولے گئے، اور وہیں سے انکا نشاطِ روح مطبوع ہو کر نشاطِ عالم کا باعث ہوا، وہ ہماری زبان کے اُن شعراء میں سے تھے جنھوں نے ہندوستانی زبان کی موجودہ شاعری کا رُخ پلٹا ہے، اور ایک نئے دورِ سخن کا آغاز کیا ہے،

ان جوانوں کے ساتھ بوڑھے نیّر کے فضل و کمال سے ہماری محرومی بھی اس سال کا افسوسناک حادثہ ہے، وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے تھے، اور خود بھی شاعر اور شاعر سے بڑھکر محقق فن تھے، ہماری زبان میں فرہنگِ آصفیہ کے بعد دوسرا مکمل لغت نور اللغات انہی کے آزمودہ کار ہاتھوں نے ترتیب دیا، سب سے آخر میں لکھنؤ کے مایۂ ناز ادیب شاعر و مصنف نواب حسام الملک سید محمد علی حسن خان طاہر کا ماتم کرنا ہے، جن کے قلم اور زبان نے کم از کم پچاس برس تک شعر و سخن اور علم و ادب کا ہنگامہ برپا رکھا،

لکھنؤ کے خدمات آج ہم جس تاریخی شہر میں جمع ہیں، وہ گو ہماری پوری ملک کی پوری راجدھانی کبھی نہیں بنا، لیکن یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ وہ ہمارے علوم و فنون اور شعر و ادب کا مدتوں پایۂ تخت رہا ہے، اور اب بھی ہے، شاہ پیر محمد صاحب جنکا ٹیلہ اور ٹیلہ پر والی مسجد مشہور ہے، وہ یہاں کے سب سے پہلے عالم ہیں، عالمگیر کے عہد میں سہالی سے فرنگی محل کو علم و فن کا وہ خاندان منتقل ہوا جو صدیوں تک ہمارے علوم و فنون کا محافظ اور شیراز ہند پورب کا دار العلم رہا، اور اس نئے زمانہ میں مسلمان

کی نئی عربی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی یہیں بنیاد پڑی، یہاں کا خاندان اجتہاد پورے ملک کے طول و عرض پر تنہا حکمراں ہے،

دلّی کے باغ میں جب خزاں آئی، تو یہاں بہار کا دور آیا، اس اُجڑے باغ کے کتنے مُرغ خوش لحن تھے جنھوں نے اڑ اڑکر اس چمن کی شاخوں پر بسیرا لیا، ہندوستان کی موجودہ بولی پیدا تو سندھ اور پنجاب میں ہوئی، نشو و نما دکن میں پایا، تعلیم و تربیت دلی میں حاصل کی، لیکن تہذیب اور سلیقہ یہیں لکھنؤ میں سیکھا،

اودھ کی راجدھانی جب فیض آباد سے لکھنؤ منتقل ہوئی، تو اوسکو اور چار چاند لگ گئے، میر تقی میرؔ انشاء اللہ خان انشاءؔ، جرأتؔ اور مصحفیؔ وغیرہ نے ادھر کا رُخ کیا، میر انیسؔ کا خاندان دلی سے پہلے ہی آچکا تھا، ان بزرگوں کے دم قدم سے بادشاہوں کے دربار امراء کی ڈیوڑھیاں اور اہلِ علم کی محفلیں شعر و سخن کے نغموں سے پُرشور بن گئیں، ناسخؔ و آتشؔ، وزیرؔ و صباؔ، اوران کے شاگردوں اور شاگردوں کے شاگردوں نے شعروادب کے جواہر ریزوں کے ڈھیر لگا دیئے،

شعر و سخن کے چرچوں اور شاعروں کے تفریحی جھگڑوں کو چھوڑ کر نفس زبان کی ترقی، محاورات کی نزاکت الفاظ کی تراش خراش اور اصول و قواعد کے وضع و تالیف کا جو اہم کام گذشتہ دو صدیوں میں یہاں انجام پایا، اوسی کا اثر ہے، کہ اس نے بولی سے بڑھکر زبان کا درجہ پایا، ملک سخن کے دو اخیر فرمانروا انیسؔ و دبیرؔ نے شاعری نہیں کی، بلکہ اپنے نام سے زبان و ادب کے سکے ڈھال ڈھال کر اہلِ ملک میں تقسیم کرتے رہے،

ناسخؔ نے زبان کی نزاکت و لطافت میں وہ کام کیا، جو ہر ایک ہوشیار جوہری جواہرات کے نوک و پلک نکال کر جلا دینے میں کرتا ہے، اون کے شاگرد والاجاہ میر اوسط علی رشکؔ نے صحیح و غلط ثقیل و سبک لفظوں کو اس طرح پرکھکر الگ کر دیا، کہ انکی پسند فصاحت کا معیار بن گئی، سیکڑوں الفاظ

جو گو بول چال میں رائج تھے، مگر شعر و انشاء کی بارگاہ میں ان کو بار حاصل نہ تھا، ان کو خود اپنے شعروں میں نظم کر کے پچھلوں کے لئے سند پیدا کی، لکھنؤ میں غالباً یہی پہلے شخص ہیں، جنھوں نے ۱۲۵۶ھ میں اردو لغت ترتیب دیا، جس کا نام نفس اللغۃ ہے، سید انشاء اللہ خاں کے دریائے لطافت کا دھارا بھی یہیں بہا،

شیخ امداد علی بحر المتوفی ۱۳۰۰ھ کی نسبت بھی مشہور ہے، کہ انھوں نے کوئی لغت لکھا تھا، مگر اس کا سُراغ نہیں ملتا،

حکیم ضامن علی جلال جن کے دیدار کا شرف مجھے بھی حاصل ہے، ان شعراء میں ہیں جنھوں نے زبان کو نہ صرف شاعری بلکہ وضع اصول اور تحقیقات کے لحاظ سے بھی مالامال کیا ہے، سرمایۂ زبان اردو، مفید الشعراء، تنقیح اللغات، گلشن فیض، قواعد المنتخب وغیرہ انکی وہ کتابیں ہیں جو اردو زبان کا سرمایہ ہیں، منشی امیر احمد امیر مینائی کے شاعرانہ خدمات سے قطع نظر، امیر اللغات کے مصنف کی حیثیت سے ہماری زبان پر ان کا بہت بڑا احسان ہے، افسوس ہے کہ اردو کے اس عظیم الشان لغت کے دو حصے الف ممدودہ اور الف مقصورہ تک چھپ سکے، ان کے جلیل القدر شاگرد نواب فصاحت جنگ جلیل سے مجھے معلوم ہوا ہے، کہ رامپور میں اس لغت کا پورا مسودہ موجود ہے، اگر یہ صحیح ہے تو ہماری زبان کی بڑی بدقسمتی ہوگی کہ ترقی کے اس روز بازار میں بھی مشتاقوں کی آنکھیں اس عروسِ فن کی دید سے محروم رہیں،

لکھنؤ نے شعر و سخن کے ذریعہ سے اس زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہماری علمی محفلوں کی بار بار کی دہرائی ہوئی کہانیاں ہیں، اور جو شہرت کی بنا پر زبان زد خاص و عام ہیں،

مجھے اس شاہراہ سے ہٹ کر لکھنؤ کی وہ خدمتیں گنانی ہیں، جنکو اس دور کے قدر داں بھول گئے ہیں، یا ہماری زبان کی تاریخ سے یہ اوراق گر کر کھو گئے ہیں،

عہد جدید کی آبادی لکھنؤ کے افق میں، ہمارے ملک میں سات سمندر پار سے آکر جب اہل یورپ نے

اپنے نئے علوم وفنون کی نمائش کی ہے، تو یہ لکھنؤ کا وہ وقت تھا جب وہ عیش ومسرت کی شراب سے بدمست تھا، اسوقت کس کو ہوش تھا کہ وہ دیسا ور کی نئی چیزوں کی قدر کرے، اور بزرگوں کی چھوڑی ہوئی کمائی اور اپنے گھر کی اندوختہ دولت میں جس پر ان کو بڑا غرور تھا، باہر سے خرید کر کچھ اور قیمتی سامانوں کا اضافہ کرے، تاہم اس میخانہ میں کچھ اہل ہوش بھی تھے، انھوں نے نئے اور پرانے کا جائزہ لیا، اور جو چیز ان کے ہاں نہ تھی، وہ فرنگستان کی دوکانوں سے خرید کر لائے،

یہ سب کو معلوم ہے، کہ خاص حالات نے سرکار اودھ اور سرکار کمپنی کو متحد کر دیا تھا، اس کا اثر یہ تھا کہ انگریزی سرکار کا رزیڈنٹ اور ان کا عملہ لکھنؤ میں اور سرکار اودھ کا وکیل کلکتہ میں، اور کبھی کبھی لندن میں رہتا تھا، اس میل جول سے دو عظیم الشان مشرقی اور مغربی تمدنوں کا سب سے پہلے یہیں پیوند لگا، اس زمانہ کے رزیڈنٹ اور انگریز حکام اردو اور فارسی میں پوری مہارت رکھتے تھے، نواب سعادت علی خان کے دربار میں بیلی صاحب رزیڈنٹ اور انشاء اللہ خاں کی ادبی نوک جھونک کی حکایتیں آب حیات کے ذریعہ مشہور عام ہیں،

سرکار اودھ کی طرف سے وکالت اور انشاء کے منصب پر جو لوگ سرفراز ہوتے تھے، وہ عموماً اہل علم کے طبقہ سے ہوتے تھے، انگریزوں کے میل جول سے وہ بھی انگریزی علوم وفنون سے آشنا ہو جاتے تھے، اور بعض بعض تو کسی نہ کسی جدید علم میں مہارت پیدا کر لیتے تھے، خان علامہ تفضل حسین خاں انہی لوگوں میں سے تھے، وہ گور ہنے والے سیالکوٹ کے تھے، اور ریاضیات ومتوسطات کی تعلیم دلی میں پائی، لیکن انتہائی تعلیم لکھنؤ میں ملا حسن فرنگی محلی سے حاصل کی، پہلے نواب سعادت علی خان کے اتالیق مقرر ہوئے، پھر نواب آصف الدولہ نے انکو اپنا وکیل بنا کر کلکتہ بھیجا، اس اثناء میں انھوں نے انگریزی اور لاطینی زبانیں سکیں، اور جدید ریاضیات وہیئت کو حاصل کیا، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں درس وتدریس اور تالیف وتصنیف کا مشغلہ جاری کیا، اور جدید علم ہیئت اور جبرو مقابلہ میں

کئی کتابیں تصنیف کیں، ۱۲۱۵ھ میں وفات پائی،

نواب محمد علی خاں کے زمانہ میں منشی الملک فخر الدولہ دبیر الملک ہشیار جنگ رتن سنگھ زخمی نے علوم و فنون کی نئی بساط بچھائی، گو انکے بزرگوں کا وطن بریلی تھا، مگر ان کے فضل و کمال کی بہار لکھنؤ میں ظاہر ہوئی، بادشاہ کے میر منشی تھے، قدیم علوم کیساتھ جدید ہیئت و ریاضیات میں بھی ماہر تھے، انگریزی سیکھی تھی، حدائق النجوم انکی مشہور تصنیف ہے، ۱۲۵۳ھ ۱۸۳۷ء میں تالیف پائی، نئے علم کے لئے نئی اصطلاحوں کا وضع کرنا انکا خاص کارنامہ ہے، لکھتے ہیں،

"باید دانست کہ چوں ایراد الفاظ یونانی و برطانیہ (انگریزی) بعینہ درکتاب فارسی دعربی کردہ غیر مانوس است، وکتب عرب یکسر بمذہب بطلیموس کہ قیاس فیہ اگرچہ بعضے مطابق بآنست لیکن بسیارے مخالف ازان و برخے مجدد کہ نشانے ازاں در تصانیف قدما پدید انیست ناچار بوضع بعضے از اصطلاحات جدیدہ یا تصرفے در تعریفات وجز آن چنانکہ عادت مترجمان قدیم ہنگام نقل علوم از یونانی بعربی بودہ است من ہم اقتضاے ایشاں کردہ میگویم، ص۹"

ان ہی لوگوں میں ایک اور قابل ذکر ہستی رائے منوں لال فلسفی کی ہے، وطن سندیلہ تھا، فلسفہ و حکمت کے علوم میں دسترس رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ کے دربار میں نوکر تھے، دوسری تصانیف کے ساتھ علم حساب و جغرافیہ و ہیئت اور حکمت انگریزی میں رسائل یادگار چھوڑے، ۱۲۲۸ھ میں وفات پائی،

سرکار اودھ کی طرف سے جو علما وقتاً فوقتاً لندن بھیجے گئے، ان میں سے دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی اور مولوی محمد حسین لندنی، ان دونوں نے یورپ کے جدید علوم و فنون سے اہل ملک کو آشنا کیا، مولوی محمد اسمٰعیل لندنی مرادآباد کے رہنے والے تھے، نواب نصیر الدین حیدر کی طرف سے سفیر لندن مقرر ہوئے تھے، منطق کی بعض پرانی کتابوں پر انکے حاشیے ہیں، ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی،

مولوی محمد حسین کا ایک عربی رسالہ ندوہ کے کتب خانہ میں ہے، جس میں یورپ کے نئے علوم و فنون، جارج سیل کے ترجمۂ قرآن اور یورپ کے بعض اختراعات کا تذکرہ ہے،

نواب نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں ان دو کے علاوہ دو اور صاحب قابل تذکرہ ہیں، مولوی عبد الرب اور مولوی کمال الدین حیدر، لکھنؤ میں جو یورپین علما رہتے تھے، ان سے برابر کی، ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں، اسی کا نتیجہ وہ رصد خانہ ہے، جو ۱۲۴۷ھ میں شاہ نصیر الدین حیدر کے زمانہ میں جنرل مکلاؤڈ کی کوٹھی میں بننا شروع ہوا، اور محمد علی شاہ کے زمانہ میں بنکر تیار ہوا، اس رصد خانہ میں کرنل ولکاکس وغیرہ انگریز علما کے علاوہ مولوی عبد الرب صاحب، مولوی کمال الدین حیدر صاحب اور مولوی اسماعیل صاحب مرادآبادی شریک تھے، اور اب یہ وہ مقام ہے جس میں امپیریل بنک کی عمارت قائم ہے،

اب تک ملک میں جدید علوم و فنون کی اشاعت کی تاریخ میں لکھنؤ کا نام نہیں لیا جاتا، حالانکہ شاہان اودھ کے زمانہ میں لکھنؤ میں بھی ایک دار الترجمہ قائم تھا، نئے علوم و فنون کی کتابیں یہاں ترجمہ ہوکر مطبع سلطانی سے شائع ہوتی تھیں، اس محکمہ کی طرف سے ۱۹ رسالے چھپ کر شائع ہوئے تھے، جن میں سے دس رسالوں کے نام ہمیں معلوم ہیں، اور جن کی تفصیل میں نے معارف ۱۹۱۷ء میں کی ہے، یہ ہیئت، کیمیا، مناظر، اور طبعیات اور اس کے اقسام قوت مقناطیسی، علم الماء، علم الہوا اور علم الحرارۃ وغیرہ سائنس کے مختلف علوم پر ہیں، لارڈ بروگھم (Brougham) کی کتاب A Treatise on the objects Advantages and pleasures of Science کا اردو ترجمہ مقاصد العلوم کے نام سے محمد علی شاہ کے زمانہ میں چھپا، اور بھوپال کے دفتر صیغۂ تاریخ میں میری نظر سے گذرا ہے،

لکھنؤ کی اس علمی و تعلیمی مجلس کا نام اسکول بک سوسائٹی تھا، اور اسکی ایک جنرل کمیٹی تھی، جو کتابوں کے ترجمہ و اشاعت کا کام کرتی تھی، اور رصد خانہ سلطانی کا انگریز مہتمم ان ترجموں کی دیکھ بھال کرتا تھا، ایک انگریز نے اردو میں فن زراعت پر کتاب لکھی تھی،

ضرورت ہے کہ لکھنؤ کی اس اسکول بک سوسائٹی کے مطبوعات کا پتہ چلایا جائے، اور آئندہ دلی سوسائٹی، اور فورٹ ولیم کالج کے ساتھ اس کا نام بھی لیا جائے، اسی عہد کی ایک کتاب اردو حساب میں لوگارثم ہے جس کا ایک نسخہ ہمارے ہاں ہے،

لکھنؤ کے ادبیات | لکھنؤ نے اسکے بعد زبان کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، افسوس ہے کہ انکی کوئی مفصل تاریخ موجود نہیں، بادشاہوں کے زمانہ میں داستان گوئی کا ایک مستقل فن تھا، اور بڑے بڑے نے باندازِ اور زبان آور بادشاہوں، اور امیروں کے شبستانوں میں بیٹھکر اپنی دلچسپ داستانوں سے بادشاہوں اور امیروں کے دل بہلایا کرتے تھے، حکیم ضامن علی جلال کے والد بزرگوار حکیم اصغر علی اس فن کے ماہر تھے، اخیر زمانہ میں اس فن پر کتابیں بھی لکھی جانے لگیں، اسوقت کہانیوں کے کردگار، دیو، پریاں، اور جادوگر اور طلسم ساز ہوتے تھے، داستانِ امیر حمزہ نوشیروان نامہ طلسم ہوش رُبا، ایرج نامہ وغیرہ مختلف ناموں سے ہزاروں صفحات میں خیالی ادب اور زورِ بیان کا ایک طلسم کھڑا کیا گیا، اس کتابی طلسم کا افتتاح ہمارے ملک کا کوئی دوسرا شہر پیش نہیں کر سکتا، ان کتابوں کے مصنف جنکو خدا جانے کس مصلحت سے مترجم کا درجہ دیا جاتا ہے، میر محمد حسین جاہ، منشی احمد حسین قمر، شیخ تصدق حسین اور طوطا رام شایان وغیرہ ہیں، یہ نظم و نثر کے ہزاروں صفحات حق یہ ہے، کہ ہماری پرانی زبان کا بہترین نمونہ ہے نثر میں سرور کا فسانۂ عجائب، اور نظم میں نواب مرزا شوق اور دیا شنکر نسیم وغیرہ کی مثنویاں وہ جواہر پارے ہیں، جن سے کبھی ادب اردو کی الماریاں سجائی جاتی تھیں،

امانت کا اندر سبھا مدتوں تک اہلِ شوق کا تماشہ گاہ رہا ہے، اور اب یہ بات پوری تحقیق سے ثابت ہو چکی ہے، کہ یہ صرف شاعرانہ فسانہ نہ تھا، بلکہ واقعی لکھنؤ میں اندر کا یہ اکھاڑا لگتا تھا، اور اسکا تماشہ پردوں کیساتھ کھیل کر دکھایا جاتا تھا، اور اس طرح اردو میں ان جدید تماشوں اور ناٹکوں کی تمدنی بدعت بھی یہیں پیدا ہوئی،

میں نے ہندوستانی ادب کی اس صنف کی یہ تمہیدی تاریخ اسلئے بیان کی ہے تاکہ معلوم ہو کہ قدیم وجدید سے ملکر ہماری زبان میں ناولوں کی پیدائش کے لئے لکھنؤ ہی کی زمین کیوں موزوں ہوئی اور شرر و سرشار، مرزا رسوا، سجاد حسین ، مرزا مچھو بیگ اور جوالا پرشاد برق کی تخلیق کا باعث ہوئی، شرر نے قومی تاریخ اور اصلاح معاشرت کے بعض موضوعات کو اور سرشار نے لکھنؤ کے آخری تمدن کے رسم و رواج اور طور وطریق کو، اور مرزا رسوا نے لکھنؤ کے ایک خاص حلقہ کے خصوصیات کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کا اخیر عہد انہی کے دم قدم سے پر رونق تھا، لکھنؤ کے اس ادبی دور میں سرشار کی سیر کہسار، اور فسانہ آزاد، شرر کی فردوس بریں، اور مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا اور سجاد حسین کی حاجی بغلول ادب اردو کی بہترین کتابیں ہیں،

مطابع۔ آجکل ادبیات کے سلسلہ تاریخ کی ایک کڑی مطابع بھی ہیں، لکھنؤ میں مطبع سلطانی کے علاوہ مطبع محمدیہ (۱۲۵۵ھ بعہد محمد علی شاہ) محمد یعقوب، مطبع علوی علی بخش خان (۱۲۶۳ھ) مطبع مصطفائی محمد مصطفیٰ خان (۱۲۷۱ھ) کانپور (۱۲۶۳ھ) مطبع محمدی حاجی محمد حسین لکھنوی (۱۲۶۲ھ) مطبع جعفری حکیم مرزا جعفر خاں (۱۲۶۵ھ) مطبع امینی محمد عباس، مطبع صدیقی عنایت اللہ وغیرہ بہت سے مطبع تھے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب مطابع، مطبع سلطانی، سلطان المطابع کے قانوناً زیر نگرانی تھے، اور اسکے مہتمم کپتان مقبول الدولہ احسان الملک مرزا محمد مہدی علی خاں بہادر قبول ثابت جنگ کا نام باقاعدہ لکھا جاتا تھا، یہ نام اس عہد کی مطبوعہ کتابوں پر اکثر لکھا ہوا ملتا ہے،

مطبع مصطفائی اپنی صحت اور صفائی میں معیار کے بلند درجہ پر تھا، علماء اور طلبہ اسکی چھپی ہوئی کتابوں کے قدرداں تھے، اور اب بھی اسکی چھپی ہوئی کتابیں اہل شوق میں اشرفیوں کے مول خریدی جاتی ہیں، سب آخر لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے، جس کی زندگی اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے، اس سے میری مراد نولکشور کا مشہور نولکشور پریس ہے، یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا تھا

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ مشرقی علوم و فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں انکا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق کا کوئی مطبع نہیں کر سکتا، ہماری زبان کی تمام ادبی اور علمی کتابیں اس مطبع سے چھپ کر نکلیں، شعرا کے دواوین، مثنویاں، قصائد، مرثیے، قصے، افسانے، داستانیں اور درس کی عام کتابیں سب اسی کی کوششوں کی ممنون ہیں، تاہم غلط نویسی اور غفلت جو کثرت کا نتیجہ ہے اسکی شہرت کے چہرہ کا بدنما داغ ہے،

شعرائے قدیم میر، سودا، ناسخ، آتش، جرأت، مصحفی، انشا، رند، وزیر، صبا، انیس، دبیر، میر، مومن، اسیر، امیر وغیرہ کے دیوان اور کلاموں کے مجموعے، اسی مطبع سے نکل کر دنیا کا اجالا ہوئے، اور ملک کے گوشہ گوشہ میں زبان کی اشاعت کا سبب بنے،

مطبع تیغ بہادر بھی صدی کے وسط میں ادب کی اشاعت کا اچھا ذریعہ رہا،

اخبارات، | زبان کی اشاعت کا تیسرا ذریعہ اخبارات ہیں، ہمارا یہ شہر اس سلسلہ میں بھی پیچھے نہیں رہا، نہیں معلوم کہ یہاں کا پہلا اردو اخبار کون ہے، تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس صوبہ میں اردو کا پہلا روزانہ اخبار اخبار اودھ یہیں سے نکلا اور جو آجتک نکل رہا ہے، اسکے آغاز کی تاریخ ۱۸۵۸ء ہے اور یہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اس اخبار نے اس ملک کے مشہور ادیبوں کے پیدا کرنے اور ان کو پروان چڑھانے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے، سرشار اور شرر دونوں اسی اخبار کے ذریعہ شہرت کے اسٹیج پر آئے،

اردو کا سب سے پہلا کامیاب مذاقیہ اخبار اودھ پنچ بھی اسی شہر کے افق پر نمودار ہوا، سید سجاد حسین جنکی ملاقات کی عزت مجھے حاصل ہے، اسکے اڈیٹر تھے، یہ وہ اخبار ہے جسکے صفحات میں منشی احمد علی کسمنڈوی منشی احمد علی شوق، میر اکبر حسین نواب سید محمد آزاد وغیرہ ہماری زبان کے وہ پرانے ادیب جو نئے طور طریق سے آگاہ تھے روشناس ہوئے،

سنجیدہ اخباروں میں مشیر قیصر (مرتبہ مولوی غلام محمد خان تپش ۱۸۸۳ء[?]) اور آئینہ اور آزاد ہفتہ وار اخبار بھی گذشتہ صدی کے ادیبوں کی پیداوار میں معین ہوئے، آزاد آخر میں اودھ پنچ کا ضمیمہ ہو گیا تھا، یہ میری

طالب علمی کا زمانہ تھا، سجاد حسین مرحوم بیکار ہو چکے تھے، اسوقت اس آزاد کی چند ماہ تک اڈیٹری کا فرض چند دستوں کیسا تھ مل کر میں نے بھی ادا کیا تھا،

اردو کا سب سے پہلا آزاد سیاسی اخبار ہندوستانی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا، گنگا پرشاد ورما اسکے اڈیٹر تھے، یہ اپنے زمانہ میں کانگریس کے خیالات کا بہترین وکیل تھا، مولینا شبلی مرحوم جو خود بھی کانگریسی خیال کے تھے اسکو بہت شوق سے پڑھا کرتے تھے، اور کہا کرتے تھے کہ اخبار یہ ہے، !

آج تو مسلمانوں میں بہت سے آزاد سیاسی اخبار ہیں لیکن زمیندار کے بعد ۱۹۱۰ء میں اس ملک میں سب سے پہلا آزاد مسلمان سیاسی اخبار مسلم گزٹ بھی یہیں پیدا ہوا، جسکے اڈیٹر مرحوم وحید الدین سلیم اور اسکے مشیر خاص اور مضمون نگار مولانا شبلی تھے،

رسالے، رسائل کے لحاظ سے بھی یہ شہر پیچھے نہیں رہا، میرے موجودہ معلومات کے لحاظ سے یہاں کا سب سے پہلا ادبی رسالہ محشر ہے، جو مولوی عبد الحلیم شرر کا پہلا ادبی کارنامہ تھا، یہ ۱۸۸۲ء میں نکل کر دو سال کے بعد بند ہو گیا تھا، ۱۸۸۶ء میں شرر نے اپنا مشہور ادبی رسالہ دلگداز نکالا جو اپنے زمانہ میں جدید طرزِ تحریر کا بہترین معیار تھا، یہی وہ رسالہ ہے جس نے ملک میں اردو کے بے شمار ادیب اور نثار پیدا کئے، نثر نویسی کا سلیقہ سب سے پہلے شرر ہی کی تحریروں نے ہمارے نوجوانوں میں پیدا کیا،

لکھنؤ کا ایک اور ادبی رسالہ ذکر کے قابل ہے، منشی نثار حسین کا پیام یار، یہ گلدستہ ایک زمانہ میں شوق کے ہاتھوں سے لیا اور عزت کی آنکھوں سے پڑھا جاتا تھا، اس میں اس عہد کے بڑے بڑے شعراء امیر، داغ، جلیل، تسلیم وغیرہ اور انکے باکمال شاگردوں کی غزلیں چھپتی تھیں، یہ انیسویں کے اواسط میں حسن و عشق کا تنہا پیامبر تھا، جسکی باتوں کو سنکر خدا جانے کتنوں کو عروس سخن کا شیدائی بننا پڑا، اور صحیح زبان کے سیکھنے اور لکھنے کا شوق پیدا ہوا،

اس عہد کا ایک اور ادبی رسالہ مرقع عالم ہے، جو حکیم محمد علی خان کی اڈیٹری میں ہردوئی سے نکلتا تھا، اس کو دلگداز کا حریف سمجھنا چاہئے، حکیم صاحب ناول نویسی میں بھی اپنے وقت میں شہرت رکھتے تھے، اور اون کے قلم میں وقت کا سماں اور سینری دکھانے کا خاص ملکہ تھا،

(باقی)

شاہجہان کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب رفیق دار المصنفین

(۲)

فضلاء: مندرجہ ذیل فضلاء دربار شاہی سے منسلک تھے،

علامی سعد اللہ خان: شاہجہانی عہد میں علامی سعد اللہ خان کو اپنی علمی فضیلت اور سیاسی تدبر میں وہی درجہ حاصل تھا، جو علامی ابو الفضل کو دربار اکبری میں تھا، سعد اللہ خان کے تبحر علمی کے تمام معاصر مورخین معترف ہیں، عبد الحمید لاہوری سعد اللہ کا تعارف اس طرح کراتا ہے:-

"چوں گرامی توجہ کشور خدیو گیتی خدا با عتنا و فضلائے نامدار و ارتباط فصحائے بلاغت دثار مصروف است و بمسامع مقدس کہ ہموارہ شاہراہ بشارت بادرسید، کہ ملا سعد اللہ کہ موطن و منشاء او دار السلطنۃ لاہور است بحلیہ فضائل و کمالات عقلی و نقلی و حفظ قرآن مجید و حسن تقریر و لطف تحریر متحلی است، و در ذہن وقاد و فکر نقاد و کثرت معلومات و بسطت مدمات مشارکُ و مساہم ندارد، بموسوی خان صدر حکم شد کہ آن حاوی فضائل را بسعادت بساط بوس مستسعد گرداند، خان مذکور، روز یک شنبہ ہفدہم ایں ماہ (رمضان) او را بایں دولت عظمیٰ فائز گردانید، پادشاہ دوربیں ثواب گزیں از خطوط پیشانی او استعداد کارگزاری کما ینبغی در یافتہ، در سلک زمرۂ بندگان منسلک گردانیدند"[1]

[1] بادشاہنامہ جلد دوم صفحہ ۲۲

یہی بات عمل صالح جلد دوم میں اس طرح مذکور ہے :۔

"..... در رمضان سنہ یکہزار و پنجاہ بصدارت و سفارش زبدہ سلسلہ حضرت خیر البشر موسوی خان صدر کل بدریافت، شرف حضور ماذون گشتہ، در مجلس اوّل از پرتو کمال قدرشناسی و مزہ دانی حضرت خلافت مرتبت استعدادش صورت نمو پذیرفت، و ببرکت تمیز اشرف و فطرت دقیقہ رس آنحضرت مقدار کمال آن بلند اقبال پدیدار گشتہ۔ دقت طبع وجودت فہم و کثرت فراست و حدس صائب و استنباط دقائق، و دریافت حقایق و تفصیل تحصیل ابواب دانش آن جامع فضائل وہبی و کسبی خاطر نشان اہل علم گشت، چون ہمگی ہمت بادشاہ ہنر پرور دانش نواز در ترویج شرع مبین و امداد و تقویت اکابر دین و اشراف و تعظیم علما و صلحا، و تربیت طلبہ علم و حسن اہتمام در پیش آوردن طائفہ مذکور معروف است ببرکت ہمزبانی خاص آنحضرت کہ ہم صحبت آب زندگانی است حیات جاودانی یافتہ، بروز زمانہ مناسب و خلعت و اسپ سرفراز گردیدہ در زمرۂ بندگان منسلک گشت، ...... رفتہ رفتہ کار آن جامع الکمالات از عنایت خاص آنحضرت بجاے کشید، کہ در سال دوم بمنصب جلیل القدر سہ ہزاری دو ہزار سوار و خدمت خانسامانی سربلند گشتہ، در انجمن ہمدم و دمساز و در خلوت محرم و ہمراز گشت، و در سال چہارم از فیض تربیت سحاب آن ابر گوہر بار سپہر قدرشناسی نہال اقبالش طولی مثال بالیدہ زینت افزائے بوستان، وزارت کل ہندوستان گشت، و در سال ہفتم بعنایت منصب ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار ازانجملہ پنجہزار دو اسپہ سہ اسپہ دو دہ کرور دام انعام و خطاب علامی و فہامی و دقائق مراتب کمالات از ارتفاع درجات آسمانی در گذرانید"[1]

افضل خان شکر اللہ نام، افضل خان خطاب تھا، شیراز کا رہنے والا تھا، ابراہیم ہمدانی اور میر تقی الدین

[1] عمل صالح جلد دوم ص ۳۳۶۔

محمد سے تعلیم حاصل کرکے جہانگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور شاہی ملازمت میں داخل ہوا، جب جہانگیر نے شہزادہ خرم کو اودے پور کی مہم پر بھیجا، تو شکر اللہ ساتھ گیا، یہاں اس نے قابل قدر خدمت انجام دی، جہانگیر نے افضل خاں کا خطاب دیا، شاہجہان جب سریر آرا ہوا، تو وہ اپنی لیاقت و قابلیت کے سبب وزارت کے عہدۂ جلیلہ پر مامور ہوا، ہفت ہزاری و چار ہزار سوار کے منصب پر فائز تھا،[۱]

ملا محمد فاضل بدخشان کے رہنے والے تھے، کابل، توران، اور شیراز سے علم معقول و منقول حاصل کرکے ہندوستان آئے، تفسیر اور اصول کی تعلیم ملا جمال لاہوری سے حاصل کی، اپنی لیاقت کے سبب صدارت اردوئے کیہان پر فائز تھے،

ملا یوسف لاہوری تفسیر اور منقولات کے ماہر تھے،

عبدالسلام دیوی، معقول منقول، فقہ اور اصول فقہ میں مہارت تامہ رکھتے تھے، شاہی فوج کیساتھ منسلک تھے،

قاضی محمد زاہد کابلی، کابل میں شاہی قضائت پر مامور تھے، یہ وہی ہیں جنکی تالیف میر زاہد رسالہ معقولات میں درس نظامی کی اونچی کتاب سمجھی جاتی ہے،

قاضی محمد اسلم ہرات میں پیدا ہوئے، بخارا میں علوم دینیہ حاصل کیا، جہانگیر کے عہد میں ہندوستان آئے، ان کی دینداری و پرہیزگاری سے متاثر ہو کر جہانگیر نے شاہی لشکر کا قاضی بنایا، شاہجہان نے ان کو امام خاص بنایا،

قاضی محمد سعید کرہرودی، کچھ دنوں تک دار الضرب کے داروغہ رہے، پھر عرض مکرر کی خدمت انجام دی، آخر میں بیوتات نوازش کے دیوان تھے، ہزاری منصب پر فائز تھے،

ملا میرک شیخ ہروی، ہرات سے ہندوستان آئے، پھر مکہ معظمہ گئے، وہاں حدیث کی تعلیم حاصل

---

[۱] بادشاہ نامہ جلد اول ص ۳۳۹،

کی ہندوستان آئے، تو شاہجہاں نے داراشکوہ اور مراد بخش کی تعلیم کے لئے مقرر کیا،

ملا عبد اللطیف سلطانپوری، تقریر و تحریر اور علمی تحقیق و تدقیق میں یگانۂ روزگار تھے، داراشکوہ کی تعلیم کے لئے مقرر تھے، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، تو شاہجہاں نے چند مکانات ان کو بطور انعام دیئے اور اجازت دی کہ وطن جاکر علوم دینیہ کا درس دیں،

میر محمد ہاشم معقولات، منقولات، طب اور ریاضی کے عالم تھے، شاہجہاں نے انکی لیاقت کو دیکھکر تمام ملک کی صدارت و طبابت کی خدمت پر مامور کیا، پھر اورنگزیب کی تعلیم انہی کے سپرد کی گئی، تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھکر شاہجہاں کے نام سے معنون کیا،

شیخ محمد مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے، وہاں سے تعلیم حاصل کرکے ہندوستان آئے، پرہیزگاری، نیک کرداری اور دوسرے فضائل سے متصف تھے، شاہجہاں نے انھیں دارالسلطنت کا میر عدل مقرر کیا[1]

ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، مآثر الکرام میں انکا ذکر ان الفاظ میں ہے:-

"علامۂ زمان افتخار زمانیان است، الحق در جمیع فنون درسی مثل او از زمین ہند برنخاست آثار دانش باین کیفیت و کمیت و حسن قبول بر صفحۂ روزگار نداشت، مولد و منشا او سیالکوٹ از توابع لاہور است ...... چون نوبت دارائے ہندوستان بہ صاحب قرآن شاہجہاں انار اللہ برہانہ، رسید، و طائفۂ علما و شعرا را رواجے دیگر پدید آمد، ملا دریں عہد بارہا خود را بہ درگاہ خلافت رسانید، بارگاہ و ار حضوری گردید، بہ رعایت نقود تا معد و مخصوص می گشت و دوبار بہ زر سنجیدہ شد، و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ بہ رسم سیورغال انعام شد ملا بحضور خاطر و فراغ بال در وطن مالوف اقامت داشت، و تخم علم و فضل در سرزمین

---

[1] مذکورۂ بالا علماء کے حالات کے لئے دیکھو بادشاہنامہ جلد اول از عبد الحمید لاہوری ص ۳۴۶-۳۴۹، [2] مزید تائید کیلئے دیکھو بادشاہ نامہ جلد اول ص۳۴۷،

سینہا و سفینہا می کاشت۔ تصانیف او در بلاد عرب و عجم سائر و دائر داشت۔[1]"

شیخ عبدالحق دہلوی، ان کا ذکر خیر عبد الحمید لاہوری ان الفاظ میں کرتا ہے:

"مجمع فضائل صوری و معنویست ...... او در فنون دانش یکصد و کسری از تصانیف مختصرہ و مطولہ دارد، با آن کہ عقود ز ندگیش بتسعین پیوستہ است از سلامت قوی با نواع طاعات و ریاضات و تعلیم و تالیف و تصحیح بسان ایام شباب می پردازد و از اعقاب او ہفت تن تحصیل علوم رسمیہ نمودہ بافادہ مشغول اند......"[2]

مگر یہ نہ معلوم ہو سکا کہ شیخ صاحب کا لگاؤ شاہجہانی دربار سے کیا تھا،

ملا فرید دہلوی، یمین الدولہ آصف خان کے حسن اہتمام سے ملا فرید دہلوی نے اور منجموں کی مدد سے ایک زیچ تیار کی جس کا نام زیچ شاہجہانی رکھا، شاہجہان کے سامنے جب یہ زیچ پیش کی گئی، تو اس نے عام استصواب کی خاطر ہندوستانی زبان میں ترجمہ کے لئے حکم دیا۔[3]

میر محمد صالح مشکیں قلم، میر عبد اللہ زریں رقم کا لڑکا تھا، ایک کتاب مناقب مرتضوی لکھ کر شاہجہان کو گذرانی، شاہجہان نے چند اوراق دیکھے، تو بہت پسند کی، پانچ ہزار روپیہ اور ایک ہاتھی انعام میں دیا۔[4]

ہندو اہل علم **چندربھان** برہمن، یہ عہد شاہجہانی کا سب سے بڑا ہندو ادیب تھا، پنجابی برہمن تھا، لاہور میں پیدا ہوا، ملا عبد الکریم سے تعلیم حاصل کی، آگے چل کر فارسی زبان کا باکمال شاعر ہوا، برہمن تخلص کرتا تھا، اس کا فارسی دیوان ابتک کتب خانوں میں موجود ہے، فارسی ادب میں بڑی دستگاہ حاصل کی تھی، اس لئے دربار شاہی کے سلک ملازمین میں داخل ہو کر وقائع نویس یعنی شاہی تاریخ در روزنامچہ

---

[1] تصانیف کی فہرست کے لئے دیکھو مآثر الکرام دفتر اول، ص ۲۰۳۔ [2] بادشاہنامہ جلد اول ص ۳۴۴۔ [3] عمل صالح جلد اول ص ۳۶۱۔ [4] خافی خان جلد اول ص ۶۰۵۔

کا چیف اڈیٹر مقرر ہوا، اس عہدۂ جلیلہ کے باعث وہ روزانہ دربار شاہی میں حاضر ہوکر ہر روز کے مرتبہ واقعات وحالات سناتا تھا۔ ۱۰۵۸ھ میں اوس نے چہار چمن برہمن لکھ کر نوروز کے موقع پر سرہند میں دربار شاہجہانی سے گذرانی، آخر میں دارا شکوہ کا میر منشی ہوا،[۵۱]

شاہجہاں، اکبر و جہانگیر کی طرح ہند و اہل کمال کی برابر سرپرستی کرتا رہا، ۱۰۶۱ھ میں ایک ہندی شاعر نے اس کے نام پر ایک کبت کہی، تو اسکو دو ہزار روپے اور ایک ہاتھی مرحمت کیا،[۵۲] ہندی شاعری میں سندر اس کے دربار کا ملک الشعراء تھا، اسکی تصنیف "سندر سرنگار" اور "سنگھاسن بتیسی" برج بھاشا میں مشہور ہے، ہندی کے مشہور شعراء چنتا منی اور راجہ شمبھو ناتھ سنگھ بھی اسکے دربار سے منسلک رہے، چنتا منی ہندی ترکیب نظم کا استاد تھا، راجہ شمبھو ناتھ نے شاہجہاں کی فرمائش سے کوندر اکلپ تا لکھی، اس کتاب میں شاہجہاں، دارا شکوہ اور جہاں آرا بیگم کی مدحیہ نظمیں ہیں،[۵۳]

ان ارباب علم کے علاوہ شاہجہاں کے عہد میں مندرجۂ ذیل علماء و شعراء بھی تھے، جن کا ذکر قزوینی کی شاہجہان نامہ میں ہے،

(۱) سید بخاری گجراتی، (۲) سید جمال الدین، (۳) شیخ میر لاہوری، (۴) خواجہ خوند محمود، (۵) شیخ بہلول قادری، (۶) مرزا ضیاء الدین، (۷) مولنا محب علی، (۸) شیخ نذیری (۹) ملا شکر اللہ شیرازی (۱۰) میر ابو القاسم ایرانی،[۵۴]

---

[۵۱] دیکھو معارف جلد ۴ نمبر ۴ مضمون ہندوں کی علمی و تعلیمی ترقی، از علامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ، نیز مخزن الغرائب از سندیلوی، [۵۲] خافی خاں جلد اول ص ۷۰۶، [۵۳] کی ہسٹری آف ہندی لٹریچر، [۵۴] یہ نام نریندر ناتھ کی کتاب "پروموشن آف محمڈن لرننگ" سے لئے گئے ہیں، قزوینی کی شاہجہان نامہ میری نظر سے نہیں گذری، اس لئے ان علماء و شعراء کے حالات اور ان کے شاہی دربار سے لگاؤ پر روشنی ڈالنے سے قاصر ہوں،

مورخین، شاہانِ مغلیہ کو تاریخ سے خاص ذوق رہا ہے، اسلئے ہر حکمراں کے عہدِ حکومت میں تاریخ نویسی کا خاص محکمہ رہا، شاہجہاں نے اس ذوق کی تکمیل کے لئے متعدد اہلِ قلم کی خدمات حاصل کیں، چنانچہ اس کی فرمایش سے جو تاریخیں مرتب ہوئیں وہ مندرجۂ ذیل ہیں،

۱- بادشاہ نامہ از محمد امین قزوینی،

۲- بادشاہ نامہ از عبد الحمید لاہوری،

۳- بادشاہ نامہ از محمد وارث،

۴- شاہجہاں نامہ از مرزا جلال الدین طباطبائی،

محمد امین قزوینی، محمد امین ابن ابوالحسین قزوینی ایران سے آکر پانچویں سن جلوس میں شاہجہانی دربار میں منشی کے عہدہ پر مامور ہوا، شاہجہاں اپنے دربار کے موجودہ تاریخ نویسوں کی کارکردگی سے خوش نہیں تھا، وہ ایک لائق اہلِ قلم کی تلاش میں تھا، اتفاق سے قزوینی نے بندیلہ کی جنگ کے حالات لکھکر پیش کئے، شاہجہان اسکی لیاقت سے خوش ہوا، ۱۰۴۵ھ یعنی آٹھویں سن جلوس میں قزوینی سے فرمایش کی کہ وہ اسکی پیدایش سے موجودہ عہد تک کی ایک مفصل تاریخ لکھے، قزوینی نے ابتدائی دس سال کے احوال قلمبند کئے، دوسرے دس سال کی تاریخ لکھنا چاہتا تھا لیکن بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر نہ لکھ سکا[۱]، عملِ صالح میں ہے

"مرزا امینا در اصطلاحاتِ زبان فارسی مہارت تمام دارد و قاعدہ فن انشا را بقانون می شناسد، شاہد نحش از لباسِ تکلف مبرا است و صاحب طبع و ذہن مستقیم ذکر رسا سابق قدمت نگارش بادشاہ نامہ بدو متعلق بود، و بعد ازان بخدمت جمع وقائع می پرداخت، مردے خوش ظاہر و خوش محاورہ بود"

عبد الحمید لاہوری، عبد الحمید کا مولد اور مسکن لاہور تھا، علامی ابو الفضل کا شاگرد تھا، اس لئے

---

[۱] ایلیٹ جلد ۷ ص ۱، برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۲۵۹۔

اسی کے طرز انشاء میں لکھنے کی مہارت رکھتا تھا، لیکن زمانہ کی ناسا عدت سے ٹھٹھہ[1] میں آکر عزلت نشین ہو گیا تھا، اسکے ادب وانشاء کی خبر شاہجہاں کو ملی، تو اس نے اسکو دربار میں طلب کیا، شاہجہاں چاہتا تھا کہ ابو الفضل کی اکبر نامہ کے طرز پر اسکی حکومت کی بھی تاریخ لکھی جائے، چنانچہ عبد الحمید کو اسی خواہش کو ملحوظ رکھتے ہوئے تاریخ نویسی کے لئے مامور کیا، عبد الحمید خود لکھتا ہے:۔

"بتوسیدہ بعضی از ملازمان بساط تقرب بعرض اشرف اقدس رسید، کہ عبد الحمید لاہوری المولد والمنشاء کہ دل رمیدہ را از اختلاط این وآن وخاطر شوریدہ را از ارتباط فلان وبہمان دامن داختہ در معمورہ پٹنہ بزاویہ تنہائی، وبیغولہ بے نوائی درساختہ است روش سخن پردازی وطرز انشاء طرازی شیخ ابو الفضل نیک فراگرفتہ، اگر نگارش معالی ومکارم ایں دولت والا وگذارش محامد وماثر ایں سلطنت دست بالا، بدو بازگذاشتہ آید ہر آئینہ ایں تالیف منیف وایں تصنیف شریف بنہجے کہ در خاطر دوربیں صواب گزیں مرکوز است نگاشتہ بود[2]"

یہ تاریخ شاہجہاں کی بیس سال کی حکومت پر مشتمل ہے، عمل صالح کا مصنف لکھتا ہے کہ شاہجہاں اسکی خدمت سے اسقدر خوش تھا کہ اس نے دو مرتبہ اسکو روپے میں تلوا کر انعام عطا کیا[3]

محمد وارث، آخر میں کبر سنی اور ضعف کے سبب عبد الحمید اس فرض کو انجام نہیں دے سکتا تھا، اس کے شاگرد محمد وارث کے ذمہ یہ خدمت سپرد کی گئی، جس نے بقیہ دس سال کی تاریخ کو مکمل کیا، وارث لکھتا تھا اور علامی فہامی سعد اللہ خان دیکھتے تھے، پھر علاء الملک طونی المخاطب فاضل خان

---

[1] الیٹ ٹھٹھہ کے بجائے پٹنہ لکھتا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی کے مطبوعہ نسخہ میں بھی پٹنہ لکھا ہے، لیکن اورنٹیل لائبریری پٹنہ کے فاضل کیٹلاگر نے صاف طور سے بتایا ہے کہ پٹنہ نہیں ہے بلکہ ٹھٹھہ ہے، پٹنہ کتابت اور پڑھنے کی غلطی ہے، ملاحظہ ہو، کیٹلاگ جلد ۷ ص۶۔ [2] بادشاہنامہ جلد اول ص۱۔ [3] عمل صالح۔

جو شاہجہانی عہد میں خانساماں کے عہدہ پر ممتاز تھا اور اورنگ زیب کے زمانہ میں [illegible]
نظر ثانی کیا کرتا تھا، آخر کا کچھ حصہ اس نے خود لکھا،[۵۱]

مرزا جلالہ طباطبائی، اصفہان سے ہندوستان ۱۰۴۲ھ میں آیا، شاہجہان کے درباری مورخین میں داخل ہوا، پانچ برس کی تاریخ لکھنے پایا تھا، کہ دشمنوں نے اسکے خلاف سازش کی اور وہ اس خدمت سے محروم کر دیا گیا، شش فتح کانگڑا اسی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے، اس میں شاہجہاں کی شاندار فتح کا حال لکھا ہے، اور کمال یہ کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی تحریر میں چھ قسم کا طرز اختیار کیا ہے،[۵۲]

درسگاہیں ان درسگاہوں کو جو اکبر، جہانگیر اور ان کے امرا نے قائم کیں، شاہجہان نے نہ صرف ان کو بجنسہ رہنے دیا، بلکہ انھیں فروغ دینے کی کوشش کی، ان کے علاوہ جامع مسجد دہلی کے ہمسایہ اس نے ایک مدرسہ دارالبقار نامی قائم کیا، جس میں طلبہ معقول و منقول کی تعلیم حاصل کرتے تھے[۵۳]

[۵۱] ایلیٹ جلد ۷، ص ۱۲۳، [۵۲] اس عہد کی اور بھی مشہور تاریخیں ہیں، مثلاً محمد صالح کی عمل صالح دو جلد اور محمد صادق خان کی شاہجہاں نامہ مگر ان مورخوں کا بظاہر کوئی تعلق شاہی دربار سے نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے اس مضمون میں ان کا ذکر ضروری نہیں سمجھا گیا، [۵۳] آثار الصنادید از سید احمد خاں باب تیسرا ص ۱۲،

رامچندر جی کی کہانی

از

جناب سلطان احمد صاحب بدایون

اس مضمون کا مقصد اردو دان اصحاب کو مسٹر ملا دی وین کنارتنام بی اے سابق وائس پرنسپل گورنمنٹ ٹرینینگ کالج راج مہندری (دکن) کی ایک تصنیف سے متعارف کرنا ہے جس کا نام "رام مصر کا فرعون" ہے،

کتاب کے نام سے ظاہر ہے، کہ مصنف کا موضوع بحث ہندوستان کی وہ مشہور ہستی ہے جسکو والمیک اور تلسی داس نے حیات دوام بخش دی ہے، رامائن اور مہابھارت ہند کے ادب قدیم کے دو زبردست شاہکار ہیں، بہت سے دماغ ان کے مطالعے سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، مگر وہ نقاد جو تاریخی تحقیق کے مقصد سے ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ہمیشہ مایوس رہتے ہیں نہ تو اب تک ان کا زمانۂ تصنیف معین کیا جاسکا ہے، نہ یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ان کے بیانات میں کہاں تک اصلیت موجود ہے، اتنا ضرور محسوس ہوتا ہے، کہ دونوں کتابیں بعد آنے والوں کی تحریف سے محفوظ نہیں رہی ہیں،

مسٹر وین کنارتنام نے ان کی تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے، اور غیر معمولی جسارت سے کام لیا ہے، رامچندر جی اور کرشن جی کی ذات اب انسانیت سے بالاتر سمجھی جاتی ہے، لاکھوں انسانوں کے قلوب اُن کو معبود یا معبود کا پرتو خیال کرتے ہیں، ایسی صورت میں اگر ان کو قدوسیت اور الوہیت

کے سرپر علوم سے آثار کر اس دنیا کے بادشاہوں میں جگہ دی جائے، تو یہ خود ایک مجرمانہ جرأت ہوگی، مگر ونین کلارتنام کی تصنیف تو اسی پر بس نہیں کرتی، بلکہ ان محبوب ہستیون اوران کے تمام متعقین کو جن کی مدح وثنا کرتے ہمارے شعراء اور بھگتون کو صدیاں گذرگئی ہیں، ہم سے چھین کر مصر کو سونپے دیتی ہے، لیکن مورخ کا قلم جذبات کا احترام کیوں کرے،

کتاب زیر بحث رامائن کے افسانے کو ایک مصری فرعون کا قصہ بتاتی ہے، یہ نسبت حیرت خیز معلوم ہوتی ہے کہاں مصر اور کہاں ہندوستان کا یہ فصیل بند رمنہ، پھر تمدن اور معاشرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بعد مکانی اور بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس نسبت کو سُن کر پہلے تو لبوں پہ وہ تبسم پیدا ہوتا ہے، جو کسی مجذوب یا دیوانہ کی باتوں پر آیا کرتا ہے، لیکن مطالعہ کے بعد استہزاء استعجاب سے بدل جاتا ہے،

مصری تعلق اسقدر حیرت انگیز نظر آنے کا سبب یہ ہے کہ ہم ابتدار سے ہندی تمدن کو ایک پردہ نشین عورت سمجھتے آئے ہیں، جس کا آنچل بھی کسی نامحرم نے نہیں دیکھا تھا، مدرسوں کی ابتدائی جماعتوں سے آخر تک بار بار یہ سبق دیا گیا ہے کہ شمال نے ہمالہ پہاڑ اور باقی تین طرف سمندر نے عہد قدیم میں اس خطۂ جنت نشان کو پڑوس کے تمام ملکوں سے بالکل الگ تھلگ رکھا، لیکن حال کے محققین جو نظریے پیش کر رہے ہیں، ان کا تقاضا ہے، کہ جلد سے جلد اس عقیدۂ باطل سے توبہ کرلیجائے، چنانچہ مسٹر دین کلارتنام کی تحقیقات کا خلاصہ پیش کرنے سے پہلے مناسب ہوگا، کہ ہند اور مغرب کے ہمسایہ ملکوں کے میل جول کا کچھ اندازہ کرلیا جائے، تاکہ مصری عقائد اور روایات کا ہندوستان میں پایا جانا ہمیں حیرت میں نہ ڈالے،

ہندوستان کے پرانے رہنے والے وہ قبیلے تھے، جن سے جنوبی ہند اب تک بھرا ہوا ہے، یہ تو یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کہان سے آکر یہاں آباد ہوئے، لیکن یہ واقعہ ہے

وہ کافی متمدن تھے، اور ہمسایہ قوموں سے ربط ضبط رکھتے تھے، ہندوستان کے مغرب میں تہذیب کے دو بڑے گہوارے تھے، نیل کی وادی مصر میں اور دجلہ کی وادی عراق میں مسیح علیہ السلام سے چار ہزار سال پہلے ان دریاؤں کے کناروں پر انسان متمدن زندگی بسر کر رہا تھا، بہت سے فنون وہ حاصل کر چکا تھا، اور اسکی حیرت انگیز یادگاریں آجتک باقی ہیں، لیکن ہندوستان میں دریاے سندھ کی وادی میں ڈراور قوموں کی تہذیب بھی ان سے پیچھے نہ تھی، اور یہ غالباً اس مسلسل تعلق کا نتیجہ تھا، جو ہندی ڈراوروں کو ہمسایہ قوموں کے ساتھ ہمیشہ رہا،

سندھ کی وادی میں جو مُہریں زمین سے برآمد ہوئی ہیں، ان کے نقش ونگار علماے آثار کے نزدیک قدیم سُمیری طرز سے مشابہ ہیں، جو عراق اور بابل کی قدیم ترین متمدن قوم تھے، سندھ سے ذرا پرے ہٹ کر سیستان میں مٹی کے برتن سمیری برتنوں سے ملتے ہوئے پائے گئے ہیں[۱] ڈراور قوم میں مُردے دفن کرنے کی رسوم وہی تھیں جو جزیرہ کریٹ یا شہر ٹرائے اور بابل میں رائج تھیں، دکن میں چنگل پٹ، مدورا، اور سلیم کے اضلاع میں جو مٹی کے تابوت نکلے ہیں، وہ شکل میں ان تابوتوں سے مشابہ ہیں، جو برہمن آباد اور موہنجو دارو (واقع سندھ) یا گہارہ (واقع عراق) اور دوسرے بابلی شہروں میں پائے گئے ہیں[۲]،

اِن کے علاوہ بابل کے کلدانی دور میں ہند اور بابل کے درمیان تجارتی تعلقات کا ثبوت بعض الفاظ سے ملتا ہے، جو ہند سے بابل پہنچے تھے، مثلاً "مَن" کا لفظ ایک وزن یا مقدار کے معنی میں بابل میں بھی مستعمل تھا، اسی طرح سِندھو ایک کپڑے کو کہتے ہیں، جو غالباً سندھ میں بنتا ہوگا[۳]،

ہندی اور بابلی میل جول نے دریاے سندھ کی وادی کو تہذیب کا وہ مولد بنا دیا تھا، جس کو ہندوستان میں بجا طور پر اولیت کا شرف دیا جا سکتا ہے، ڈاکٹر ہنڈار کرنے گذشتہ انڈین کلچرل

[۱] مشرق قدیم مصنفہ ہوگرٹ، [۲] ہند قدیم، بنرجی، [۳] ویدی ہند ریگوزن، صفحہ ۳۰۵،

کانفرنس کا خطبۂ صدارت ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ "دریاے سندھ کی وادی ایک غیر آریہ تہذیب کا گہوارہ تھی، آریہ قوم نے اس تمدن سے جو کچھ سیکھا اس کا صحیح اندازہ اب تک نہیں کیا گیا ہے، یہ حقیقت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے، کہ آخو زمانے کے ہندو مذہب کو رگ وید کے قدیم مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، برخلاف اس کے بعد کا ہندو مذہب اُس غیر آریہ مذہب سے بہت کچھ ہمرنگ ہے، جو سندھ کی وادی میں پہلے سے موجود تھا"

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے ڈراور قومیں جہازرانی سے واقف تھیں، اور جب آریہ بدیسیوں نے اُن کو دھکیل کر جنوبی ہند میں اتار دیا، تب تو ان کے بیرونی تعلقات اور بھی زیادہ وسیع ہوگئے، توریت میں مذکور ہے کہ ملکۂ سبا نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو جو تحائف نذر کئے، اُن میں بہت سی خوشبو کی چیزیں، سونا اور بیش قیمت جواہر تھے، ان تحائف کے جو نام عبرانی توریت میں تحریر ہیں وہ عبرانی الاصل نہیں، بلکہ جدید تحقیق کے مطابق ڈراوری الفاظ ہیں[۱]

اسی کیساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ابتداے تاریخ سے عربی قومیں تجارت اور جہازرانی میں ممتاز رہی ہیں، ان میں سب سے زیادہ نامور فنیشین یا فنیقی تھے، جو مسیح سے تقریباً ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے عروج حاصل کر چکے تھے،

فنیقیوں اور عربوں کی سیاحت اور تجارت آریہ اور سامی قوموں کے میل جول کا بہت بڑا ذریعہ تھی، بہت سے ہندی الفاظ عرب تاجروں کی وساطت سے نقل وطن کر کے عرب میں آباد ہوگئے زنجبیل کافور، اور مشک وہ تین ہندوستانی الفاظ ہیں، جو عرب کی ٹکسالی زبان میں شامل ہو کر اتنے عربی نما ہو گئے تھے، کہ قرآن کریم میں بھی موجود ہیں[۲] فن ملاحی کی بہت سی اصطلاحات جو عربی جہازرانوں میں رائج تھیں، ہندی الفاظ سے ماخوذ بتائی جاتی ہیں[۳]

---

[۱] ویدی ہند، راگوزن، ص ۳۰۳۔ [۲] عرب اور ہند کے تعلقات سید سلیمان ندوی، ص ۳۱ [۳] ایضاً

جدید نظریات کی روشنی میں دیکھا جائے، تو ہند اور مغربی ایشیا کے درمیان سب سے بڑا واسطہ اتحاد خود آریہ قوم تھی، اب تک آریہ قوم کا ابتدائی وطن ہندوکش کے پرے کسی نامعلوم خطہ کو بتایا جاتا تھا، لیکن ایک عرصہ سے یہ نظریہ زیر بحث آرہا ہے، مسٹر بال گنگا دھر تلک کا خیال تھا، کہ آریہ وطن بحر شمالی کے ساحل پر کسی جگہ واقع تھا، مسٹر جے جی سپرنٹنڈنٹ آثار قدیمہ کاشمیر نے بعض جرمن مستشرقین کے اشارات سے امداد پاکر اس نظریہ کو پیش کیا، کہ آریہ قوم کا مولد یا ان ٹش یعنی بحر اسود کے سواحل کو سمجھنا چاہئے، گذشتہ سال ڈاکٹر پیران ناتھ (بنارس یونیورسٹی) نے ایک سلسلۂ مضامین اسی مبحث پر سپرد قلم فرمایا تھا، اور دکھایا تھا، کہ ایشیائے کوچک میں جہاں سامی النسل قومیں آباد تھیں، وہیں پہلو بہ پہلو آریہ قومیں بنتی بگڑتی رہیں، کلدانی آشوری، کنعانی وغیرہ اگر سامی النسل تھیں تو حطی، مطانی، میدی وغیرہ آریہ، مصر ڈاکٹر صاحب کے بقول سامی اور آریہ دونوں قوموں کا جولانگاہ رہا، رگ وید میں ڈاکٹر صاحب کو بابل کی تاریخ کے اتنے حوالے ملتے ہیں، کہ وہ اس کتاب کو ہندی نہیں بلکہ سمیری کہنا زیادہ مناسب خیال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک ہندوستان میں آریہ ایشیائے کوچک سے آئے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے، کہ ان میں بہت سے نوآبادکار مصر سے تشریف لائے ہوں [1]

اس سے بہت پہلے ڈاکٹر ہیول نے بھی یہ خیال ظاہر کیا تھا، کہ ہندوستان کے اندر بعض آریہ آبادیاں ایشیائے کوچک سے آنے والوں نے بسائی تھیں، وہ کہتا ہے کہ گمان غالب یہ ہے کہ پنجاب میں جو آریہ آباد ہوئے، ان میں بہت سے سمندر کی راہ سے خلیج فارس اور دریائے سندھ کے کنارے کنارے آئے، دو ہزار قبل مسیح کے بعد مطانی آریوں نے (ایشیائے کوچک میں) ایک طاقتور سلطنت قائم کرلی تھی .... جب یہ سلطنت آشوریوں اور حطیوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی تو مطانیوں کے لئے

---

[1] ماڈرن ریویو انڈیا، جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۲۵ء [2] ہسٹری آف آرین رول، ہیول ص ۱۵

راہِ فرار بس یہی تھی کہ براہ دریا خلیج فارس تک اور وہان سے ہندوستان تک پہونچیں؛[1]

عجب نہیں کہ دکن میں آریہ قوم کا پہلا قدم سمندر ہی کے راستے سے پہنچا ہو، بے اصل قصص سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو دکن میں آریوں کا پہلا فاتحانہ داخلہ چندر گپت موریہ کے عہد میں ہوا، موریہ سلطنت اسوقت تمام شمالی ہندوستان پر پھیل چکی تھی، چنانچہ گجرات کی جانب سے آریہ سلطنت دکن کی طرف بڑھی، اور کانکن کا علاقہ جو مغربی ساحل کے برابر واقع ہے، سب سے پہلے فتح ہوا، حالانکہ جغرافی اعتبار سے یہ وہ حصہ تھا جو موریہ دارالسلطنت سے بعید تر ہونے کے علاوہ پہاڑوں اور دریاؤں کے سبب گجرات سے بالکل منقطع تھا، قدرتی طور پر موریہ سلطنت کو دکن کی طرف پھیلنے کے لئے جو راستہ اختیار کرنا چاہیے تھا، وہ مگدہ یا جنوبی بہار کے متصل علاقوں یعنی تلنگانہ اور گونڈوانہ سے گذر کر آگے بڑھتا، یہ الجھن اس نظریہ کی روشنی میں صاف ہو جاتی ہے کہ مغربی ساحل پر آریہ قوم کی آبادی آریہ سلطنت کے پہونچنے سے پہلے موجود تھی، اور اس خطہ کی جائے وقوع اس امر کی شاہد معلوم ہوتی ہے، کہ اس کے آریہ باشندے سمندر کے راستے سے آکر وہاں آباد ہوئے تھے؛

دکن کی ساری سرزمین میں یہی کانکن کا علاقہ جو مرہٹوں کا آبائی وطن ہے، آریہ تمدن اور آریہ نسل سے آباد ہے، جنوبی ہند کی تمام زبانوں میں صرف مرہٹی زبان کو آریہ خاندان میں شمار کیا جاتا ہے، اور بقیہ تمام ڈراوری زبانین بتائی جاتی ہیں، اس کے علاوہ تمام دکن میں ڈراوڑی تہذیب کا اثر غالب نظر آتا ہے، اور ان میں صرف مرہٹہ مرقوم مستثنیٰ ہے، بہ الفاظ دیگر اس کا یہ مطلب ہے کہ صرف کانکن ہی وہ حصہ تھا، جہاں آریہ آباد ہوئے تھے، بقیہ دکن پر انکا تصرف فاتحانہ حیثیت سے قائم ہوا،

مختصر یہ ہے کہ ان اکتشافات کی روشنی میں جو آریہ قوم کا ابتدائی وطن ایشیاے کوچک

---

[1] ہسٹری آف آرین رول اہیول صفحہ ۱

میں قائم کرتے ہیں، آریہ اور سامی تہذیب کا میل جول اور عقائد و روایات کا لین دین قرین قیاس ہوجاتا ہے، ان دونوں قوموں کی روایات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے تو محنت بار آور ثابت ہونے کی امید ہے، کیونکہ یہ ابتدائی ربط بعد کو بھی تازہ ہوتا رہا، وادی سندھ اور پنجاب کے علاقے تو بالخصوص مغرب کے ہمسایہ ممالک سے ہمیشہ پیوستہ رہے، اور غالبًا اس تعلق کو برقرار رکھنے میں سب سے زیادہ آشوریوں نے امداد کی،

آشوری سب سے پہلی قوم تھی، جس نے ایک وسیع سلطنت کی بنا ڈال کر مختلف ممالک اور مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے کا موقع دیا، نویں اور آٹھویں صدی قبل مسیح میں آشوری سلاطین کے لشکر میڈیا اور پارس پر حملہ کرتے تھے، شمالی شام سے گذر کر جنوبی شام تک پہنچ گئے تھے، دمشق اور فنیقیوں کی سلطنت ان کی باجگذار تھی، تکلات فالازار ثانی کے تخت نشیں ہونے پر (۷۴۵ ق م) ایک نئی روح پیدا ہوگئی،

نئے نئے ممالک فتح ہوئے، مصر تک زیر نگین آگیا، مشرق میں آشوری سلطنت کے ڈانڈے اندلس سے مل گئے، اور یونان بھی مفتوحہ ممالک میں شمار ہونے لگا،[1]

اس دور میں کہ وسائل آمد و رفت مفقود تھے، بیرونی صوبوں پر مرکزی حکومت کا اقتدار ماتحت والیان ملک کی وفاداری پر منحصر تھا، چنانچہ ماتحت صوبوں اور مرکزی حکومت کے درمیان رابطۂ اتحاد مضبوط رکھنے اور تمدن و معاشرت کے اختلافات مٹانے کے لئے آشوریوں نے غالبًا فراعنۂ مصر کی تقلید میں یہ دستور قائم کر لیا تھا، کہ مفتوحہ علاقہ کے سربرآوردہ لوگوں کو آشوریہ میں اور آشوریہ کے باشندوں کو نو تسخیر ممالک میں آباد کر دیتے تھے،[2] اس عمل کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ آشوری تہذیب ہمسایہ تہذیبوں میں گھل مل گئی ہوگی، چنانچہ بیکا نی رسم الخط جا بابل اور آشوریہ میں

---

[1] تاریخ عہد قدیم، راولنسن ص ۲۳۔ [2] ایضًا ۵۲ یونیورسل ہسٹری ص ۵۱۹،

شروع ہوا تھا، تمام مغربی ایشیا میں عام ہوگیا، فراعنہ مصر کے صوبہ دار شام سے جو مراسلے لکھتے تھے، وہ اسی رسم الخط میں ہوتے تھے،

آشوریوں کے بعد جب ایران پر میدیوں کی طاقتور سلطنت قائم ہوئی، ان میں کیخسرو سب سے زیادہ مشہور ہوا، جس نے نینوا کو فتح کر کے سلطنت کے حدود ایشیائے کوچک تک پھیلا دئے، میدیوں ہی کے عہد میں بابل کی قدیم سلطنت نے دوبارہ عروج حاصل کیا، یہاں تک کہ اس کی حد شام و فلسطین تک پہنچ گئی، بابلی سلطان نے مصر کے فرعون نیکوۃ نامی کو خود اسی کے ملک میں پہنچ کر شکست دی، بنوکد نصر یا بخت نصر اس خاندان کا سب سے زیادہ مشہور سلطان تھا، (تاریخ انتقال ۵۶۲) اس کے عہد میں شام، فلسطین، فنیقیا اور مصر فتح ہو گئے تھے،

اُدھر میدیوں کے چند روزہ عروج کو پارسیوں نے ختم کر دیا، داراے اوّل کے عہد میں پارسی سلطنت مغربی ایشیا کی سرتاج حکومت تھی، اس کی قبر پر جو کتبہ موجود ہے، اس میں سلطنت کے صوبوں کے نام درج ہیں، جن میں ایک طرف مصر اور یروشلم شامل ہیں، تو دوسری طرف پنجاب[1]، اسوقت دارا تمام دنیا کا بادشاہ معلوم ہوتا تھا، اور اس کے فرستادے شاہی احکام لئے ہوئے سندھ سے دریائے ڈینیوب تک اور مصر سے لیکر وسط ایشیا تک سفر کرتے نظر آتے تھے[2]،

پارسیوں کے ہی عہد میں ایران اور یونان کے باہم خونریزی کا وہ طویل سلسلہ شروع ہوا، جس کا آخری نتیجہ سکندر کی فتوحات تھیں، مقدونیہ سے نکل کر سکندر نے ایشیائے کوچک، مصر، عراق، ایران، افغانستان، ترکستان اور پنجاب غرض کل مغربی ایشیا کو ایک سلطنت میں شیرازہ بند کر دیا، مگر یہ اتحاد عارضی ثابت ہوا، تاہم سکندر کے بعد ہندوستان کی سرحد پر باختر کی یونانی حکومت قائم ہو گئی، جس نے پھر ایک بار پنجاب پر قبضہ کر کے غالباً متھرا تک اپنے حدود وسیع کر دیتے، اُدھر وادی سندھ میں

[1] ریگوزن صفحہ ۱، [2] تاریخ عالم، ایچ جی ویلز، صفحہ ۱،

دارائے اعظم کے صوبہ دار جو اب خود مختار حاکم تھے، اب بھی کہیں کہیں حکومت کر رہے تھے، ان میں سب سے زیادہ مشہور گجرات کا حاکم رُدْرَمن تھا جس کا کتبہ گرنار (واقع ریاست جوناگڈھ) کی مشہور چٹان پر موجود ہے،

غرض ولادت مسیح تک کوئی عہد ایسا نظر نہیں آتا، کہ ہندوستان کو مغربی ہمسایوں سے واسطہ نہ رہا ہو، اگر ایک طرف وادی فرات کی قومیں سواحل نیل کے لوگوں سے ملتی رہتی تھیں، تو دوسری طرف بابل آشوریہ، میدیا اور پارس کی سلطنتیں کبھی ہندوستان کی سرحد اور کبھی اندرون ملک تک پھیلی رہیں، ان حالات میں قدرتی بات تھی، کہ بہت سی مصری اور بابلی روایات ہندوستان آگئی ہوں، آج یقین کے ساتھ یہ بتانا تو مشکل ہے، کہ اس مسلسل تعلق کے سبب کون کون سے علوم و فنون عقائد و مراسم مغرب سے آکر ہمارے تمدن میں جذب ہوگئے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اس طویل ربط کے باوجود بھارت دیس کی تہذیب اچھوتی نہ رہ سکتی تھی،

مصر اور بابل کے سامی تمدن کا ہندی تمدن سے اگر مقابلہ کیا جائے، تو بہت سے مشترک عقائد اور مراسم سامنے آجاتے ہیں، قدیم رگ ویدی ہندو تمدن، اور متاخر ہندو تہذیب میں جو بعد اور مغائرت ہے، اس کا سبب یہی بیرونی اثرات نہ ہوں، ممکن ہے کہ ہندوستان میں آریہ قوم کا ورود دو مختلف زمانوں میں اور دو مختلف مرکزوں سے ہوا، یا قدیم آریہ تہذیب کو ڈراوڑی میل جول نے کچھ سے کچھ کر دیا، تناسخ، ذات پات کی تفریق، برہمنوں کی غیر معمولی برتری، گائے کی پرستش، بتوں کی پوجا، مندروں کی تعمیر، ستی کا رواج، پردے کا دستور، ختنہ اور چوٹی وہ چیزیں ہیں، جن سے رگ ویدی معاشرت خالی معلوم ہوتی ہے، اور جو متاخر ہندو سماج کے لوازم ہیں، قیاس چاہتا ہے کہ یہ رسوم اور عقائد بابل، آشوریہ یا مصر سے ہم تک پہنچے ہوں گے، کیونکہ یہ ہمسایہ تمدن ہندو معاشرت سے اسی قدر قریب نظر آتے ہیں، جتنا کہ رگ ویدی عہد بعید معلوم ہوتا ہے،

آشوری کلدانی زندگی کی ایک مختصر سی تصویر ملاحظہ ہو، جو سین وس کی کتاب تاریخ عالم قدیمہ

سے ماخوذ ہے، اور جو ہند ورسوم کا عکس نظرآتی ہے،

تیہان کے امرا رباز و بند گلو بند اور گوشوارے استعمال کرتے تھے، اُن کے بال بڑے بڑے اور گھونگر والے ہوتے تھے، عام لوگ ننگے پاؤں رہتے، بادشاہ اور امرا کئی بیویاں کرتے تھے، اور اُن کو گھروں میں قیدیوں کی طرح رکھتے تھے، دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں پتھر یا سونے چاندی کی بناکر قیمتی لباس پہناتے، اور عمدہ مکانوں میں بہت حفاظت کیساتھ رکھتے، تیوہار کے دن اُن کو باہر نکالتے، اور نہایت عزت و احترام کے ساتھ گشت دے کر پھر رکھدیتے، دیوتاؤں کی پوجا میں بخور جلاتے اور جانور قربان کرتے تھے، وہ خیال کرتے تھے، کہ ستارے خداوندوں کے بھید ظاہر کر دیتے ہیں، لہذا اُن کی حرکت کا کھوج لگاتے، اور اُن سے آیندہ واقعات معلوم کرتے، اُنکے کاہن پہلے سے ہوا یا نی طوفان، سخت گرمی، اور اچھی بُری پیداوار کی خبر دیدیتے تھے، کلدانیوں کا خیال تھا، کہ بچے کی پیدائش کے وقت ستارے کے موقعے اور محل کو دیکھکر اُس بچہ کے آیندہ واقعات زندگی معلوم ہوسکتے ہیں، اور ہر آدمی کے لئے ایک خاص ستارہ ہوتا ہے، جس کے اثر میں اسکی زندگی بسر ہوتی ہے، تمام حوادث خصوصًا امراض کو شیاطین سے منسوب کرتے تھے، اس کے لئے بہت سے عمل کرتے تھے، سحر وطلسم کے بہت سے منتر اُن کے ہاں رائج تھے، اُن کا خیال تھا، کہ بعض الفاظ میں ایک خاص اثر ہے، جس سے شیطان بھاگ جاتے ہیں،

مذکورۂ بالا بیان کے تمام اجزا آج بھی ہند و معاشرت میں جھلکتے نظر آتے ہیں، اس عام رنگ کے علاوہ ہند و دیو مالا کے بہت سے نام اور بہت سے قصّے مغربی ایشیا کی روایات اور اصنام سے کچھ اسقدر مشابہ ہیں، کہ ان ممالک کا باہمی تعلق پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، چنانچہ ان مشترک قصص اور ناموں کے علاوہ جنکو رگ وید سے انتخاب کرکے ڈاکٹر پران ناتھ نے پیش کیا ہے، ہند و ادب میں اور بھی مثالیں نظر آتی ہیں، مثلاً ایشور یا ایشر کا لفظ اور جسم و صورت سے بالاتر الوہیت کا وہ مفہوم جس پر یہ لفظ دلالت

کرتا ہے، دونوں عجب نہیں کہ آشوری قوم کا عطیہ ہوں، آشوری مذہب بہت سے دیوتاؤں کے علاوہ سب سے بالاتر ایک خدا کو سمجھتے تھے، اور ان کے تخیل میں یہ کوئی مبہم اور موہوم وجود نہ تھا، بلکہ ایک شخص ذات تھی، جس کا نام "ایس شر" تھا[1]، ریگوزن کے بقول رگ وید میں ایشور کا لقب بطور ایک اہم صفت کے آریوں کے سب سے بڑے دیوتا دیایش کے ساتھ ملحق تھا، اور اسی مصنف کا خیال ہے کہ یہی لفظ ایران میں اہرمزد کی شکل میں تبدیل ہو گیا، جس کو زرتشت نے خدائے قدوس کے لئے استعمال کیا، بعد میں اس کا اطلاق خوفناک اور مضرت رساں شیاطین پر ہونے لگا[2]، جو لوگ ویدوں کے منتروں سے تاریخی واقعات نچوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے نزدیک آشور دیوزاد نہ تھے، بلکہ ہندوستان کے دراوری باشندوں کا کوئی قبیلہ تھا، دشمن کو برے ناموں اور برے اوصاف سے یاد کرنا ہر قوم کا رواج رہا ہے، اسی جذبہ کی پیروی میں آریوں نے آشوروں کو شیاطین بنا دیا، بتایا جاتا ہے کہ چھوٹا ناگپور میں آج بھی ایک دراوری قبیلہ آشوری کہلاتا ہے[3]،

لیکن اس تفسیر کے بعد بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ رگ وید میں سب سے بڑے خدا کے لئے اس لفظ کا استعمال کیوں ہوا، اور دوسرے یہ کہ آج کے روزمرہ میں ایشور سے مراد خدائے قدوس کیوں ہونے لگا،

اتھرووید میں جو اس مقدس سلسلے کی سب سے آخری کڑی ہے، یہ لفظ پھر اعلیٰ اور اسفل دونوں معنوں میں مستعمل ہوا ہے[4]، اس کے یہ معنی ہوئے کہ ابتداءً اس لفظ کا اطلاق ایک عالی اور برتر خدا پر ہوتا تھا اور آخر زمانہ میں شیاطین کے لئے استعمال ہونے لگا، مفہوم کا یہ انقلاب صرف اس مفروضہ کے تحت، قابل فہم ہو سکتا ہے کہ آریہ اور آشوری قومیں کبھی علاقہ ہمسائگی رکھتی تھیں، چنانچہ آریہ بھی آشوری

---

[1] نیو لارنڈ ہسٹری ص ۵۵۵، [2] ویدی ہند ص ۱۳۰، [3] تاریخ ہند قدیم برجی ص ۲۰-۲۱، [4] اتھروید مصنفہ گرفتھ کتاب ۱۰ منتر ۹۵ اور کتاب ۸، منتر ۱۔ شیاطین کے لئے زیادہ کثرت کے ساتھ مستعمل ہے، کتاب ۸ منتر ۳ و منتر ۹ وغیرہ

خدا کا نام استعمال کرنے لگے، لیکن جب آشوری سلاطین کی جوع الارض نے ہمسایوں کو جابر حاکم اور ظالم فرمانروا بنا دیا، اور آریوں کو ان سے تنگ آکر نقل وطن کرنا پڑا، تو آریہ زبان میں آشور کا لفظ خبیث اور خوفناک قوتوں کا مترادف بھی بن گیا، اور اسی طرح یہ ذومعنویت ظہور میں آئی، چنانچہ ہیول کہتا ہے کہ ویدوں میں اسیُروں اور دیوتاؤں کی جنگ کا ذکر غالباً اس مخاصمت کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو آفتاب پرست آریوں اور سامی النسل آشوریوں میں جاری رہی[1]،

نسل انسانی کا ایک فرد سے شروع ہونا بھی ہند و دیومالا اور سامی روایات کی مشترک روایت ہے، ہندو دینیات میں دنیا کا پہلا آدمی منو ہے، یہ ایک لفظ ہے جس کے خاندان سے انگریزی (man) فارسی مَن، جرمن (Mann) مصری مِنا اردو مانس سندھی ماڑو ہاتھ وغیرہ پیدا ہوئے، سنسکرت لغت میں ہندو دیومالا کے بقول نسل انسانی سات بار ہلاک ہو چکی ہے، اور ہر بار ایک منو پیدا ہوا ہے، جس سے نسل دوبارہ شروع ہوتی ہے، آخری منو ساتواں مورث انسانی تھا، اور اس کا باپ ویوس وتھ دیوتا تھا، منو کا ایک بھائی بھی تھا، جس کا نام یم تھا، یم کو بھی بعض نے غلطی سے پہلا انسان کہا ہے لیکن ریگوزن کے بقول یہ عزت منو ہی کا حق ہے، کیونکہ رگ وغیرہ کے تمام منترجن میں یم کا ذکر آتا ہے، اسکو پہلا مرنے والا انسان بتاتے ہیں، نہ کہ پہلا پیدا ہونے والا[2]، اسی خصوصیت کے باعث مردوں کی دنیا کا بادشاہ یم ہی کو مانا گیا ہے، یم کی بیوی یمی ہیں، اور منو کی بیوی ایدا، یم اور یمی توام بھائی بہن ہیں، منو کی بیوی ایدا اس طرح پیدا ہوئی ہیں کہ منو تنہائی سے گھبرا کر بہت سی دعائیں مانگتے ہیں، اور یہ دعائیں ایدا کی شکل اختیار کرکے ان کے سامنے آجاتی ہیں،

اس روایت میں سامی عقائد صاف نظر آتے ہیں، آدم علیہ السلام کے پہلو سے حوا پیدا ہوتی ہیں، منو کی دعائیں ایدا بن جاتی ہیں، آدم اور منو تو باہم مترادف ہیں ہی، ایدا کا الف جو

---

[1] آرین رول صکے۔ [2] ریگوزن ص۱۸۴

تانیث کی علامت ہو سکتی ہے، اگر ساقط کر دیا جائے تو اید رہ جاتا ہے، اور اماں حوا کے انجیلی نام ایو (EVE)
سے اس قدر قریب ہو جاتا ہے، کہ دونوں ایک ہی لفظ معلوم ہوتے ہیں، دوسری قدر مشترک یہ ہے کہ سامی
روایت میں بھی پہلا پیدا ہونے والا، پہلا مرنے والا انسان نہ تھا، آدم پہلے پیدا ہوئے، تو ہابیل سب سے
پہلے مرے، جیسا کہ توریت کے باب پیدایش میں مذکور ہے، فرق صرف اس قدر ہے کہ یہاں یم اور منو
بھائی بھائی ہیں، اور وہاں آدم اور ہابیل باپ بیٹے، آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھائی بہن کے ازدواجی
تعلقات بھی یم اور یمی کی شادی سے تائید پاتے ہیں،

ہندی روایت کے بہت سے اجزا غیر مربوط ہیں، مثلاً یم اور منو دونوں ویے وَس وتہ خدا
کے بیٹے ہونے کے باوجود، ابو البشر ہونے کی عزت صرف منو ہی کا حق کیوں سمجھی گئی، دوسرے یمی کو بھی
خدائی فرزندیت کا شرف حاصل ہے، کیونکہ یم اور یمی توام ہیں، لیکن ہندی شعرائنے اس قصہ کو اور بھی
زیادہ غیر مربوط نوح علیہ السلام کا واقعہ شامل کرکے بنا دیا، انھوں نے نوح کو بھی منو ہی کا نام دیا، مگر
ناموں کے خلط ملط ہونے سے اس بحث پر کچھ اثر نہیں پڑتا، کہ ابتدائے آفرینش سے سامی روایات
آریہ قوم تک پہنچتی رہیں، چنانچہ نوح علیہ السلام کا واقعہ جو رگ وید کے علاوہ متعدد قدیم کتابوں میں
مذکور ہے، اور جس کو تمام محققین سامی قوموں کا عطیہ تسلیم کرتے ہیں، اس امر کی سب سے بڑی شہادت ہے، اور
اس کی تکرار بے محل نہ ہوگی،

سنسکرت کی قدیم ترین روایت کہتی ہے، کہ صبح کے وقت وہ منو کے پاس بدن دھونے کے لئے
پانی لائے، وہ دھو رہا تھا کہ ایک مچھلی ہاتھ میں آگئی، مچھلی نے منو سے کہا کہ مجھے پال لے، میں تجھے ایک
طوفان سے بچا لوں گی، جو آنے والا ہے، چنانچہ منو نے مچھلی کو پال لیا، مگر اس کا جسم اتنا بڑھتا گیا کہ
گھڑے سے نکال کر تالاب اور تالاب سے نکال کر دریا یا سمندر میں چھوڑ دینا پڑا، جس سال مچھلی نے
بتایا تھا طوفان آیا، مچھلی ہدایت کر چکی تھی کہ کشتی پہلے سے تیار کر لینا، چنانچہ منو نے کشتی بنا رکھی تھی،

جب طوفان آیا تو منوجی تمام جانداروں کا ایک ایک جوڑا لے کر اس میں بیٹھ گئے، اب وہ مچھلی نمودار ہوئی اور کہنے لگی کہ کشتی کو میرے سینگ سے باندھ دے، ایسا ہی کیا گیا، آخر کشتی شمال کی طرف دُور ایک پہاڑ پر جا کر ٹھہری[1]،

بُت پرستی مندروں کی تعمیر، برہمن کا تفوق، یہ سب وہ چیزیں ہیں جن سے رگ ویدی تمدّن کو بہت کم لگاؤ تھا، مگر بابل اور اسیریا دونوں جگہ یہ دستور موجود تھے، آشوریہ میں تو برہمن جماعت اتنی با اثر تھی کہ آشوری سلاطین کو قدیم دار السلطنت جہاں پروہتوں کا زور تھا، چھوڑ کر نینوا کو منتقل ہونا پڑا، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ رگ ویدی عہد میں نہ بُت تھے نہ مندر، اور ریگوزن کا خیال ہے، کہ آریہ قوم نے یہ چیزیں باہر سے حاصل کیں[2] لیکن بیرونی اثرات صرف بابل اور آشوریہ سے منتقل ہو سکتے تھے کیونکہ ہندوستان کا قریب ترہمسایہ زرتشتی تمدّن معابد اور اصنام سے ہمیشہ بے نیاز رہا[3]،

اسی سلسلہ میں ہندوستان کے قدیم رسم الخط کو بھی آریہ اور سامی داد و ستد کے ثبوت میں پیش کیا جاسکتا ہے، رسم الخط کو مغربی ایشیا اور ہندوستان کے درمیان قوی ترین واسطۂ اتحاد تصور کرنا چاہئے، ہندوستان کے قدیم ترین کتبے برہمی اور خوراشتی رسم الخط میں پائے جاتے ہیں، اور یہ دونوں ابتداً سیدھے ہاتھ سے الٹے ہاتھ کی طرف لکھے جاتے تھے، جو سامی تحریر کی مستقل خصوصیت ہے، آخر زمانہ میں برہمی خط کی روش تو بدل گئی لیکن خوراشتی رسم الخط کی یہ شان آخر تک قائم رہی، محققین کے نزدیک یہ دونوں رسم الخط فنیقی اور آرامی تحریر سے ماخوذ ہیں[4]، یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ رسم الخط کے ساتھ خدا معلوم کتنی رسوم اور روایات ہندوستان وارد ہوئی ہوں گی، ہندوستان میں تحریری آثار تین سو قبل مسیح سے پہلے کے موجود نہیں، اسی عہد سے کچھ قبل یہ رسم الخط اور اس کی ذیلی روایات ہندوستان منتقل ہوئی ہوں گی،

---

[1] ویدی ہند صفحہ ۲۳۶، [2] ۵۲ - صفحہ ۱۳۳، [3] نیو لائٹ ہسٹری صفحہ ۲۲۳، [4] ہند قدیم مصنفہ ریپسن

بابل اور اشوریہ سے گذر کر فنیقی اور مصری روایات کو بھی ہندوستان پہنچنے کے مواقع کثرت سے حاصل تھے، ہندوستان اور مصر کے درمیان مواصلت کے سلسلے بحری راستہ سے قائم تھے، اسکے علاوہ مصر اور بابل کے باہم مبادلہ مسلسل ہوتا رہا، اور مصری عقائد اور روایات کا براہ بابل ہندوستان پہنچنا بھی ممکن تھا، چنانچہ مصری تہذیب کے بہت سے عناصر بھی ہندوستان میں جھلکتے نظر آتے تھے، مثال کے طور پر انسان کے جسم میں خدا کا ظاہر ہونا، جیسا کہ رامچندر جی اور کرشن جی کی نسبت عقیدہ ہے، مصری تخیل معلوم ہوتا ہے، مصری فراعنہ خود کو "آمن رع" دیوتا کا اوتار کہتے تھے، اسی خیال کا اعادہ مغربی ممالک میں حضرت مسیح کی الوہیت میں ہوا، قدیم مصری خداوندوں میں آسیرس کو مخصوص اہمیت حاصل تھی، مسٹر ویلز لکھتے ہیں، "آسیرس کے متعلق عقیدہ تھا کہ وہ بار بار مرتا اور بار بار زندہ ہوتا تھا، وہ صرف تخم ریزی اور نباتات ہی کا دیوتا نہ تھا، بلکہ تصور کو ذرا وسعت دیجئے، تو بقاے دوام کا مظہر تھا، اس کا نشان ایک جوڑے پروں والا کیڑا تھا، جو اپنے انڈے دفن کر دیتا ہے، مگر اس کے اس عمل کا مقصود جو بظاہر ایک مہلک فعل ہے، یہ ہوتا ہے کہ زندگی دوبارہ وجود میں آئے، چمکتا ہوا آفتاب بھی آسیرس کا نشان تھا، کیونکہ وہ غروب ہی اسی لئے ہوتا ہے کہ پھر برآمد ہو، آخر زمانہ میں اس دیوتا کا نام اپے پس تھا، آسیرس سے وابستہ ایک دیوی آسس نامی تھی، جس کا دوسرا نام ہوتر یا گائے کی دیوی تھا، ہلال اور چمکتا ہوا تارا اس کا نشان تھا، ہوتر کی تصویر ایک ہلال پر کھڑی ہوئی اور ایک شیر خوار بچہ گود میں لئے ہوئے ہے، یہ بچہ ہورس یا صبح کا دیوتا ہے، ان تین خداؤں کے نیچے اور بہت سے عجیب قسم کے دیوتا تھے"،

اس اقتباس میں چاند سورج اور گائے بیل کی زوجیت کا وہ تخیل موجود ہے، جس کی مثالیں کثرت کیساتھ ہندو قصص میں پائی جاتی ہیں، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ دیوتاؤں کی شادیاں کروانے اور ان سے اولاد کا سلسلہ قائم کرانے میں یونانی قوم بھی ان سے پیچھے نہیں رہی، مگر البتہ وہ خداوندی

تثلیث جو مصر اور بابل میں پائی جاتی تھی، وشنو شیو اور برہما کے مثلث اتحاد سے ہمرنگ معلوم ہوتی ہے، چنانچہ مسٹر ونکیٹارتنام مصری آسرس کو ہندی شیو کا پیشرو بتاتے ہیں،

لیکن سب سے زیادہ نمایاں اشتراک گائے کی تقدیس اور حرمت ہے، جو موجودہ زمانہ میں بجز ہندوستان کے اور کہیں باقی نہیں، بنی اسرائیل کا گوسالہ پوجنا، اور بابل کے قدیم آثار میں پردار گائیں منا، جنکو بیماری پیدا کرنے والے شیاطین کا دخل روکنے کے دروازوں پر نصب کیا جاتا تھا، ظاہر کرتا ہے کہ گاؤ پرستی مصر اور بابل کے مذہب کا اہم جزو رہی تھی، اور بہت ممکن ہے، کہ ہندوستان نے یہ سبق وہیں سے سیکھا ہو گائے کے علاوہ گھڑیال، بگلہ، اور بندر بھی مصر کے مقدس جانور تھے، نیل کا وہی احترام کیا جاتا تھا، جو گنگا کو ہمارے دیس میں حاصل ہے. بخور اور ناقوس پوجا کے وقت استعمال ہوتے تھے، اور ایک برہمن طبقہ ہندوستان کی طرح وہاں بھی موجود تھا، رالنسن کہتا ہے:-

ایک جماعت دوسری جماعت سے اس قدر نمایاں طور پر جدا تھی، اور موروثی پیشہ اختیار کرنے کا رواج اس درجہ عام تھا، کہ مصری معاشرت کا نظام ہندوستان کی سماج سے بہت زیادہ ملتا جلتا معلوم ہوتا ہے؛

اور سنویس بتاتا ہے کہ

"کاہنوں کے لئے معبد ہی میں مکان بنے ہوتے تھے، اُن کا کام تھا، کہ عبادت اور ریاضت میں عمر بسر کریں، ہر ایک کو رات دن میں دو مرتبہ غسل کرنا ضروری تھا، بدن کے تمام بال حتی کہ ابرو تک روزانہ ترشواتے تھے، بکری، سور، مچھلی اور لوبیا کھانے سے پرہیز کرتے تھے"،

مابعد ہندی برہمنیت میں ان مصری کاہنوں کا رنگ جھلکتا معلوم ہوتا ہے، اسی سلسلے میں تناسخ کے عقیدے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے، یہ عقیدہ آج ہندو دھرم کا بنیادی اصول ہے مگر

اس کا مولد مصر کو بتایا جاتا ہے[۱]، اسی کے ساتھ یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ویدوں میں ہر جگہ حیات مابعد کے سلسلے میں یہ عقیدہ صاف نظر آتا ہے کہ انسان کی رُوح مرنے کے بعد ایک دوسرے عالم کو منتقل ہو جاتی ہے، جہاں موت کا دیوتا یم حکمراں ہے، اور جہاں کا قیام ابدی ہے، بلکہ بعض منتروں میں اس عالم مابعد کا نقشہ راحت و سرور سے اس قدر لبریز دکھایا گیا ہے، کہ رگوزن اسکو اسلامی جنت کا مکمل نمونہ کہتا ہے، ممکن ہے کہ ہندوستان تک اس عقیدے کی رسائی یونانی وساطت سے ہوئی ہو، یونان ہی وہ ملک تھا جہاں فیثاغورث اور اس کے متبعین نے اس کو فلسفہ کا جزو بنا دیا، اور اس شدت کے ساتھ اس کے قائل ہوئے کہ گوشت کھانا ترک کر دیا، کیونکہ جن جانوروں کو مارا جاتا تھا، ان میں انسانی روح ہونے کا احتمال ہوتا تھا، کہا جاتا ہے کہ سکندر کے آنے سے پہلے ہی ہندوستان اس عقیدے سے آشنا ہو چکا تھا، اور اس کے ساتھیوں کو اس امر پر تعجب ہوا تھا[۲]، بہرکیف مصر، یونان اور ہندوستان میں ایک ایسے عقیدے کا وجود جس کی طرف مادّی ماحول اور ذاتی تجربہ کی بنا پر ذہن منتقل ہونا ممکن ہے، ان ممالک کے ربط قدیم پر ایک حجت ہے[۳]

مصر اور ہندوستان کے تعلق پر سب سے زیادہ روشنی ڈاکٹر پران ناتھ کے اس سلسلۂ مضامین سے پڑتی ہے جس کا ذکر پہلے گذر چکا ہے، ڈاکٹر صاحب کے نزدیک آریہ قوم کا ابتدائی وطن (Aegean Sea) کا ساحل تھا، یہاں سے بڑھ کر وہ ایشیاے کوچک اور مصر میں آباد ہوئے، انہی ممالک میں سامی النسل قومیں رہتی تھیں، چنانچہ آریہ اور سامی دست و گریباں ہونے لگے، یہ بین الاقوامی

---

[۱] انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، تناسخ، [۲] مضمون بر اسلام و نیکٹا رتنام ص ۲۰، [۳] تناسخ کے اعتقاد سے وید خالی ہیں، اپنشد اور بعد کی کتابوں میں ملتا ہے، (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون ہندوستان)، ممکن ہو قدیم ہندی قوموں سے آریہ فاتحوں نے حاصل کیا ہو، اور قدیم آریہ قوموں سے مصر وغیرہ تک پہنچا ہو (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مضمون سنسکرت زبان)

جنگ مصر سے شروع ہو کر تمام مغربی ایشیا میں عام ہو گئی، اسی جنگ کے سلسلے میں مصری آریہ لڑائی بھڑاتے بابل تک پہنچے، جو غالبًا عرصہ تک ان کے قبضہ میں رہا، ڈاکٹر صاحب کے بقول بابل کی قسمت فیصل کرنے والی جنگ بہ مقام تعل واقع ہوئی جس میں آریہ آدن نے سامی انندپت کو شکست دی، اور جس کا مفصل بیان رگ وید میں موجود ہے، دجلہ کی وادی سے آریہ قوم نے ہندوستان کا رُخ کیا، اور سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہو گئے، چنانچہ ڈاکٹر پران ناتھ نے بہت سے مصری اور بابلی نام رگ وید میں مذکور پائے ہیں، بابلی اُرگ وید میں موجود ہے، اِسی شن اور سپتر کے مشہور شہر وید میں ایش پرام اور شیپر کے نام سے وارد ہوئے ہیں، بابل کے بادشاہ سارگن اور اُش وید میں بجنسہٖ منقول ہیں، اسی طرح مصری بادشاہوں کے نام وید میں پائے جاتے ہیں، مثلاً مینس، مِیندو، اخی تے تان، انار میدہ وغیرہ ڈاکٹر صاحب کے بقول رگ وید کا ایک خمس مصری واقعات اور اشخاص سے متعلق ہے،

اس طویل تمہید کا خلاصہ یہ ہے، کہ تاریخی شواہد سے ایک طرف تو ہندوستان اور سامی ایشیا کا تجارتی اور سیاسی تعلق ثابت ہے، اور دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور مغربی ہمسایوں میں قدم قدم پر مماثلت نظر آتی ہے، اگر جدید مورخین کی یہ تحقیق کہ آریہ قوم کا اصلی وطن مغربی ایشیا کے قریب تھا، ناقابلِ قبول کہی جائے تو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا، کہ آریہ اور سامی قوموں میں ہمیشہ سے عقائد اور روایات کا مبادلہ ہوتا رہا، چنانچہ اب یہ نظریہ کہ رامائن کا افسانہ ایک مصری فرعون سے متعلق ہے، اتنا خلاف قیاس نہیں رہنا چاہیئے، جتنا کہ بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے،

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانحِ خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۲)

نکاحِ اولی، جب میری عمر پندرہ سال کی ہوئی، تو حضرت والد مرحوم نے ماہ ربیع الاول ۱۲۹۸ھ مطابق ۱۸۸۱ء میں میرا نکاح میر حیدر علی صاحب مرحوم ساکن موضع بیتی سادات پرگنۂ ہنسوہ ضلع فتحپور کی صاحبزادی عترت النساء بیگم کیساتھ بعوض مہر پانچہزار روپیہ سکۂ رائج الوقت کر دیا، میرا اور برادر گرامی مرحوم کا عقد ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہوا، شیخِ عصر حضرت مولینا مولوی شاہ عبد السلام صاحب قدس سرہٗ نے خطبۂ نکاح پڑھا، بعد فراغِ نکاح جب بارات فتحپور ہنسوہ سے بھوپال پہنچی تو فوجِ ریاست نے جلوس و ماہی و مراتب کیساتھ مقام جہانگیر آباد تک استقبال کیا، اس وقت تک بھوپال میں ریلوے لائن کا اجرا نہیں ہوا تھا، رئیسۂ عالیہ خلد مکان کے جانب سے وہ تمام مراتبِ اعزاز عمل میں آئے، جن کا ذکر برادر معظم کے تذکرہ واقعات میں گذر چکا ہے، عالیجناب ہمشیرۂ معظمۂ محترمہ نواب ولیعہد صاحبہ یعنی نواب سلطان جہان بیگم صاحبہ خلد آشیاں نے بھی محفلِ تہنیت منعقد کرکے ضیافت و زر و زیور و پوشاک گران بہا سے عزت افزائی کی، رئیسۂ عالیہ خلد مکاں نے میری اہلیہ موصوفہ کو اعزاز دلہن کا خطاب عطا فرمایا، اور مجکو بعوض عطائے مکان تیس ہزار روپیہ بذریعۂ خط مورخہ دوازدہم شعبان ۱۲۹۸ھ اور مہر خطاب خانی مرحمت فرما کر عزت بالائے عزت عطا فرمائی

شعرائے پائے تخت نے قصائد و قطعاتِ تاریخ و تہنیت لکھکر حضرت والدہ محترمہ کے حضور میں پیش کئے، یہ سب قصائد و قطعات تذکرۂ بزم سخن مؤلفہ راقم الحروف میں طبع ہو کر شائع ہو چکے ہیں،

عطائے اعزاز قبل از نکاح رئیسۂ عالیہ نے پانزدہم ذی الحجہ سنہ ۱۲۹۳ھ مطابق یکم جنوری سنہ ۱۸۷۷ء کو جب دہلی میں عظیم الشان دربار قیصری منعقد ہوا تھا، برادر معظم اور راقم الحروف کو اپنا بیج آف آنر بنا کر خاص اعزاز عطا کیا تھا،

عطائے تمغہ سنہ ۱۲۹۹ھ میں جب رئیسۂ عالیہ دار السلطنت کلکتہ میں ورود فرما ہوئیں، اور ہز اکسلنسی لارڈ رپن صاحب بہادر سابق وائسرائے ہند کی ملاقات کے لئے ڈلہیزگل لاج تشریف لے گئیں، اسوقت راقم الحروف بھی ہمراہ تھا، رئیسۂ عالیہ نے ازراہ مزید شفقت عطائے تمغۂ طلائی سے (جس پر اسم گرامی شاہجہاں کا حرفِ شین منقوش تھا) سرفراز فرمایا،

تمام ملک محروسۂ بھوپال میں تقرر اردلی و سلامی سنہ ۱۳۰۰ھ میں رئیسۂ عالیہ نے ریاست سے نقیب و سواران فوج کی اردلی میری سواری کے ہمراہ بذریعۂ خط مرقومۂ بست و دوم جمادی الاول سنہ ۱۳۰۰ھ مقرر کی، اور تمام ملک محروسۂ ریاست میں غرۂ جمادی الثانی سنہ ۱۳۰۰ھ سے تاحین حیات فوج کی سلامی کا حکم صادر فرمایا،

عطائے خطاب و تقرر القاب و آداب سنہ ۱۳۰۱ھ میں جشنِ تاج محل کے موقع پر خطاب فرزند سعید صفی الدولہ حسام الملک سے مخاطب فرمایا، اور فہر خطاب اپنے دستِ مبارک سے عطا فرمائی، اور خلعت و فیل و اسپ و چنور و ہودج نقرہ و پالکی وغیرہ سے مخلع اور مفتخر فرمایا، خطوط و فرامینِ سرکاری میں راقم الحروف کا حسب ذیل القاب و آداب قرار دیا، قرۂ باصرۂ سعادت غرۂ ناصیۂ سعادت فرزند سعید میر محمد علی حسن خان صاحب حفظہ اللہ و سلمہ وبعد دعوات زیادت عمر و درجات واضح خاطر اقبال توام باد،

من درین رتبہ از کجا لیکن، مور پیرہ در رۂ سلیمان است،

دیگر مراتب اعزاز، | صاحبانِ ذیشان پولیٹکل ایجنٹ بہادر و صاحبانِ عالیشان ایجنٹ نواب گورنر جنرل بہادر و ہزاکسلینسز و یسرایانِ ہند کے رونق افروزی بھوپال کے وقت مجکو مراسم استقبال و مزاج پرسی و مشائعت و شرکت دربار اور تواضع عطر و پان سے عزت بخشی جاتی تھی، اور سرکاری دربار اور سرکاری تقریبوں کے موقع پر اخوان ریاست میں میری نشست کا نمبر پانچوان رکھا گیا تھا

عطائے جاگیر، | اوّلاً مجکو رئیسۂ عالیہ نے ازراہ شفقت ۱۲۸۹ھ میں تا مین حیات مبلغ بارہ ہزار روپیہ سالانہ کی سند جاگیر موّرخہ غرۂ صفر ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۲۷۹ فصلی عطا فرمائی تھی،

تجدید سند جاگیر بطور وثیقۂ کامل، | اس کے بعد ۱۳۰۵ھ میں رئیسۂ عالیہ نے اپنے قدیم شفقتِ مادرانہ و مراحم شاہانہ سے سند جاگیر کی تجدید فرمائی، اور بجائے حین حیات کے چہارم ربیع الثانی ۱۳۰۵ ہجری مطابق ۱۲۹۷ فصلی سے مبلغ بارہ ہزار سالانہ کی سند جاگیر نسلاً بعد نسل بطناً بعد بطن ابداً موبداً مرحمت فرماکر شرف و اختصاص خاص بخشا، اور بذریعۂ خط موّرخہ ہفدہم ربیع الثانی ۱۳۰۷ھ ہدایت فرمائی کہ اس سند کو بطور وثیقۂ کامل نزدیک اپنے رکھو،

تقرر مشاہرہ و عطائے پوشاک، | حضرت والد محترم اپنی جاگیر سے ہم لوگوں کو مصارف سالانہ کے لئے ایک رقم معینہ دیا کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد رئیسۂ عالیہ نے اپنی مادرانہ شفقت سے مبلغ تین سو روپیہ ماہوار میرے اور ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار میری اہلیہ کے مقرر فرمائے، اور مبلغ ساٹھ روپیہ میری اولاد کی تنخواہ روز ولادت سے مقرر فرمائی، اور سالانہ بارہ جوڑے پوشاک کے میرے لئے اور چھ چھ جوڑے پوشاک کے میری اہلیہ اور اولاد کیلئے اپنی ڈیوڑھی خاص سے عطا ہونیکا حکم صادر فرمایا،

روانگی تورج | ۱۳۰۵ھ مین حضرت والد محترم نے ریاست کے اندرونی سیاسی تغیرات اور زمانہ کے روز افزون انقلابات کو پیش نظر رکھکر اور مباش امین از بازی روزگار پر عمل پیرا ہوکر ازراہ دور اندیشی

یہ ارادہ کیا، کہ شہر قنوج میں جو قدیم آبائی وطن ہے، بطور یادگار سلف اور مصالح آیندہ کے لحاظ سے ایک مکان ہم لوگوں کی سکونت کے لئے تعمیر کیا جائے، اور ساتھ ہی اسکے انکی دین پرستی اور معارف نوازی اسکی مقتضی ہوئی کہ جس طرح وہ مجھکو دنیوی مال و متاع سے آسودہ حال دیکھتے ہیں، اسی طرح وہ معارف باطنی کی دولت لازوال سے بھی میرے جیب و دامن کو مالا مال دیکھیں، اسلئے انھوں نے مجکو سفر قنوج کا ایما کیا، اور تعمیر مکان کو میری پسند و مرضی پر محمول کیا، اور سرخیل صوفیاے عصر شیخ وقت حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن صاحب مرادابادی قدس سرہٗ العزیز کے شرف حضوری اور برکات انفاس سے مستفید ہونے کی طرف توجہ دلائی، چنانچہ بیستوین ماہ جمادی الاول ۱۳۰۵ھ کو دوشنبہ کے دن بھوپال سے روانہ ہوکر چہارشنبہ کے روز میں قنوج پہنچا، اور اپنے جدّ بزرگوار حضرت سید علامہ مولانا اولاد حسن صاحب بخاری رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ حضرت مجدد وعصر مولینا سید احمد صاحب بریلوی شہید قدس سرہٗ کے مزار پر انوار کی زیارت و فاتحہ سے شرف اندوز ہوا، نماز ظہر کے وقت باوجود غایت معذرت بعض مریدان و معتقدان خاص جد مرحوم کے اصرار سے مجبور ہوکر جد مرحوم کی مسجد قدیم میں مجکو امامت کرنی پڑی، فراغ نماز کے بعد حضرت جلال ثالث رحمۃ اللہ علیہ وحضرت بالا پیر رح اور حضرت حاجی شریف زندنی رح کی زیارت مزارات و فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا،

روانگی گنج مرادآباد، پھر وہاں سے چوتھی جمادی الثانی کو گنج مرادآباد روانہ ہوا، جمعہ کے دن مغرب کے وقت وہاں پہنچکر حضرت مرشدنا و مولانا مولوی فضل رحمٰن صاحب رح کی خدمت اقدس میں باریاب ہوا، حضرت طہارت گاہ سے برآمد ہوکر حجرہ کی صحنچی میں وضو کر رہے تھے، مجھ کو دیکھکر فرمایا کہ حضرت عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر کے پاس تنہا اور پیدل جایا کرتے تھے، اور حضرت عمر اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس

میں بہت دور سے پیادہ پا آیا کرتے تھے اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ میں وضو کرتا ہوں تم دیکھتے جاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی طرح وضو کیا کرتے تھے، غرض جب وضو اور نماز سے حضرت فارغ ہوئے تو ایک حاضر الوقت صاحب سے میری نسبت فرمایا، کہ یہ امیر آدمی ہیں، ان کو احمد میاں کے گھر میں ٹھیراؤ، تھوڑی دیر میں جناب احمد میاں صاحب خود آکر مجکو اپنے مکان پر لے گئے، رات بھر وہاں قیام رہا، صبح کو نماز فجر کے بعد پھر مجکو حضرت کے دیدار فائض الانوار سے مستفیض ہونے کا موقع ملا، اور میں نے ان کے دستِ شریعت وطریقت پناہ پر طریقۂ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی، قریباً نصف ساعت سے زائد حضرت مراقب رہ کر مجکو اپنی توجّہ اور ہمت باطنی سے مستفید فرماتے رہے، اس کے بعد سر اٹھا کر اپنی زبان فیض ترجمان سے بیتابانہ عشق کے لہجے میں فرمانے لگے، اپنے پیا پر تن من واروں جو داروں سو تھوڑا رے، اسوقت برق وروح کے اتصال اور جذبات اور تجلّیات کے باہمی امتزاج کی میرے دل پر جو ایک پر سرور والہانہ وجدانی کیفیت طاری تھی، اسکو لفظوں میں ادا کرنا میرے لئے قطعًا ناممکن ہے ؎

لطیفہا کہ بہ لفظ و بیان نمی گنجد تو چوں فرشتہ زغیب آمدی و وا گفتی

بہرحال اس کے بعد حضرت بہت سے اشعار فارسی اور اردو اور ہندی کے ایک دلکش انداز اور پر تاثیر لہجہ کیساتھ ساتھ پڑھتے رہے، اُن میں سے صرف یہ دو شعر مجکو یاد رہ گئے، ؎

پروانہ نیستم کہ بہ یکدم عدم شوم شمعم کہ جان گدازم و دم بر نیاورم

در کنز و ہدایہ نتواں یافت خدارا بر صفحۂ دل بیں کہ کتابے بہ ازیں نیست

اخیر صحبت میں جب میں نے رخصت ہونے کا قصد ظاہر کیا، تو حضرت نے فرمایا کہ تم اپنے والد سے کہدینا، کہ ہم تمھارے لئے دعا کیا کرتے ہیں، خدا تمکو اتباع سنت کی توفیق عطا فرمائے، اتباع سنت بہت مشکل ہے، پھر میں حضرت کے پاس سے اٹھکر چلا آیا، تھوڑی دیر کے بعد حضرت حجرہ سے صحن مسجد میں آکر بیٹھ گئے، اور نسائی شریف کا درس جناب احمد میاں صاحب مرحوم کو پڑھانے لگے

میں بھی وہاں جا بیٹھا، دوران سبق میں حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ اسمٰعیل کے معنی جانتے ہو، میں نے عرض کیا کہ آپ ارشاد فرمائیں، حضرت نے کہا کہ اسمٰعیل کے معنی ہیں خدا کا فرمانبردار، جب درس سے فراغت ہوئی، تو آپ نے صحن مسجد میں ٹہلنا شروع کیا، اور میرے قریب تشریف لاکر اور مسکرا کر آہستہ سے ازراہ شفقت میری پشت پر مُکا مارا، اور حجرہ میں تشریف لے گئے، کچھ دیر کے بعد جناب احمد میاں صاحب کی ہمراہ میں پھر حضرت کے حجرہ میں پہنچا، اور توفیقِ الٰہی کے موافق نذر دکھائی، آپ نے زرِ نذرانہ کو خوشی کیساتھ اپنے دامن میں لے لیا، اور وہیں کھڑے کھڑے میرے سامنے تمام زرِ نذرانہ ضرورتمندون اور محتاجون کو تقسیم کر دیا، اور ایک حبہ باقی نہیں چھوڑا، پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، کہ تم کو یہان آنے سے کیا فائدہ ہوا، اپنا نقصان مفت میں کیا، چونکہ میں اسی وقت لکھنؤ روانہ ہونیکے لئے تیار تھا، اور سواری کچھ دور کھڑی ہوئی تھی، میں نے مراجعتِ وطن کی اجازت چاہی حضرت نے خدا حافظ کہکر اور یہ شعر پڑھکر مجکو رخصت کیا ؎

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست   تو نہ پنداری کہ تنہا می روی

اس سفر میں تین روز تک میرا قیام لکھنؤ میں رہا، پھر وہان سے موضع بیتی سادات پرگنۂ ہنسوہ ضلع فتحپور اور جبلپور ہوتا ہوا چہارم جمادی الثانی ۱۳۰۰ھ کو بھوپال پہنچا، اور تمام حالات وواقعات حضرت والد محترم سے بیان کئے، اور شہر قنوج کی سکونت کے متعلق میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، یہ شہر اگرچہ قدیم زمانہ میں ہندوستان کا پایۂ تخت اور راجدھانی رہا ہے، مگر امتدادِ زمانہ اور انقلاب روزگار سے اب وہ ایک قصبۂ تباہ حال سے زائد وقعت نہیں رکھتا، وہاں کے سکنۂ شہر میں بھی کوئی فضیلتِ علم وعمل ودولت وثروت باقی نہیں رہی، اور حضرت والد مرحوم اور اہلِ خاندان کے ترکِ وطن اور ترکِ تعلق کے سبب جو آبائی تعلقات اس سے وابستہ تھے، وہ کلیۃً منقطع ہو چکے تھے، اسلئے میں نے وہاں کی اقامت پسند نہیں کی، اور صاف صاف اپنا خیال حضرت والد مرحوم پر ظاہر کر دیا،

والد مرحوم ابتغاء المنن کے صفحہ ۱۴۸ میں لکھتے ہیں، کہ میں نے بہ مجبوری یہ قصد کیا تھا کہ وطن قدیم بلدۂ کہنہ قنوج ہی میں طرح توطن ڈالی جائے، لیکن غرہ جمادی الثانی ۱۳۰۵ھ کو جب عزیزی میر علی حسن خان نے اسکو ملاحظہ کرکے ناپسند کیا، تو خیال اس جگہ کا چار ناچار خاطر فاتر سے دور کیا گیا، وماتشاؤن الا ان یشاء اللہ رب العالمین۔

وفات زوجۂ اولیٰ راقم الحروف۔ مراجعت وطن کے آٹھ نو ماہ کے بعد میری اہلیہ موصوفہ نے بحالت وضع ولادت بست و یکم ربیع الاول ۱۳۰۶ھ مطابق بست و ششم نومبر ۱۸۸۸ء کو روز دوشنبہ چار ساعت صبح انتقال کیا، رحمہا اللہ تعالیٰ اسوقت سے تمام انتظام خانہ داری اور خردسال اولاد کے غور و پرداخت کا مجکو بذات خود جزاً وکلاً متکفل ہونا پڑا، ؎

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا مجھے
اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو،

میری یہ بیوی نہایت نیک مزاج کم سخن، پاکیزہ خصلت اور عفت و محبت کی مجسم تصویر تھیں غفر اللہ لہا، میرے محب مکرم جناب مولوی جمیل احمد صاحب سہوانی سلمہ اللہ تعالیٰ نے حسب ذیل قطعہ تاریخ لکھا، ؎

بانوی خواجہ زادۂ من حسرتا برد
پیوستہ باد رحمت حق بر روان او،

بے اختیار ریختہ از دیدہ اشک سرخ
برنا و پیر در غم مرگ جوان او،

جاداشت آن کہ در دل ممدوح زادۂ م
امروز حیف کنج لحد شد مکان او،

بے پاسبان و خادمہ یارب نماندہ است
حوران شوند خادمہ و پاسبان او،

بے سایہ زیر چرخ گہی نارمیدہ است
کن فضل خود بزیر زمین سائبان او

ایمن کنش ز مسالت منکر و نکیر،
حرفے زدن بغیر چہ در اندر زبان او

ناخواندہ مہمان نبود تا بر انیش
مہمان خواندہ است بشو میزبان او

دیگر دہم چہ شرح تو دانی و کار تو، او مہمان و رحمت تو میزبان او،

نکاح ثانی راقم الحروف، حضرت والد محترم کو میری زوجۂ اولی کی وفات کے بعد ہی ۱۳۰۶ھ سے میرے نکاح ثانی کی تشویش و فکر دامنگیر ہو گئی تھی، چنانچہ اونھوں نے لکھنؤ میں اسکی سلسلہ جنبانی شروع کی، چونکہ اکابر سادات شرفائے لکھنؤ کے خاندانوں میں خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب مودودی مرحوم کا دودمان سیادت ممتاز شہرت رکھتا تھا، اسلئے یکم جمادی الاول ۱۳۰۶ھ مطابق جنوری ۱۸۸۹ء کو انکی دختر کلاں ماہ جبین بیگم کے ساتھ میرا عقد ثانی بعوض پانچہزار روپیہ مہر معجل کے کر دیا، اعیان لکھنؤ اور اکابر بھوپال تقریب مذکور میں شریک تھے، خطبۂ نکاح حضرت شیخ الحدیث مولینا شیخ حسین صاحب عرب مرحوم متوطن حدیدۂ ساکن بھوپال نے پڑھا، شجرۂ نسب حضرت صاحب مرحوم کا حسب ذیل ہی،

ماہ جبین بیگم بنت خواجہ سید جلال الدین حسین عرف حضرت صاحب بن خواجہ نظام الدین احمد عرف حضرت سید نقیر صاحب مودودی بن سید شاہ خواجہ حسین بن خواجہ سید ابراہیم بن خواجہ غیاث الدین بن خواجہ سید محمد شریف بن سید ابراہیم معروف بخواجہ کمال بن خواجہ سید محمد صالح بن خواجہ سلطان محمد بن خواجہ احمد بن خواجہ افزیں بن خواجہ محمد یحیی بن خواجہ ابی احمد بن سید قطب الدین بن سید رکن الدین بن سید ابی احمد بن سید سلطان الاسلام خواجہ قطب الدین مودودی بن سید ابو یوسف ناصر الدین چشتی بن سید خواجہ محمد بن سید خواجہ سمعان بن سید خواجہ محمد بن سید عبد اللہ بن سید ابن الحسن بن امام جواد بن امام محمد تقی، بن امام موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق، بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن حضرت امام حسین بن حضرت فاطمۃ الزہرا، رضی اللہ عنہا بنت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،

لکھنؤ سے جب بارات روانہ ہو کر بھوپال پہنچی، تو فوج ریاست نے جلوس و ماہی مراتب کے ساتھ بھوپال کے اسٹیشن تک استقبال کیا، میں نے اپنے مکان مسکونہ نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں داخل ہونے سے قبل مسجد نور محل میں نماز دوگانہ تحدیثاً بنعمۃ اللہ ادا کی، شام کو سہ پہر کے وقت رئیسہ عالیہ نے نور محل میں رونق افروز ہو کر عروس کی رونمائی کی رسم ادا کی، اور میری اہلیہ موصوفہ کو

دیکھ کر بہت مسرور ہوئیں، حضرت والد محترم سے مسکرا کر فرمایا، کہ یہ آپ کی نہیں بلکہ خاص میری بہو ہے
پھر کچھ دیر قیام فرما کر وقت مغرب مراجعت فرمائے تاج محل ہوئیں، جمعہ کے روز رئیسہ عالیہ نے تاج
محل پر ایک نہایت پرتکلف محفل ضیافت ترتیب دے کر میری اہلیہ موصوفہ کو افتخار دُولہن کے
خطاب سے سرفرازی بخشی، اور ہم دونوں کو عطائے پوشاک زرنگار اور نذر و زیور طلائی و مرصع سے
مشرف و مفتخر فرمایا،

شعرائے پایۂ تخت حکیم اعظم حسین صاحب سندیلوی، و حافظ سید محمد سورتی صاحب، منشی فدا علی صاحب
فارغ، مولوی عبد الحئی صاحب آسی مدراسی، شیخ محمد صاحب عرب حدیدی یمنی اور مولوی جمیل احمد
صاحب سہوانی نے تہنیت میں قطعات لکھ کر حضرت والد محترم کے حضور میں پیش کئے،

بحمدہ تعالیٰ میری اہلیہ ثانیہ نہایت صالح، نظافت پسند، غایت درجہ فیاض اور عفت و حیا کی مجسم
مرقع ہیں، سیم و زر کی اُن کے دستِ گہر پاش کے سامنے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں، قلب خاشع
اور طبیعتِ متواضع رکھتی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم دونوں کو اور ہماری اولاد کو صراطِ مستقیم اور طریقۂ انیقۂ حضرت
رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قائم و ثابت قدم رکھے، وھو ولی التوفیق،

(باقی)

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب و لہجہ دلآزی اور تعصب سے خالی نہیں
ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولنا
ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا
طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں
جو کام کئے ہیں، وہ بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عمر، **منیجر**

مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم

"برٹش ایسٹ افریقہ کے شہر ممباسہ واقع کینیا سے ہم کو حسب ذیل خط موصول ہوا ہے، جو افادۂ عام کی غرض سے شائع کیا جاتا ہے۔"

"س"

مکرمی معظمی جناب مولینا سید سلیمان ندوی صاحب دام اقبالکم،

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

پچھلے سال ۱۱ فروری ۱۹۲۵ء کے رسالہ معارف کے شذرات میں جناب نے نوآبادیات میں اسلامی تعلیم کی کمی پر روشنی ڈالتے ہوئے مشرقی افریقہ کا ذکر بھی فرمایا تھا، اسی وقت خیال آیا، کہ جناب کی خدمتِ اقدس میں برٹش ایسٹ افریقہ کے عام مسلمانوں کی حالت کا نقشہ پیش کر دوں، لیکن افسوس کہ کاروبار کی الجھنوں نے اس کام کی التوا میں ڈالے رکھا، آج اتفاقاً وہی رسالہ معارف نظر سے گذرا، تو دوبارہ خیال پیدا ہوا، آج اسکو عملی جامہ میں آپکی خدمت میں پیش کر رہا ہوں،

محترم آپنے جو تعلیمی نقشہ اسلامی دنیا کا نوآبادیات کی بابت کھینچا ہے، وہ بالکل درست اور بجا ہے، لیکن آپ یہ سن کر خوش ہوں گے، کہ کینیا کولونی کے ہندوستانی مسلمانوں نے اس کمی کو محسوس کرکے ۱۹۲۳ء میں ایک انجمن دارالسلطنت نیروبی میں قائم کی، جس کا نام انجمن حمایت اسلام رکھا، اس کی کوششوں سے مسلمانوں کی دینی تعلیم کا انتظام ہوگیا ہے، چونکہ موجودہ تجارتی حالات کی وجہ سے انجمن کی مالی حالت اتنی اچھی نہیں، جتنی ہونی چاہئے، پھر بھی اپنے مقدور کے

مطابق کافی سے زیادہ کام کر رہی ہے، اور اب تک مندرجۂ ذیل کام سرانجام دے چکی ہے، انجمن کے سرپرست مولانا حاجی سید عبد اللہ شاہ صاحب اور مولینا عبد المومن صاحب مرحوم تھے، مولینا عبد المومن صاحب پچھلے سال وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ دونوں حضرات مشرقی افریقہ میں عالم جید تھے اور محض مختلف عقائد رکھنے والے مسلمانوں ہی میں نہیں، بلکہ غیر مسلموں میں بھی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے،

۱- مرزائی اعتقادات کی مکمل بیخ کنی کر چکی ہے، کیونکہ یہاں یہ وبا اور فتنہ پھیل چلا تھا،

۲- کینیا کولونی، یوگنڈا، اور ٹانگانیکا کے بڑے بڑے شہروں میں انجمن کی شاخیں قائم ہیں، جو اپنے اپنے شہر میں مسلمانوں کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح میں کوشاں ہیں،

۳- نیروبی میں افریقی مسلمانوں کے لئے اسلامی تعلیم کا انتظام اور تبلیغ اسلام کے لئے خاص مبلغ (جو کہ افریقی لوگوں میں سے ہوں گے) تیار کرنے کا کام، ان کے تمام اخراجات طعام، لباس اور رہائش وغیرہ انجمن برداشت کرے گی،

۴- ان دنوں انجمن نے اپنا پریس منگوایا ہے، جس میں ہفتہ وار اخبار نکلے گا، جو سہ رقمی انگریزی اور اردو میں ہوگا،

۵- اس سے قبل ہفتہ وار ٹریکٹ نیروبی سے اردو زبان میں نکلتے تھے، جو تمام شہروں میں تقسیم کئے جاتے تھے،

۶- انجمن نے ایک عالم مولینا محمد حسین صاحب فاضل دیوبندی کی خدمات حاصل کر لی ہیں، جن کے فرائض مندرجۂ ذیل ہیں، برانچوں کی دعوت پر دوسرے شہروں میں دورہ، خاص نیروبی شہر میں قرآن اور حدیث شریف کا جامع مسجد میں روزانہ درس (جس میں حاضرین کی تعداد تقریباً سو ہوتی ہے) ایک دوسرے بزرگ مولینا محمد حسین صاحب، حضرت مولینا سید حسین احمد صاحب مدنی کی وساطت سے یہاں آئے ہیں،

۷۔ مسلمان بچوں کے لئے مذہبی تعلیم کا انتظام بھی خاص طور پر کیا گیا ہے، اَن پڑھ مسلمانوں کے لئے نائٹ اسکول جاری کئے گئے ہیں،

۸۔ مولینا محمد حسین صاحب کے قبل انجمن نے مولانا لال حسین اختر صاحب کی عارضی خدمات انجمن احمدیہ اسلام لاہور کی معرفت حاصل کی تھیں جنھوں نے اپنی فرائض کو اس طرح تن دہی سے انجام دیا، کہ اُن کی کوششوں اور خداوند کریم کے فضل و کرم سے انجمن کی مالی حالت بھی درست ہوگئی، بر انجمن بھی کافی دلچسپی لینے لگ گئی ہیں، اور مرزائیت کو انھوں نے موت کے گڑھے میں ڈال دیا ہے، اس کام میں وہ خاص ملکہ رکھتے ہیں،

۹۔ ہر اتوار کو اسلامی لکچر ہوتا ہے جس میں ہر خیال کے مسلمان شریک ہوتے ہیں، اس سرزمین میں اگرچہ ہر عقیدہ کے مسلمان ہیں، لیکن تمام کام آپس میں اتحاد اور اتفاق سے طے پاتے ہیں، کوئی مذہبی جھگڑا نہیں، صرف مرزائی فرقہ ایک لعنت تھی، اس کا خداوند کریم نے کافی سدباب کردیا،

۱۰۔ اب انجمن قرآن حکیم کا سواحلی زبان (یعنی افریقہ میں جو عام رائج زبان ہے) میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کرتی ہے، اور ساتھ ہی سیرۃ الرسول بھی اس زبان میں شائع کرے گی،

اخیر میں ایک افسوسناک خبر بھی گوش گذار کر دیتا ہون، کہ انجمن مذکور کے محترم صدر سید احمد اللہ صاحب کوکن (جو بڑے بارسوخ اور متمول شخص تھے، اور چار سال سے انجمن کے صدر تھے) اس سے ایک ہفتہ قبل موٹر کار کے حادثہ میں داغِ مفارقت دے گئے، اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعُون، ان کی موت نے مشرقی افریقہ کو چند دنوں کے لئے ماتم کدہ بنا دیا، سید صاحب مرحوم نے چار سال تک جس تن دہی سے انجمن کی خدمت کی، اس کی مثال ملنی مشکل ہے، ڈاکٹر خالد شیلڈریک جب یہ زوبلی آکر ایک ہفتہ رہے، تو اونھوں نے صدر صاحب کی عدم موجودگی میں یہ الفاظ فرمائے، کہ میں تمام اسلامی دنیا میں پھر آیا ہوں، لیکن جس قسم کا صدر یہاں کی انجمن کو ملا ہے، اس قسم کے آدمی شاذ ونادر ہی دیکھنے میں آئے"

آپ کا تابعدار محمد اسمٰعیل ٹھیکیدار،
ممباسہ (کینیا)

تلخیص و تبصرہ

نادر شاہ ایرانی اور اتحادِ اسلامی

نادر شاہ نے شیعہ اور سنیوں کو باہم متحد کرنے کی جو کوشش کی تھی، اس کا مختصر تذکرہ معارف اپریل ۱۹۲۳ء کے مضمون خلافت میں آج سے پندرہ سال پہلے گذر چکا ہے، اب مسلمان (کلکتہ) کے گذشتہ عید نمبر میں ایک مفصل مضمون حوالۂ قلم ہوا ہے، اس کوشش میں علامہ عبد اللہ سویدی کی خدمت بھی بہت نمایاں تھی، اور موصوف نے اس پر ایک رسالہ الحجج القاطعہ تحریر فرمایا تھا جس کے بعض حصے اس مضمون میں نقل کئے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوگا، کہ کن اسباب کی بنا پر یہ کوشش ناتمام رہی، اب آج تمام مسلمانوں کے لئے یہ قابلِ غور مسئلہ ہے، کہ اب جب اسلام کے سیاسی حالات میں عظیم الشان تغیر پیدا ہو چکا ہے، اور سنیت اور شیعیت ترکی اور ایرانی سلطنتوں کے تعمیری اجزاء باقی نہیں رہے، ان ہی مقررہ اصول کے طرز پر فریقین کے درمیان کیا اب صلح کی دفعات مرتب نہیں ہوسکتیں، ؟ خصوصًا اس حالت میں کہ سلطان ابن سعود نے حرمین المحترمین سے چار مصلوں کی بدعت بھی مٹا دی ہے ؛

" متعدد فتوحات کے بعد جب ۱۱۴۸ھ میں نادر شاہ وادی مغاں میں داخل ہوا تو اعیانِ سلطنت نے ایران کا تاج اس کے سامنے پیش کیا، لیکن اس نے تاج کے قبول کرنے سے اس وقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک شیعہ اور اہلِ سنت کا اختلاف دور نہ ہو جائے، تاریخ جہاں کشا میں ہے کہ اس نے

ایرانی سرداروں سے حسب ذیل گفتگو کی:۔

نبی کریم صلعم کی وفات کے بعد آپ کے چار صحابہؓ خلافت پر مامور ہوئے، اس واقعہ کو ہندوستان روم (ترکی) ترکستان اور دوسرے ملک نے تسلیم کر لیا ہے، قدیم زمانہ میں ایران کا بھی یہی عقیدہ تھا، پھر شاہ اسمعیل صفوی نے ملکی اسباب کی بنا پر اُسے ترک کر دیا، اگر اہل ایران چاہتے ہیں کہ میں بادشاہی قبول کروں، اور وہ خود اپنی اصلاح کے بھی خواہشمند ہیں، تو ضروری ہے کہ وہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ اختیار کر لیں، جو ہمارے آبا و اجداد کا مسلک تھا، چونکہ امام جعفر صادق کو جو ہمارے نبی کی اولاد میں ہیں، تمام مسلمان امام تسلیم کرتے ہیں، نیز چونکہ اہل ایران انکے مسلک سے واقف ہیں، لہذا انھیں چاہئے کہ امام موصوف کے مسلک کو اپنا مذہب بنا لیں"،

لوگوں نے یہ شرط منظور کی، اور ایک محضر تیار کرکے اس پر اپنی مہریں ثبت کر دیں، اس کے بعد نادر شاہ نے تاج قبول کر لیا، اور اس واقعہ کی اطلاع امیر المومنین سلطان ترکی کی خدمت میں بھیجی تاکہ دولت عثمانیہ اور حکومت ایران کے اختلافات دور ہو جائیں، اور دوستانہ تعلقات پھر قائم ہو جائیں، نادر شاہ نے دربار خلافت میں جو مراسلہ بھیجا، اسمیں مندرجہ ذیل امور کی درخواست بھی کی:۔

۱۔ چونکہ اہل ایران ان عقائد سے تائب ہو گئے ہیں، جو اب تک بنائے مخالفت تھے اس لئے امید ہے کہ امیر المومنین اور علماے دولت عثمانیہ جعفری مذہب کو اسلام کا پانچواں مذہب تسلیم کرین گے،

۲۔ حرم کعبہ میں چار مصلوں کے علاوہ ایک پانچویں مصلے یعنی جعفری مُصلّے کا اضافہ کر دیا جائے تاکہ ہمارے آدمی اپنے امام کے پیچھے نماز ادا کر سکیں،

۳۔ ایرانی زائرین کو ایک ایرانی میر حج کی قافلہ سالاری میں مکہ معظمہ جانے کی اجازت دیجائے اور عثمانی عمّال اس قافلے کے لئے ویسی ہی سہولتیں بہم پہنچائیں جیسی مصر اور شام وغیرہ کے قافلوں

کو پہونچائی جاتی ہیں،

۴- جنگ کے قیدیوں کو جو دونوں حکومتوں میں ہیں، آزاد سمجھا جائے، اور انہیں غلام نہ بنایا جائے،

۵- دونوں حکومتیں اپنے مستقل سفیر ایک دوسرے کے دار السلطنت میں متعین رکھیں تاکہ باہمی معاملات بہ حسن وخوبی طے ہوتے رہیں،

چونکہ باب عالی میں مذکورۂ بالا معروضات بے اثر رہے، اسلئے جب ۱۱۵۶ھ ہجری میں نادرشاہ نجف گیا، تو اُس نے سلطان سے ان مطالبات کی منظوری حاصل کرنے کی ایک بار اور کوشش کی، اس نے اپنی سلطنت کے تمام بڑے بڑے علما، اور سربرآوردہ اشخاص کو دعوت دی، کہ ایک مجلس منعقد کرکے معاہدۂ مغان کی تجدید وتصدیق کریں، چنانچہ احمد پاشا والی بغداد کو بھی لکھا گیا کہ وہ ایک ایسا عالم روانہ کرے، جو دینیات کا فاضل ہو تاکہ ثالث کی حیثیت سے فریقین کے اختلافات دور کرکے اون کو باہم ملا سکے، احمد پاشا نے اس خدمت کے لئے علامہ عبد اللہ سویدی کو منتخب کیا، جو اپنے وقت میں بغداد کے سب سے بڑے فاضل تھے،

یہ مجلس کامیاب ہوئی، معاہدۂ مغان از سرِ نو مستحکم کیا گیا، نادرشاہ نے مرزا محمد علی نائب وزیر کو ایران کے تمام حصوں میں مجلس کے فیصلہ کا اعلان کرنے اور خلفاے اربعہؓ کے نام تمام ایران میں جمعہ کے خطبے میں داخل کرانے کے لئے روانہ کیا، اس نے مجلس کی روئداد دربارِ خلافت میں قسطنطنیہ بھیجی، اور اپنے مطالبات کی منظوری کے لئے پھر استدعا کی، ترکی شیخ الاسلام اور سلطان محمود خان پہلے دو مطالبات پر راضی نہیں ہوئے، یعنی جعفری مذہب کو تسلیم کرنا، اور کعبہ میں ایک پانچواں مصلّی قائم کرنا، نادرشاہ نے بھی معاملہ کی دشواری دیکھ کر زیادہ زور نہیں دیا، اور بقیہ تین مطالبات کی منظوری پر قناعت کر لی، ۱۱۵۹ھ ہجری میں بالآخر سلطنتِ عثمانیہ اور حکومتِ ایران کے درمیان ایک صلحنامہ مرتب ہوگیا،

علامہ عبد اللہ سویدی نے ایک رسالہ الحجج القاطعہ فی اتفاق الامم الاسلامیہ کے عنوان سے لکھا ہے جس میں انھوں نے بغداد سے نجف تک کے سفر اور اس مجلس کے حالات بیان کئے ہیں، اسکے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"میں دوران سفر میں فریقین کے امکانی دلائل کے سوچنے اور مرتب کرنے نیز جو اعتراضات پیش کئے جا سکتے تھے، ان کے جوابات تیار کرنے میں تمامتر منہمک رہا، یہ انہماک اور اعتراضات کے جوابات معلوم کرنے اور شبہات کے دور کرنے کی کوشش اس وقت تک جاری رہی، جب تک میں نے اپنے ذہن میں سو سے زیادہ امکانی سوالات اور ہر سوال کے ایک، دو یا تین جواب اس شبہہ کی مناسبت سے جو اس کے متعلق پیدا ہو سکتا تھا، مرتب نہ کر لیا، ان باتوں کا اثر مجھ پر اتنا پڑا کہ میں بیمار ہو گیا"

اس کے بعد علامہ موصوف نادرشاہ کی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں:-

"میں نے اپنے سامنے ایک دراز قد آدمی کو دیکھا جیسا کہ اسکی نشست سے اندازہ ہو سکتا تھا اس کے سر پر قلنسوہ کے مثل جو اہل ایران پہنتے ہیں، ایک بلند چوکور ٹوپی تھی، اس پر ایک عمامہ تھا جو موتیوں، لعل، ہیرے اور دوسرے قیمتی جواہرات سے آراستہ تھا، گلے میں موتیوں اور لعل کا ایک ہار تھا، بازوؤں پر بازوبند تھے، جن پر موتی، ہیرے اور لعل ٹکے ہوئے تھے، اس کے چہرے سے بوڑھاپے کی علامتیں ظاہر تھیں، سامنے کے دانت گر گئے تھے، عمر تقریباً اسی سال تھی، داڑھی میں نیل کا خضاب تھا، بھنویں مثل دو کمانوں کے تھیں، آنکھیں کسی قدر بھوری لیکن خوبصورت تھیں، چہرہ بحیثیت مجموعی خوشنما تھا، جوں ہی میری نظر اس پر پڑی، میرے دل سے تمام ہول زائل ہو گیا، اور اسکی طرف سے جو خوف تھا، وہ سب جاتا رہا، وہ پہلے کی طرح مجھ سے ترکمانی زبان میں مخاطب ہوا، اور پوچھا کہ احمد خان کیسا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بخیریت ہے، پھر اس نے پوچھا کیا تم جانتے ہو

کہ میں نے تمکو کیوں بلایا ہے، ؟ میں نے کہا نہیں، تب اُس نے کہا ، میری مملکت میں دو گروہ ہیں یعنی ترکستان اور افغانستان کے لوگ جو ایرانیوں کو کافر کہتے ہیں، اور مذہب میں کفر میرے نزدیک ایک نفرت انگیز چیز ہے،

ایسا نہ ہونا چاہئے، کہ میری حکومت کے اندر بعض جماعتیں بعض دوسری جماعتوں کو کافر کہیں، اب میں تمھیں اپنا وکیل مقرر کرتا ہوں، اور تم سے کہتا ہوں کہ تمام زندقہ کا استیصال کردو، اور ان تینوں گروہوں کے درمیان جو معاہدہ ہو، میری طرف سے اس کے گواہ رہو، جو کچھ تم سنو اور دیکھو، اسکی اطلاع مجھے دو، نیز احمد خاں کو بھی اس سے مطلع کرو"، پھر اوس نے مجھے رخصت ہونے کی اجازت دی، اور حکم دیا کہ میرا قیام اعتماد الدولہ کے مکان پر ہو، اور بعد نماز ظہر میں ملا باشی سے ملاقات کروں، میں حضور شاہ سے بڑی خوشی اور مسرت کی حالت میں نکلا، کیونکہ نائبی کی خدمت مجھے عطا کی گئی تھی"،

"جب میں ملا باشی کی خدمت میں پہنچا تو وہ نکل کر میرے استقبال کے لئے آیا، وہ ایک چھوٹے قد کا آدمی ہے، گندمی رنگ، جلنے سے جو نشان کنپٹی پر پڑ گیا ہے، وہ سر کے درمیان تک پہنچا ہے، میں گھوڑے سے اتر پڑا، اس نے مجھے تعظیم دی، اور تخت پر بٹھایا، اور خود ایک شاگرد کی طرح میرے سامنے بیٹھا، پھر ہمارے درمیان گفتگو شروع ہوئی،" (اوس کے بعد مذہبی مباحثہ کی تفصیلات ہیں)

"شاہ کو اس بحث کی اطلاع بالکل صحیح صحیح دے دی گئی، اُوس نے علماے ایران، علماے افغانستان اور علماے ماوراالنہر کو حکم دیا، کہ جمع ہو کر بدعت و زندقہ کے ختم کرنے کا فیصلہ کریں، مجھ سے کہا کہ تم میرے نمایندہ کی حیثیت سے انکو دیکھتے رہو، اور زیر بحث مسائل پر جو اقرار نامہ انکے درمیان مرتب ہو اسکے گواہ رہو"

جلسہ کے روز مجمع بہت تھا حضرت علیؓ کے روضہ کے پیچھے ایران کے ستر علما مجتمع ہوئے ان میں مفتی اردولان کے سوا اور کوئی سُنّی نہ تھا، میں نے کاغذ اور قلم دوات منگوائی، اور جو لوگ ان میں سے زیادہ اہم تھے، ان کے نام لکھ لئے............اس کے بعد افغان علما آئے، میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے........تھوڑی دیر کے بعد علماے ماوراء النہر آئے جنکی تعداد سات تھی...........میں نے ان کے نام بھی لکھ لئے، جب مجلس باقاعدہ طور پر بیٹھ گئی، تو ملّا باشی نے بحر العلم (یہ لقب علامہ ہادی خواجہ کا تھا، جو علمائے ماوراء النہر میں سب سے زیادہ ممتاز تھے) کو مخاطب کرکے پوچھا، "کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں"؟ یعنی مجھے، انھوں نے جواب دیا، کہ "نہیں" تب ملّا باشی نے کہا، "یہ شیخ عبداللہ آفندی ہیں، جو سُنّی فرقہ کے اکابر علما میں ہیں، انھیں وزیر احمد پاشا نے شاہ کی دعوت پر بھیجا ہے تاکہ اس جلسہ میں ثالث کی حیثیت سے موجود رہیں، یہ شاہ کے وکیل ہیں، لہذا اگر ہمارے درمیان کسی بات پر اتفاق ہوگا، تو وہ ہم سب کی طرف سے اوس کے گواہ ہوں گے، اب بتائیے آپ کن باتوں کی وجہ سے ہم پر کفر کا الزام رکھتے ہیں، تاکہ ہم شیخ عبداللہ کی موجودگی میں ان سے باز آجائیں، لیکن حقیقت یہ ہے، کہ ابو حنیفہ کے مسلک کی رو سے بھی ہم کافر نہیں ہیں، وہ اپنی کتاب جامع الاصول میں کہتے ہیں، کہ اسلام پانچ فرقوں کو تسلیم کرتا ہے، اور انھوں نے امامیہ فرقہ کے پانچویں مذہب ہونے کا اقرار کیا ہے، صاحب المواقف بھی امامیہ فرقہ کو اسلامی فرقوں میں شمار کرتے ہیں، ابو حنیفہ اپنی فقہ الاکبر میں کہتے ہیں کہ اہل قبلہ کو کافر نہ کہو اور وہ سید جس کا نام میں اسوقت بھول رہا ہوں، انھوں نے ہدایۃ الفقہ الحنفی کی شرح میں لکھا ہے، کہ یہ صحیح ہے کہ امامیہ فرقہ اسلامی فرقوں میں سے ایک ہے، لیکن جب آپ کے علماے متاخرین آئے، تو انھوں نے ہمکو کافر کہنا شروع کیا، اور اسی طرح ہمارے علمائے متاخرین آپ لوگوں کو کافر کہنے لگے، ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ آپ کافر ہیں نہ ہم، بہرحال وہ باتیں بتائیے، جو آپکے علماے متاخرین

نے بیان کی ہیں، اور جن کی بنا پر آپ لوگوں نے ہمیں کافر کہا ہے تاکہ ہم انہیں ترک کردیں"،

ہادی خواجہ بحر العلم :- آپ کافر ہیں اسلئے کہ شیخین رضؓ پر تبرا کہتے ہیں،

ملا باشی :- ہم شیخین پر تبرا کہنا چھوڑتے ہیں،

بحر العلم - آپ کافر ہیں اسلئے کہ صحابہ کو گمراہ اور کافر بتاتے ہیں،

ملا باشی :- تمام صحابہؓ عادل تھے،

بحر العلم :- آپ حضرات ابو بکرؓ وعمرؓ پر حضرت علیؓ کو فضیلت دیتے ہیں، آپ کہتے ہیں رسول اللہ صلعم کے بعد خلافت حضرت علیؓ کو ملنی چاہئے تھی،

ملا باشی :- رسول اللہ صلعم کے بعد سب سے بہتر ابو بکرؓ تھے، ان کے بعد عمرؓ، تب عثمانؓ اور پھر علیؓ بن ابی طالب، اور اُن کا منصب خلافت پر مامور ہونا اُن کی فضیلت کی ترتیب کے مطابق تھا،

بحر العلم :- جب صورتِ حال یہ ہے، تو آپ مسلمان ہیں، ہمارا نفع نقصان آپ کا نفع نقصان ہے،

سب لوگوں نے کھڑے ہو کر ہاتھ ملائے، اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی،

تینوں گروہوں نے جلسہ کی کارروائی اور اپنے فیصلہ کی مہر سے تصدیق کرائی ۲۴ شوال چہارشنبہ کے روز قریب مغرب جلسہ برخاست ہوا"،

دوسرے روز نادرشاہ کے حکم سے یہ مجلس پھر منعقد ہوئی، اور شاہی مفتی آقا حسین نے نادرشاہ کا فرمان پڑھ کر سنایا، وہ فرمان یہ تھا :-

"بلاشبہہ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کاملہ سے نبیوں کا بھیجنا مقرر فرمایا، وہ یکے بعد دیگرے نبیوں کو بھیجتا رہا، یہاں تک کہ سب سے آخر ہمارے نبی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، جب آپکا انتقال ہوا، تو چونکہ آپ نبیوں اور رسولوں میں سب سے آخری تھے، اسلئے آپ کے صحابہؓ نے

آپ کی جانشینی کے لئے اپنے میں سے سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دانشمند شخص ابو بکر صدیقؓ بن ابی قحافہ کو منتخب کیا، انھوں نے جمع ہو کر بالاتفاق حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا فیصلہ کیا، اور سب نے مل کر اُن کی اطاعت اور وفاداری کا حلف لیا، ان میں حضرت علیؓ بھی شامل تھے، انھوں نے بھی بہ رضا و رغبت اور بغیر کسی جبر یا دباؤ کے یہ حلف لیا، اس طرح بیعت اور خلافت کی تصدیق ہوئی اور صحابہ کا اتفاق آرا اس واقعہ کا قطعی ثبوت تھا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کی تعریف فرمائی ہے کہ "بیشک اللہ مومنوں سے خوش ہوا جب کہ انھوں نے درخت کے نیچے تمھاری اطاعت کا حلف لیا" یہ صحابہ تعداد میں سات سو تھے، اور حضرت صدیقؓ کی بیعت کے وقت سب موجود تھے، نبی کریم صلعم نے فرمایا کہ "میرے صحابہ مثل ستاروں کے ہیں، ان میں سے جس کسی کی پیروی کروگے ہدایت پاؤگے" حضرت ابو بکر صدیقؓ نے خلافت کیلئے اپنا جانشین حضرت عمرؓ بن الخطاب کو نامزد کیا، اور تمام صحابہ نے ان کے سامنے بیعت کی جس میں حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی شامل تھے، اس طرح حضرت عمرؓ کی بیعت صحابہ کے متفق علیہ فیصلہ کے مطابق بھی تھی، اور خود خلیفہ کی ہدایت کے مطابق بھی، حضرت عمرؓ نے خلافت کا مسئلہ چھ آدمیوں کی ایک مجلس کے سپرد کر دیا، جس میں ایک حضرت علیؓ بن ابی طالب بھی تھے مجلس نے حضرت عثمانؓ بن عفان پر اتفاق کیا، جب وہ اپنے گھر میں شہید کئے گئے، اور اپنا جانشین نامزد نہ کر سکے، تو خلافت کا عہدہ معطل رہا، پھر صحابہ نے اس روز سہ پہر کو حضرت علیؓ بن ابی طالب کی خلافت پر اتفاق کیا، یہ چاروں حضرات رض ایک ساتھ ایک مقام پر اور ایک وقت میں تھے، لیکن ان کے درمیان کبھی کوئی لڑائی جھگڑا یا تکرار نہیں ہوئی، بر خلاف اس کے وہ ایک دوسرے کا اسقدر احترام اور مدح سرائی کرتے تھے کہ جب حضرت علیؓ سے شیخینؓ کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ "وہ دو راستباز اور عادل رہنما تھے، وہ حق پر زندہ رہے، اور حق پر مرے"، اسی طرح جب حضرت ابو بکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا "کیا تم میرے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہو، جب کہ علیؓ تمھارے درمیان میں ہیں" آپ

اہل ایران تم کو معلوم ہونا چاہئے، کہ ان حضرات کی فضیلت اور جانشینی کی ترتیب وہی تھی، جو بیان کی گئی، اب اگر تم میں سے کوئی شخص ان پر تبرا کہے گا، یا ان کی عیب جوئی کرے گا، تو اس کی دولت اُس کے بال بچے، اس کے اعزہ و اقربا، اور اس کا خون شاہ کے لئے جائز ہو جائے گا، اور ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ اُس کے فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو گی، جب تم نے ۱۱۴۸ھ میں وادی مغاں میں میری وفاداری کا حلف لیا تھا، تو میں نے یہ شرط تم پر پہلے ہی عائد کر دی تھی، کہ تبرا یک قلم موقوف کر دیا جائے گا، چنانچہ اب میں اسکو بند کرتا ہوں، آئندہ اگر کوئی صحابہ پر تبرا کہے گا تو میں اُسے قتل کر دوں گا، اس کے بال بچوں کو قید اور اسکی جائداد کو ضبط کر لونگا، زمانہ قدیم میں مملکتِ ایران یا ان ممالک میں جو ایرانی علاقوں کے اطراف میں تھے، ان شرمناک بدزبانیوں کی قسم کی کوئی چیز نہ تھی، ان کا رواج بدذات شاہ اسمٰعیل صفوی کے عہد میں ہوا، اور اُس کے جانشین اُسی کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، یہاں تک کہ تبرا ترقی کرتا گیا، بدعت و زندقہ ہر طرف پھیل گیا، اور رخنے وسیع ہو گئے، یہ ۹۰۶ ہجری میں ہوا، ان نفرت انگیز باتوں کو شائع ہوئے تین سو برس گذر چکے ہیں، ...."

شاہی فرمان کے نیچے اسی کاغذ پر ایک اقرار نامہ اہلِ ایران کی طرف سے درج تھا، وہ یہ تھا، "ہم لوگوں کو قبول ہے کہ صحابہ پر تبرا کہنا بالکل موقوف کر دیا جائے، ہم ان کی فضیلت اور ترتیبِ خلافت کو جیسا کہ اس دستاویز میں مذکور ہے تسلیم کرتے ہیں، ہم میں سے جو شخص تبرا کہے یا ان معاہدوں کے خلاف کچھ زبان سے نکالے اُس پر خدا کی لعنت، اسکے فرشتوں کی لعنت اور تمام نوع انسانی کی لعنت ہو، اور ہم لوگوں پر نادر شاہ کا غضب نازل ہو، اور ہماری جائداد، خون اور بال بچے اس کے لئے جائز ہو جائیں"،

ایرانیوں نے اس اقرار نامہ پر اپنی مہریں لگائیں، اس کے نیچے نجف، کربلا، حلات اور

خوارزم کے لوگوں کی طرف سے بھی ایک اقرارنامہ تھا، اس کا مضمون بھی وہی تھا جو اہل ایران کے اقرارنامہ کا، پھر اسکے نیچے افغانوں کی طرف سے حسب ذیل اقرارنامہ تھا :-

"جب تک اہل ایران معاہدہ کے پابند رہیں گے، اور اس کی خلاف ورزی نہ کریں گے اس وقت تک وہ اسلامی فرقوں میں شمار ہوں گے، اور ان کا نفع نقصان مسلمانوں کا نفع نقصان سمجھا جائے گا"،

ان لوگوں نے بھی اپنے اقرارنامہ پر اپنی مہریں ثبت کیں، اس کے علاوہ علماے ماوراءالنہر کی طرف سے ایک اقرارنامہ تھا جس کا مضمون افغانوں کے اقرارنامہ کے مثل تھا، انھوں نے بھی اپنی مہریں لگائیں، تب میں نے دستاویز کے سرے پر اپنی یہ شہادت درج کی :-

"میں اس معاہدہ کی تصدیق کرتا ہوں جس پر تینوں جماعتوں نے اتفاق کیا ہے، اور اس پر پابند رہنے کا وعدہ کیا ہے، نیز اس امر کی کہ انھوں نے اپنے اس اقرارنامہ کا مجھے گواہ بنایا ہے"،

نادر شاہ نے علامہ سویدی کو بلاکر ان کا شکریہ ادا کیا، اور مجلس کی کامیابی پر نہایت مسرت ظاہر کی، دوسرے روز جمعہ کو اسکے حکم سے کوفہ کی مسجد میں خلفاے اربعہ کے نام خطبہ میں بالترتیب پڑھے گئے، اور سلطان محمود خاں عثمانی اور اس کے بعد نادر شاہ کے لئے دعا کی گئی، نماز جعفری طریقہ کے مطابق ادا ہوئی، پھر علامۂ موصوف کو بغداد واپس جانے کی اجازت ملی، اور ان کے ساتھ معاہدہ مذکور اور اس خطبہ کی ایک نقل بھی روانہ کی گئی،

"ع ز"

امریکہ میں قتل کی گرم بازاری

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں قتل کے واقعات کا اوسط تقریباً بارہ ہزار سالانہ رہتا ہے، اور یہ آب سے دس سال قبل کی بہ نسبت کم ہے، ڈاکٹر فریڈریک ہوفمین (Dr. Frederick Hoffman) ماہر اعداد و شمار کے بیان کے مطابق ۱۹۲۵ء میں مردم کشی کا اوسط (۱۱/۲) فی لاکھ تھا جو ۱۹۳۵ء میں (۸/۱) فی لاکھ تک اتر آیا، ۱۹۲۵ء کے بعد اس جرم کا سب سے زیادہ ارتکاب ۱۹۳۳ء میں ہوا تھا جبکہ ریاستہائے متحدہ میں (۱۲۱۲۴) آدمی قتل کئے گئے تھے یعنی (۹/۶) فی لاکھ ۱۹۲۸ء میں یہ اوسط (۸/۸) تھا لیکن اسکے بعد کساد بازاری کے سالوں میں ترقی کرکے ۱۹۳۳ء میں (۹/۶) تک پہنچ گیا ۱۹۳۴ء سے اس میں پھر تخفیف ہو رہی ہے لیکن اس تخفیف کے باوجود امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت دوسرے ملکوں کے اب بھی زیادہ ہوتے ہیں، مثلاً انگلستان اور ویلز میں مردم کشی کا اوسط ۱۹۳۴ء میں صرف (۶/۰) فی لاکھ تھا، کناڈا میں (۱/۳) اور اٹلی میں (۲) فی لاکھ، فن لینڈ میں البتہ ۱۹۳۲ء کا اوسط (۹) فی لاکھ تھا، اور رومانیا میں (۶/۴) فی لاکھ،

اگرچہ بحیثیت مجموعی امریکہ میں قتل کے واقعات بہ نسبت پہلے کے اب کم ہو رہے ہیں، تاہم وہاں نوجوان قاتلوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے، دسمبر ۱۹۳۶ء میں نیویارک کے قیدخانہ سنگ سنگ (Sing Sing Prison.) میں قتل کے مجرموں کی تعداد جن کو سزائے موت کا

کم ہو چکا تھا (۲۳) تھی، ان میں سے (۹) کی عمریں اکیس سال سے کم تھیں بعض سترہ سال کے تھے، بعض اٹھارہ انیس اور بیس سال کے، ان سب نے روپیہ کی خاطر قتل کئے تھے، ان (۹) کے علاوہ بقیہ (۱۴) میں صرف دو کی عمریں اکیس سال سے زیادہ تھیں، نیویارک کے علاوہ ریاستہائے متحدہ کے تمام دوسرے حصوں میں بھی ہزاروں نوجوان قاتل قیدخانوں میں بند ہیں، ۱۹۳۶ء کے پہلے نو مہینوں میں (۲۱) سال سے کم کے جو مجرم گرفتار کئے گئے، ان کی تعداد (۴۵۹۹۵) تھی، ان میں (۵۲۶) قتل کے مجرم تھے، ۱۹۳۶ء کے ان ہی مہینوں میں گرفتار شدہ مجرموں کی تعداد میں (۲۱) سال سے کم عمر والوں کا تناسب (۱۷) فی صدی تھا، ۱۹۳۵ء میں اور اس کے قبل چار سال تک (۱۹) سال کے مجرموں کی تعداد ہر عمر کے مجرموں کی انفرادی تعداد سے زیادہ تھی،

امریکہ میں قتل کی وبا اسقدر عام ہے کہ وہاں کے محکمۂ تفتیش جرائم کا ایک افسر جارج شٹیل (George Schattle.) بیان کرتا ہے، کہ "ریاستہائے متحدہ، امریکہ میں جو جرم سب سے زیادہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے، وہ مردم کشی کا جرم ہے"، اس کے پیش کردہ اعداد و شمار کی رو سے ہر سال تقریباً بارہ ہزار واقعات قتل کے ہوتے ہیں، لیکن گرفتاریاں صرف نو ہزار ہوتی ہیں، ان نو ہزار قیدیوں میں سے سزائے موت اوسطاً صرف (۱۱۰) کو ملتی ہے، قتل کے نشتر فی صدی واقعات میں جیوری سزائے موت کا فیصلہ صادر نہیں کرتی، یا مجرم بری کر دیئے جاتے ہیں، افسر مذکور کی رائے ہے، کہ قتل کی یہ گرم بازاری پبلک اور جیوری کی بیجا ہمدردی کی وجہ سے ہے، وہ لکھتا ہے کہ قاتلوں کی گرفتاری کا معاملہ اتنا دشوار نہیں ہے، جتنا ان کے اثبات جرم اور سزا کا

جنگ جو کی امن پسندی اور نوبل انعام کا عطیہ

حال میں اوسلو (ناروے) کی نوبل پرائز کمیٹی نے اعلان کیا ہے، کہ ۱۹۳۵ء کا انعام امن (Peace Prize) کارل فان اوسٹیزکی (Karl von Ossietzky

اور ۱۹۳۶ء کا کارلوس ساویدرالاماس (Carlos Saavedra Lamas) وزیر خارجہ آرجنٹائن (جنوبی امریکہ) کو عطا کیا گیا، یعنی کمیٹی مذکور کے نزدیک ان دونوں اشخاص نے دنیا میں تحریک امن کو ترقی دینے میں سب سے زیادہ سعی کی ہے، اور اس صلہ میں دنیا کے سب سے بڑے انعام نوبل پرائز کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں، اوسٹینز کی جنگ عظیم میں چار سال تک جرمن فوج کا ایک افسر رہ چکا ہے، اپنے تجربات کی بنا پر وہ بعد میں جنگ کا مخالف ہوگیا، اور ایک اخبار نکال کر صلح و امن کی تبلیغ شد و مد کے ساتھ شروع کردی، اس تبلیغ کے سلسلہ میں اُس نے بعض ایسے مضامین بھی شائع کئے جن میں حکومت جرمنی کے فوجی معارف پر نہایت سخت اعتراضات کئے گئے تھے، چنانچہ حکومت نے اسے گرفتار کرکے دو سال کے لئے قید کردیا، رہائی کے بعد جب ۱۹۳۳ء میں نازی حکومت برسراقتدار آئی، تو اس نے پھر اس داعی امن کو گرفتار کرلیا، ابھی حال میں وہ اپنی مدت پوری کرکے دوبارہ قید سے چھوٹا ہے، قید کے دوران ہی میں نوبل پرائز کمیٹی نے اس کے انعام کا اعلان کیا، اس مسئلہ پر کمیٹی کے ارکان میں شدید اختلاف تھا، چنانچہ کابینۂ ناروے کے دو ممبروں نے جو اس کمیٹی کے بھی رکن تھے، اس بنا پر کمیٹی کی رکنیت سے استعفا دیدیا کہ اوسٹینز کی کو انعام دینے کی وجہ سے غیر حکومتوں کے جذبات اور اغراض پر بُرا اثر پڑے گا، برلن کا ایک سرکاری بیان نوبل کمیٹی کے اس فیصلہ کی نسبت لکھتا ہے، کہ "یہ ایک گستاخانہ اشتعال انگیزی، اور جدید جرمنی کے لئے ایک توہین ہے" اوسٹینز کی کے متعلق بیان مذکور میں ہے کہ "وہ اپنے وطن کا غدار ہے، جس کے جرم کا فتویٰ ملک کی سب سے بڑی عدالت صادر کرچکی ہے"، قرائن سے معلوم ہوتا ہے، کہ حکومت جرمنی اوسٹینز کی کو نہ تو انعام وصول کرنے کی اجازت دے گی، اور نہ ملک سے باہر جانے کی، نازی حکومت کی طرح اٹلی کی فاسستی حکومت میں بھی ان دونوں انعاموں پر سخت برہمی پھیلی ہوئی ہے، روما کا اخبار لاوورو فاسستا (Lavoro Fascista) لاماس کو ایک آتش انگیز جہاں سوز

کا لقب دیتا ہے، حالانکہ گذشتہ سال ہی نازی گورنمنٹ اُسے توسیع امن کی خدمت کے صلہ میں جرمن صلیب احمر کا تمغہ عطا کیا تھا"

ایک عجیب مرض

امریکہ میں ایک شخص ہانس نلسن (Hans Nelson.) نامی ہے، جو ایک عجیب و غریب مرض کا شکار ہو گیا ہے، اب سے تیرہ برس پہلے اس کا وزن (۱۹۰) پونڈ اور قد پانچ فٹ ساڑھے دس انچ تھا، پھر کسی نامعلوم سبب سے اس کا قد اور بدن کم ہونا شروع ہوا، یہاں تک کہ گذشتہ دسمبر میں اسکا قد صرف پانچ فٹ اور وزن (۱۵۵) پونڈ رہ گیا، یعنی اس کا قد تقریباً ایک انچ ہر سال گھٹتا گیا، پچھلے سال اس نے ڈاکٹروں سے مشورہ کیا، اونھوں نے اوسٹیو ملیشیا (Osteomalacia) کا مرض تجویز کیا، یہ مرض گردن کے چار خاص غدودوں کی خرابی سے پیدا ہو جاتا ہے، ان کو پرا تھی رائڈ گلینڈز (Para thyroid Glands) کہتے ہیں، یہ چاول کے برابر ہوتے ہیں، جب انکا فعل خراب ہو جاتا ہے، تو ہڈیوں میں چونے کی مقدار کم ہونے لگتی ہے، اور وہ نرم ہو کر سکڑنے لگتی ہیں، اسی وجہ سے قد بھی کم ہونے لگتا ہے، تکان رہتا ہے، اور وزن اور قوت میں کمی آجاتی ہے،

ڈاکٹروں نے نلسن کے لئے جو پرہیزی غذا تجویز کی ہے، اس سے کافی فائدہ معلوم ہوتا ہے، وہ غذا یہ ہے، پھل، ترکاریاں، دودھ، مچھلی کا تیل، چنانچہ گذشتہ دسمبر میں اس کا وزن (۱۵) پونڈ بڑھ گیا ہے، قوت بھی آگئی، اور وہ اس قابل ہو گیا کہ خود موٹر چلا سکے، اسکے معالج ڈاکٹروں کا خیال ہے، کہ اب اس کا قد کم نہ ہوگا، لیکن چونکہ اسکی عمر (۵۲) سال کی ہو چکی ہے، اسلئے قد کے دوبارہ بڑھنے کی امید نہیں، یہ غدود اعصاب کی صحت کے لئے بھی نہایت ضروری ہیں، ان کی خرابی سے احساس میں برانگیختگی بڑھجاتی ہے، اور ذرا ذرا سی بات پر مریض بے قابو ہو جاتا ہے،

"ع ز"

داغِ جگر

از جناب جگر مراد آبادی

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں
روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

کوئے جاناں کی ہوا تک سے بھی تھراتا ہوں میں
کیا کروں؟ بے اختیارانہ چلا جاتا ہوں میں

آ، کہ تجھ بن، اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں
جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

یک بہ یک گھبرا کے جتنی دور ہٹ آتا ہوں میں
اور بھی اُس شوخ کو نزدیک تر پاتا ہوں میں

جب مکان و لامکاں سب سے گذر جاتا ہوں میں
اللہ اللہ تجھ کو، خود، اپنی جگہ پاتا ہوں میں

میری ہستی شوق پیہم، میری فطرت اضطراب
کوئی منزل ہو، مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

حسن کو کیا دشمنی ہے، عشق کو کیا بیر ہے
اپنے ہی قدموں کی خود ہی ٹھوکریں کھاتا ہوں میں

ہائے رے مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے
مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیری محفل، تیرے جلوے، پھر تقاضا کیا ضرور
لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

تا کجا یہ پردہ داری ہائے عشق و لافِ حسن
ہاں سنبھل جائیں دو عالم ہوش میں آتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا، میری طبیعت دیکھنا
جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

دیکھنا اس عشق کی یہ طرفہ کاری دیکھنا
وہ جفا کرتے ہیں مجھ پر اور شرماتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو | کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں
یاد ایامے کہ ہر ہر سانس تھا لبریز شوق | اب تو نام آرزو بھی سن کے تھراتا ہوں میں
تیرنؔ ہی اک آنکھوں کا ساغر ترا اک رُخ کی بہا | یہ میسر ہوں تو ہر جنت کو ٹھکراتا ہوں میں
تا کجا درد محبت تا کجا درد فراق | رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کھلاتا ہوں میں
میری خاطر اب وہ تمثیل تجلی کیوں کریں | اپنی گرد شوق میں خود ہی چھپا جاتا ہوں میں
تو فنا آمادہ ہے تجھ کو نظر آتی ہے موت | زندگی تابندگی پایندگی پاتا ہوں میں
واہ رے شوق شہادت کوئے قاتل کی طرف | گنگناتا رقص کرتا جھومتا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفان حوادث اے جگرؔ،
ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

ن اک تری آنکھوں کا ساغر ایک ترے رخ کی بہار ،

بیان حقیقت

از جناب سید شاہ عبد العلی صاحب تجرؔ،

حیرت کدۂ دہر میں کیا دیکھ رہا ہوں، | غارت گری کار قضا دیکھ رہا ہوں،
حیران ہوں یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں، | انسان کی صورت میں خدا دیکھ رہا ہوں
کیا جز سر دوش فنا دیکھ رہا ہوں، | اپنے لئے سامان بقا دیکھ رہا ہوں
اک عالم حیرت ہے مرا دیدۂ بینا، | ذروں میں خدا جانئے کیا دیکھ رہا ہوں
ملتا نہیں ڈھونڈے سے کبھی جو دیر و حرم میں | میں دل میں اُسے جلوہ نما دیکھ رہا ہوں
کیا پوچھتے ہو حیرت نظارہ کا عالم | ہر شے کو ہم آغوش فنا دیکھ رہا ہوں
ہر چند کہ آنکھیں ہیں مری محو تماشا | میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ کیا دیکھ رہا ہوں

موسیٰ کی نگاہیں تو تھیں محدودِ تجلی، میں اور کچھ اس سے بھی سوا دیکھ رہا ہون

ساحل پہ کھڑا بحر میں لہروں کی فضا میں

تاروں کے چمکنے کی ادا دیکھ رہا ہون،

نقوشِ جذبات

ازجناب حبیب صاحب اشعر دہلوی،

مداواے دردِ جگر چاہتا ہون
کوئی نشترِ کارگر چاہتا ہون،

نگاہِ حقیقت نگر چاہتا ہون
میں جلووں سے پہلے نظر چاہتا ہون

مزہ مل گیا مجھ کو ناکامیوں کا
میں اب آہ بھی بے اثر چاہتا ہون

نشیمن کی تعمیر وہ بھی چمن میں
گرے مجھ پہ بجلی اگر چاہتا ہون

قیودِ دو عالم سے آزاد ہو کر
تمھیں تم کو پیشِ نظر چاہتا ہون،

مجھے ظلمتوں میں بھی تسکینِ دل ہو
میں اب شام بھی بے سحر چاہتا ہون

سزا بھی جزا بھی فنا بھی بقا بھی
تری ذات پر منحصر چاہتا ہون

کوئی حد ہے اس جوشِ وحشت کی اشعر

بیابان کی مانند گھر چاہتا ہون،

باب التقریظ والانتقاد

جہانِ آرزو

مصنفہ جناب سید انور حسین آرزو لکھنوی، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ حجم ۲۷۰ صفحے قیمت عہ۔

پتہ روزنامہ حقیقت لکھنؤ،

از مولانا عبد السلام صاحب ندوی

حکیم سید ضامن علی جلال لکھنؤ کے اُن شعراء میں تھے، جنھوں نے سب سے پہلے لکھنؤ کی شاعری مین انقلاب پیدا کیا، اور خارجی مضامین یعنی خال و خط، زلف و کاکل اور محرم اور دوپٹہ کو چھوڑ کر جذبات و واردات کو اپنا سرمایۂ تغزل بنایا، اون کے تلامذہ نے بھی یہی روش اختیار کی، اور ان میں سید انور حسین آرزو نے اس روش کو اسقدر ترقی دی، کہ اب اُن کا شمار دورِ جدید کے شعراء میں کیا جاتا ہے، اس جدید رنگ میں ان کا دوسرا دیوان جو جہانِ آرزو کے نام سے شائع ہوا ہے، ہمارے پیشِ نظر ہے، اور اسکے دیکھنے سے انکے کلام کی جو خصوصیات سامنے آتی ہیں، وہ حسب ذیل ہین،

۱- وہ بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیے استعمال کرتے ہیں جن کی تعداد محدود ہوتی ہے،" اس وجہ سے شعراء غزلون میں ان قافیون کو بہت کم استعمال کرتے ہیں، مثلاً

یہ دوئی کب تک جو دل کو سوزِ غم سے لاگ ہو

جل اٹھی ہیزم تو پھر ہیزم نہیں ہے آگ ہے،

کم التفات پہ بھی شوقِ دل کو سیری ہے — گھنا درخت نہ ہو چھاؤں تو گھنیری ہو،

دم بخود بیٹھ کے خود جیسے زباں کیلی ہو — سانس کیا لوں کہ ہوا دہر کی زہریلی ہو،

ہمکو تو حسرتیں کبھی عزت انکو ضد کہ خفیف کرو — ڈھائیں ستم اور اُسپہ ستم یہ کہتے ہیں تعریف کرو

۲۔ بہت سی غزلوں میں نامانوس بحریں اختیار کرتے ہیں، مثلاً

کیوں وادیٔ ایمن کے پھیرے کیوں طور کو آنا جانا ہے،

میں نے نہیں بھی کب کہا گریہ کہا نہیں کہو،

سپید و سیاہ ایک ہی ہیں، تو مجھو نظر نظر ہی نہیں،

دے کے فریب لے کے دل کہتے ہیں حیلہ ساز ہو،

۳۔ اس قسم کی بحروں میں بعض غزلیں ایسی ہیں، جن کا مضمون بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے، اور آخری شعر میں قافیہ کی پابندی کی جاتی ہے، مثلاً

ہے راہِ ہوس وہ طولانی، — حد جس کی کوئی نہ تمامی ہے،

ہر گام خوشی کا سہی پھر بھی، — آخر منزل ناکامی ہے،

اس باغ میں آکر ہم کو بھی — تقدیر ملی ہے قمری کی،

بندش بازو میں اطاعت کی،

گردن میں طوقِ غلامی ہے،

میں ہوں تیرا خلوتیٔ ازل — مجھے کام منظرِ عام سے،

سرِ بام جلوہ ہے ضو فگن — نظر آسکے رفعتِ بام سے،

وہ پلٹ کے جلد نہ آئیں گے — یہ عیاں ہے طرزِ خرام سے،

کوئی گردش ایسی بھی اے فلک — جو ملا دے صبح کو شام سے،

نہ قفس نصیب نہ آشیان، ہے میان برزخِ این و آن

ابھی پرشکستہ ہے مرغ جان

کہ پھڑک کے نکلا ہے دام سے

ان خصوصیات کا نتیجہ ہے کہ ان کی اکثر غزلیں حُسنِ تغزل سے معرا ہیں، اس کے ساتھ انھون نے اس جدید کوچے میں بہ تکلف قدم رکھا ہے، اور لکھنو کے دائرے سے نکلنے کے معنی یہ سمجھے ہیں کہ سرے سے عاشقانہ مضامین ہی ترک کر دیئے جائیں، حکیم جلال نے بے شبہہ مبتذل اور خارجی مضامین کو جو غزل سے تعلق نہیں رکھتے ترک کر دیا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اونھون نے حدودِ تغزل سے باہر قدم نہیں نکالا تھا، لیکن سید انور حسین آرزو کے بہت سے اشعار پڑھتے چلے جائیے، یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں، ایک پوری غزل ملاحظہ ہو،

مانگ جو کھو کے آن بان نہ مانگ — قتل ہو جا مگر امان نہ مانگ،

دیکھ پیمان شکن زبان نہ مانگ — بعد کو پھیر دے کے جان نہ مانگ

صرف اُس کی خوشی میں سب کچھ ہے — ایک شے مانگ دو جہان نہ مانگ

روح پہ ور ہے کاہشِ غم دل — موت ہو ہو کے بدگمان نہ مانگ

ظلم سے بھاگتے نہیں حق گو، — دار کافی ہے ریسمان نہ مانگ

دینے والے سے تو ہے کم ہمت — خود اُسے مانگ لے جہان نہ مانگ

جان کر جان دی نہیں جاتی، — ہو ون و منی بات کا زیان نہ مانگ

بیدلی میں دکھاؤں دل کیونکر — نہیں جو شے وہ میری جان نہ مانگ

آرزو یہ طلب ہے بے معنی

ہند میں رہ کے اصفہان نہ مانگ

باوجودیکہ ان کے کلام میں اغلاق و ابہام نہیں ہوتا شعرائے دورِ جدید کی طرح مصنوعی غلط ترکیبیں بھی استعمال نہیں کرتے، تصوف و فلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی نظم نہیں کرتے، لیکن بایں ہمہ اس قسم کے پھیکے اور بدمزہ اشعار سے ان کا یہ دیوان بھرا ہوا ہے، البتہ کہیں کہیں معیارِ تغزل کے مطابق کچھ اشعار بھی ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں، اور انہی کو اس دیوان کا حاصل سمجھنا چاہئے ان کی مثالیں یہ ہیں،

ساقیا چشمِ کرم کا وقت ہوگا کونسا　　جامِ دل خالی ہے جامِ زندگی لبریز ہے

ناتوانی نے کیا گم ترے دیوانے کو　　اب تو زنجیر ہی زنجیر نظر آتی ہے

آپ کا نقشِ قدم میرا خطِ پیشانی　　ایک ہی ہاتھ کی تحریر نظر آتی ہے

آگیا وقتِ رہائی ترے دیوانے کا　　سانس، ٹوٹی ہوئی زنجیر نظر آتی ہے

آرزو خواب بھی وحشی کے ہیں کیا وحشتناک
کبھی بیڑی، کبھی زنجیر نظر آتی ہے

بات تجھ میں بھی اسے ادائے سکوت　　لبِ حاضر جواب کی سی ہے،

کیفیت میری اُن کی چپ میں بھی　　کچھ سوال و جواب کی سی ہے

ابھی تمہیدِ غم دل پہ یہ اُف اُف کیسی　　جس کا ہر لفظ ہے شعلہ وہ بیاں باقی ہے

غفلت میں ہے وہ جس کیلئے جاگ رہا ہوں　　آنکھوں سے نہیں نیند مقدر سے اڑی ہے

اخفائے رازِ شانِ وفا، امتحانِ صبر　　آج ایک خامشی نے بڑے حق ادا کئے

بسکہ طولِ ہجر سے افزوں ہے طولِ انتظار　　آپ کا اقرار بھی انکار ہے میرے لئے

میرے ہی آنسوؤں سے دھوڈالو خونِ میر　　دامن سے کچھ نچوڑ دو کچھ پیلو آستیں سے

———

مطبوعات جدیدہ

داغ مؤلفہ جناب نور اللہ محمد نوری صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ سپید کتابت وطباعت بہتر، قیمت انگریزی سکہ سے عار عثمانی سے عار، پتہ:۔ غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چارکمان حیدر آباد دکن، اور شاخ عابد روڈ بک اسٹال جامعہ عثمانیہ

داغ کی شوخیاں موجودہ شاعری سے ہم آہنگ نہیں، اس لئے ان کے محاسن کلام بھی نئے طبقہ کی نگاہوں سے چھپ گئے ہیں، جناب نور اللہ محمد نوری صاحب کی یہ کوشش لائق ستائش ہے کہ انھوں نے داغ کی شاعری پر نہایت جامع اور مبسوط تبصرہ کرکے ان کے کلام کے تمام پہلوؤں کو اس طرح دکھایا ہے، کہ انکی شاعری کی حقیقت اور اس دور کے شعرا میں داغ کا درجہ واضح ہوجاتا ہے، مثلاً داغ کا احول، ان کی شاعری کے محرکات، خاص خاص مواقع کا کلام، انکی شاعری کا مقصد، ان کا فلسفۂ زندگی، ان کی شاعری میں مقامی عنصر، موسموں کا سمان، داغ کے کلام کا تجزیہ بلحاظ اصناف سخن، اور بلحاظ مضامین و اسلوب بیان، ہندوستانی زبان میں داغ کا تعمیری حصہ وغیرہ تمام مباحث کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ دکھایا ہے، آخری بحث میں کسی قدر مبالغہ کا رنگ آگیا ہے تاہم مجموعی حیثیت سے یہ کتاب داغ کی شاعری پر نہایت اچھا تبصرہ ہے، ابتدا میں داغ کے مختصر حالات اور آخر میں انکے چند مشاہیر تلامذہ کا تعارف اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، اس کتاب میں ضمنی طور سے مصنف نے کہیں کہیں اجتماعیات کے نکتوں کی طرف اشارے کئے ہیں، ان سے مصنف کی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے، اگر وہ اس موضوع کی طرف توجہ کریں، تو زیادہ بہتر خدمت انجام دیسکتے ہیں،

گل عجائب شائع کردہ انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، تقطیع اوسط ضخامت ۱۹۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد عہ، پتہ انجمن ترقی اردو،

انجمن ترقی اردو اس سے قبل شفیق اورنگ آبادی کا تذکرہ شائع کر چکی ہے، اب اس نے شفیق کے ایک اور ہم وطن اور معاصر شاعر اسد علی خان تمنا کا تذکرہ گل عجائب شائع کیا ہے، تمنا بارھویں صدی ہجری کا شاعر ہے، اس کے حالات تذکروں میں بہت کم ملتے ہیں، لیکن خود اس تذکرہ سے اسکے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے، اس تذکرہ میں بارھویں صدی کے اواخر کے ترپن ۵۳ دکنی شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کا نمونہ ہے، ایک آدہ شمالی ہند کے شعراء کے حالات بھی ہیں، اگرچہ یہ حالات اتنے مختصر ہیں کہ بعض شعراء کا صرف نام و تخلص ہے، اور معلومات میں بھی اس سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہوتا تاہم ایک قدیم تذکرہ کی حیثیت سے لائق قدر ہے،

رسالہ دینیات حصہ پنجم، ششم و ہفتم مرتبہ مجلس نصاب کتب شعبہ دینیات و اخلاقیات سررشتہ تعلیمات حیدر آباد دکن تقطیع اوسط ضخامت علی الترتیب ۸۰، ۱۲۰، اور ۹۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۹ر، ۴ر، ۱۲ر پانچویں اور چھٹے حصہ کے ملنے کا پتہ مولوی محمد فخر الدین ہاشم صاحب فاروقی مالک مطبع قاسمی نظام شاہی روڈ حیدر آباد دکن، ساتواں حصہ سید عبد القادر تاجر کتب چار مینار حیدر آباد دکن سے ملے گا،

یہ تینوں رسالے حیدر آباد کے سر رشتہ تعلیم کے سلسلۂ دینیات کی کڑی ہیں، پانچویں حصہ میں اللہ توحید رسالت کی تشریح انبیا، خاتم الانبیاء اور ان کے متعلق ضروری عقائد، اللہ کی کتابوں، کلام اللہ اور اس کی خصوصیات، اور ملائکہ اور قیامت کے مختصر حالات ہیں، پھر برائیوں میں جھوٹ غیبت اور چوری، اور بھلائیوں میں توبہ زہد اور تقوی کا بیان ہے، آخر میں آنحضرت صلعم کے مختصر حالات ہیں، چھٹے حصہ میں ارکان اسلام اصطلاحات فقہ کی تشریح طہارت، نماز، زکواۃ، روزہ اور

تیج کے جملہ ضروری مسائل ہیں، پھر صحت جسمانی کی ضرورت اس کے فوائد حلال وحرام چیزوں کی تشریح نشہ اور جوئے کی برائیاں اور توکل وصبر کی تشریح اور اسکی خوبیاں بیان کی گئی ہیں، آخر میں خلفاے راشدین کے مختصر حالات ہیں، ساتویں حصہ میں تسلیم ورضا عبدیت وکسب حلال کی دلنشیں تشریح ان کے فوائد ان کے حصول کی ترغیب اور قتل ناحق سود اور ریاکاری کی وضاحت اوران کے ترک کی تعلیم ہے، آخر میں چند اکابر مہاجر وانصار صحابہ کے مختصر حالات ہیں، تینوں رسالے نہایت مفید ہیں، ان میں جملہ ضروری مذہبی معلومات کا نہایت خوبی سے استقصا کیا گیا ہے، انداز بیان دلنشین ہے،

تاریخ اسلام، مؤلفہ جناب برکت اللہ صاحب فاروقی اصلاحی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ھر ملنے کا پتہ اسلامیہ کتب خانہ نمبر ۰۹ بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

یہ مختصر تاریخ مکاتب اسلامیہ کے بچوں کی ابتدائی اور ثانوی جماعتوں کے لئے لکھی گئی ہے، اس میں سیرت پاک کے کسی قدر تفصیلی اور خلفاء اربعہ کے ضروری مختصر حالات ہیں جو بچوں کے لئے کافی ہیں،

پنڈوہ از جناب شاہ حسن الدین احمد صاحب منعمی ابوالعلائی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۳ صفحات،
کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت :- ۸ر پتہ شاہ حسن الدین احمد صاحب خانقاہ منعمی ابوالعلائی گیا

پنڈوہ اور لکھنوتی بنگال کے نہایت قدیم مگر ویران شہر ہیں، اسلامی عہد کے بعض دوروں میں بھی ان کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے، یہاں متعدد اولیائے کرام کے مزارات اور دوسرے اسلامی آثار ہیں، شاہ حسن الدین احمد صاحب نے ان کی زیارت کرکے یہاں کے حالات معارف میں لکھے تھے جنھیں اب انھوں نے رسالہ کی شکل میں شائع کیا ہے، اور بعض مزارات اور آثار کے فوٹو بھی دیدیئے ہیں

زادِ راہ مصنفہ منشی پریم چند تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ کتابت وطباعت روشن،
قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

زادِ راہ منشی پریم چند کے پندرہ افسانوں کا مجموعہ ہے "وفا کی دیوی"، "زیور کا ڈبہ"، "آشیان برباد"

"خدا کا قہر، فریب"، "لاٹری"، "تیور"، "لعنت"، "بڑے بھائی صاحب"، "مس پدما"، "بولی کی چھٹی"، "زادِ راہ"، "حقیقت"، "ڈامل کا قیدی"، ان تمام فسانوں میں منشی پریم چند کی افسانہ نگاری کی خصوصیات نمایاں ہیں، کوئی افسانہ کسی مفید تعلیم و نتیجہ سے خالی نہیں،

ہتیا اور دوسرے افسانے، مصنفہ جناب مجنوں گورکھپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مذکور نہیں، پتہ حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی،

یہ جناب مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ ہے، اس میں آٹھ افسانے ہیں "ہتیا"، "گہنا"، "حسین کا انجام"، "مراد"، "جشن عروسی"، "بڑھاپا"، "کلثوم"، "محبت کا دم واپیں" ان میں سے کچھ طبعزاد ہیں، اور کچھ دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں، لیکن سب پڑھنے کے لائق ہیں، اور مجنوں صاحب کا المیہ رنگ تقریباً سب میں نمایاں ہے،

یادگار ماجد، مولفہ جناب سید طالب علی صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۰۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت قسم عام عہ، قسم خاص عا، پتہ سید طالب علی ایم اے شاہ گنج الہ آباد،

سید ماجد علی صاحب مرحوم ایڈوکیٹ الہ آباد نے اگرچہ بحیثیت شاعر کے کوئی شہرت حاصل نہیں کی، لیکن وہ اس دور کے خوشگو شعراء میں تھے، اور انکی شاعری قدیم اور جدید رنگ کی آمیزش کا خوشرنگ مجموعہ تھی، وہ مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے تھے، غزلوں کے علاوہ منقبت میں ان کے جوہر زیادہ چمکتے تھے، ان کے لائق بھتیجے سید طالب علی صاحب ایم اے نے یادگار ماجد کے نام سے ان کی غزلوں کا مجموعہ شائع کیا ہے، ابتداء میں پنڈت منوہر لال زتشی کا تعارف ہے، اس کے بعد فاضل مرتب نے سید ماجد علی کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے، دیوان میں بیشتر حصہ غزلوں کا ہے، آخر میں خاص خاص موضوع پر چند نظمیں ہیں، غزلوں کی ترتیب ردیف وار کے بجائے تاریخی ہے،

جس سے شاعر کے کلام کی تدریجی ترقی کا پتہ چلتا ہے،

مقام محمود، از جناب آغا محمد صدیق حسن صاحب ضیا تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۸ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، **قیمت**:- ۴ر پتہ مستری غلام نبی صاحب کامل کوچہ مستریان، راولپنڈی،

یہ ایک نعتیہ مثنوی ہے، جس میں جناب ضیا نے حسن وعشق کی زبان میں ظہور آدم سے لیکر ظہور قدسی تک کے مختلف مدارج واحوال دکھائے ہیں، ہر بیان نیاز عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، وفور جذبات میں کہیں نظم کا دامن تنگ ہوگیا ہے، امید ہے کہ ارباب ذوق عقیدت کے ان پھولوں سے لطف اندوز ہوں گے،

حمید کے سو شعر، از جناب خواجہ حمید الدین صاحب حمید لکھنوی تقطیع جیبی صفحات ۳۲، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۴ر علاوہ محصول ڈاک، پتہ نیجر نامی پریس لکھنؤ،

خواجہ حمید الدین صاحب لکھنؤ کے ہونہار شعراء میں ہیں، اور اس سے پہلے ان کا دیوان پرواز خیال منظر عام پر آچکا ہے، اب انھوں نے اپنے سو شعروں کا انتخاب شائع کیا ہے، یہ انتخاب لکھنؤ کے نامور شاعر مرزا ثاقب کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہے جو امید ہے کہ ارباب ذوق میں مقبول ہوگا،

دل صد پارہ، از جناب محمد عباس صاحب طالب صفوی تقطیع جیبی ضخامت ۲۲ صفحات، کاغذ سپید، کتابت وطباعت اوسط، قیمت ۲ر کا ٹکٹ بھیج کر مصنف سے شمس آباد ضلع فرخ آباد سے ملیگی،

دل صد پارہ جناب محمد عباس صاحب صفوی کے سو منتخب اشعار کا مجموعہ ہے، ابتک اس قسم کے انتخابات سو شعر کے نام سے چھپتے تھے، لیکن جناب صفوی کی شاعرانہ جدت نے اسکو دل صد پارہ کے نام سے بدل دیا، جو ممکن ہے آیندہ چل جائے، صفوی صاحب کی شاعری کی کلی ابھی نو شگفتہ ہے، لیکن رنگ سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگر اگلی لیائی جاری رہی، تو اسکی نگہت بہت جلد پھوٹ نکلے گی،

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۹۰ — مارچ سنہ ۱۹۳۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

مطبع معارف اعظم گڈھ

السیرۃ

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ
جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر نہایت اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے
اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے
حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و
تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات
اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے
معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان
معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے
جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ ان میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ اسلام کے صحیح عقائد کے بیان
پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور
دوسرے مذاہب کی عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد [illegible] حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ سوم
تقطیع [illegible] تقطیع خورد [illegible] حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] حصہ پنجم تقطیع خورد [illegible]
تقطیع کلاں [illegible] (مطبوعہ [illegible])

جلد ۳۹	ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۵ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۷ء	عدد ۳

مضامین

شذرات

آئینی مجلسون کے پچھلے انتخابات نے مسلمانون کے سامنے عبرتون کے دفتر کھول دیئے ہین، اب یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ کونسلون کی ممبری قومی اور ملکی خدمتون کا ذریعہ ہے، جاہ و اعزاز کے حصول کا اب وہ پرانا وسیلہ نہین رہی ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اب شخصی انتخاب کی جدوجہد بالکل بے معنی ہے، جو کچھ ہے وہ اب سیاسی جماعتون کے افراد کی حیثیت سے ممکن ہے اس نئے انتخاب کے بعد بڑے سے بڑے اشخاص کی حالت یہ ہے کہ

اکیلے پھر رہے ہین یوسف بے کاروان ہوکر

لیکن ہم کو جس بات کی طرف اس وقت اشارہ کرنا ہے وہ سیاسی رجحانات کے بجائے شخصی انتخابات کی بنا پر اخراجات کی وہ عظیم الشان میزان ہے جس کو مسلمان قوم کبھی برداشت نہین کرسکتی، ہم کو بہار اور اس صوبہ کے متعدد باہمت مسلمانون کا حال معلوم ہے جو مہاجنون سے قرض لیکر، یا اپنی جائداد اور مکانون کو رہن رکھکر یہ لڑائی لڑے ہین، اب اگر وہ جیتے ہین تو بھی ہارے ہین، اور اگر ہارے ہین تو اپنے ساتھ اپنے خاندان کو بھی لے ڈوبے ہین،

ضرورت اس کی ہے کہ آئینی مجلسون کی رکنیت کو نام و نمود اور عزت و جاہ کا ذریعہ نہ سمجھا جائے اور نہ بنایا جائے بلکہ وہ ملک کے سیاسی خادمون کی جماعت سمجھی اور بنائی جائے، اور قومی حیثیت سے اس مہم کے لئے سرمایہ جمع کیا جائے اور قوم لائق ممبرون کو چنکر اپنی نمایندگی کا امیدوار قرار دے، ورنہ مسلمانون کی سیاسی تباہی کے ساتھ مالی تباہی بھی لازمی ہے،

اس الیکشن کی خاص حیثیت نے یہ بھی بتادیا کہ بعض مسلمان اہلِ سیاست کا صوبون مین چند مسلمان نشستون کے

اضافہ پر اصرار سراسر لاحاصل ہے، ہر اقلیت خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی مقدار سے کم ہو کسی سمجھوتے کے بغیر بڑی اکثریت کے مقابلہ مین ناچار ہے، اس لئے چند نشستون کی کمی بیشی فیصلہ پر کوئی اثر نہین رکھتی،

مارچ کی اخیر تاریخون مین مسلمانون کی پرانی تعلیمی انجمن مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی علی گڈہ مین پنجاہ سالہ جوبلی ہے، اس تقریب سے اس کانفرنس کے ساتھ بہت سے شعبون کے الگ الگ اجلاس بھی ہونگے، امید ہے کہ مسلمانون کی معقول تعداد ان جلسون مین شرکت کریگی، خدا کرے یہ صرف جلسون اور جلوسون تک محدود ہوکر نہ رہجائے، بلکہ اس مین مسلمانون کی پچھلی پچاس برس کی تعلیمی جد وجہد پر صحیح تبصرہ ہو، اور آیندہ کے لئے کوئی مفید پروگرام تیار ہو،

انگریزی تعلیم گاہون مین یہ شکایتین عام ہورہی ہین کہ مسلمان طالب علم عربی بہت کم لے رہے ہین، اور ان کی تعداد ہر سال گھٹ رہی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس جدید دور مین قدیم کے ساتھ نوجوانون کی محبت کم ہوجانے کی وجہ سے یہ صورت حال ہے، تو دوسری طرف اس کے برخلاف یہ نظر آرہا ہے کہ سنسکرت پڑھنے والے ہندو طالب علمون کی تعداد مین علانیہ اضافہ ہورہا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہر شہر مین ایسی انجمنین قائم ہون جو عربی پڑھنے والے طالب علمون کو وظیفہ دے کر ان کا دل بڑھائین، ہم کو معلوم ہوا ہے کہ الہ آباد مین اس قسم کی ایک انجمن قائم ہوئی ہے، ایسی ہی انجمنین ہر شہر مین قائم ہونی چاہیئن

یہ بھی ممکن ہے کہ صوبہ مین مسلمانون کے جو بھی چند اسکول ہین ان مین عربی لینے والے طالب علمون کے ساتھ فیس کی خاص رعایت کیجائے، اور عربی کے معلمون کو چاہئے کہ صرف ونحو کی تعلیم کے نئے آسان اصولون سے واقف ہوکر انھین نئے طریقے سے تعلیم دین، تاکہ وہ کم سے کم وقت مین کچھ نہ کچھ سیکھ لین،

مصر کی وزارت اوقاف نے ملک کے اہل قلم حضرات سے ایک میلاد نامہ کی فرمائش کی تھی، جس کا انتخاب مقابلہ سے ہوا

اس مقابلہ مین سب سے بہتر رسالہ شیخ عبداللہ عفیفی کا قرار پایا ہے، اور شیخ ازہر نے حکم دیا ہے کہ پرانی طرز کے میلاد ناموں کے بجائے ہر جگہ اس کو پڑھا جائے، رسالہ گو نظم و نثر اور دعا و سلام پر بدستور مشتمل ہو تاہم روایتون کی صحت اور افادیت کا پہلو اس مین ملحوظ رکھا گیا ہے، محمد علی مرحوم بھی اپنے ملک مین اسی قسم کا رسالہ چاہتے تھے،

علامہ شبلی نعمانیؒ سے جن کتابون کی تعریف سنی تھی اور وہ خود بھی انکے مشتاق تھے ان مین سے ایک کتاب فتوح البلدان کے مشہور مصنف احمد بن یحیٰی بلاذری المتوفی ۲۷۹ھ کی تصنیف انساب الاشراف ہے، ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الاخبار والانساب لکھا ہے، اس زمانہ مین اُسکے صرف ایک ہی مکمل نسخہ کا پتہ چلا ہے اور وہ قسطنطنیہ مین ہے،

فلسطین مین یہودی آبادی کی ترقی کے ساتھ ساتھ وہان ایک عبرانی یونیورسٹی بھی قائم ہوئی ہے، اس یونیورسٹی مین علوم مشرقیہ کا بھی ایک شعبہ ہے جس کا انگریزی نام "اسکول آف اورینٹل سٹڈیز" ہے، اس شعبہ کی طرف سے ایس، ڈی، الیف، گوئیٹن (S. D. F. GOITEIN) نے اس کتاب کی پانچوین جلد ۱۹۳۶ء مین چھاپکر شائع کی ہے، باقی جلدین بھی طبع ہونگی، دلچسپ چیز یہ ہے، کہ مرتب نے اس کا مقدمہ عبرانی مین لکھا ہے، اس جلد مین حضرت عثمانؓ اور مروان اور مختار و مصعب بن زبیر کے حالات ہین،

اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ کی عام تاریخون کے برخلاف سنہ کی ترتیب کے بجائے خاندانون کی ترتیب سے حالات لکھے گئے ہین، روایتون کی سندین دیکھنے سے افسوس ہوا کہ اس مین مدائنی وغیرہ کے ذریعہ سے واقعات نقل کئے گئے ہین، ہندوستان مین یہ جلد ۱۶ روپیے مین جیب اینڈ کمپنی تاجرین کتب اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے ملے گی،

مقالات

ذبح عظیم

حضرت ابراہیمؑ کو اپنے جس اکلوتے بیٹے کے ذبح کرنے کا خدا کی طرف سے خواب میں حکم ہوا تھا، یہود کہتے ہیں کہ وہ اسحاقؑ تھے، لیکن مسلمانوں کے نزدیک حضرت اسمٰعیلؑ تھے، اور اسی لئے ذبیح اللہ مسلمانوں میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا لقب مشہور ہے، اس کے لغوی معنی ہیں خدا کا ذبح کیا ہوا یا خدا کی راہ میں ذبح ہوا، اس لقب کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت ہے:-

يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرَىٰ (والصّٰفّٰت-۳)

(حضرت ابراہیمؑ نے کہا) میرے پیارے بیٹے میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں تیری رائے کیا ہے،

حضرت اسمٰعیلؑ نے جواب میں کہا:-

يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ. (/)

اے میرے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے وہ کرگذر، خدا نے چاہا تو مجھے تو ثابت قدم رہنے والوں میں پائے گا،

مقدس باپ نے اپنے بیٹے کے اس صبر و ثبات کو دیکھا تو اُن کو لے کر قربانگاہ کو روانہ ہوگئے، جو اُن کی جائے قیام سے کئی دن کی مسافت پر تھی، وہاں پہنچکر بیٹے کو لیکر اور آگے بڑھے، اور بیٹے کو

پیشانی کے بل گرا کر چھری اُن کی گردن پر رکھ دی، آواز آئی، اے ابراہیم!

قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ‏(صافات-۳)

تو نے خواب کو سچ کر دکھایا، ہم اسی طرح نیکو کاروں کو جزائے خیر دیتے ہیں

علیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل سر زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند

ابھی یہ منظر آنکھوں سے دور نہیں ہونے پایا تھا کہ ندا آئی،

وَفَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ (ر)

اور ہم نے اس کو (اسمٰعیل کو) ایک بڑی قربانی دے کر چھڑایا،

اس آیت میں یہ ذکر ہے کہ خدا فرماتا ہے کہ میں نے ایک دوسری بڑی قربانی کا فدیہ دیکر اسمٰعیل کو ان کی اس قربانی سے نجات بخشی، اب سوال یہ ہے کہ وہ بڑی قربانی کیا تھی جسکو حضرت اسمٰعیل کی اس قربانی اور فدیہ اور بدلہ قرار دیا گیا، مفسرین کی عام روایتیں یہ ہیں کہ جنت کا ایک مینڈھا لاکر حضرت ابراہیمؑ کے سامنے کر دیا گیا، کہ وہ حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربانی کیا جائے، چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے ایسا ہی کیا، اور اس مینڈھے کو حضرت اسمٰعیلؑ کی جگہ قربانی کیا، مگر یہ روایتیں اسرائیلیات سے زیادہ نہیں، اور ان سب کا ماخذ توراۃ ہے، و-

تب ابراہام نے اپنی آنکھیں اٹھائیں، اور اپنے پیچھے ایک مینڈھا دیکھا جس کے سینگ جھاڑی میں اٹکے ہیں، تب ابراہام نے جا کر اس مینڈھے کو لیا، اور اسکو اپنے بیٹے کے بدلے میں سوختنی قربانی کے لیے چڑھایا؛ (پیدائش ۲۲-۱۳)

لیکن قرآن پاک میں اس مینڈھے کا ذکر نہیں، بلکہ اس کے بجائے ایک بڑی قربانی کہا گیا ہے، اگر یہ بڑی قربانی مینڈھے یا بکرے ہی کی صورت میں ہوتی تو قرآن اسکو ایک بڑی قربانی کیوں کہتا، ہمارے مفسرین نے اس کے یہ جوابات دیئے ہیں،

۱- چونکہ یہ قربانی کا مینڈھا جنت سے لایا گیا تھا، اسلئے اسکو بڑی قربانی کا لقب ملا،

۲- یہ وہی مینڈھا تھا جس کو ہابیل نے قربان کیا تھا، اور جسکو خدا نے قبول فرمایا تھا، تو چونکہ خدا اسکو قبول کرچکا تھا، اسلئے اسکو بڑی قربانی فرمایا،

۳- ان روایات میں سب سے بہتر جواب حسن بصری کا ہے، فرمایا کہ اس بڑی قربانی سے مقصود وہ خاص جانور نہیں، جو حضرت ابراہیمؑ کے سامنے قربانی کے لئے پیش ہوا، بلکہ وہ مطلق قربانی ہے، جو اس کے بدلہ میں پوری ملت کے لئے قیامت تک یادگار سنت قرار پائی،

جسمانی یادگار کی حیثیت سے اس میں شک نہیں کہ ابراہیمی ملت میں عید قربان یا عید اضحی کا سالانہ جشن، اور اس میں غریبوں اور مسکینوں کے کھلانے، اور دوستوں کی ضیافت اور خوشی کے اظہار کیلئے کسی جانور کی قربانی اسی واقعہ کی یادگار ہے، اسلام میں دو ہی تہوار ہیں، عید، اور بقرعید، بقرعید ملت ابراہیمی کا جشن ہے، یعنی اس واقعہ کی یادگار ہے، جس کی بنا پر ملت ابراہیمی کی تاسیس اور مکہ میں خانۂ الٰہی کی تعمیر ہوئی، اور وہ تعمیر ملت ابراہیم کا قبلہ قرار پائی، اور عید ملت محمدی کا جشن ہے یعنی نزول قرآن کی یادگار، جس سے پردہ عالم میں ملت محمدی کا ظہور ہوا،

یہ سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا تھا، شریعت میں خواب کی دو قسمیں ہیں، ایک کا نام رویائے تمثیلی اور دوسرے کا نام رویائے حقیقی ہے، رویائے حقیقی میں اصل حقیقت بے پردہ نظر آتی ہے، اور وہی مقصود ہوتی ہے، جیسے کسی نے خواب میں دیکھا کہ فلاں شخص مرگیا ہے، اور وہ واقعی مرگیا تھا، یہ رویائے حقیقی ہے، رویائے تمثیلی یہ ہے کہ مقصود اس واقعہ سے ملتی جلتی کوئی مشابہ چیز ہو، جیسے حضرت یوسفؑ نے قحط کو سوکھی بالوں اور دبلی پتلی گایوں کی صورت میں دیکھا، امام خطابی معالم السنن میں کہتے ہیں،

وبعض الرؤیاء مثل یضرب　　بعض خواب تمثیل ہوتے ہیں جسکو اس

لیتاول علی الوجه الذی یجب	مثالی صورت میں اس لئے بیان کیا جاتا
ان یصرف الیه معنی التعبیر فی	ہے، کہ اس طریقہ پر اس کی تعبیر کی جائے
مثله وبعض الرویا لایحتاج	جس طریقہ پر ایسے خواب کی تعبیر پھیری جاتی
الی ذلك بل یاتی کالمشاهدة	ہے، اور بعض خواب اسکے محتاج نہیں ہوتے
(فتح الباری جلد ۱۳ ص ۳۶۲ مصر)	بلکہ وہ مشاہدہ بن کر سامنے آتے ہیں،

اس بنا پر ہم کو غور کرنا ہے، کہ حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنے بیٹے کو قربانی کرتے ہوئے خواب میں دیکھا، تو یہ خواب تمثیلی تھا یا حقیقی تھا، اس گرہ کے کھلنے سے وفدینا ہ بذبح عظیم کے معنی بھی کھل جائینگے،

درحقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو جو خواب دکھایا تھا، وہ تمثیلی تھا، یعنی یہ کہ وہ اپنے بیٹے کو قربانی کر رہے ہیں کے یہ معنی تھے، کہ وہ اسکو ہمیشہ کے لئے خدا کی راہ میں خانہ کعبہ کی خدمت گذاری اور دین حنیف کی تبلیغ کیلئے خدا کی راہ میں قربانی کردیں، حضرت ابراہیمؑ نے فدا کاری کے سچے جوش میں اس خواب کو حقیقی سمجھا، اور جیسے اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کی راہ میں واقعی جسمانی طور سے قربانی کرنے، مکہ کے پاس پہنچکر بیٹے کو قربانگاہ پر چڑھا کر چاہ ہی تھا کہ اس کے گلے پر چھری پھیر دیں کہ بارگاہ قدس سے ندا آئی، قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْیَا، اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، اور اب خداوند حق نے حضرت ابراہیمؑ کو وحی سے مطلع فرمایا کہ یہ خواب حقیقی نہیں بلکہ تمثیلی تھا، اور حضرت اسمٰعیلؑ کی جسمانی قربانی نہیں، بلکہ روحانی قربانی مقصود ہے، اور یہ جانور کی جسمانی قربانی اُس روحانی قربانی کی تمثیل ہے، اب غور کیجئے تو معلوم ہوگا، کہ وہ "ذبح عظیم" جس کو دیکر حضرت اسمٰعیلؑ جسمانی قربانی سے بچ جاتے ہیں، وہ ان کی روحانی قربانی ہے،

روحانی قربانی جسمانی قربانی کے مقابلہ میں یقیناً ذبح عظیم ہے، جسمانی قربانی کی تکلیف تو ایک لمحہ کی بات ہے، مگر روحانی قربانی تو کسی امر حق کی خاطر ساری زندگی کی جیتے جی کی قربانی ہے، جس میں

مرکز نہیں بلکہ حج کرحق کی راہ میں ہر کلفت اور مصیبت کو انگیز کرنا اور ہر وقت موت کے لئے آمادہ رہنا ہے؛

حضرت اسمٰعیلؑ نے اسکی خاطر ملک شام کے سبزہ زار کو چھوڑا، وہاں کے عیش و آرام کو خیرباد کہا، عزیز و اقارب کو ترک کیا، اور ایک لق ودق صحرا میں تن تنہا رہنا گوارا کیا، وہاں خدا کے نام کا ایک گھر بنایا اور اسکو آنے جانے والے مسافروں اور سوداگری کے قافلوں کے لئے مرکزی گذرگاہ ٹھہرایا، اور اس طرح دین حق کی تبلیغ اور خانہ خدا کی پاسبانی کے لئے نہ صرف اپنی زندگی تک بلکہ محمد رسول اللہ صلعم کے ظہور تک جو ربنا وابعث فیھم کی ابراہیمی دعا کی قبولیت کا زمانہ تھا، اپنی پوری نسل کو ایسے صحرائے بے آب ودانہ میں گذار دینے کا حکم دیا، یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی جو حضرت اسمٰعیلؑ کی جسمانی قربانی کی تمثیل میں حضرت ابراہیم کو دکھائی گئی، اور آج کے دن تک یہ روحانی قربانی ملت ابراہیمی کی حقیقت اور نسل اسماعیلی کی شریعت ہے، اور جانور کی جسمانی قربانی اس حقیقت کا مجاز ہے، اور اسلام میں جہاد اس مجاز کی حقیقت ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوگا، کہ وہ ذبح عظیم کا فدیہ جس کے بدلہ میں حضرت اسمٰعیلؑ کی جسمانی قربانی معاف کی گئی، وہ ان کی وہ روحانی قربانی ہے، جو نسلاً بعد نسلٍ ان پر فرض ہوئی، اور اسکی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی کی شکل میں ظاہر ہوئی، اور اسی لئے یہ ہر سال کے جشن قربانی میں حضرت اسمٰعیلؑ کے جسمانی و روحانی فرزندوں پر واجب ہے،

جہاد اور شہادت جنگی غنیمتوں میں اسلام کا سارا دفتر لبریز ہے، وہ اسی ذبح عظیم کی تفسیریں ہیں جو مسلمان اس ذبح عظیم کا منظر پیش کرتا ہے، بارگاہ قدس سے وہ بقائے دوام حیات جاوید اور بل احیاء کے سرخ خلعت سے سرفراز ہوتا ہے، جنت کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے ہیں، اور خداوند تعالےٰ اپنے پاس کی روزی سے اس کو سیر فرماتا ہے،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قربانی کا اقتصادی پہلو

عید اضحیٰ جس کے معنی جشن قربانی کے ہیں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے تاریخی واقعہ کی یادگار ہے، اس وقت کے جو سامی بادشاہ عراق شام اور مصر پر حکمراں تھے، وہ اپنے نمرودی و فرعونی کبر و نخوت میں مبتلا تھے۔ ہر جگہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے بادشاہوں کی پوجا ہو رہی تھی، ضرورت تھی کہ ان نمرودوں اور فرعونوں کی جابر و ظالم سلطنتوں کے حدود سے آزاد کسی سرزمین میں اس پیام حق کے لئے جو حضرت ابراہیمؑ کے ذریعہ دنیا میں آیا تھا، کوئی مرکز قائم کیا جائے، جو ہر قسم کی دنیاوی سرسبزی و شادابی سے پاک ہو تاکہ سلاطین کی حرص و آز کے ہاتھوں سے وہ ہمیشہ محفوظ رہے،

انتخاب کی نظر عرب کی اس شور اور بنجر زمین پر پڑی جس کا نام حجاز ہے، جو بحر احمر کے کنارے شام اور یمن کے دو زرخیز علاقوں کے بیچ میں آمد و رفت کا راستہ اور تجارت کے قافلوں کا گذرگاہ تھا، تاہم چونکہ وہ ہر قسم کی روئیدگی اور سیرابی سے مبرا تھا، اسلئے اس میں کوئی مستقل آبادی نہ تھی، لیکن سوداگروں کی آمد و رفت سے وہ تبلیغ کا اہم مرکز ہو سکتا تھا، اس لئے زمین کے اس چھوٹے سے ٹکڑے کی قسمت میں ازل سے جو عزت مقدر ہو چکی تھی، حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں اسکے ظہور کا وقت آیا،

حجاز دعوت حق کا مرکز قرار پایا، اور خانہ کعبہ کی تعمیر اور تطہیر کا حکم آیا، اور اس کی پاسبانی کے لئے حضرت ابراہیمؑ کو اپنی سب سے پیاری اور اکلوتی اولاد حضرت اسمٰعیلؑ کی قربانی کا منظر خواب میں دکھایا گیا، اس جسمانی قربانی کے خواب کی تعبیر روحانی قربانی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے مروہ پہنچکر اپنے خواب کی جسمانی

بل کرنی چاہی تو ندا آئی، اے ابراہیم تم اپنے خواب کو پورا کر چکے، اور اب اس خواب کی تعبیر وہ "ذبح عظیم"
عظیم الشان قربانی ہے، جو اپنی جان کو راہ حق میں دیکر اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں لٹا کر ادا کر سکتے
اس رمز کی جسمانی تمثیل جانور کی قربانی ہے، جو ہر حاجی پر ہر سال فرض ہے، ہر مسلمان پر جس میں استطاعت ہو
واجب ہے،

اس خواب کی حقیقی تعبیر کی تکمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کو شام کے مرغزار سے
کر حجاز کے بے آب ودانہ اور شور زمین میں خانہ خدا کے پاس آباد کیا، تاکہ حق کا پیغام اور توحید کا
دعوت سلاطین زمانہ کی جابرانہ تعدی سے محفوظ رہکر آخری پیغام الٰہی کے ظہور کے لئے تیار رہے،

اس بے آب ودانہ بنجر اور شور زمین میں کسی انسانی آبادی کی بقا کسی مادی اقتصادی انتظام کے
بیر ناممکن تھی اور ہے، اس کے لئے قدرت الٰہی نے دو انتظام کئے، حج اور قربانی، حج کو علاوہ اپنے روحانی
ض وبرکات کے اقوام عالم کی تجارتی نمایشگاہ، یا عالمگیر تجارتی میلہ ٹھہرایا، اشہر حرم کے مامون زمانہ میں
ب کے سارے گوشوں سے تاجر اور سوداگر آتے، اور مکہ کے میدان میں قیام کرکے سال بھر کی روزی
یدا کرتے،

اسی نکتہ کو سامنے رکھکر حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کے معنی سمجھئے:-

وَاِذْ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور جب ابراہیم نے کہا، اے میرے
هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ	پروردگار اس کو امن والا شہر بنا،
مِنَ الثَّمَرَاتِ،	اور یہاں کے رہنے والوں کو کچھ پھلوں
(بقرہ - ۱۵)	میں سے روزی کر،
رَبَّنَا اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِیْ	اے ہمارے پروردگار! میں نے
بِوَادٍ غَيْرِ ذِیْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	اپنی کچھ اولاد بن کھیتی کے میدان میں تیرے

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً	عزت والے گھر کے پاس اس لئے بسائی
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ	ہے، کہ نماز کو قائم کریں، تو انسانوں کے
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ،	کچھ دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان
(ابراہیم-۶)	کو کچھ پھلوں کی روزی دے تاکہ وہ ش

حج کی تجارتی گرم بازاری، اور حاجیوں کی آمد ورفت سب اسی لئے ہے تاکہ اس کے ذریعہ اس ویرانہ کی روحانی وجسمانی ومالی آبادی ہو، اسلام آیا تو لوگوں نے سمجھا کہ روحانی مقصد سے حج کے مالی مقاصد رد کر دیے گئے، مگر خدا نے تصریح کی کہ ایسا نہیں ہے، فرمایا:-

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا	تمھارے لئے یہ گناہ نہیں کہ (حج میں)
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ، (بقرہ-۲۵)	خدا کی روزی کو تلاش کرو،

اسی لئے خدا کی روزی تلاش کرنے والے حاجیوں کے لئے راستوں کے امن کا حکم دیا گیا، فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا	اے ایمان والو! اللہ کے شعائر کی
شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ	بے توقیری نہ کرو، اور نہ حرمت والے
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ وَلَآ	(حج کے) مہینے کی، اور نہ حج کی قربانی کی
آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ	اور نہ قربانی کے جانوروں کے پٹوں کی
فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا،	اور نہ ان کی جو عزت والے گھر (کعبہ) کے
(مائدہ-۱)	قصد سے نکلے ہوں، اپنے پروردگار کے
	فضل (تجارت) اور اس کی رضامندی

اس سے معلوم ہوا کہ حج کے اغراض میں ایک اہم غرض اس کا تجارتی اور اقتصادی پہلو ہے

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے، کہ حضرت ابراہیم کو اس اعلان کا حکم ہوا تھا،

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ	اور لوگوں میں حج کو پکار دے، وہ
رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ	پیادہ اور ہر دبلی پتلی سواریوں پر ہر
مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ	دور دراز راستہ سے تیرے پاس آئینگے
لَهُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْٓ	تاکہ اپنے (دینی و دنیاوی) منافع کے
اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ	مقاموں پر حاضر ہوں، اور چند مقررہ
مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ فَکُلُوْا	دنوں میں اللہ کا نام جانوروں پر لیں
مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ	جو ہم نے ان کو روزی کئے، تو ان جانوروں
(حج - ۴)	کے گوشت میں سے کچھ کھاؤ، اور بدحال

ان آیتوں میں خاص تصریح ہے کہ حج کے مقاصد میں سے ایک خاص مقصد یہ ہے کہ لوگ تجارتی و مالی منافع کے مقاموں پر اکٹھے ہوں، اور باہم مبادلہ اور خرید و فروخت سے اقتصادی فائدے اٹھائیں، اسی لئے متعدد مفسرون نے آیت میں منافع سے مراد تجارت لی ہے، اور کسی نے مغفرت، مگر اکثروں نے ان دونوں کو شامل کیا ہے،

آیت میں اس بات کی بھی تصریح ہے، کہ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ جانوروں کی جو نعمت انسانوں کو ملی ہے، اس کا وہ شکریہ ادا کریں، اور اس مسرت اور جشن کے موقع پر خود انکا گوشت کھائیں، اور فقیروں اور مسکینوں کو کھلائیں، کہ وہ بھی اس خوشی میں شریک ہوسکیں، قربانی کا یہ مقصد نہیں کہ نفس جانور کی خونریزی خدا کو محبوب ہے، یا اس کا گوشت اسکو پسند ہے فرمایا،

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا	اللہ کے پاس قربانی کے جانور
وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰکِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی	کا گوشت اور خون نہیں پہونچتا بلکہ تمہارے

مِنکم ؕ (حج - ۵) (دل کی پرہیزگاری پہنچتی ہے،

اب معلوم ہوا کہ حج میں قربانی کی غرض ایک تو یہ ہے کہ اس جشن میں دعوت کا سامان ہو، دوسری غرض یہ ہے کہ بدحال فقیروں کو کھلایا جائے، اسلئے قربانی کے اتنے حصے کے علاوہ جو ذاتی صرف میں آئے بقیہ کل گوشت پوست سب فقیروں کو ہدیہ ہے،

دولت کا سرچشمہ تین چیزیں ہیں، زراعت صنعت اور مویشی کی پرورش، عربوں کے پاس زراعت نہیں، اور نہ صنعت ہی ہے، اسلئے دوسری قوموں کے تجارتی سامانوں کی دلالی کے بعد جو چیز ان کی دولت کا سرمایہ ہے، وہ جانوروں کی پرورش ہے، اور یہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے،

بے مایہ عربوں کو بیت حرام کی پاسبانی کی اجرت اور ان کی اقتصادی امداد کا ذریعہ یا تو خیرات ہو سکتی تھی، جو صدرجہ ان کی دنائت اور پست حالی کو ہر حال میں بڑھاتی، جس طرح وہ آج کل خلاف شریعت خیرات لے لے کر تمام دنیا کی نگاہوں میں عربوں کی عزت کو بٹہ لگا رہے ہیں، یا کوئی دوسری صورت ہوتی، اسلام نے دوسری صورت نکالی اور وہ ان کی پرورش کے لئے تجارت، حاجیوں کا کرایہ، کان حاجیوں کی خدمت کی مزدوری، حاجیوں کی سواری کی اجرت، اور دوسرے ذریعے مقرر کئے ہیں انہی میں سے ایک قربانی بھی ہے،

پہلے زمانہ میں پانچ لاکھ حاجیوں کا تخمینہ ہوتا تھا، اور اب ایک لاکھ ہے، ہر حاجی کم از کم ایک دنبہ یا بکرا قربانی کرتا ہے، بعض اونٹ کرتے ہیں جس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، مگر اس میں شرکت بھی ہوتی ہے، بہرحال اوسطاً ایک لاکھ دنبہ رکھ لیجئے، ایک دنبہ کی قیمت اوسطاً چار روپے ہوتی ہے، تو اس طرح اہل بادیہ عرب کو ہر سال حج میں کم از کم چار لاکھ روپئے تقسیم ہوتے ہیں، اور پہلے کے حساب سے بیس لاکھ روپئے تقسیم ہوتے تھے،

غیر حاجی مسلمان ہندوستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی جو قربانی کرتے ہیں، اس کا

سو یہ بھی ہر ملک کے دیہاتی مسلمانوں کو پہنچتا ہے، ہندوستان میں گو اکثر قربانی کے جانور قصائیوں کے ذریعہ خرید سے جاتے ہیں، مگر شاید مسلمانوں سے زیادہ نامسلمان مویشی کی پرورش کرتے ہیں، اور فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر یہ قصور کس کا ہے؟

جانور کا گوشت، پوست، ہڈی سب کی قیمت بازار میں ہے، اور ان سب کا نفع زکوٰۃ کی طرح مستحقین کے لئے مخصوص ہے، اگر عرب یا حجاز کی حکومت اس کا مناسب انتظام نہیں کرتی، اور اس کا نفع حاصل کرکے غریبوں کو نہیں دیتی، تو یہ قصور اسلام کا نہیں مسلمانوں کا ہے، اسکے لئے اسلام میں اصلاح کی ضرورت نہیں مسلمانوں میں اصلاح کی ضرورت ہے،

عرب کے باہر دوسرے اسلامی ملکوں کا حال گو نہیں معلوم مگر اسکو ہندوستان پر قیاس کیا جا سکتا ہے، ہندوستان میں ۸ کروڑ مسلمانوں میں ۸ لاکھ قربانیاں ہوتی ہونگی، اور آٹھ لاکھ قربانیوں کی کھالوں کی قیمت اگر آٹھ ہی لاکھ کم وبیش رکھی جائے، تو یہ آٹھ لاکھ روپئے سالانہ عربی مدرسوں، مکتبوں، قومی اداروں اور شہر ودیہات کے غریبوں میں بانٹے جاتے ہیں، اگر ہر سال ان آٹھ لاکھ روپیوں کے جمع وخرچ کا ٹھیک انتظام نہیں کیا جاتا ہے تو یہ مسلمانوں کا قصور ہے، پھر بھی یہ معلوم ہے کہ ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے کئی مہینوں کے اخراجات اس قربانی کی مد سے پورے ہوتے ہیں

جشن قربانی کے اظہار کے لئے کوئی ایسا طریقہ جس میں جشن کا اظہار ہو، باہم دوستوں کی ساتھ دعوت اور ہدیہ کا انتظام ہو، اور پھر غریبوں اور مسکینوں اور قومی ضرورتوں کا فنڈ بھی اس سے قائم ہو، فَدَيْنَاهُ بِذِبْحٍ عَظِيمٍ کا مصداق بھی ہو، قربانی کے سوا کوئی دوسرا نہیں،

آجکل کی مہذب سلطنتوں میں ٹیکس کے دو طریقے ہیں، ایک براہ راست ٹیکس جیسے انکم ٹکس، دوسرا بواسطہ ٹیکس، جس طرح ہم اس سلطنت میں ہر چیز پر ہر وقت ٹیکس ادا کر رہے ہیں، مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ براہ راست ٹیکس ہمیشہ گراں گذرتا ہے، اور بواسطہ ٹیکس کبھی معلوم بھی نہیں ہوتا یہی سبب ہے

کہ جتنے لوگ زکوۃ ادا کرتے ہیں، اوس سے زیادہ لوگ قربانی دیتے ہیں، اسلام نے ان دونوں ٹیکسوں سے کام لیا ہے، زکوۃ براہ راست انکم ٹیکس ہے، اور قربانی بواسطہ ٹیکس ہے اور اس کی ادائی کا راز اسی قربانی کے پُرپیچ رمز میں ہے، اگر کوئی اس دینی راز کے نفسیاتی فلسفہ کو کھول کر اسکو نقد روپیہ سے بدلنا چاہے، تو وہ دیکھے گا کہ چند ہی سال میں یہ منتر بے اثر، اور عید اضحیٰ کا فلسفہ باطل ہو جائے گا، اور وہ روز جشن نہیں بلکہ تحصیل وصول کا ناگوار دن بن جائے گا،

الغرض قربانی بہت سے نفسیاتی، روحانی، اور مادی اقتصادی فوائد پر مبنی ہے، اور اس میں جو کمی نظر آتی ہے، وہ مسلمانوں کے ہر شعبہ میں نمایان ہے ضرورت ہے، کہ مسلمان اپنی اصلاح کریں، اسلام کی اصلاح نہیں، کہ وہ ہر اصلاح سے پاک و بلند ہے،

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، اون کا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہو جائیں ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت عہر

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل و ایسا تبصرہ ہو جس کو جدید فقہ کی ترتیب میں مدد مل سکتی ہو، حجم ۴۰۰ صفحے قیمت سے ،

"منیجر"
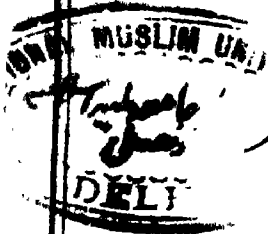
رامائن پر ایک عمومی نظر

از

جناب مولوی سید سبطین احمد صاحب بی اے، بدایونی

(۲)

یورپ کے مستشرقین کی رائے میں مہابھارت کے پڑھنے سے تو یہ حقیقت صاف کھل جاتی ہے، کہ اس کی تصنیف میں بہت سے شاعروں نے حصّہ لیا ہی، اور مختلف اوقات میں جدید اضافے ہوتے رہتے ہیں لیکن رامائن کی نسبت خیال تھا، کہ اس کا بیشتر حصّہ ایک ہی عہد اور ایک ہی قلم کا اثر ہے، اور بہت کم اجزا ایسے پائے جاتے ہیں، جن پر بعد کے ملحقات ہونے کا شبہہ ہو سکتا ہے، لیکن مسٹر ونیکٹا رتنام کا خیال ہے کہ رامائن اس الزام سے بری نہیں بلکہ ایک تو بہ تو تصنیف ہے جس میں کم سے کم چار افسانہ نویسوں کی کوشش کو دخل ہے۔

خود رامائن بتاتی ہی کہ نرد (ن۔ر۔د) پہلا شخص ہے جس نے والمیک کو یہ افسانہ سنایا، نرد کی ابتدائی روایت میں والمیک کے جادو نگار قلم نے کتنی رنگ آمیزی کی ہوگی، اس کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن یہ باور کر لینا کہ ابتدائی روایت کو بغیر کسی تغیر کے نظم کر دیا گیا، قرین عقل نہیں، مسٹر ونیکٹا رتنام کہتے ہیں کہ یہ والمیک بھی نہ ہندو تھا نہ ہندوستان کا رہنے والا بلکہ کوئی بدیسی نو وارد تھا، جس کی وساطت سے نارد کا افسانہ پہلی مرتبہ ہندوستان پہنچا، نرد جس سے والمیک نے نقل کیا، کسی نامعلوم مقام اور اجنبی قوم کا آدمی تھا جس نے ہندوستان کی سرزمین پر کبھی قدم بھی نہ رکھا تھا، ظاہر ہے کہ مورخ جب کسی ایسے عہد کے حالات

[1] یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اس مضمون کا موضوع والمیک سے منسوب رامائن ہو، تلسی داس کی رامائن سے بحث نہیں

تحقیق کرتا ہے، جس کی تاریخ تحریری آثار کی ممنونِ احسان نہیں ہوتی، تو اس کے نظریات کا مدار صرف الفاظ اور لغات پر رہ جاتا ہے، چنانچہ نرد کی نسبت مسٹر وینکٹارتنام کے نظریہ کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ نرد کے معنی بادل ہیں، اور بادل سے مراد ایک سُنی سُنائی اُڑتی ہوئی خبر لیجاتی ہے، ہندو دیومالا میں جو بیرونی عنصر کو اپنے قدیم نظام میں جگہ دینے کے لئے تیار تھی، نرد کو برہما جی کا بیٹا کہا گیا ہے، جس کو رام کا قصہ سنانے کے لئے برہما نے والمیک کے پاس آسمان سے بھیجا تھا، اور جو یہ خدمت انجام دینے کے بعد پھر آسمانوں کی طرف چلا گیا، ہندو دینیات کا یہ جز اگر تاریخی نگاہ میں کوئی معنی رکھتا ہے، تو بس یہی کہ نرد کوئی اجنبی تھا جس کی قومیت اور ذاتی حیثیت ہندوستان والوں کی نظر سے مخفی رہی،

والمیک کے غیر ہندی ہونے پر مصنف نے جو استدلال کیا ہے، وہ اور بھی زیادہ دلنشیں معلوم ہوتا ہے آریہ قوم کی عادت تھی کہ ہر بدیسی کو ذلیل سمجھتی تھی، اور اس کو ملکش یا شودر کہتی تھی، والمیک بھی اسی نسلی تفوق یا تعصب کا شکار رہا، چنانچہ ہندوستان کی شودر قومیں آجتک والمیک کو اپنی جماعت کا ایک ممتاز فرد سمجھتی ہیں، مسٹر وینکٹارتنام کا خیال ہے کہ رامائن کی وہ داستان جو والمیک نے نظم کی تھی، ہندوستانی مقامات اور ہندی اشخاص سے متعلق نہ تھی بلکہ ان افراد اور بستیوں کا ذکر کرتی تھی، جن کے نام نرد کی ابتدائی روایت سے ماخوذ تھے، اور جو راویوں اور زبانوں کی اختلاف سے اپنی اصلی صورت سے کسی قدر دور ہو گئے تھے،

والمیک کے ایک عرصہ بعد قدرتی طور پر ان تمام مقامات اور افراد کو ہندی نام تصور کیا جانے لگا اور ایک تیسرے ناقل نے کچھ مزید تصرف کے بعد اصلی ناموں کو شمالی ہندوستان کے مقامات سے منطبق کر دیا پھر بھی رامائن کی منظوم داستان والمیک کی تصنیف سمجھی جاتی رہی،

یہاں تک تو رامائن کا تعلق صرف شمالی ہندوستان سے تھا، اور اس میں ایک غیر ہندوستانی سلطان کی ایک کامیاب مہم مذکور تھی، مگر جنوبی ہند میں اسی سلطان کی ایک اور مہم کا افسانہ پہنچ چکا تھا، چنانچہ رامائن کی داستان میں ایک اور تہ بعد کو چڑھائی گئی، اور موجودہ رامائن وجود میں آگئی، یہ واقعہ ہے کہ

فاضل مصنف نے رامائن کی ان ارتقائی منزلوں سے بحث کرتے وقت خطرناک اختصار سے کام لیا ہے، اور کتاب کا یہ جزء غیر سنسکرت وان اصحاب کے لئے تسلی بخش نہیں ہے،

بصورتِ موجودہ راماین کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ کبھی ایک بڑی سلطنت کوسل نامی دریائے سرجو کے کنارے واقع تھی، اس دریا کا موجودہ نام گھاگرا ہے، اس کا دار السلطنت اجودھیا تھا جسکو خود منو نے آباد کیا تھا، چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں اور ایک ناقابلِ عبور خندق اسکی حفاظت کے سامان تھے، یہاں ایسے ایسے آلاتِ حرب موجود تھے، جو ایک دم سو سو آدمیوں کو ہلاک کر سکتے تھے، کئی محل اور بہت سی منزل در منزل عمارتیں اس کی رونق تھیں، یہ تھا اجودھیا کا وہ شہر جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا[1]،

اس سلطنت کا حکمراں راجہ دسرتھ تھا، ایک طویل مدت تک جس کی میعاد ساٹھ ہزار سال بتائی گئی ہے، حکومت کرنے کے بعد دسرتھ نے ایک مجلس میں رعایا کو مطلع کیا کہ بڑھاپے اور کمزوری کے تقاضے سے مجبور ہو کر میں نے بڑے بیٹے رامچندر کو گدی پر بٹھا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے، یہ تجویز ہر ایک کو پسند آئی لیکن کیکئی کی ضد نے مجبور کر دیا، کہ بیٹے کو چودہ سال کا بن باس دیا جائے، چنانچہ رام کو ترکِ وطن کرنا پڑا،

لکشمن اور سیتا جی رام کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں، دسرتھ کا ایک وزیر سومنتر رتھ ہانک رہا ہے، شام کے قریب یہ قافلہ دریائے تمسا کے کنارے پہنچتا ہے، دوسرے دن صبح تڑکے دریا کو عبور کرتے ہیں، یہاں تک اجودھیا کے بہت سے لوگ خیر باد کہنے کے لئے ساتھ ہیں، لیکن رام ان سے بچنا چاہتے ہیں، اور سومنتر کو حکم دیتے ہیں، کہ شمال کی طرف رتھ لیجائے، تاکہ لوگ سمجھیں کہ رام اجودھیا کو واپس جا رہے ہیں، اور رتھ جنوب کی طرف لوٹ کر کسی دوسرے راستہ سے رام سے آملے[2]، اس کے بعد رام جنگل میں داخل ہو جاتے ہیں،

---

[1] رامائن از گرفتھ کتاب نمبر ۱، باب نمبر ۵ اشلوک نمبر ۸، [2] رامائن کتاب نمبر ۲ باب ۴۶،

اور کوسل کی جنوبی حد تک پہنچ جاتے ہیں، آخر دریائے گنگا کے کنارے سنرنگی بیراپور نام ایک مقام پر پہنچتے ہیں، اور وہیں اپنے دوست گوہا کی صحبت میں جو نشدون (شکاری قوم) کا بادشاہ ہے رات گذارتے ہیں،

تیسرے دن رتھ اور رتھ بان اجودھیا کو واپس بھیجدیا جاتا ہے، رام سنیاسی کا لباس پہنکر گنگا پار چلے جاتے ہیں،

چوتھے روز صبح کو اس مقام کی طرف کوچ شروع ہوجاتا ہی جو گنگا جمنا کا سنگم ہے، یہاں بھردواج رشی سے ملاقات ہوتی ہے، اور رام اپنا قصہ بیان کرتے ہیں، بھردواج ہدایت کرتا ہے کہ چترکوٹ پہاڑی پر (جو ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے) جاکر رہیں، اس پہاڑی پر رشیوں کے صرف وعظ نظر آتے تھے، کیونکہ رشی لوگ اپنے اپنے سر لئے ہوئے آسمان پر چلے گئے تھے،

پانچویں روز بھردواج سے رخصت ہوتے ہیں، جو ہدایت کرتا ہو کہ سنگم پر پہنچ کر جمنا کے کنارے کنارے سفر کریں، تر تھم گھاٹ پر دریا عبور کرکے رام جنوبی کنارے پر پہنچ جاتے ہیں، اور بناس پتی کے نیچے رات گذارتے ہیں،

چھٹے روز چترکوٹ پہنچ کر والمیک سے ملاقات ہوتی ہے، اور رام اپنا قصہ سناتے ہیں یہیں ایک جھونپڑا بنا کر رہنے لگتے ہیں، اسوقت اجودھیا میں راجہ دسرتھ کا انتقال ہوجاتا ہی نعش کسی روغن میں ڈال کر رکھدی جاتی ہے، اور بھرت کو بلانے کے لئے گرو راج یا کیکیا پور کو جو بلکھ سے آگے ہے قاصد روانہ ہوتے ہیں، بھرت رات میں کہیں ٹھہرے بغیر سات دن میں اجودھیا آجاتے ہیں اور کیکئی، کوسلیا اور سومتر کو ساتھ لیکر رام کی تلاش میں نکلتے ہیں،

چترکوٹ میں قرب وجوار کے رشی رام سے راکششوں کی شکایت کرتے ہیں، جو جن استھان میں رہتے تھے، بالخصوص کھارراکشش سے جو راون کا بھائی ہے، انکو بہت زیادہ خطرہ رہتا ہے،

ساتویں روز رام ڈنڈک کے جنگل میں داخل ہوتے ہیں، جہاں بہت سے رشیوں کے علاوہ سربھنگ سے ملاقات ہوتی ہے، جو گوتم کی اولاد ہے، یہاں بھی رشی راکششوں کے شاکی ہیں، اور

رام ان کو برباد کر دینے کی قسم کھا لیتے ہیں،

آٹھویں روز اگستیا سے ملاقات ہوتی ہے، یہاں دکن میں رشی اور راکشش برسرِ جنگ نہیں ہیں، اگستیا رام کو بتاتا ہے کہ اُن کے بن باس کے دس سال اسوقت تک گذر چکے، اُس کی ہدایت پر رام پنچاوٹی میں سکونت اختیار کر لیتے ہیں، جسکے معنی پانچ برگد کے ہیں، اور جو گوداوری کے کنارے واقع ہے،

یہیں سے راون سیتا کو لیجاتا ہے، جتیو چیل سے رام کو یہ حال معلوم ہوتا ہے، روتے اور ماتم کرتے ہوئے وہ رسیامکا پہاڑ کی طرف مغرب کی سمت بڑھتے ہیں، جہاں بھالو کثرت سے ہیں، یہاں سرگیو سے ملاقات ہوتی ہے، اور سرگیو کے ساتھ کشن کھنداپور پہنچتے ہیں، جو بندروں کے بادشاہ والی کا پایۂ تخت ہے، رام والی کو قتل کر کے سرگیو کو تخت پر بٹھا دیتے ہیں،

سرگیو سیتا کو تلاش کراتا ہے، ہنومان سرگیو کا وزیر اور رام کا دوست ہے، اسکو سامپتی چیل سے سیتا کا سراغ ملتا ہے، وہ آسمان تک جست کر کے مہندر پہاڑ سے سمندر پھاند جاتا ہے، اور لنکا میں جا کر گرتا ہے، یہاں سے لوٹ کر رام کو سیتا کا پتہ دیتا ہے،

آخر پُل بنایا جاتا ہے جس کے لئے پتھر ہمالیہ پہاڑ سے آتے ہیں، اس پُل کے بنانے والے سرگیو کے محکوم بندر یعنی دکھنی لوگ ہیں، رام اس پُل سے گذر کر راون کو قتل کر دیتے ہیں، اور سیتا ملجاتی ہیں،

دکن سے اجودھیا تک سفر کچھ معرکہ خیز نہیں، اور اس کا اعادہ غیر ضروری ہے، جتنا بیان کیا گیا، اسی سے افسانہ کے واقعات کی نوعیت معلوم ہو جاتی ہے، خلافِ فطرت واقعات جو راماین میں جابجا مذکور ہیں، اگر معرضِ تنقید میں لائے جائیں، تو افسانہ نگار نہیں، بلکہ نقاد کی غلطی ثابت ہوگی، لیکن شاعر کے دماغ کو خیال آرائی اور اعجوبہ آفرینی کی پوری آزادی دینے کے بعد بھی ہر ناقد ہی نہیں بلکہ ہر ناظر کو یہ حق پہنچتا ہے کہ واقعات کے باہم مربوط ہونے اور تخالف سے پاک رہنے کا مطالبہ کر سکے، دسرتھ کا ساٹھ ہزار سال حکومت کرنا، اندر کا گیارہ ہزار برس تخت نشین رہنا، جتایو کا جو ایک چیل ہے، ساٹھ ہزار برس فرمانروائی کرنا، راون کا دس

تسخیر کرنا، بندروں کا ہمالہ سے تیر لانا اور آسمان تک جست لگا سکنا یا سمندر کو ایک قلانچ میں پھاند جانا یہ تمام خلاف عقل بیانات شاعرانہ تخیل کے لئے جائز سمجھ لئے جائیں، لیکن واقعات اگر باہم متضاد نظر آئیں، تو یہ ایک ناقابل عفو جرم بن جاتا ہے، اور کتاب کو تاریخ کیا معنی افسانہ کی حیثیت سے بھی گرا دیتا ہے،

مسٹر وین کٹا رتنام کے بقول رامائن متضاد اقوال سے پُر ہے، سب سے پہلے تو قصہ کی اصلی بنیاد نارد کی روایت کو بتایا گیا ہے جس سے سُن کر والمیک نے اسکو نظم کیا، مگر دوسری جگہ دکھایا گیا ہے کہ چترکوٹ میں والمیک اور رامچندر جی کی ملاقات ہوئی رامچندر جی نے اپنا تمام حال والمیک کو سُنایا اور انھوں نے اس کو نظم کر دیا، چترکوٹ پہنچنے تک جو حادثات پیش آئے تھے، وہ تو اس ملاقات میں ذکر کئے جا سکتے تھے، لیکن بعد کے واقعات معلوم ہونے کے لئے والمیک کے پاس کونسا ذریعہ تھا، اسی تضاد کی ایک اَور مثال یہ ہے کہ رام کے بن باس کا سبب بڑے اہتمام کیساتھ حرم سرا کی ایک سازش اور سوکن کا جلاپا دکھایا گیا ہے، لیکن دوسری جگہ رام کے منہ سے کہلایا جاتا ہے کہ مجھے باپ نے کھارا جیسے راکشس کو قتل کرنے کے لئے بھیجا ہے، ایک جگہ اور رام کہتے ہیں، کہ میں رشیوں کے دشمنوں کو برباد کرنے کے لئے خود اپنی مرضی سے آیا ہوں،

اس کے بعد رامائن نگار کی جغرافی معلومات سے بحث کی گئی ہے، مثلاً رام کا گومتی کو پار کرنا، جب کہ وہ گنگا کے جنوبی کنارے پر چل رہے تھے، ناممکن تھا، ڈنڈک کے جنگل کی وسعت رامائن نگار کے نزدیک گنگا سے گوداوری ہی تک نہیں، بلکہ پمپا جھیل تک جو احاطہ مدراس کے ضلع بلاری میں واقع ہے پہنچتی ہے، پھر تمام افسانے میں گنگا جمنا اور گوداوری کے علاوہ کسی بڑے دریا کا ذکر نہیں جو رام کو عبور کرنا پڑا ہو، اسی طرح پہاڑوں میں صرف ہمالہ، وندھیا اور چترکوٹ کو قابل التفات سمجھا گیا، مگر چترکوٹ جس کو گنگا جمنا کے سنگم سے پچیس میل پچھم کی طرف بتایا گیا ہے، صرف فرضی وجود ہے، کیونکہ مسٹر وینکٹا رتنام کے بقول ہندوستان کا یہ علاقہ پہاڑوں کے بوجھ سے آزاد ہے، وندھیاچل پہاڑ اگستیا کو نمسکار کرنے کے لئے زمین

پر لیٹ کر تمام اس زمین کو ایک مسطح میدان بنا دیتے ہیں، اور رامائن نگار کے بقول آج تک اگستیا کی واپسی کے انتظار میں اسی طرح تن بر زمین اور چشم براہ ہیں، اسکے بالفاظ دیگر یہ معنی ہیں، کہ رامائن کا مصنف دکن اور شمالی ہند کو ایک مسطح اور مسلسل قطعۂ زمین تصور کرتا تھا،

اسی طرح رام کے سفر کے واقعات باہم مربوط نظر نہیں آتے، مثلاً سفر کے آٹھویں روز رام اور اگستیا کی ملاقات ہوتی ہے، مگر اگستیا رام کو یہ مژدہ سناتا ہو کہ بن باس کے دس سال ختم ہو چکے، دونوں کے شمار سے قطع نظر کر کے اگر یہ مان لیا جائے، کہ اگستیا کا قول صحیح تھا، تو مدت سفر یوں تقسیم ہو جاتی ہے، کہ دس سال شمالی ہند میں اور تین سال پنچ وتی میں گذرے، بقیہ ایک سال گوداوری سے لنکا تک پہنچنے لشکر فراہم کرنے، راون سے لڑنے، سیتا کو حاصل کرنے اور اجودھیا تک واپس آنے میں صرف ہو، یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ تمام سفر پیادہ پا کرنا پڑا تھا، آخری ایک سال ان تمام مہات کے لئے ناکافی نظر آتا ہے،

کتاب زیر بحث میں رام کے سفر کا ایک نقشہ بھی شامل کر دیا گیا ہے، جو دکھاتا ہے کہ کتنی مدت میں ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کیا گیا، اس نقشہ کی رو سے رامچندر جی چوتھے روز چتر کوٹ پہنچتے ہیں، حالانکہ سفر کا خلاصہ جو مصنف نے پہلے دیا ہے، رام کی چتر کوٹ میں آمد چھٹے روز قائم کرتا ہے، اس اختلاف سے قطع نظر نقشہ میں چتر کوٹ کے بعد کسی کوچ کا دن شمار نہیں کیا گیا ہے، اور خلاصہ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ اگستیا کی ملاقات تک روز شماری ممکن ہے، لیکن بات تو یہ ہے کہ اس افسانہ کے واقعات کو دن اور تاریخ کے حوالہ سے ترتیب دینے کی کوشش کرنا ہی فضول ہے، ورنہ ایسی ایسی مشکلات سامنے آئیں گی، کہ حل ہی نہ ہو سکیں گی، مثلاً رام چھٹے روز چتر کوٹ پہنچتے ہیں اور جب کہ وہ چتر کوٹ میں ہیں اجودھیا میں دسرتھ کا انتقال ہوتا ہے، قاصد بھرت کی ننھیال کو روانہ کئے جاتے ہیں، بھرت سات روز میں بغیر کہیں ٹھہرے ہوئے اجودھیا پہونچ کر کیکئی کو سلا اور

سومتر کے ساتھ رام کی تلاش میں نکلتا ہے، اور چتر کوٹ میں رام سے ملاقات ہوتی ہے، لیکن مسٹر وئیکنا
رتنام کا خلاصۂ سفر پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ رام ساتویں دن ڈنڈک کے جنگل میں داخل ہو گئے،
گویا چتر کوٹ کے قیام کی مدت ایک ہی دن تھی، اور مذکورۂ بالا تمام واقعات اسی ایک دن میں پیش آگئے،
جیسا کہ پہلے گذر چکا مسٹر وئیکنا رتنام اس افسانے کو ہندی الاصل ہی نہیں سمجھتے، اس سلسلے میں
پہلے تو یہ دکھایا گیا ہے، کہ راماین نگار نے جتنے مقامات کا ذکر کیا ہے، ان میں چند کو چھوڑ کر کوئی بھی ایسا
نہیں کہ بلا خوف تردید ہندوستانی کہا جا سکے، اور پھر ان مستثنیات کی اصل بھی مصری جغرافیہ کی مدد سے
معلوم کیجا سکتی ہے، جیسا کہ آگے چل کر دکھایا جائے گا،

ہندوستان کے آثار الصنادید بھی کوئی چیز ایسی نہیں پیش کر سکتے جسکو رامچندر جی کی یادگار
کہا جا سکے، چتر کوٹ، رام ٹیک، پنچ وتی، غرض تمام ایسے مقامات پر جن کو رام کے گذر یا قیام کا شرف
حاصل ہے، سوا ان مندروں کے کچھ بھی نہیں، جو عقیدتمندوں نے بعد کو تعمیر کر دئیے ہیں، بلکہ اکثر مقامات
کا وقوع بھی مشتبہ ہے، کیونکہ ہندوستان میں شاید ہی کوئی صوبہ ایسا ہو، جہاں کے دو چار مقامات
پر رام کا گذر ہونا مردی نہ ہو، گوداوری کے قریب بہت دور مشرق کی طرف ہٹا ہوا ایک اور مقام
پرناسالہ نامی بھی رام کا قیام گاہ بتایا جاتا ہے، پرناسالہ اور پنچ وتی یہ دونوں مقام وہ ہیں، جہاں
سے کہا جاتا ہے کہ راون سیتا کو لے گیا، یہ رقیبانہ دعوی ان تمام مقامات کی فرضی حیثیت پر روشنی ڈالتا
ہے جن کو رام کے سفر وحضر سے منسوب کیا جاتا ہے، پھر راماین میں شہر اجودھیا کی عظمت، خوبصورتی
اور استحکام کا جو حال مذکور ہے، آج اس پر گواہی دینے والی ایک اینٹ بھی اس قصبہ میں نظر نہیں
آتی، اجودھیا آج ایک مرتفع میدان پر چھوٹا سا قصبہ ہے، جس کے ارد گرد یا جس کی سطح کے نیچے راماین
کے بیان کی تائید کرنے والے کوئی آثار نظر نہیں آتے، ممکن ہے کہ یہاں کچھ بدیسیوں نے آکر نوآبادی
قائم کر لی ہو اور وہیں سے رام کی روایت ملک میں پھیلی ہو،

اس کے بعد رامائن کے زمانہ تصنیف کا سوال آتا ہے، جو مستشرقین کے نزدیک نزاعی مسئلہ ہو، مسٹر گرفتھ نے اپنے مقدمہ میں اس مسئلہ پر بحث کی ہو جس کا ماحصل یہ ہے کہ رامائن کم سے کم چودہ پندرہ سو قبل مسیح میں تصنیف کی گئی، کتاب کی قدامت پر جو دلائل دیئے گئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں،

۱- رامائن کے مختلف نسخوں میں کثرت سے اختلافات ملتے ہیں، جو اس امر کی دلیل ہیں، کہ مرور زمانہ سے مختلف اضافے ہو گئے،

۲- رامائن کا طرزِ عبادت اس کی قدامت کا شاہد ہے،

۳- رامائن میں کہیں بودھ مت کا ذکر نہیں ملتا، اور چونکہ بدھ جی کا زمانہ چھٹی صدی قبل مسیح ہے، اسلئے رامائن کو قدیم تر ہونا چاہئے،

۴- رامائن میں کہیں ستی کی رسم کا ذکر نہیں، حالانکہ یونانی مورخ جو چوتھی صدی قبل مسیح میں ہندوستان سے روشناس ہوئے، اس رسم کو ملک کا قدیم دستور بتاتے ہیں، لہذا رامائن یونانیوں کے آنے سے کئی صدی پہلے لکھی گئی ہوگی،

۵- رامائن میں (Ceylon) کے لئے قدیم ناموں میں سے لنکا کا لفظ ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے، جو اس جزیرہ کا سب سے زیادہ پرانا نام ہے،

۶- رامائن میں کہیں بھگتی مذہب کا ذکر نہیں حالانکہ یہ مذہب بھی ولادتِ مسیح سے بہت پہلے شروع ہو چکا ہے،

۷- کشمیر کی تاریخ موسومہ راج ترنگنی میں مذکور ہے، کہ کشمیر کے راجہ دامودر دویم کو کچھ برہمنوں نے بددعا دی تھی، اور اس بددعا کا اثر ختم کرنے کی تدبیر یہ بتائی جاتی تھی، کہ ایک نشست میں ساری رامائن پڑھوا کر سن لی جائے، دامودر دویم کا عہد گیرنیبو کے قیاس کے مطابق چودھویں صدی قبل مسیح ہے، اور یہ رامائن کی قدامت پر زبردست حجت ہے،

م۔ رامچندرجی کا یہی افسانہ کالیداس کی تصنیف موسومہ رگھوونس کا بھی موضوع ہے، اور کالیداس خود تسلیم کرتا ہے، کہ اس افسانہ کو اگلے شعرا بھی نظم کر چکے ہیں، گورشیو کے نزدیک یہ اشارہ والمیکی ہی کی طرف ہو سکتا ہے،[1]

ان محققین کے برعکس مسٹر ساکس وغیرہ رامائن کی قدامت مشتبہ خیال کرتے ہیں اور ان کا استدلال یہ ہے، کہ یونانی مورخ اور چینی سیاح جنھوں نے چشم دید یا سماعی حالات تحریر کئے ہیں، اس کتاب کا ذکر نہیں کرتے، مثلاً فاہیان جب اجودھیا پہونچا ہے، تو یہ امر حیرت انگیز ہے، کہ وہ اس کی قدیم عظمت اور رامچندرجی کا دارالسلطنت ہونا بیان نہیں کرتا لیکن گورشیو کی جماعت اس حجت کو قابلِ التفات نہیں سمجھتی اسکا جواب یہ ہے کہ چینی سیاح ہوں، یا یونانی مورخ ان سے یہ امید کرنا کہ انھوں نے سنسکرت کے ادبی سرمایہ کا جائزہ لیا ہو بے جا ہے،

مسٹر ونیکٹا رتنام ان تمام مورخین کے برخلاف رامائن کا زمانہ تالیف چھٹی صدی بعد مسیح قرار دیتے ہیں، افسوس ہے کہ مسٹر ونیکٹا رتنام نے لسانی تحقیق اور اسماء کی تطبیق کے ساتھ ساتھ ان متعلقہ مسائل پر سیرِ حاصل تبصرہ اور تنقید نہیں فرمائی۔ رامائن کی تصنیف کو چھٹی صدی بعد مسیح سے منسوب کرنے کیلئے جو دلائل دئیے گئے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ بیرونی اقوام مثلاً ایرانیوں اور یونانیوں کا اکثر ذکر ملتا ہے یونانیوں کا حوالہ سب کو تسلیم ہے، مگر قدامت کے قائل فرض کر لیتے ہیں کہ سنسکرت کا لفظ "یوانا" شاید قدیم زمانے میں ہر غیر ملکی قوم کے لئے استعمال ہوتا ہو، اور بعد کو یونانیوں کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہو، دوسرے محققین کے برخلاف مسٹر ونیکٹا رتنام کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ رامائن میں بودھ مت کے حوالے اکثر موجود ہیں، مثلاً جب رام اور لکشمن وشوامتر رشی کے ساتھ راکششوں کو قتل کرنے جا رہے ہیں، اور متھلا پہنچتے ہیں، تو گوتم کے سب سے بڑے بیٹے ستانند سے ملاقات ہوتی ہے، اور دوسری جگہ وارد ہوتا ہے، کتا،

[1] اس تمام بحث کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ رامائن مترجمہ گرفتھ،

یک بودھی عالم سرادھ کی رسم کے بارے میں رامچندر جی سے مناظرہ کرتا ہے، ایک اور جگہ کہا گیا ہے کہ "بودھ ایک چور کی مانند ہے"، اور تاتاگت اور ملحد میں کوئی فرق نہیں، ان اشاروں سے فاضل مصنف نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ رامائن کی تصنیف نہ صرف بودھ جی کے بعد ہوئی، بلکہ اس دور میں عمل میں ئی جب کہ بدھ مت کا زوال شروع ہو چکا تھا، کیونکہ بدھ مت کے دور اقبال میں اس کے بانی کو ن الفاظ سے یاد کرنا قرین مصلحت نہ ہو سکتا تھا، مصنف کا آخری استدلال اس کتاب پر مبنی ہے، جو امرکوش کے نام سے منسوب ہے، اور جس کو سنسکرت فن لغت میں وہی مرتبہ حاصل ہے، جو پینی کو صرف و نحو میں ہے س کتاب میں رام نامی صرف دو شخص مذکور ہیں، ایک بالا رام اور دوسرا پرس رام، امرکوش کی تصنیف تقریباً نو سو سال بعد مسیح ہوئی، اور ایسی جدید کتاب میں دسرتھ کے بیٹے رام کا نام نہ آنا قدامت کا دعویٰ بالکل طل کر دیتا ہے،

مصنف کے ان دلائل کو آسانی سے رد نہیں کیا جا سکتا، البتہ ضروری تھا کہ مخالفین کے استدلال بھی جرح کی جاتی، اور بالخصوص ان متضاد بیانات پر محاکمہ کیا جاتا، جو مصنف نے دوسرے محققین کے لاف دیئے ہیں، مثلاً یہ دعویٰ کہ رامائن میں بدھ مت کے حوالے موجود ہیں، گورنیشیو کے قول کے خلاف ہے، یہاں ضروری تھا کہ سابق مبصرین کی غلط فہمی کے وجوہ بیان کئے جاتے، اور دکھایا جاتا کہ مصنف نے جن الفاظ کو اپنی تائید میں پیش کیا ہے، دوسرے لوگ ان کو کن معنی پر محمول کرتے ہیں، اس بحث کا قطعی فیصلہ تو سنسکرت پر عبور رکھنے والا ہی کر سکتا ہے، لیکن انگریزی تراجم اگر صحیح ہیں، تو مذکورہ بالا شہادتوں کے علاوہ رامائن کے اندر اور بھی حوالے تلاش کئے جا سکتے ہیں جو اس کی قدامت کے خلاف شہادت دیں گے، مثلاً ایک جگہ رام کے بیٹوں کی تعریف کرتے ہوئے شاعر اُن کو پتھر کے تراشے ہوئے اصنام سے تشبیہ دیتا ہے، اور یہ امر کسی طویل بحث کا محتاج نہیں، کہ ہندوستان کا قدیم عہد بت پرستی سے ناآشنا تھا، ہندوستان کے قدیم تا

جو بُت اور تصویریں پائی گئی ہیں، وہ سب مسیح علیہ السلام کی ولادت کے بعد کے زمانہ کی ہیں[1]،
غرض رامائن کی قدامت ایک مشکوک مسئلہ ہے، اور اس لئے مسٹر وینکٹا رتنام کے اس
نظریے کے خلاف کہ یہ افسانہ مصری فرعون رامیسز ثانی (۱۳۰۰ ق م) کے متعلق ہے حجت
نہیں بن سکتا،

(باقی)

---

[1] بعض کے نزدیک آریہ قوم میں لکڑی کے بُت بنانے کا رواج بہت قدیم تھا، ملاحظہ ہو تاریخ ہند قدیم مصنفہ بنرجی ص۲۹، پھر بھی پتھر کے بُت بعد کے عہد کی مخلوق ہیں، جو بدھ جی کی پرستش کے سلسلے میں ظہور میں آئے، فارسی بُت کو لفظاً بودھ ہی سے ماخوذ سمجھا جاتا ہے،

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر متضد ولی الرحمن صاحب ایم اے

"عام خیال یہ ہے کہ آزادی ارادہ" کے مسئلہ کا رس عرصہ ہوا کہ تمام کا تمام نچوڑ لیا گیا ہے" یہ وہ الفاظ ہیں جن سے جیمس نے جبر و اختیار پر اپنی بحث شروع کی ہے[1]، ہر مفکر کی طرح جیمس بھی اس خیال سے متفق نہیں بقول پروفیسر پالسن یہ ایسا مسئلہ نہیں، جو خاص حالات میں پیدا ہوا اور ان حالات کے ختم ہو جانے کے ساتھ ہی ختم ہو گیا، نہ یہ ایسا مسئلہ ہے، جو صرف دینیات، یا کلام کے لئے ہے[2] جن حالات میں یہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ باقی رہتے ہیں، لہذا یہ مسئلہ بھی ہمیشہ باقی رہے گا، اس مسئلہ پر ہر دور میں ہر قوم نے بہت کچھ سوچا اور بہت کچھ لکھا لیکن کسی کا ناخن بھی اس گرہ کو کھولنے میں کامیاب نہ ہوا،

اس مسئلے کا اخلاقی پہلو خصوصیت کے ساتھ تختۂ مشق بنا، کیونکہ اسی کے حل پر مذہب اور اخلاقیات کی ہستی و بقا موقوف ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ جبر و اختیار میں سے کسی ایک کے انتخاب سے مذہب و اخلاقیات دونوں کی بنیادیں ہل جاتی ہیں، ہر زمانے اور ہر ملک کے مفکرین کی طرح مسلمان مفکرین بھی اس مسئلے میں صاف نہیں ہیں، قرآن شریف میں جہاں وَمَا تَشَاۤءُوْنَ

---

[1] "The Dilemma of determinism." دیکھو اس کی کتاب The will to believe. ص ۱۴۵،

[2] Ethic جلد اول ص ۲۵۱،

اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰہُ کے ہم معنی آیتیں ہیں، وہاں فَمَنْ شَاءَ فَلْیُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْیَکْفُر کے ہم معنی آیتیں بھی ہیں، مسلمانوں نے تو کیونکر اس بحث سے اپنا پیچھا چھڑا لیا، کہ اس مسئلے میں مبداء وحی و رسالت محمد رسول اللہ صلعم کی عجیب مصلحت بینی ہے، کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی، اسی شدت سے اس میں بحث مناقشہ سے منع فرمایا[1]

زمانہ حال کے مغربی فلاسفہ میں بھی وہی تمام اختلافات پائے جاتے ہیں، جو متقدمین میں تھے، ذیل کا مضمون ڈاکٹر والٹر گڈنا ڈاوریٹ (Dr. Walter Goodnow Everett) کی کتاب (Moral values) کے باب دوازدہم کا آزاد ترجمہ ہے، ڈاکٹر موصوف انسان کو مجبوری میں مختار مانتا ہے، یعنی یہ کہ انسان ایک دائرے کے اندر محدود ہے، وہ اس دائرے کے اندر رہ کر جو کچھ چاہے کر سکتا ہے جس خوبی سے مصنف نے اپنے دعوے کو ثابت اور واضح کیا ہے، وہ اوراق آئندہ کے مطالعے سے روشن ہوگی،

"مقصد"

۱۔ زیر بحث مسئلہ

آزادی کے مسئلے پر تمام بحث میں دو متخالف نظریات مابہ النزاع ہیں، جو جبر و اختیار کے نام سے معروف عام ہیں، جبر کے قائلین کا دعویٰ ہے کہ انسان کی ذہنی زندگی، اور عالم خارجی کے تمام واقعات و حادثات لازماً پہلے سے معین و مقرر ہوتے ہیں، یعنی یہ کہ ان کی پیدائش گذشتہ متقدم واقعات سے ہوتی ہے، یا یہ ان کے لازمی معلولات ہوتے ہیں، عمل کے تعلق سے اس عقیدہ

[1] سیرۃ النبی مصنفہ سید سلیمان ندوی جلد چہارم صفحہ ۲۰۶ بحوالہ مشکوٰۃ باب الایمان بالقدر،

کا مطلب یہ ہے کہ ہر فعل عام اس سے کہ اچھا ہے یا برا، انسان کی داخلی فطرت اور خارجی عوارض حالات یا بالفاظ دیگر فاعل کی مجموعی سیرت اور اس کے ماحول کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، عقیدہ جبر کے مطابق ایک شخص کی سیرت اور اس کا ماحول ایسی قوتوں کا نتیجہ ہوتے ہیں، جنکا کھوج ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے میں بہت پیچھے تک لگایا جاسکتا ہے، اسی عقیدے کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اگر ہم کو کسی فعل کے مقدمات کا مکمل علم ہو، جو عملاً ناممکن ہے، تو ہم اس فعل کو سمجھ سکتے ہیں، اور معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ فعل ایسا کیوں ہے،

اس کے برعکس اختیار کا قائل دعویٰ کرتا ہے کہ ذہنی اور اخلاقی زندگی میں ایسے واقعات وحادثات ہوتے ہیں، جن کی توجیہ لازمی تعلقات کے ایسے جال سے نہیں ہوسکتی، یہ واقعات براہ راست اور از خود ارادے سے پیدا ہوتے ہیں، اور انسانی تجربے میں کلیۃً نئی تخلیق کی شکل میں نما ہوتے ہیں، اس نظریے کے مطابق ارادہ متقابل محرکات کی قوت کا اندازہ کئے بغیر فیصلہ صادر کر سکتا ہے، چنانچہ دو مثالوں میں بالکل ایک ہی جیسے مقدم نفسی حالات اور خارجی ماحول کے باوجود لازمی نہیں ہے کہ ایک ہی جیسا نتیجہ صادر ہو[1] بہ قول لوتزے آزاد ارادی کے ایسے افعال غیر صادر شدہ بھی رکھے جاسکتے ہیں "غیر معین اور بلا علت ہونے کے لحاظ سے کوئی منطقی وجہ اس امر کی نہیں کہ وہ صادر کئے ہی جائیں، لہذا آخری نتیجہ یہ ہے کہ انسانی عمل میں ایک عنصر اپنی ذاتی ماہیت نہ کہ ہمارے محدود علم کی وجہ سے ایسا ہے جو ہمیشہ کے لئے ناقابل توجیہ رہتا ہے، اور جس کو نہ صرف ناقابل توجیہ

---

[1] ریشڈال نے اس صورت حال کو دو توام بھائیوں کی فرضی مثال سے واضح کیا ہے، جو بالکل ایک ہی سی طبیعتیں لے کر پیدا ہوئے، اور پیدائش کے بعد بالکل ایک ہی جیسے عمرانی اور دیگر اثرات میں رہے اختیاریت کے نزدیک ان میں سے ایک ولی بن سکتا ہے، اور دوسرا شیطان، دیکھو نظریہ خیر و شر جلد دوم ص ۳۰۳، (مصنف)

اور پُر اسرار کہنا چاہئے، بلکہ وہ محض اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے؛

آیندہ اوراق میں اس عقیدے کے مطابق آزادی اور ذمہ داری کی تاویل کی کوشش کیجائے گی، کہ ذہن اور عالمِ خارجی کے واقعات میں معیّن و مقرر تعلقات ہوتے ہیں، کیونکہ خیال ہے کہ صرف اسی طرح حکمی (سائنٹفک) تفکر اور عملی اخلاقیات کے مقاصد پورے ہوتے ہیں، اس میں تو شبہہ ہی نہیں ہوسکتا کہ سائنس کی ترقی اور اس کے دائرۂ عمل کی توسیع کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ صرف طبیعی مظاہر تک محدود نہیں رہی، بلکہ انسانی اعمال میں بھی داخل ہو چکی ہے، نفسیات، اخلاقیات، معاشیات اور تاریخ کے سے جو علوم انسانی فعیت پر بحث کرتے ہیں، وہ اپنے وجود اور اپنی ترقی کے خاطر یہ فرض کرنے پر مجبور ہیں، کہ انسانی افعال، جو بہت زیادہ پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں، لازمی تعلقات و اضافات کے سلسلے میں واقع ہیں، جب تک ہماری فکر کسی سلسلۂ واقعات پر بحث کرتی ہے، اسوقت تک وہ مجبورًا ان کو کسی طرح متعلق فرض و متصور کرتی ہے، اس طریقے سے متصور کرنے سے انکار دراصل فکر کرنیکے انکار کے ہم معنی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے، کہ واقعات کے لازمی تعلقات کا تخیل ہی جس کو عمومًا اصولِ تعلیل کہا جاسکتا ہے، فکر کا عالمگیر اصول ہے، یہ صحیح ہے کہ ہم رفتہ رفتہ اور طویل تجربہ کے بعد اس اصول سے واقف ہوتے ہیں، اور ایک دفعہ واقف ہوجانے کے بعد پھر ہم اسکو واقعات کی توجیہ کے لئے عالمگیر اور لازمًا صحیح سمجھتے ہیں، یہاں مسئلۂ تعلیل پر مابعد الطبیعیاتی نقطۂ نظر سے بحث ممکن نہیں، لہذا ہم مجبورًا اپنے آپ کو اس بیان تک محدود رکھتے ہیں، کہ فکر کی ضرورت کے معنوں میں اصولِ تعلیل کا مطلب یہ ہے کہ کسی نئے واقعے کی وجہ یا بنیاد کو ہمیشہ گذشتہ واقعات میں تلاش کرنا چاہئے، یہ قول ریش ڈال "مطلقًا نئی اور ماضی سے غیر متعلق ابتدا ناقابلِ فکر ہے"

اختیار کا حامی اکثر واقعات کے لئے اس اصول کی ہمہ گیری کا تو قائل ہے، لیکن وہ اعتراض کرتا ہے کہ انسانی عمل میں بعض واقعات بہ ذات خود ایسے ہوتے ہیں، کہ جن پر مقدم واقعات کے تعلق

سے غور نہیں کیا جاسکتا، اس کے علاوہ اگر اخلاقی انتخابات کو ان مقدمات کیساتھ ملانے کی کوشش اخلاقیات میں فساد برپا کرتی ہے، تو کیا اس کوشش کو ترک کر دینا ہی بہتر نہیں، کہا جاتا ہے کہ زندگی، سائنس سے بڑھکر ہے، اور اخلاقی مقاصد معقولات فکر سے بالاتر ہیں، اس اعتراض کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اگر ہم دیکھیں گے، کہ کوئی نظری مقصد مستقلاً کسی اخلاقی مقصد کے منافی ہے، تو ہم کو مجبوراً کسی ایک کو ترک کرنا ہی پڑے گا، اسوقت یا تو عملی محرک شکست کھائے گا، یا اخلاقی، اس کا انحصار اس فرد میں کسی ایک مقصد کے غلبہ پر ہے، لیکن اس مشکل کا یہ حل ہمارے تفکر میں ایک مستقل اور ناقابلِ برداشت ثنویت کو متضمن ہے جس کو صرف بہ صورت بیچارگی تسلیم کیا جاسکتا ہے، لیکن ہم کیوں نہ یہ دریافت کرنے کی کوشش کریں کہ یہ دونوں مقاصد متحد ہیں، بلکہ یہاں تک کہ اپنے کردار پر لازمی تعلقات کے سلسلے کی صورت میں غور کرنے کا نظری محرک ہمارے اخلاقی مقاصد کا ممد ہے، اس مقدمہ کو ان الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے کہ نظری مقاصد بہ ظاہر قیاس جبر کے متقاضی ہیں، اگر اخلاقی مقاصد اس قیاس کے منافی نہیں، تو ہم عقلاً اس کو تسلیم کر لینے پر مجبور ہیں اور اگر اخلاقی مقاصد اختیاریت کے معاند ثابت ہوں، تو جبریت کے حق میں فیصلہ قطعی ہوجاتا ہے،

۲- کانٹ کی ثنویت

اکثر کوشش کی گئی ہے کہ ان دونوں نظریات کو ایک مابعد الطبیعیاتی عقیدے کی بنا پر مان لیا جائے جس کے مطابق جبریت تجربی دائرے کے اندر محدود ہوجاتی ہے، اور آزادی ایک ایسی مختلف دنیا میں منتقل ہوجاتی ہے جس پر سائنس کے معقولات ناقابلِ اطلاق ہیں، اس عقیدے کی قدیم صورت کانٹ کے ہاں پائی جاتی ہے جس نے محسوس اور معقول عوالم میں امتیاز کیا ہے، حسی تجربے کی ظاہری دنیا میں اصول تعلیل عمیم الاطلاق اور کلیتہً صحیح ہے، یہاں آزادی محال ہے کیونکہ تجربی نوعیت قطعی نظام کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے لیکن انسان معقول یا اشیاء بانفاسہا کی دنیا کا باشندہ بھی ہے، اس اعلیٰ شہرت

کی وجہ سے وہ طبعی قانون اور ضرورت کا محکوم نہیں رہتا، مختصر یہ کہ اس تجربی دنیا میں ہم آزاد نہیں کیونکہ تمام محرکات، حسیات اور تصورات معین و مقرر ہوتے ہیں لیکن عقل کی اُس ابدی دنیا میں ہماری آزادی ایک بلا قید زمان غیر معین انتخاب میں کام کرتی ہے۔[1]

اس قسم کی ثنویت میں جو فلسفیانہ مشکلات پیدا ہوتی ہیں، اُن پر یہاں بحث نہیں ہو سکتی، اُن سے قطع نظر کرنے کے بعد بھی یہ اخلاقی حیثیت سے بھی غیر تشفی بخش رہتی ہے، اس میں آزادی اور اختیار کو بالآخر ایک ہی کر دیا جاتا ہے، اس کے علاوہ اس میں کسی اور تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی، پھر یہ اس واقعہ کو بھی ملحوظ نہیں رکھتی کہ ہمارا اخلاقی کردار اولاً تجربی دنیا میں ہوتا ہے، جہاں زمانی انتخابات اور ارضی تجربات ہوتے ہیں، انسان کا ذی عقل ہونا اور اس کا محض احساسی تجربات تک محدود نہ ہونا آزادی کے لئے ایک نہایت اہم واقعہ ضرور ہے، لیکن اس واقعہ پر آزادی کے عقیدے کو مبنی کرنا

---

[1] اسی موخر الذکر نقطۂ نظر سے کانٹ کو اختیاریت کا حامی کہا جا سکتا ہے، لیکن اس کے فکر کا ایک اور پہلو بھی ہے جس میں آزادی فرائض کے تصور کی مدد سے عقلی تعیین کے ہم معنی ہے، دیکھو نوٹ مندرجۂ اخلاقیات کے مابعد الطبیعیاتی عناصر کا دیباچہ انگریزی ترجمہ از ایبٹ ص ۲۹۲، اس نوٹ میں صاف طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ آزادی کے مختلف درجے ہوتے ہیں، بلند ترین درجہ وہ ہے، جس پر فرائض کا تصور ہماری تعیین یا ہم کو مجبور کرتا ہے،

زمانۂ حال کی تصوریت کی بعض صورتوں میں بھی اسی طرح کی ثنویت بہ شکل عنصر پائی جاتی ہے اس کے مطابق نفسیات تمام ذہنی اعمال کو لازمی طور پر معین سمجھتی ہے، لیکن دقت یہ ہے کہ نفسیات کی تمام تاویلات عملی مقاصد کو پورا کرتی ہیں، اس لئے اخلاقیات کے لئے وہ صحیح نہیں، دیکھو میونسٹر برگ کی کتاب سائیکالوجی اینڈ لائف ص ۹، و ص ۲۲۲-۲۲۱، اس دوطرفہ نظریے کے ایک اور مختلف بیان کے لئے دیکھو روائس کی کتاب دی سپرٹ آف موڈرن فلاسفی ص ۴۲۴-۴۲۸، نیز دی ورلڈ اینڈ دی انڈی وی جوئل سلسلۂ ثانی ص ۳۳۱-۲۲۴، (مصنف)

فطرتِ انسانی کے مختلف عناصر کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج پیدا کرنے سے بالکل مختلف ہے، اسی طرح یہ اس انکار سے بھی مختلف ہے، کہ اعلیٰ عقلی زندگی ایک ایسے ذریعہ کی مالک ہو جس کی محض مدد سے وہ آزادی حاصل ہو سکتی ہے، جو ہمارے لئے ممکن ہے، علّی تعیین کو ملزوم قرار دیکر آزادی کو نجات دلوانے کی کوشش دراصل کسی اور راستے کو اختیار کرنے، اور اخلاقی زندگی کے منتظم اعمال سے بچنے کی کوشش ہے،

۳ - اختیاریت کی طبعی تاریخ

یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ عام غیر ناقدانہ خیال ہمیشہ اختیاریت کا حامی ہوتا ہے، اور یہ کہ جبریت اپنے موجودہ مرتبہ تک رفتہ رفتہ اور حکمی تفکر کی ترقی کی وجہ سے پہنچی ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس واقعے کی توجیہ کیا ہوگی، ؟ اس سوال کا تفصیلی جواب تو یہاں ممکن نہیں لیکن تفکر انسانی کے بعض تاریخی پہلو ایسے ہیں، جن کی مدد سے ہماری سمجھ میں آسکتا ہے، کہ انسان کی باطنی زندگی کو عرصہ دراز تک کیوں لازمی تعیین کا استثناء اور شاید واحد استثناء سمجھا جاتا رہا، اس سلسلے میں قدرت کے متعلق ابتدائی انسان کا خیال اور حکمی تصوریت کی ترقی کی تاریخ خاص طور پر سبق آموز ہیں،

سب جانتے ہیں، کہ ابتدائی تفکر حیاتیت[۱] کا قائل ہوتا ہے، یہ جاندار اور بے جان دنیا کو خود اپنی روح جیسی روحوں سے آباد کرتا ہے، یہ تمام فعلیت کو ایک ایسے شعور کا نتیجہ سمجھتا ہے، جو ان انفرادی اشیاء میں مشتمل ہے، جن سے وہ فعلیت صادر ہوتی ہے، چشموں کا ابلنا، دریاؤں کا بہنا، سمندروں کی بےتاب حرکات، ہواؤں کا چلنا، درختوں کی زندگی، اور ان کا نشوونما، ان سب کو ایسی جاندار روحوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، جن کے مشابہ روح خود انسان اپنے اندر پاتا ہے، لہٰذا ہر واقعہ اور حادثہ اتنا خود رَو اور خود مختار ہوتا ہے، جس کا اندازہ نہیں ہو سکتا، ہوا جس طرف کو چاہتی

[۱] Animism

چلتی ہو، اس وقت تک قدرت کی یکسانیت کا تخیل پیدا نہیں ہوا تھا، جس طرح وحشی اپنے آپ کو ایسی جذبوں اور ہیجانات کی وجہ سے کبھی یہ کام کرتا ہوا پاتا ہو اور کبھی وہ کام جن کی ابتدا اور معنوں کا اسکو علم نہیں بالکل اسی طرح وہ قدرت کو متصور کرتا ہو، اس کے اعمال بھی اسی قدر ناقابلِ توجیہ ہوتے ہیں، ان میں بھی کسی ایسے اصولِ وحدت کا اتنا ہی نقدان ہوتا ہے، جن کی وجہ سے یہ سب ایک باہم مربوط اور متوازن کل کی صورت اختیار کرتے ہیں، وحشی انسان کا مذہب اس طریقِ تفکر کی یادگار ہے فطرت کی طاقتوں کی تسکین، اور ان کو مہربان بنانے کی کوشش ابتدائی مذہبی رسوم اور عبادات کی مرکزی غایت ہے، اس غایت کے حصول کے لئے عبادت کرنے والا وہی طریقے اختیار کرتا ہے جن کو وہ انسانی تعلقات میں مؤثر سمجھتا ہو، یہ بالکل وہی طریقے ہوتے ہیں، جن سے کوئی دوسرا شخص خود اس کی مہربانی اور عنایت کو حاصل کر سکتا ہے، یعنی ہدایا، خوشامد اور محبت و عزت کا اظہار،

لیکن مشاہدے اور تفکر کی ترقی کے ساتھ ساتھ فطرت میں عام اعمال اور یکسانیتوں کا تخیل آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے، چنانچہ احساسی تجربے کی بے شمار اشیار کی ایک جماعت بنائی جاتی ہے، اسطفات جو طبعًا منطقی توجیہ کے پیش رُو ہوتے ہیں، بروئے کار آتے ہیں، اب ہوا اور پانی خود مختار ہستیاں نہیں رہتے، بلکہ وہ کُلی ہستیوں یا طاقتوں کا مظہر بن جاتے ہیں، غیر نامی فطرت کی ناقابلیتِ حرکت اور اضافی ناقابلیتِ تغیر نے اس دنیا میں علّی توجیہ میں آسانی پیدا کی چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ پتھر صرف اسی وقت حرکت کرتا ہے، جب اس پر کوئی طاقت عمل کرتی ہو، پانی بلندی کی طرف نہیں بہتا، بلکہ ہمیشہ پستی کی طرف رُخ کرتا ہے، لیکن درختوں اور جانداروں کی زندگی اب بھی بہت پُراسرار رہتی ہے، درختوں میں انسان کو زندگی کا راز سادہ ترین شکل میں دکھائی دیا، درخت ایک ننھے سے بیج سے پیدا ہو کر کارآمد اور خوبصورت شکل اختیار

کرتا ہے، یہ ظاہرہ اصول ضرورت کا محکوم معلوم نہیں ہوتا، اور نہ اس پر عام قوانین کا اطلاق ہوتا ہے، اس کا نشو و نما ایسے پراسرار طریقے سے ہوتا ہے جسکو وہ سمجھ نہیں سکتا، یہ نشو و نما مختلف اجزاء کے جمع ہونے سے نہیں ہوتا جیسے کہ پتھروں کے ڈھیر کا نشو و نما ہوتا ہے، بلکہ غذا کی تحلیل کے داخلی عمل سے ہوتا ہے اسی پر اسراری کا احساس تھا، جسکی وجہ سے قدیم رومن ان دیوتاؤں کے سامنے عاجزی کرتا تھا، جو نشو و نما پانے والے درختوں کی زندگی کے نگران تھے،

عالم حیوانی اس سے بھی زیادہ پُراسرار اور خود اسکی فطرت کے قریب تھا، بہائم اپنی یقینی جبلت اور پرزور فعلیت کی وجہ سے انسان کے قریب ترین رقیب تھے، یہ اکثر اپنے مکر و فریب سے انسان کو عاجز اور اپنی قوت سے اسکو مغلوب کرتے تھے، ان میں ایک قوت تھی جو کسی قانون کے تابع نہ تھی، بلکہ بذاتِ خود قانون تھی، جو غیر مرئی داخلی اعمال کی وجہ سے بدلتی رہتی تھی، نہ کہ خارجی مجبوریوں کی وجہ سے فعلیت کے اس آلے کی باطنیت اور پیچیدگی، بالکل ناقابلِ توجیہ تھی، حیوان پرستی کا عام واقعہ اس امر کی شہادت ہے، کہ صدیوں تک انسان نے حیوانی کردار کو ایک راز سمجھا، جو احترام کے لائق تھے، نہ کہ توجیہ کے، تفکر کی اضافی پختگی کے بعد اسکی سمجھ میں آیا کہ حیوانی زندگی کے تمام عجائب معین مظاہر کے دائرے کے اندر واقع ہیں، اور یہ اصول تعلیل کے مستثنیات نہیں،

سب سے آخر میں انسان نے خود اپنی طرف توجہ کی، یہ صحیح ہے کہ انسانی بچے کی طرح نوعِ انسانی بھی عرصۂ دراز تک خارجی اشیاء کے ساتھ مشغول رہی لیکن بالآخر اس نے خود اپنی طرف توجہ کی، جوں جوں انسان خود اپنی ہستی، فطرت پر اپنے روز افزوں غلبے، اپنے ساتھیوں کے ساتھ اپنے تعلقات، صداقت، حسن اور نیکی کی اپنی تحسین کے عجائب کو متحقق کرتا گیا، ویسے ہی وہ یہ بھی دریافت کرتا کرتا گیا، کہ وہ خود کائنات کے عجائب و اسرار کا سرتاج ہے، اب صرف ایک عالم رہ جاتا ہے جس کی توجیہ وہ نہیں کر سکتا یعنی وہ قلعہ جس میں اندھے اور بلا علت واقعات پناہ گزین ہیں لیکن

سائنس نے اس قلعہ میں بھی رفتہ رفتہ دخل پا لیا ہے، اس نے اپنی سلطنت کو آہستہ آہستہ انکے بچیدہ اور متنوع میدان تک پھیلا لیا ہے، اور اس کے مظاہر کو امتحان و توجیہ کے تابع بنا لیا ہے، لازمی علاقے کا اصول وہ رہنما زنجیر رہا ہے، جس کی مدد سے انسان نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ غلطی اور توہم کی خطرناک بھول بھلیوں سے محفوظ کیا ہے، صرف ایک مثال لو اور ان مفید نتائج پر غور کرو جو ذہنی امراض کے واقعات پر علی توجیہ کے اطلاق سے مترتب ہوئے، جنون کی تمام صورتوں اور بھوتوں کی ناقابلِ توجیہ دنیا سے نکال لیا گیا، اس طرح مجنونوں کو ناقابلِ بیان بے رحمیوں [illegible] سے نجات ملی، علمی توجیہ کی ترقی کی وجہ سے سحر اور جادو اور دیگر توہمات معقول آدمیوں کیلئے کالعدم سے ہو گئے ہیں، اسکے علاوہ انسان کی اعلیٰ روحانی زندگی نے کسی قیاسی اور متلون صورت میں اپنا کشف نہیں کیا ہے، بلکہ اب یہ مقدم واقعات پر مبنی ہو گئی ہے، گذشتہ چند سالوں میں ایسے قوانین کو دریافت کرنے کی اہم کوشش ہوئی ہے، جو ان گہرے مذہبی تجربوں پر حکمراں ہیں، جو ابتک خصوصیت کیساتھ ناقابلِ توجیہ سمجھے جاتے تھے، لیکن بہرصورت ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ اگر علی توجیہ کا کام پورا بھی ہو جائے تب بھی اسرار باقی ہی رہیں گے، ایک ننھے سے بیج کا بڑھنا، ہر ذرّے کا حرکت کرنا، اور شعوری زندگی کے تمام مدارج ان اسرار کی مثالیں ہیں، لیکن یہ اسرار ایسے ہیں، جو تحقیق کی دعوت دے رہے ہیں، یہ ناقابلِ علم نہیں کہ جن کی تحقیق ناممکن ہو، تمام واقعات کے مرتب تعاقبات میں اُن واقعات کے تعلقات کو سمجھنے سے ان کی عجائبیت اور ان کی قیمت میں کسی طرح کمی نہ آئے گی،

یہ اجمالی خاکہ ہے علمی علم کی دنیا کی ترقی کا، اس دنیا میں تمام واقعات لازمی طور پر معین ہوتے ہیں، اس ترقی کی تاریخ ہی سے اختیاریت کی طبعی تاریخ بھی واضح ہو جاتی ہے، اختیاریت علمی تصوّرات کی ترقی میں سب سے آخری رُکاوٹ ہے، بقول پروفیسر ہوک [illegible] کہ تمام واقعات ان عوارض حالات سے معیّن تعلقات رکھتے ہیں، جو ان سے فوراً قبل موجود تھے، اب تمام

قابل منکرین کے ہاں لائق قبول ہے، اور اسکو یہ انسانی ارادوں کے سوا باقی تمام واقعات
کے لئے صحیح مانتے ہیں، یہ بجا و درست کہ تعمیم وضاحت وتعین اور عمومیت اطلاق برابر ترقی پر ہو،
اور یہ ترقی انسانی ذہن کی ترقی، اور انسانی تجربے کی تنظیم و توسیع کا نتیجہ ہے، واقعات کے تمام
شعبوں میں سے متخالف طریق تفکر آہستہ آہستہ محو ہوئے ہیں یہاں تک کہ اب وہ ارادے کے پرانے
قلعے کے ماسوا ہر جگہ سے ناپید ہو گئے ہیں، باقی ہر مقام پر یہ عقیدہ اس قدر مضبوطی کیساتھ قائم ہو چکا
ہے کہ بعض منکر تو اسکی ضد کو ناقابل تصور سمجھتے ہیں، اور بعضوں کا خیال ہے، کہ یہ ہمیشہ سے ناقابل
تصور ہے، ہر عملی طریق عمل اس کو فرض کرتا ہے، اور سائنس کی ہر کامیابی اس کی تائید کرتی ہے، کیا
یہ اندیشہ کہ سائنس کے طریقے کو تسلیم کرنے سے یہاں فساد پیدا ہوگا، اتنا ہی بے بنیاد نہیں جتنا کہ یہ عقیدہ
کہ سائنس فطرت کے عجائب اور حسن کو تباہ کر دیتی ہے؟

۴۔ جبریت و اختیاریت کا مابہ الاشتراک

پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے، کہ جبریت و اختیاریت دونوں، اخلاقی زندگی کے واقعات
کی تاویل کی کوششیں ہیں، ہم یہانتک کہہ سکتے ہیں کہ دونوں کسی نہ کسی معنوں میں آزادی کو اس
زندگی میں بطور ایک عنصر کے تسلیم کرتے ہیں، حقیقی فرق ایک ایسے واقعے کی توجیہ کا ہے، جس پر دونوں
متفق ہیں، اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ دونوں ابتدا ہی میں اس عام اور غیر ناقدانہ عقیدے سے
سے انکار کرتے ہیں، کہ حسب خواہش عمل کرنے کی طاقت اور فطرت اور سوسائٹی میں بلا روک ٹوک اپنی
اپنی خوشی کے مطابق کام کرنے کی قدرت کا نام آزادی ہے، ظاہر ہے کہ ایسی آزادی خیالی
دنیا کے سوا، اور نہیں ملتی، فطرت پر اپنی تمام حکومت کے باوجود انسان کتنی ہی ایسی رکاوٹوں سے
دوچار ہوتا ہے، جن کو وہ رفع نہیں کر سکتا، تھوڑی دیر کے نیلے کے بعد جلد ہی وہ فطرت کی قوتوں
کے زبردست دیوتا کے سامنے اپنی جان قربان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اسی طرح سوسائٹی بھی آس

کی ذاتی آزادی کے لئے حدود قائم کرتی ہے، بعض اشخاص تو عمرانی ماحول کے ایسے غلام ہوتے ہیں کہ وہ کبھی بھی اس کی زنجیروں کو توڑ کر حقیقی انفرادی زندگی اختیار نہیں کر سکتے، پھر جب ہم اپنے باطن پر غور کرتے ہیں، تو ہم کو امکانی فعلیت کی ایسی حدود دکھائی دیتی ہیں، جو خود ہماری فطرت نے قائم کی ہیں، اور اس فطرت کو خود ہم نے منتخب نہیں کیا ہے، بلکہ اس کی جڑیں خاندان اور قوم کی گذشتہ تاریخ میں راسخ ہیں، یہ یا وہ صنف شخصیت بننے کی خواہش تک موروثی میلانات کا نتیجہ ہوتی ہے، یہ قول یتھوآز ملڈ :-

ہمارے مقید ارادے خواہ مخواہ کرتے ہیں، اور دنیا پر غلبہ پانے کی کوشش کرتے ہیں، ہمارے تمام افعال ایسے شرائط کے ماتحت صادر ہوتے ہیں، جو ہمارے مقرر کردہ نہیں ہم اسی زندگی میں پیدا ہوئے ہیں، اور یہی زندگی ہمارا سانچا ہے،

"زندگی میں پیدا ہوئے ہیں، انسان اپنے والدین سے پیدا ہوتا ہے، اور اُن کا خون بالکل اسی طرح سموتا ہے، جس طرح ان کا خون اس میں سمویا جاتا ہے، اس طرح ہر نیا شخص اپنی جڑیں مستقبل میں بہت دور تک پھیلاتا ہے،

"زندگی میں پیدا ہوئے ہیں، ہم یہاں اپنے ساتھ تعصبات لیکر آتے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ہر وہ چیز ہم پر اثر کرتی ہے، جس کے قریب ہم جاتے ہیں، ہم کو اُن سُرون کے پیچھے چلنا ہے، جنکو ہم خود نہیں نکالتے"

ان تمام واقعات کا اقرار اس قدر عام ہے کہ معقول اشخاص میں اس کے متعلق کوئی بحث نہیں ہوتی، اختیاریت کا حامی صفائی کیساتھ تسلیم کرتا ہے، کہ غیر معین انتخاب کا میدان بہت تنگ ہے اور یہ کہ جبریت انسانی عمل کے بہت بڑے حصے پر بلا شرکت غیرے حکمراں ہے، اس کا دعویٰ بالآخر اس دعوے میں تحویل ہو جاتا ہے، کہ بعض مثالیں ایسی ملتی ہیں، جن میں ایک شخص دو متبادل طرق عمل

میں کسی ایک کو منتخب کر سکتا ہے، اور اس انتخاب میں وہ ذات کوئی اثر نہیں رکھتی، جو ماضی کی پیداوار ہے،
لہذا انتخاب سے قبل اس ذات کا مکمل علم بھی مشاہدہ کرنے والے کو واقعی فیصلے کے اندازہ کرنے میں کوئی
مدد نہیں دیتا، اس کے برخلاف جبریت کا اصرار ہے، کہ نفس یہ انتخاب ذات کی سیرت پر منحصر ہے، اور ذات
اپنی تمام قوتوں کو حاوی ہے، لہذا اس ذات کا مکمل علم ہر انتخاب کے فہم کو شامل ہے، اس مسئلے کی تنگی کی
توضیح کے لئے فاعل کو ایک دائرے کے مرکز پر کھڑا ہوا فرض کرو، اس مرکز سے جو نصف قطر محیط کی
طرف جاتے ہیں، وہ عمل کے راستوں کو ظاہر کرتے ہیں، اس دائرے کے اندر اور باہر کی قوتیں فاعل کی
حرکات کی سمت کو معین کرتی ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا ایک راستے کو چھوڑ کر دوسرے کا انتخاب بھی معین
ہوتا ہے، ؟ اطلاقی آزادی کا سوال تو پیدا ہی نہیں ہوتا،

پھر تدبّر اور انتخاب بھی اس بحث کے دونوں فریقوں میں مسلّم ہیں، لیکن یہ معروف عام نفسیاتی عمل
زیر بحث مسئلے کے لئے اس قدر اہم ہے، کہ اس کی مزید توضیح لازمی ہے، اگر یہ نام نہاد انتخاب شعوری
تامّل کا نتیجہ نہیں، بلکہ اُن جبلتوں اور ہیجانات کا نتیجہ ہے، جو ہم میں اندھا دھند کام کرتے ہیں، تو کوئی بحث پیدا
ہی نہیں ہوتی، سب کو تسلیم ہے، کہ جن افعال کا سرچشمہ ان جبلتوں میں ہے، وہ موروثی جبلتوں اور خارجی
محرکات کے تعامل سے معیّن ہوتے ہیں،

۵ - انتخاب کا طریقہ،

زیر غور اخلاقی انتخاب صرف دو یا زائد متخالف محرکات یعنی غایتوں کے تصورات اور ان کے
لازمی جذبات کی موجودگی میں شعوری تامّل کے وقت واقع ہوتا ہے، حقیقی معنوں میں شعوری انتخاب غایات
کے تصورات کا، اور ان کے ساتھ پیدا ہونے والے جذبات، دونوں کو شامل ہوتا ہے، یہی جذبات بعض اوقات عمل
حقیقی محرک یعنی حرکت دینے والے عناصر کہلاتے ہیں، ان دونوں عناصر کی علٰحدگی ایک کاذب تجرید ہے، تمثّلی
اور تاثری عناصر مختلف درجوں میں نمایاں ہوتے ہیں، ان میں سے کبھی ایک آگے ہوتا ہے، اور کبھی دوسرا،

لیکن اخلاقی فعل میں موجود دونوں ہوتے ہیں، مادی جماد ہوس بھی کبھی مادی نہیں ہوتی، اس کا اعلیٰ [illegible]
کسی نہ کسی مُدرک غایت کا راستہ اختیار کرتا تھا، اس کے برخلاف ہمارا سرد ترین تصور بھی حقیقت کی آتشی
گرمی ضرور پیدا کرتا ہے، کہ خود اپنے لئے دلچسپی اور توجہ حاصل کرے، عمل کا بہت بڑا حصہ توجہ شعور غایت
کے زیر نگرانی ہوتا ہے، ایک شخص کوشش کا راستہ یا حصول غایت کا ایک طریقہ انتخاب کرتا ہے، تو اس غایت
یا طریقے کی تفاصیل خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، لیکن انتخاب کے حقیقی عمل میں وقفہ ضروری ہوتا ہے، یہ وقفہ بڑا ہو
یا چھوٹا، اس وقفے میں امکانی انتخابات میں رہتے ہیں، اور ہم پر غلبہ پانے کے لئے اس درجہ کشمکش سے
باہم مقابلہ کرتے ہیں، جو ان میں ہمارے لئے ہوتا ہے، اس کشمکش میں محرک کے زور کا اندازہ محض خارجی
معیار کے مطابق نہیں، بلکہ انتخاب کے وقت ذات کی حالت کی بنا پر ہونا چاہئے، یہی ذات ہر محرک کو اس کا مخصوص
درجۂ شدت عطا کرتی ہے، یا زیادہ صحت کے خیال سے یوں کہو کہ معلومہ محرک، جزمن جملہ ان بہت سی فعلیتوں
کے ہے، جس سے مجموعی ذات مرکب ہوتی ہے، اپنی شدت کے لئے اس مجموعی ذات کا دست نگر ہوتا ہے،

جبریت کے خلاف تمام تعصب کا بہت بڑا حصہ اس خیال کا نتیجہ ہے، کہ اس کی وجہ سے اخلاقی فاعل
خارجی اور خود مختار قوتوں، یا تصورات کا شکار ہو جاتا ہے، لیکن اصلیت یہ ہے کہ اگر تمام خیالات، عواطف
اور ترجیحات کو ذات کی تعیینیں سمجھا جائے، تو اصلی جبر خود جبری ہوتا ہے[1]، لہٰذا جو قوی محرک قائل جبریت
کے نزدیک، بالآخر ہم پر غلبہ پاتا ہے، وہ صرف وہ ہوتا ہے، جو ہم میں پایا جاتا ہے، یا جس کو ہم خود
بہت زیادہ قوی سمجھتے ہیں، نہ کہ وہ جو ایک بے غرض تماشائی کو بہت زیادہ دلکش دکھائی دیتا ہے،
ہو سکتا ہے کہ جو محرک ایک شخص کے لئے بہت زیادہ قوی اور شدید ہوتا ہے، وہ دوسرے کے لئے
کوئی دلکشی نہ رکھتا ہو، بلکہ یہاں تک ممکن ہے کہ دوسرا شخص اس کی وجہ سے سرد ہو جائے، اور اس کو
اس سے نفرت ہو جائے، بعض اوقات کہا جاتا ہے، کہ فلاں شخص نے کمزور تر محرک کے مطابق عمل کیا،

---

[1] Egery Determinism is Auto-Determinism.

اس قول کے واحد معنی یہ ہو سکتے ہیں، کہ اس شخص نے وہ راستہ منتخب کیا ہے جو دوسروں کو بہت کم مرغوب تھا یا جس کو وہ خود، بعد کے تجربے کی روشنی میں بُرا اور احمقانہ سمجھتا ہے۔ قوی تر محرک کی فتح کی تردید اُن مثالوں سے بھی نہیں ہوتی، جن میں ایک فعل جو کسی شخص کی نفسیاتی خواہشات یا اس کے کسی طبعی ہیجان کے لئے دلکش ہے، کسی ایسے فرض کے مقابلے میں مسترد کر دیا جاتا ہے، جو مجوزہ تشفی کے مقابلے میں بہ ظاہر غیر دلکش بلکہ نفرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ ایسی مثالوں میں اخلاقی مطالبے کی شدت بعض اوقات تو غیر محلل احساس فرض سے مطابقت کا نتیجہ ہوتی ہے، جس کی جڑیں جبلت اور عادت میں ہوتی ہیں، اور بعض اوقات ہماری مجموعی فطرت کے ظاہری تقاضوں اور ہماری زندگی کے مجموعی اغراض کے ساتھ اتفاق میں لیکن یہ خیال کہ ضعیف تر محرک قوی تر محرک پر غالب رہا، بعد میں سوچنے سے یہ معلوم کر کے غلط ثابت ہوتا ہے، کہ اس فعل کے صدور کے وقت ہماری تصدیق وسیرت، ہمارا مذاق اور میلان ایسے تھے کہ منتخبہ فعل فی الواقع ہم کو باقی تمام افعال کی بہ نسبت بہتر معلوم ہوا۔ اب ان تصدیق، سیرت، مذاق اور میلان کے متعلق جنھوں نے ہمارے انتخاب کو معین کیا، کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیا یہ اسباب ذات کی ایسی قوت کا اظہار ہیں، جس کے طریق اثبات وانکار سے عمل میں ایک ایسا عنصر داخل ہو جاتا ہے، جس کی کوئی علت نہیں؟ نہیں، بلکہ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، ہم کو ماننا پڑتا ہے، کہ یہ اسباب ایسے نہیں، جو خود بخود پیدا ہوئے ہیں، اور جو ارادے کے کھنے پر نیست سے ہست ہوئے ہیں، فی الواقع یہ ذات کی مجموعی گذشتہ زندگی کا نتیجہ ہیں،

شعوری تامل کی صورت میں جو انتخاب بھی ہوتا ہے، اس کی توجیہ سوائے اس کے اور کسی طرح نہیں ہو سکتی، کہ یہ متقدم اور تعیین کرنے والے محرک کا نتیجہ ہوتا ہے، کسی فعل کا "کیوں" لازماً ایک معین تعلق پر دلالت کرتا ہے، اگر کسی انسانی فعل کا "کیوں" نہ ہو، تو پھر وہ فعل ناقابلِ تصور اشیاء کی دنیا میں منتقل ہو جاتا ہے، جبریت کا دعویٰ ہے کہ یہ سوال کہ اس شخص نے اس خاص طریقے سے کیوں عمل کیا؟ کبھی بھی احمقانہ سوال نہیں ہوتا، یہ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص مثال میں ہم کو اس کے جواب کا علم نہ ہو، وہ فرض کرتی ہے کہ

ہر نتیجے کی کوئی نہ کوئی علت ہوتی ہے، اس کے برعکس اختیاریت کا دعویٰ ہے، کہ ایسے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا جا سکتا، یہ اس وجہ سے نہیں کہ ہم لاعلم ہیں، بلکہ اس سبب سے کہ انسانی افعال لازماً علتوں کا نتیجہ نہیں ہوتے، اگر ہم اس سے سوال کریں کہ "اس شخص نے کیوں اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر فقیر کے لئے پیسہ نکالا؟" تو اس کا جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ اس لئے کہ اس نے ایسا کیا..... اس کا مطلب قریب قریب یہ ہے، کہ چونکہ انسانی افعال "آزاد" ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی کوئی علت نہیں ہوتی، اور ان کے صادر ہونے کی توجیہ کی تلاش لاحاصل ہے"

اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ جس انتخاب کی کوئی بنیاد، یا تعیین کرنے والا محرک نہیں، وہ معقول انتخاب نہیں ہو سکتا، اور کیا ہم معقول انتخاب کو اس کے محرک کا نتیجہ کہنے پر اسی طرح مجبور نہیں ہیں کہ بلیرڈ کے متحرک گیند کو اس گیند کی علت کہنے پر، جس سے یہ جا کر ٹکراتی ہے، اگر ہم انسانی فعل کے "کیوں" کو ترک کرنے اور اس کو اتفاق اور ناقابلیت تصور کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں، تو ہم کو اس پر کسی نہ کسی اصول تعیین کا اطلاق کرنا ہی پڑے گا، اس پر بحث کرنے کی میرے نزدیک ضرورت ہی نہیں کہ انسانوں کے عمل پر حکم لگانے میں ہم ان کے اعمال کو کسی نہ کسی علت کا نتیجہ سمجھتے ہیں،

لیکن اختیاریت کا وکیل فوراً جواب دیتا ہے، کہ "تم خود اپنے منہ سے جبریت کی تردید کرتے ہو تم کہتے ہو کہ ذات اپنے محرکات کی تقویت کرتی ہے، اور ان ہی محرکات کے مطابق ان کا انتخاب کرتی ہے، اختیاریت سے میری مراد یہ نہیں کہ ایک فعل کی کوئی علت ہی نہیں، بلکہ یہ کہ ذات اس کو خود اپنی تخلیقی توانائی سے پیدا کرتی ہے، اس طرح یہ تمام بحث ذات، اس کی ماہیت اور اس کے مبدء پر ختم ہوتی ہے"

(باقی)

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۳)

امتحان مدارس ریاست کا راقم الحروف سے تعلق، نکاح ثانی کے تقریباً دو سال کے بعد رئیسۂ عالیہ نے میرے خاندان کی علمی عظمت وحیثیت کو مدنظر رکھکر باوجود عدم قابلیت سوم ذیقعدہ ۱۳۰۱ھ کو اولاً طلبۂ مدارس ریاست کے سالانہ امتحان لینے کا حکم میرے نام صادر فرماکر شرف خاص بخشا،

نگرانی مدرسۂ جہانگیری بعد ازاں چہارم ربیع الاول ۱۳۰۱ھ کو مدرسۂ جہانگیری کا انتظام اور اسکی نگرانی مجھ کو تفویض فرمائی، یہ مدرسہ تعلیم قرآن مجید کے لئے یکم صفر ۱۳۰۵ھ مطابق ۱۲۹۵ فصلی سے رئیسۂ عالیہ نے قائم کیا تھا، جب اس کا انتظام میرے سپرد ہوا، تو میں نے رئیسۂ عالیہ سے عرض کرکے مولانا مولوی ابو الخیرات سید احمد صاحب دہلوی مرحوم کو مہتمم مدرسۂ جہانگیری مقرر کرایا، مولینائے ممدوح علم ریاضی کے ایک مستند زبردست عالم تھے، ساتھ ہی اس کے یکم رجب ۱۳۰۱ھ سے مدرسۂ مذکور میں میں نے تعلیم قرآن کے ساتھ عربی وفارسی تعلیم کا بھی اضافہ کیا، اسلئے کہ بغیر تعلیم عربی وفارسی کے قرآن کریم کی تعلیم سے جو مقصد تھا، وہ حاصل نہیں ہوسکتا تھا،

نگرانی مدرسۂ صدیقی والاجاہ مرحوم نے یتیم اطفال کی تعلیم کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، جو مدرسۂ صدیقی کے نام سے مشہور تھا، رئیسۂ عالیہ نے ان کی وفات کے بعد یکم ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ سے اسکو

مدارسِ ریاست میں شامل کر لیا تھا، ہیزدہم ذی الحجہ ۱۳۱۲ھ سے رئیسۂ عالیہ نے اس کا انتظام بھی میرے سپرد فرما کر مزید قدر افزائی فرمائی، یہ مدرسہ والاجاہ مرحوم کے عہد میں مکان پائگاہ متصل نور محل میں قائم تھا، رئیسۂ عالیہ نے ان کی وفات کے بعد جب ان کا شاندار حجرۂ مزار بصرفِ کثیر تعمیر کرایا، تو بست ودوم شوال ۱۳۱۳ھ کو ایک فرمان رئیسۂ عالیہ کا میرے نام اس مضمون کا شرف صدور لایا، کہ چونکہ نواب صاحب بہادر مرحوم کی عزیز ترین زندگی کا بیش بہا حصّہ خدمتِ اسلام نشر علوم کتاب وسنت میں بسر ہوا ہے، اور ان کو شغل و اذکار کتاب وسنت سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ تھی، اسلئے مدرسۂ صدیقی مزار والاجاہ مرحوم کے عمارات ملحقہ میں (جو خاص اسی مقصد سے تعمیر ہوئی ہیں) منتقل کر دیا جائے، تاکہ قرآن وحدیث کے درس وتدریس کا ثواب علی الاتصال پہونچتا رہے، اور اطفال یتیم کے قرآن خوانی کی آواز سے ان کی روح کو راحت ومسرت حاصل ہوتی رہے، چنانچہ اس حکم کی اسی وقت تعمیل کیگئی، اور وہ مدرسۂ مزار والاجاہ مرحوم کی عماراتِ ملحقہ میں منتقل کر دیا گیا،

عمارت مذکور پر حسب ذیل کتبہ کندہ ہے،

از وفاتِ امیر والاجاہ — درتب وتاب یک جہاں افتاد
بر مزارش نگاشت کلکِ قضا — تقرحنت نشیمن او باد،

مدرسۂ تعلیمات ریاست کی افسری اور تمام مدارس ریاست کی نگرانی، اس واقعہ کے تقریباً ڈیڑھ دو برس کے بعد جب رئیسۂ عالیہ سفر شملہ و پنجاب وغیرہ سے مراجعت فرمائے بھوپال ہوئیں، تو انھوں نے بست ودوم شعبان ۱۳۱۵ھ میں مجکو تمام مدارس ریاست اور مفصلات کا افسر اعلیٰ یعنی آنریری ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن مقرر فرمایا،

مدارس ریاست کی عام حالت جس وقت میں نے مدارسِ شہر ومفصلات ریاست کا چارج لیا، اس وقت مدارسِ ریاست کی حالت حسب ذیل تھی،

شہر خاص بھوپال میں سات مدارس تعلیم قرآن مجید و عربی و فارسی و ہندی و انگریزی کے قائم تھے اُن کے نام یہ ہیں، مدرسۂ سلیمانی، مدرسۂ جہانگیری، مدرسۂ صدیقی، مدرسۂ وقفی، مدرسۂ جہانگیر آباد، مدرسۂ انگریزی، مدرسۂ ہندی، مفصلات میں فارسی واردو و ہندی کے اکثر مدارس اس تفصیل کے ساتھ قائم تھے، ضلع مشرق میں ۱۹، ضلع مغرب میں ۱۴، ضلع جنوب میں ۱۲، ضلع شمال میں ۱، مگر عجیب بات یہ تھی کہ مدارس ریاست کو قائم ہوئے ایک مدت دراز گذر چکی تھی، اور بیش قرار رقم تعلیمات و وظائف میں صرف ہوتی تھی، مگر کبھی کوئی طالب علم معمولی لیاقت کا بھی جو فارغ التحصیل ہوکر میرے عہدۂ ڈائرکٹری تک کسی مدرسہ سے نکلا ہو، دیکھا اور سنا نہیں گیا، نہ ریاست میں میرے ڈائرکٹری سے قبل کوئی مستقل باضابطہ سررشتہ تعلیمات قائم تھا، جو تمام مدارس کی انتظامی اور تعلیمی نگرانی اور اصلاح کرتا، بلکہ صورت یہ تھی کہ ہر ایک مدرسہ کے متعلق ایک مختصر سا عملہ رہا کرتا تھا، جو اس مدرسہ کے مہتمم کے ماتحت ہوتا تھا، اور ہر مدرسہ کا مہتمم بجائے خود جدا جدا ایک مختار کل افسر کی حیثیت رکھتا تھا، ایک کو دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا اور نہ عام نگرانی کسی افسر خاص کے متعلق تھی،

نصاب تعلیم | یہی حال نصاب تعلیم کا تھا، ہر ایک مہتمم مدرسہ نے اپنی پسند اور مذاق طبعی کے موافق بے ضابطہ ایک معمولی نصاب تعلیم درس نظامیہ کے طریق پر بنا رکھا تھا، مگر اس کی بھی پوری پابندی نہیں کیجاتی تھی، شاید ابتدائی درجہ کے طلبہ اس کی پابندی کرتے ہوں، مگر عام طور پر ہر ایک طالب علم جس کتاب کو پسند کرتا، یا جس کتاب کو استاد مناسب سمجھتا، اس کو پڑھایا کرتا تھا، بجز معمولی دیکھ بھال کے انضباط اوقات کا بھی کوئی باضابطہ انتظام اور خاص رجسٹر نہ تھا،

مدرسۂ سلیمانی ایک جامعہ کلیہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس میں بھی محض ضابطہ پرستی کے طریقہ پر ایک دستور العمل اور نصاب تعلیم قدیم سے چلا آتا تھا، مگر ان پر کبھی پورے طور پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آئی،

امتحان کا کوئی خاص انتظام تھا طلبہ کے امتحانات کی یہ صورت تھی کہ مہتمان مدارس بطور خود زبانی امتحان لے لیا کرتے تھے، تحریری امتحان کا کوئی قاعدہ جاری نہ تھا، نہ کوئی رجسٹر خاص امتحان کا رہا کرتا تھا، نہ درجات امتحان کے اعتبار سے طلبہ کو ترقی دی جاتی تھی، نہ انکے فیل ہونے پر انکا نام خارج کیا جاتا تھا،

وظائف کی حالت، جو وظائف طلبہ کو دیئے جاتے تھے وہ محض مہتمان مدارس اور زیادہ تر ارباب رسوخ کی سفارش پر مقرر کر دیئے جاتے تھے، طلبہ کی کامیابی یا ناکامی یا اہلیت کو ان میں کوئی دخل نہ ہوتا تھا نہ انکی عمر اور مدت تعلیم کا لحاظ رکھا جاتا تھا،

کوئی کتبخانہ ریاست کے نام سے قائم نہ تھا، ریاست میں کوئی پبلک لائبریری یعنی کتب خانہ ایسا موجود نہ تھا، جو ریاست کے جانب سے رفاہ عام کی غرض سے قائم ہوا ہو، ہر مدرسہ میں متفرق طور پر کم وبیش مطبوعہ اور غیر مطبوعہ درسی اور غیر درسی کتابیں رہا کرتی تھیں، انہی کو کتب خانہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، ایک مدرسہ کا طالب علم دوسرے مدرسہ کی موجودہ کتابوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا تھا، نہ شائقین علم کو ان سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تھا، وہ کتابیں نمائشی طور پر زینت مدرسہ تصور کی جاتی تھیں، اور صرف مدرسین اور مہتمان مدارس کے وقت گذاری کیلئے ایک دلچسپ مشغلہ کا کام دیتی تھیں،

انتظام جدید:-

محکمۂ سررشتہ تعلیمات کا اجرا میں نے سب سے پہلے مدارس شہر بھوپال کے عملہ ہاے دفتر کو یکجا کر کے ایک باضابطہ مستقل محکمۂ سررشتہ تعلیمات ریاست کی تشکیل کی، اور ہر ایک مہتمم مدرسہ کو اسکے مدرسہ کا مدرس اعلیٰ قرار دیا، تاکہ وہ درجۂ تکمیل کے طلبہ کو درس دیا کرے، اس جدید انتظام اور اجرائے سررشتۂ تعلیمات کے وقت اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا، کہ کوئی شخص اہل عملہ میں سے بلا وجہ یا قصور محض انتظاماً موقوف

یا جائے،

اور ماہرین تعلیم کی مجلس شوریٰ | انکے ساتھ ہی میں نے رئیسہ عالیہ سے اجازت لے کر دہم ربیع الاول ۱۳۲۱ھ
ے، ایک مجلس شوریٰ انجمن نظارۃ المعارف العمومیہ کے نام سے قائم کی، جس کا کام ضوابط و قواعد سررشتہ تعلیم
از سر نو ترتیب و تنظیم عمل میں لانا تھا، علماے ریاست و مشاہیر علمائے ہند کے مشورہ سے ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کیلئے
ے جدید نصاب جاری کیا گیا، مجوزین نصاب کے سلسلہ میں حضرت شمس العلما، علامہ شبلی رح اور مولینا مولوی
ابراہیم صاحب آروی رح کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، انجمن کے سالانہ اجلاس کم سے کم دو
بہ ہوا کرتے تھے، دوازدہم اکتوبر ۱۹۰۳ء میں اس انجمن کی پہلی روداد اردو اور انگریزی میں چھپ کر
ائع ہوئی،

اب تعلیم کا اجرا، | کمل تعلیم کی مدت نو سال قرار دیگئی، اور نصاب تعلیم کو چار درجوں پر تقسیم کیا گیا، درجۂ
یہ، درجہ رشدیہ، درجہ امدادیہ، درجہ تکمیلیہ،

نقشہ ہاے انضباط اوقات جاری کئے گئے، اور ان کی جانچ کے لئے انسپکٹروں کا تقرر عمل میں آیا،

اعد امتحان | ماہواری امتحان طلبہ کا امتحان مدارس کے متعلق رکھا گیا، سالانہ امتحانات کے لئے حکم جاری
لیا گیا، کہ تحریری امتحان ہو، پرچہائے امتحان نہایت احتیاط اور رازداری کے ساتھ مختلف اور غیر متعلق علمائے
یاست سے مرتب کرائے جاتے تھے، اور جیسا کہ قاعدہ ہے، وہ سربستہ لفافوں میں عین امتحان کے
قت طلبا، کو تقسیم کر دیئے جاتے تھے، تمام طلبہ ریاست کا امتحان محکمۂ سررشتۂ تعلیمات کے مکان میں جو
ن سرکاری کے متصل واقع تھا لیا جاتا تھا، اور خاص خاص اہل علم جن کو مدارس ریاست سے کوئی تعلق
ہوتا تھا، وہ نگرانی کے لئے متعین کئے جاتے تھے، بعد ختم امتحان حسب قاعدہ رزلٹ طبع کرا کر بغرض
اطلاع مہتمان مدارس کے پاس بھیجدیا جاتا تھا،

قواعد تقسیم وظائف، | طلبہ چونکہ ارباب رسوخ کی سفارش پر مدارس میں داخل کئے جاتے تھے، اس لئے

ان کے وظائف ابتدا سے بلا تقسیم درجات چلے آتے تھے، اور مدت تعلیم مقرر نہ ہونے کے سبب سے وہ بجائے نام سلسلۂ تعلیم جاری رکھکر سالہا سال وظیفہ پاتے رہتے تھے، جب میں نے وظائف کا باقاعدہ انتظام اور ان کو درجات تعلیم کے لحاظ سے تقسیم کرنا چاہا، تو مجھ کو سخت دشواری پیش آئی، رئیسہ عالیہ چونکہ ایک عالی صفات خدا ترس اور فیاض رئیسہ تھیں، اسلئے وہ طلبہ کے وظائف کو کم کرنا یا بند کرنا پسند نہیں کرتی تھیں، اور اس کو ایک قسم کی خیرات ومبرات تصور فرماتی تھیں مگر مشکل یہ تھی کہ اگر وظائف بدستور سابق جاری رکھے جاتے تو تعلیمی مقاصد کو سخت نقصان پہنچتا، ناچار میں نے رئیسہ عالیہ کی مرضی کو مدنظر رکھکر یہ حکم جاری کیا، کہ جو طلبہ جس طریقہ پر وظیفہ پا رہے ہیں، وہ بدستور پاتے رہیں، البتہ درجات تعلیم کے لحاظ سے ان کی درجہ وار تقسیم کردی جائے، اور جب وہ اپنی مدت تعلیم پوری کرلیں، اور بجائے اون کے نئے طلبہ داخل ہوں، تو اون کے وظائف ابتدا سے اُن کی اہلیت دیکھ کر مطابق تعداد مندرجۂ نقشہ مجریہ وظائف مقرر کی جائے، اور درجات کامیابی کے موافق اون میں اضافہ کیا جائے،

مدارس کے مداخل ومخارج

مدارس کی آمدنی وصرف ماہواری کا تعلق ابتدا سے مہتممان مدارس کے ہاتھ میں تھا، وہی خزانہ عامرۂ ریاست سے آمدنی وصول کرتے تھے، اور وہی صرف کیا کرتے تھے، میں نے آمدنی وصرف کا تعلق بدستور مہتممان مدارس سے قائم رکھا، اور تمام مدارس ریاست کا تعلیمی سالانہ بجٹ قرار دیکر یہ حکم جاری کیا کہ مہتممان مدارس بدستور اپنے طور پر ماہواری آمدنی مطابق تجویز سررشتہ تعلیمات کے اپنے دستخطوں سے وصول کرتے رہیں، اور مصارف معینہ میں ان کو خرچ کرتے رہیں، اور تمام حسابات ماہواری وسالانہ جانچ کی غرض سے محکمۂ سررشتہ تعلیمات میں ارسال کرتے رہیں، بعد مصارف جو زر توفیر بچے وہ ریاست کے خزانہ عامرہ میں داخل کرتے رہیں،

ایک مستقل کتبخانہ ریاست قائم کیا گیا

ساتھ ہی اس کے میں نے رئیسہ عالیہ کی منظوری سے منجانب ریاست

ایک پبلک لائبریری کی بنیاڈالی، اور اس کا نام کتب خانۂ شاہجہانی تجویز کیا، اور تمام مدارسِ ریاست سے مطبوعہ اور قلمی نوادر کتب فراہم کرکے اور ان کو ایک خاص ترتیب وتہذیب کیساتھ نہایت خوشنما الماریوں میں سجاکر بر وقت افتتاح رئیسۂ عالیہ سے یہ درخواست کی کہ وہ اپنے کتب خانہ محل سرکاری کی نادر اور عزیز الوجود کتابیں اس کتب خانہ کیلئے مرحمت فرمائیں، تاکہ طلبۂ مدارس وعام باشندگان ریاست اور بیرونی ممالک کے علما اور سیاحان شایق علم کو یکساں اس سرچشمۂ علم سے اپنی تشنگی بجھانے کا موقع ملے، رئیسۂ عالیہ نے فیاض دلی کے ساتھ یہ درخواست منظور فرمائی، اس طرح ایک بہترین بیت علم و حکمت ریاست میں قائم ہوگیا،

رئیسۂ عالیہ کے جانب سے مزید مراعات وعزت افزائی، دوم ذیقعدہ ۱۳۱۲ھ کو رئیسۂ عالیہ نے عزت افزائی اور سہولتِ کار کی نظر سے تمام مدارسِ ریاست کے زرتوفیر صرف کرنے کا مجکو اپنی ذاتی رائے وتجویز سے مجاز قرار دیا، اور مہتمم خزانۂ ریاست کو اس کے مجرا دینے کی ہدایت فرمائی، مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نے کبھی ایک حبہ بھی اپنی رائے یا حکم سے صرف نہیں کیا،

حکم تحریر مراسلہ بنام مہتمان محکمات وناظمان ہرچہار اضلاع، میرے زمانۂ ڈائرکٹری کے شروع میں مہتمان محکمات وناظمان ہرچہار اضلاع مطابق دستور قدیم بر وقت ضرورت احکام لکھ کر سررشتہ تعلیمات میں بھیجا کرتے تھے، رئیسۂ عالیہ نے پنجم رجب ۱۳۱۶ھ کو حکم صادر فرمایا، کہ تمام مہتمان محکمات ریاست وناظمان ہرچہار اضلاع بجائے احکام مراسلہ لکھ کر افسر اعلیٰ محکمۂ تعلیمات کے نام ارسال کیا کریں،

نہایت افسوس ہے کہ انتظام مدارس ریاست ومفصلات اور نظم تعلیم جس بلند معیار اور اعلیٰ نصب العین کو ملحوظ رکھکر شروع کیا گیا تھا، ہنوز اس کے سنگ بنیاد ہی رکھنے کی نوبت آئی تھی، کہ انقلاب روزگار کے ظالمانہ دست برد، اور بیدردانہ غارتگری نے اس کے مرکزِ ثقل ہی کو متزلزل کردیا، یعنی حضور رئیسۂ عالیہ خلد مکان نے بست وہشتم صفر ۱۳۱۹ھ کو آغوش لحد میں استراحت فرمائی

(غفر اللہ لہا و برد اللہ مضجعہا) ظاہر ہے کہ جب وہ ذات قدسی صفات جو سرگرمی عمل کی محرک اعظم تھی،
وہی نہیں رہی، تو تمام جذبات قلبی و احساسات عقلی ایک آہ سرد کے ساتھ ٹھنڈے پڑگئے طبیعت
کی افسردگی اور دماغ کی پراگندگی سے مجبور ہوکر اور اسوقت کے فضاے ملکی سے متاثر ہوکر مجھ کو انتظام
مدارس اور محکمہ سررشتہ تعلیمات کی خدمت سے سبکدوش ہونے کا خیال پیدا ہوا، اور میں نے اپنی علٰحدگی
کی باضابطہ درخواست علیا حضرت سرکار عالیہ کے حضور میں پیش کردی اور حسب منشاے سرکار عالیہ
مدرسۂ صدیقی کو عمارات ملحقہ مزار والاجاہ مرحوم سے اٹھاکر مدرسۂ جہانگیری میں شامل و منتقل کردیا، پھر
حکم سرکاری پہنچنے کے بعد پنجم جمادی الاول ۱۳۰۹ھ کو میں نے عہدہ ڈائرکٹری سے مستعفی ہوکر محکمہ
سررشتہ تعلیمات کا انتظام نواب عبد الجبار خاں صاحب بہادر مرحوم سابق وزیر ریاست بھوپال کو تفویض کردیا،

یہاں تک تو اُن سرسری واقعات کا ذکر تھا، جن کا مدارج دنیوی اور دولت و مال و جاہ
سے تعلق ہے، اور جس کی خوش آیند آرزؤں اور تمناؤں میں ارباب دنیا طلب آغاز شعور سے
اپنی زندگی کے آخری لمحون تک ہر قسم کے مصائب و متاعب برداشت کرنے کے لئے تیار رہتے
ہیں، اور اسکی راہ طلب میں اپنا پسینہ اور خون تک بہانے میں دریغ نہیں کرتے، مگر ساتھ ہی اسکے اپنی حیات
مستعار کے مختلف لمحات اور ادوار مشغول بدو شعور عنفوان شباب کے گذشتہ واقعات پر بھی ایک نظر ڈالنی ضروری ہے تاکہ فطرت انسانی
کے طبعی جذبات اور حیات مادی کے پراسرار حالات پر کچھ نہ کچھ اثر پڑے وما الحیوٰۃ الدنیا الا لعب و لہو کی اصل
حقیقت اور قدر و قیمت بھی واضح اور منکشف ہوجائے، جو ارباب شہود و حق آگاہ کی نگاہ فطرت شناس
و حقیقت بین میں ایک خندۂ گل، سایۂ ابر اور موج سراب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، ؎

چو گل در باغ ہستی فرصت یکخندہ میباشد | نسیم صبح می گوید کہ بربندید محملہا
زمین شدیم چہ شد آسمان شدیم چہ شد | بچشم خلق سبک یا گران شدیم چہ شد
بہ ہیچ رنگ درین بوستان قرارے نیست | تو گر بہار شدی ما خزان شدیم چہ شد (باقی)

حیدرآباد دکن

کے

اردو اخبارات اور رسائل

از

جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل، ایف آر، اے ایس، ام، ار، اے، ایس

یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ اردو کی ایجاد، اصلاح اور خدمت تینوں کے سہرے حیدرآباد دکن کے سر نظر آتے ہیں، دنیا جانتی ہے کہ وہ زبان جو آج اردو کہلاتی ہے، اسی دکنی زبان کا نقش ثانی ہے جو بقول

اک بات لچر سی بہ زبانِ دکنی تھی

امیر خسرو کی پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں سے پہلے کا دکنی منظوم کلام منظرِ عام پر آچکا ہے، اور نثر فقرے اور جملے بیسیوں کتابوں میں نظر آتے ہیں، اسی طرح اردو میں سب سے پہلے اپنے دیوان کو مرتب اور مکمل کرنے کا فخر ولی کو حاصل ہے، یہ لطیفہ بھی قابلِ غور ہے، کہ نہ صرف اردو کا پہلا شاعر (ولی) دکنی تھا بلکہ اردو کی پہلی شاعرہ حضرت محمد قادری خاکی (۱۱۶۲ھ) کی اہلیہ بھی دکنی ہی تھیں، اور اردو کی سب سے پہلی شاعرہ جس نے اپنا دیوان مرتب اور مدوّن کیا، ماہ لقا بائی چندا دکنی تھی، اور ہندوستانی خاتون کی پہلی تصنیف جو متحف برطانیہ میں داخل ہوئی وہ دیوان چندا ہی تھا، بعض حضرات کو یہ معلوم کرکے حیرت ہوگی کہ تراجم کی ابتدا بھی دکن ہی سے ہوئی، گلستاں اور بوستان اور رباعیاتِ عمر خیام اور بعض قصص اور مثنویوں کا ترجمہ منظوم اور منثور اس وقت دکن میں ہوا ہے، جبکہ ہندوستان یا شمالی ہند میں اردو اچھی طرح بولی بھی نہ جاتی تھی، اسی طرح انگریزی کی فنی ہیئت، طب اور تاریخ کی اہم کتابوں کا ترجمہ دکن

میں ان دنوں ہوا ہے، جب کہ ہندوستان میں کسی کو ترجمہ کا خیال تک نہ تھا، غور کیجئے کہ وہی بات جو کبھی اس زبان دکنی تھی آج منجھ کر اتنی صاف ہو گئی ہے کہ دنیا بھر کے علوم و فنون اس زبان میں منتقل ہو گئے ہیں، اور ایک یونیورسٹی اسی زبان کی قائم ہو گئی ہے، معاف کیجئے کہیں آپ یہ خیال نہ کریں کہ میں عصبیت میں مبتلا ہو کر اس طرح لکھ رہا ہوں، بلکہ واقعات، حالات اور مواد اس کے شاہد ہیں،

یہی حال اردو رسائل کا بھی ہے، افسوس ہے کہ اب تک کسی نے حیدرآباد کی صحافتی خدمات پر نظر نہیں ڈالی، عام طور پر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ سب سے پہلا رسالہ دلگداز تھا، جسے مولینا شرر نے جاری کیا، غالباً یہ غلط فہمی ادیب الٰہ آباد کی پھیلائی ہوئی ہے، ادیب بابتہ جنوری ۱۹۱۲ء کے صفحہ ۴۳ پر اخبار اور اخبار نگاری کے عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے، جس پر فٹ نوٹ دیتے ہوئے اڈیٹر نے لکھا ہے،

"۱۸۸۷ء میں پہلے پہل رسالہ دلگداز مولینا عبدالحلیم شرر نے نکالا تھا، اسلئے اوّلیت کا فخر ممدوح کو ہے"،

اڈیٹر ادیب کو سخت مغالطہ ہوا ہے، دلگداز کو کسی طرح بھی اوّلیت کا فخر حاصل نہیں ہو سکتا، ہندوستان میں ۱۸۳۳ء سے اخبارات اور رسائل کی اشاعت شروع ہو چکی تھی، ۱۸۳۷ء میں بنارس سے خیر خواہ ہند نامی ایک اخبار جاری ہوا، ۱۸۴۶ء میں اسی نام کا ایک اخبار مرزا پور سے جاری ہوا ۱۸۴۹ء میں بنارس سے مرأت العلوم کا اجرا ہوا، ۱۸۵۶ء میں سیالکوٹ سے معلم العلما، آگرہ سے معدن القوانین، اور سیالکوٹ ہی سے نورٌ علیٰ نور نامی اخبار جاری ہوا، مگر کوئی ماہوار رسالہ اس وقت تک ہندوستان سے جاری نہیں ہوا تھا، سب سے پہلا ماہوار رسالہ جو جاری ہوا، وہ "رسالہ طبابت" تھا جو حیدرآباد دکن سے ۱۸۵۸ء میں جاری ہوا، یہ رسالہ گویا دلگداز سے انتیس سال پہلے جاری ہوا ہے، یہ ایک فنی طبی رسالہ تھا جس میں ڈاکٹری اور یونانی طب پر مضامین شائع ہوتے تھے، یہ رسالہ مدرسہ

طبیہ حیدرآباد دکن کی زیر نگرانی اجرا ہوا تھا، طبیب اپنے تجربات اور عمل جراحی کے نتائج اس میں لکھا کرتے تھے، اور مفید طبی معلومات بھی بہم پہنچائی جاتی تھیں، یہ رسالہ مدت تک جاری رہا ہے، اسکی دوسری جلد کے پہلے نمبر میں سے جو اگست ۱۸۶۲ء مطابق ۱۲۷۹ھ میں شائع ہوا ہے، ایک حصہ نمونۃً نقل کیا جاتا ہے،

"ایک عورت قوم سے اہلِ اسلام کے کہ عمر اسکی قریب پچپن سال کی، ساکن قصبہ بیڑکی، نام اس کا پاپا بی غرہ شہر شوال المکرم ۱۲۷۸ھ کو نزدیک اس فدوی کے آئی، اور ایسا بیان کی کہ یہ رسولی مجھے تین سال سے ہے، اور دن بدن ترقی پہ ہے، القصہ اس فدوی نے اول اس بیمار کو بیہوش کرکے یومرل آٹری ٹرنکٹ سے باندھ کر ایک کیپسل سے بیضاوی شکل کے مانند چیر کر پوست کو تشریح کر کر اس رسولی کو امانت نکال لیا، اور ذرا بھی مادہ اس رسولی کا رہنے نہ دیا، بعد ازاں آٹری وغیرہ کو باندھ کر لبِ زخم کو ملا کر ٹانکے دے کر اڈھی زن پلاسٹر کے تسمے لگا دیا، اور انٹی فلوجسٹک ٹریٹمنٹ کے حال پر رکھا، چند روز میں عنایتِ الٰہی سے بیمار درست ہوگئی، اور وہ رسولی دو اونس پانچ ڈرام تھی"

(فلینگ)

اسی رسالہ کی جلد سوم نمبر ۴ بابت ماہ رجب ۱۲۷۹ھ کے ایک مضمون کا ٹکڑا ملاحظہ کیجئے،

"فاسفورس ہیڈروجن، یہ بھی ایک شفاف اور بیرنگ گاس ہے، اور حیوانی مادّوں کی سڑاوٹ سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کی بو ایسی ہے جیسا کہ مچھلی کی بو ہے، یہ گاس بھی انسان کی جان کو اور صحت کو بہت مضر ہے، اور اہلِ کیمیا اسکو ایسی پاکی سے تیار کر سکتے ہیں کہ تیار ہوتے ہی فوراً سلگ کر جل جاتا ہے، (دیکھو دکن میں اردو طبع دوم ص۱۶۱)

اردو کا یہ سب سے پہلا ماہوار رسالہ تقریباً آٹھ سال تک جاری رہا ہے، اسکے بعد ایک نرا علمی ادبی رسالہ مخزن الفوائد کے نام سے ۱۸۷۴ء مطابق ۱۲۹۱ھ میں حیدرآباد سے جاری ہوا، جسکے اڈیٹر مولوی سید حسین

رامی (نواب عماد الملک مرحوم) تھے، اس میں علمی ادبی، اخلاقی، تاریخی، بہترین مضامین شائع ہوتے
، اور اسکی طباعت دار الطبع سرکار عالی میں ہوتی تھی، اس رسالے میں سید حسین بلگرامی کے علاوہ
باقر علی خان بہادر، مولوی مشتاق حسین، مرزا قربان علی سالک، آغا مرزا نواب سرور جنگ مرحوم
مہدی علی (محسن الملک مرحوم) وغیرہ مضامین لکھا کرتے تھے، اس طرح یہ رسالہ بھی رسالۂ دلگداز
بارہ تیرہ سال پہلے جاری ہوچکا تھا، اردو زبان میں سب سے پہلا ماہوار رسالہ (رسالۂ طبابت) جاری کرنے
حیدرآبادی کو حاصل ہے، اور اردو میں سب سے پہلا علمی ادبی اخلاقی ماہوار رسالہ (مخزن الفوائد) جاری
نے کا فخر بھی حیدرآبادی کو ہے،

مخزن الفوائد جلد اول نمبر ۹ میں بابت ماہ ذیحجہ ۱۲۹۱ھ سے مولوی سید حسین بلگرامی کے ایک مضمون
ادر ہوا کا ایک ٹکڑا نقل کیا جاتا ہے،

"یہ تو معلوم ہوچکا کہ ابخروں کے ٹھنڈے ہو کر بھاپ کی شکل میں جانے سے ابر پیدا ہوتا ہے
جب تک ابخرے کم کم اور آہستہ آہستہ جمتے رہتے ہیں، اسوقت تک ابر ہی ابر پیدا ہوتا ہے مینہ
نہیں برستا، مگر جب آمد ابخروں کی زیادہ ہوتی ہے، اور سرعت کیساتھ تہ پر تہ جمنی شروع ہوتی
ہے، اسوقت پانی کے ذرّے جن سے یہ ابر مرکب ہے، دوسرے سے مل مل کر بڑے قطرے
بننے لگتے ہیں، اور اپنے بوجھ سے زمین پر گرنے لگتے ہیں، اور مینہ برسنے لگتا ہے"،

یہ رسالہ چار چھ سال تک جاری رہا، افسوس ہے کہ اسکے پرچے میرے پاس نہیں رہے، اسلئے
یں کہا جاسکتا کہ کب بند ہوا،

اس رسالے کے اجراء سے پانچ سال پہلے جریدۂ اعلامیہ ۱۲۸۶ھ میں جاری ہوچکا تھا، جسے آقا
ن العابدین شیرازی مرتب کرتے تھے، اور دار الطبع سرکار عالی میں طبع ہوتا تھا، اس کے اغراض و
مقاصد دفتری اور محکماتی تغیر و تبدل، موسمی رپورٹ، نرخ اجناس، محکمہ جاتی (ڈپارٹمنٹل) امتحانات

کے نتائج اور سرکاری اشتہارات شائع کرنا تھے، یہ ہفتہ وار اخبار اب تک جاری ہے، اور اپنے اغراض و مقاصد کا حامل، اس میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ملک کی دولت آبادی دیسی کاغذ پر طبع ہوتا ہے، آدھا حصہ دارالطبع سرکار عالی کے حسین ٹائپ میں اور آدھا حصہ لیتھو میں طبع ہوتا ہے، غالباً اتنا قدیم کوئی ہفتہ وار اخبار نہیں ہے،

جریدۂ اعلامیہ کے بعد آصف الاخبار کا نام لیا جا سکتا ہے، جو فروری ۱۸۷۸ء سے رزیڈنسی سے نارائن راؤ مدلیار کی ملکیت میں ہفتہ وار جاری ہوا، اس کے متعلق بھی معلوم نہ ہو سکا کہ کب تک جاری رہا،

۱۸۸۰ء میں رزیڈنسی ہی سے شفیق ہفتہ وار سید حسین رضوی کی ملکیت میں جاری ہوا جسکا تعلق غالباً کسی انجمن سے تھا،

۱۸۸۰ء ہی میں انجمن اخوان الصفا کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ ادیب جاری ہوا، جو بہت جلد بند ہو گیا،

۱۸۸۲ء میں مولوی محب حسین کی ادارت میں معلم شفیق ماہوار جاری ہوا، اور دو سال تک ماہوار رہکر ۱۸۸۴ء سے ہفتہ وار ہو گیا، مگر افسوس ہے کہ اس ہفتہ وار پرچے نے بھی زیادہ عمر نہیں پائی،

۱۸۸۲ء ہی میں رزیڈنسی سے حاجی محمد قاسم کرنان نے شوکت الاسلام ہفتہ وار جاری کیا، دراصل یہ اخبار ابتداءً پونا سے جاری ہوا تھا، مگر چند ہی پرچے پونا سے شائع ہوئے تھے کہ کرنان صاحب حیدرآباد آ گئے، اور شوکت الاسلام بھی یہیں سے نکلنے لگا، یہ اخبار حال تک جاری تھا، ابتداءً آٹھ دس سال مسلسل شائع ہوتا رہا، مگر درمیان میں چھ ماہی تہ ماہی ہو گیا، آخر میں حضرت ملک معظم کی سالگرہ مبارک اور دسمبر اور سال نو کی تقریب میں نکلا کرتا تھا، آٹھ دس سال ہوئے کہ حاجی

قاسم صاحب نے انتقال کیا، اور ان کے فرزند نے اسی طرز پر اُسے جاری رکھا، مگر دو ایک سال سے شاید بند کر دیا گیا ہی بہرحال اپنی نوعیت اور قدامت کے لحاظ سے ایک ہی پرچہ تھا،

مئی ۱۸۸۳ء سے مولوی مشتاق احمد احقر نے ایک صنعتی اور حرفتی ماہوار پرچہ فنون کے نام سے جاری کیا، مگر زیادہ جاری نہ رہ سکا، چونکہ اس پرچہ کے فنی ہونے کی وجہ سے کامیابی سے چلنے کی توقع نہ تھی، اسلئے عوام کے ذوق کے مدنظر مولوی مشتاق احمد نے جون ۱۸۸۳ء سے گلکدۂ مشتاق کے نام سے ایک شعر و سخن کا ماہوار گلدستہ نکالا، جو مدت تک جاری رہا، ستمبر ۱۸۸۳ء میں مولوی مشتاق نے ایک اور ماہوار رسالہ "مذاق سخن" جاری کیا، جس میں نظم اور نثر دونوں کی رعایت تھی، یہ پرچہ البتہ کچھ دنوں تک جاری رہا،

۱۸۸۳ء ہی میں مولوی محمد سلطان عاقل نے "ہزار داستان" روزانہ جاری کیا جو اس زمانے کے مذاق کے موافق تھا، مگر اسکی عمر بھی زیادہ نہ ہو سکی،

۱۸۸۳ء ہی میں مولوی سید ابراہیم عفو نے مئی ۱۸۸۳ء سے "داستان سیاح" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جو جلد ہی بند ہو گیا،

اپریل ۱۸۸۳ء میں مولوی سید احمد زید بلگرامی، اور مولوی سید حسن جشن بلگرامی نے "ارم دکن" جاری کیا،

۱۸۸۴ء میں انجمن مستفیدان علوم فنون رزیڈنسی کیجانب سے مولوی عزیز الدین نے ایک ماہوار رسالہ رفیق دکن جاری کیا، جو مدت تک نکلتا رہا،

۱۸۸۴ء کی ابتدا میں زید اور جشن بلگرامی نے ملکر ایک روزنامہ پیک آصفی کے نام سے جاری کیا،

۱۸۸۴ء سے معلم شفیق جو مولوی محب حسین کی زیر ادارت ۱۸۸۲ء سے ماہوار جاری تھا، ہفتہ وار بن گیا،

مئی ۱۸۸۳ء سے مولوی عبد الجلیل نعمانی نے "طغرائے اعجاز" کے نام سے ایک پندرہ روزہ گلدستہ جاری کیا،

مئی ۱۸۸۵ء ہی سے نواب عبد اللہ خان ضیغم (داماد آنریبل سر شرف الامراء؟) نے "جوہر سخن" کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ جاری کیا،

۱۸۸۵ء کے اوائل سے نواب حسام الملک خان خانان بہادر کی سرپرستی اور سید حسین قابل کی ادارت میں ایک اخبار "آصفی" جاری ہوا،

۱۸۸۵ء میں فروری سے حاجی کرتان نے اخبار شوکت الاسلام کے ضمیمہ کے طور پر "مسرت القلوب" ہفتہ وار جاری کیا،

جون ۱۸۸۵ء میں دکن پنچ کے نام سے ایک ہفتہ وار پرچہ کشن راؤ جی نے جاری کیا، جس کے مہتمم عبد الکریم ظریف اور مدیر غریب الدین غریب تھے، یہی پرچہ آگے چل کر مشیر دکن بن گیا، جو ابتک جاری ہے،

جون ۱۸۸۵ء ہی سے قلعہ گولکنڈہ سے مشتاق احمد احقر نے "افسر الاخبار" جاری کیا،

جولائی ۱۸۸۵ء سے مولوی عبد السلام ترشی نے "خیال محبوب" نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

دسمبر ۱۸۸۵ء سے الطاف حسین قابل اور محمد عباس مہجور نے "گل و بلبل" کے نام سے ایک ماہوار گلدستہ جاری کیا،

۱۸۸۵ء ہی میں اورنگ آباد سے ایک ماہوار گلدستہ "مطلع سخن" بشیر الدین نے جاری کیا،

جنوری ۱۸۸۶ء سے حسن بن عبد اللہ نواب عماد نواز جنگ بہادر نے "حسن" نام سے ایک بہترین علمی ادبی تاریخی ماہوار رسالہ جاری کیا، جس میں مولوی حبیب الرحمن خان شروانی، سرر چہ ڈامیسٹر

عبداللہ کوئلم، مسٹر سی ال، شادر وغیرہ مشاہیر کے مضامین طبع ہوتے تھے، یہ رسالہ مدت تک جاری رہا، ۱۸۹۲ء سے اس میں ایک ضمیمہ تاریخ حسن، واقعات دکن کے نام سے اضافہ ہوا تھا جو بڑی کارآمد چیز تھی، یہ حیدر آباد کا اولین معیاری رسالہ تھا جو آجکل کے ٹھوس اور بلند معیار رسائل کی طرح مرتب کیا جاتا تھا، یہ رسالہ ۱۸۹۲ء تک جاری رہا،

۱۸۸۸ء میں منشی نثار علی شہرت نے سفیر دکن کے نام سے ایک اخبار جاری کیا،

۱۸۸۹ء میں محبوب القلوب کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری ہوا،

۱۸۹۲ء میں مولوی محب حسین نے معلم نسواں کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۸۹۳ء میں مولوی مجیب احمد تمنائی نے سحر بیان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۸۹۵ء میں سید علی رضا نے منتخب روزگار کے نام سے ایک ماہوار رسالہ کا اجرا کیا،

۱۸۹۵ء میں میں سید احمد ناطق نے ملک وقت کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

۱۸۹۶ء میں ایک ماہوار رسالہ افسر جاری ہوا جسے دو سال تک مولوی محب حسین مرتب کرتے رہے، اور ان کے بعد مولوی عبدالحق بی اے (حال معتمد انجمن ترقی اردو پروفیسر جامعہ عثمانیہ نے مرتب کرنا شروع کیا،

۱۸۹۶ء ہی میں منشی قدرت اللہ مضطر نے ایک ہفتہ وار اخبار نظارۂ عالم جاری کیا،

۱۸۹۶ء میں چونکہ مولینا عبدالحلیم شرر حیدر آباد آگئے تھے، اس لئے انھوں نے دلگداز بھی یہیں سے جاری کیا، جو ایک سال تک حیدر آباد سے شائع ہوتا رہا اور پھر لکھنؤ منتقل ہوگیا،

۱۸۹۷ء میں مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کے زیر سرپرستی "دبدبۂ آصفی" ماہوار جاری ہوا، جس کے مدیر پنڈت رتن ناتھ سرشار تھے، ایک مدت تک یہ رسالہ بڑی آب و تاب سے جاری رہا،

۱۸۹۷ء میں مولوی سلیمان قدسی نے شمس الکلام ماہوار جاری کیا،

۱۸۹۷ء ہی میں مولوی غلام حسین داد نے پیام محبوب کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا۔

۱۸۹۸ء میں نواب لقمان الدولہ بہادر نے میڈیکل جرنل کے نام سے ایک طبی ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۸۹۸ء ہی میں غلام صمدانی گوہر نے ایک ماہوار رسالہ جوہر محبوب کے نام سے جاری کیا،

۱۸۹۸ء ہی میں حافظ جلیل حسن صاحب (نواب فصاحت جنگ بہادر) جلیل نے محبوب الکلام ماہوار جاری کیا،

۱۸۹۹ء سے دکن پنچ مشیر دکن کے نام سے موسوم ہوا، جو روزنامہ کی شکل میں اب تک جاری ہے،

۱۸۹۹ء ہی میں مولوی امجد علی اشہری نے سفیر دکن کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا،

۱۹۰۱ء میں محمد ابراہیم خان نے ایک ہفتہ وار اخبار جام جمشید کے نام سے جاری کیا،

۱۹۰۲ء میں راجہ رائے رایان بہادر کی سرپرستی میں مولوی نادر علی برتر غازی پوری نے نسیم دکن ماہوار جاری کیا، اس رسالے میں تین حصے علٰحدہ علٰحدہ مضامین کے ہوا کرتے تھے، ایک حصہ میں طرحی غزلیں ہوتی تھیں، دوسرے حصے میں علمی ادبی مضامین ہوتے تھے، مولینا عبدالحلیم شرر، قطب الدین تسلی، مولوی محب حسین، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ اس حصہ کیلئے مضامین لکھا کرتے تھے، تیسرے حصہ میں ایک ناول مسلسل شائع ہوتا تھا،

۱۹۰۲ء ہی میں شمس العلماء نواب عزیز جنگ بہادر نے عزیز الاخبار ہفتہ وار جاری کیا،

۱۹۰۳ء میں مولوی عبدالرحیم وکیل نے دکھنی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

۱۹۰۳ء ہی میں مولوی ظفر علی خان بی اے (مدیر زمیندار) نے دکن ریویو کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو بڑا ٹھوس علمی ادبی رسالہ تھا، اس میں مولوی ظفر علی خان کے علاوہ مولوی محفوظ علی بدایونی، مولوی عبدالحق بی اے، مولوی عزیز مرزا بی اے وغیرہ جیسے اچھے انشا پرداز

مضامین لکھتے تھے، چند سال تک حیدرآباد سے جاری رکھ کر مولوی ظفر علی خان نے اس رسالے کو بمبئی سے بھی نکالا مگر پھر حیدرآباد لاکر مولوی مودود احمد تشنہ کے ہاتھ فروخت کر دیا، افسوس ہے کہ تشنہ صاحب اُسے جاری نہ رکھ سکے،

۱۹۰۳ء ہی میں مولوی ظفر علی خان نے افسانہ کے نام سے ایک ماہوار پرچہ جاری کیا، جس میں رینالڈز کے مشہور ناول اسرار لندن وغیرہ کا ترجمہ شائع ہوتا تھا، یہ پرچہ زیادہ مدت تک جاری نہ رہ سکا،

۱۹۰۴ء میں مولوی محب حسین نے علم و عمل کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا،

۱۹۰۴ء ہی میں سراج الدین احمد خان نے معیار الانشاء کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

۱۹۰۴ء ہی میں جناب امیر حمزہ نے نظامی کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو کم و بیش گیارہ سال تک نکلتا رہا،

۱۹۰۵ء میں منشی پیارے لال نے محبوب گزٹ ہفتہ وار جاری کیا،

۱۹۰۵ء ہی میں مولوی غلام حسین داد نے الہادی ماہوار رسالہ جاری کیا، جو مدت تک جاری رہا، غلام حسین صاحب کے انتقال کے بعد بھی ایک اور صاحب نکالتے رہے، تقریباً دس سال جاری رہ کر بند ہوا،

۱۹۰۵ء ہی میں مولوی سید رضی الدین حسن کیفی اور مولوی نوازش علی مست نے صحیفہ ہفتہ وار جاری کیا، جو مدت تک بڑی آب و تاب سے نکلتا رہا، ۱۹۰۹ء یا ۱۹۱۰ء میں مولوی اکبر علی صاحب نے اُسے مرتب کرنا شروع کیا، اور آخر میں اُسے روزنامہ بنا دیا، جو ابتک جاری ہے،

۱۹۰۶ء میں منشی محمد قاسم نے المحبوب ہفتہ وار جاری کیا، (باقی)

تلخیص و تبصرہ

بلقان کے مسلمان

جامعہ الجزائر کے ایک استاد جی، ایچ - بوسکے (G. H. Bousquet) نے حال میں ریاستہائے بلقان کی سیاحت کی تھی، وہان مسلمانون کی نسبت جو معلومات حاصل ہو سکے موصوف نے انکو ایک مضمون میں شائع کر دیا ہے[1] ہم اس مضمون کا خلاصہ ذیل میں درج کرتے ہیں،

یوگوسلاویا میں تقریباً سولہ لاکھ مسلمان آباد ہیں، جو وہان کی مجموعی آبادی میں بقدر دس فی صدی کے ہیں، ان میں سات لاکھ پچاس ہزار بوسینا ہرزیگووینا کے علاقہ میں ہیں، یہ سب زبان اور نسل کے لحاظ سے سردی ہیں، بقیہ جنوبی سرویا میں آباد ہیں، جہاں اکثریت ترکی اور خصوصاً البانی نسل کے لوگوں کی ہے، معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے ترک اور البانی سروی مسلمانوں سے بہت گرے ہوئے ہیں، اور برخلاف سردی مسلمانوں کے یوگوسلاویا کی قومی زندگی میں مطلق ضم نہیں ہوئے ہیں، یہ لوگ ترکی فتوحات کے بعد اسلام لائے تھے، انکی حیثیت نسلی نہیں بلکہ ایک مذہبی اقلیت کی ہے، معاشرتی نقطۂ نظر سے یہ لوگ ابھی منزل ارتقا میں ہیں، موجودہ حکومت میں دو مسلمان وزرا بھی شامل ہیں،

جہان تک مذہبی ارکان کا تعلق ہے، یوگوسلاویا کے مسلمان رمضان کے روزوں کے بہت

---

[1] مسلم ورلڈ جنوری ۱۹۳۷ء

پابند ہین، لیکن دوسرے فرائض کی پابندی نسبتہً کم ہے، سفر کی گوناگون دشواریون کی وجہ سے حاجیون کی تعداد کم رہتی ہے، مذہبی گروہ بندیاں بھی کم ہوتی جارہی ہیں، مجلس علماء کے ایک فیصلہ مورخہ ۱۱ر جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کے مطابق یوگوسلاویا کی جمعیۃ اسلامیہ نے ان تمام گروہ بندیوں کو جو دستور اور روح اسلام کے خلاف ہیں، ممنوع قرار دیا ہے، یہ جمعیۃ اپنا مستقل بجٹ رکھتی ہے، اور اس کی آمدنی زیادہ تر لاوارث جائدادون، سرکاری امداد اور مسلمانوں کے ٹیکسوں سے پوری ہوتی ہو، سیاسی نقطۂ نظر سے مسلمانون کو شہری حقوق حاصل ہیں، ان کے مذہبی حقوق بھی محفوظ ہین، اوران کے شرعی معاملات مذہبی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں، سروی مسلمانوں میں تعدد ازدواج کی مثالیں شاذ ونادر پائی جاتی ہیں، اگر کسی شخص کی بیوی موجود ہے تو کوئی امام اس کا دوسرا نکاح نہیں پڑھا سکتا، جب تک وہ شخص یہ ثابت نہ کرے کہ اس کی مالی حالت کافی طور پر قابل اطمینان ہو اور وہ عقد ثانی کے لئے معقول وجوہ رکھتا ہے، پہلی بیوی کی رضامندی حاصل کرنے کی بھی کوشش کی جاتی ہے، نابالغوں کی شادی کا رواج بھی تقریبًا بالکل اٹھ گیا ہے، یوگوسلاویا کے مسلمان حنفی مذہب کے پیرو ہین، قبول کا اظہار عروس خود کرتی ہے، اور شہروں میں اکثر نکاح کے وقت وہ قاضی کے سامنے آبھی جاتی ہے، دیہاتوں میں دستور یہ ہے کہ عروس کی طرف سے اس کا کوئی قریبی عزیز ناکح کے پاس چلا جاتا ہے، اکثر صورتوں میں دولہا دولھن نکاح سے قبل بھی ایک دوسرے سے واقف رہتے ہیں، پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا، طلاق بہت شاذ ہوتی ہے، اور جب کبھی ہوتی ہے لوگ اسکو نہایت بُرا سمجھتے ہیں، آج کل یہ کسیقدر زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی جب تک قاضی کو اطمینان نہ ہو جائے کہ شوہر سچائی کے ساتھ طلاق دے رہا ہے، وہ اُسے باقاعدہ طور پر رجسٹر میں درج نہیں کرتا، یوں رفتہ رفتہ طلاق کی شکل قانونی علحدگی کی ہوتی جاتی ہے، نوجوانوں میں برقعہ تیزی سے اٹھتا جاتا ہے، جو مسلمان زیادہ روشن خیال ہیں وہ اسے بالکل

اتحاد دینا چاہتے ہیں،

بلغراد میں مسلمان طلبہ کی سرگرمیاں بہت نمایاں ہیں، ان کا ایک خوبصورت دارالاقامہ ہے، جس میں ڈیڑھ سو طلبہ کے رہنے کی جگہ ہے، اسے وہاں کی انجمن اسلامیہ نے جو غیرت کے نام سے موسوم ہے قائم کیا تھا، بعض غیر مسلم طلبہ بھی اس میں رہتے ہیں، یوگوسلاویا میں طلبہ کا سب سے زیادہ خوبصورت دارالاقامہ یہی معلوم ہوتا ہے، اسکے قریب ہی لڑکیوں کے لئے بھی ایک مکان انجمن غیرت نے کرایہ پر لے رکھا ہے، جس میں غالبًا پندرہ طالبات رہتی ہیں،

مختصر یہ ہے کہ جہانتک ہم نے دیکھا یوگوسلاویا کے مسلمان کم از کم ان کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد تہذیب جدید کو اختیار کرنے کی بہت زیادہ کوشش کر رہے ہیں، دوسرے یہ کہ وہاں مختلف مذاہب کے پیرؤں کے باہمی تعلقات نہایت دوستانہ ہیں،

بلغاریا کے مسلمانوں کی حالت یوگوسلاویا کے مسلمانوں سے بہت مختلف ہے، بلغاریا کی تقریبًا ساٹھ لاکھ کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد قریب آٹھ لاکھ ہے، یوں بہ نسبت یوگوسلاویا کے وہاں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے، لیکن ان کی حیثیت زیادہ تر نسلی ہے، بلغاریا کے مسلمانوں میں سے تین چوتھائی ترک ہیں، جو بیشتر شمالی بلغاریا کے علاقہ شوملہ میں آباد ہیں، ایک لاکھ مسلمان ایسے ہیں، جن کا مذہب در اصل کسی قدر مبہم و مشتبہ ہے، صرف جنوبی بلغاریا میں وہ بلغاری مسلمان پائے جاتے ہیں، جو سترھویں صدی میں اسلام لائے تھے، اور جن کو ہم پوماک (Pomaks.) کہتے ہیں،

ان میں سے مسلمانوں کا کوئی حصہ بلغاری قوم میں اُس طرح نہیں مل جُل گیا ہے، جس طرح سروی مسلمان اپنے ملک والوں میں مل گئے ہیں، بلغاریا کے مسلمانوں کی معاشرتی اور دماغی سطح وہاں کے بقیہ باشندوں سے فروتر ہے، بلغاریا کے ترک ایک عجیب دشواری میں مبتلا ہیں،

وہاں انکو اپنے اصلی وطن ترکی سے زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے، پھر بھی جو لوگ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں انکی نگاہیں انقرہ کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور ان میں سے اکثر جلد بلغاریا چھوڑ کر ترکی چلے جانے والے ہیں، پومک مسلمانوں کو بلغاریا کی قومی زندگی میں حصہ لینے کا حق حاصل نہیں، حالانکہ وہ صرف سلافی زبان بولتے ہیں،

صوفیا کی یونیورسٹی میں مسلمان طلبہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، چند سال ہوئے ایک مسلمان لڑکی بھی یونیورسٹی میں تھی، بہرحال دوسری حیثیتوں سے بلغاریہ کے مسلمان شمالی افریقہ کے مسلمانوں سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، شہر فلیپو پولیس کے ترکوں نے ٹوپی کا استعمال ترک کر دیا ہے عورتوں نے برقعہ اٹھا دیا ہے، مگر یہ حالت ہر جگہ نہیں ہے، مدرسوں میں دس گیارہ سال تک کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں ساتھ بیٹھ کر پڑھتی ہیں،

قانونی معاملات میں بلغاریا کی مسلمان اقلیت کے ساتھ غیر معمولی طور پر فیاضانہ برتاؤ کیا جاتا ہے، ان کو شہریت کے حقوق عیسائی بلغاریوں کے برابر ملے ہیں، اور اپنے ذاتی معاملات میں اسلامی قانون کے تابع ہیں، بلغاریہ میں غیر مذہبی شادی تسلیم نہیں کی گئی ہے،

مسلمانوں کے اپنے مدرسے ہیں جن میں پچاس ہزار طلبہ تعلیم پاتے ہیں، ان مدرسوں کی زبان ترکی ہے لیکن بلغاری زبان بھی پڑھائی جاتی ہے، ان مدرسوں کے ذرائع آمدنی حسب ذیل ہیں:۔ لاوارث جائدادوں کے محاصل، سرکاری امداد، بعض قومی جائدادوں کی آمدنی، ٹیکس جو مسلمانوں پر عائد کئے جاتے ہیں،

صرف قاضیوں، مفتیوں اور ان کے نائبوں کو براہ راست حکومت سے تنخواہ ملتی ہے، صوفیا میں عدالت عالیہ کا اجلاس ہوتا ہے، جس کا صدر بلغاریہ کا مفتی اعظم حسین احمد وف ہے

وہ بلغاری زبان سے بالکل ناواقف ہے جنگ عظیم کے بعد مفتیوں کے فیصلہ کی رو سے یہ قانون نافذ کر دیا گیا ہے، کہ نکاح کے لئے لڑکوں کی عمر کم سے کم اٹھارہ سال اور لڑکیوں کی سترہ سال ہونی چاہئے، اس سے کم عمر والوں کا نکاح پڑھانے کا اختیار امام کو نہیں ہے، جبتک فریقین معقول وجوہ کی بنا پر مفتی سے خاص اجازت حاصل نہ کر لیں،

خلاصہ یہ کہ بلغاریہ کے مسلمانوں کے ساتھ جن کی حیثیت حقیقۃً ایک نسلی اور مذہبی اقلیت کی ہے، اکثریت کا سلوک انتہائی رواداری کا ہے، مگر بظاہر یہ لوگ اکثریت میں شامل ہونا نہیں چاہتے ہمارے نزدیک ان کے مستقبل کی فلاح کی اور کوئی دوسری صورت نہیں،

البانیا کے مسلمانوں کا حال یوگوسلاویا اور بلغاریا دونوں ریاستوں کے مسلمانوں سے بہت کچھ مختلف ہے، البانیا ایک چھوٹا سا ملک ہے، تقریباً بلجیم کے برابر، نہایت غریب، آبادی دس لاکھ سے کچھ زیادہ ہے، ایک لاکھ کیتھولک ہیں، دو لاکھ یونانی کلیسا کے پیرو، اور سات لاکھ پچاس ہزار مسلمان ہیں، یہاں کے لوگ دیر میں اسلام لائے، اور بہتیرے محض نام کے مسلمان ہیں، شمالی علاقوں میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان شادی بیاہ کی رسم جاری ہے، مسلمان عہدہ داروں کی ایک بہت بڑی تعداد بکتاشی فرقہ سے تعلق رکھتی ہے، اس فرقہ کے لوگ شراب پیتے ہیں، اور سوائے خرگوش کے ہر قسم کی غذا کھاتے ہیں،

حکومت البانیا نے مذہب اور سیاست کو ایک دوسرے سے علحدہ کر دیا ہے، ملکی قوانین غیر مذہبی اصولوں پر مدون ہو رہے ہیں، البانیا میں اسوقت ایک مجموعہ قوانینِ تجارت، ایک مجموعہ قوانینِ فوجداری، اور ایک مجموعہ قوانینِ دیوانی موجود ہے، پہلے دونوں اطالوی ضابطہ تجارت و فوجداری پر مبنی ہیں، ان کے علاوہ ایک ضابطہ دیوانی بھی مرتب کیا جا رہا ہے، یہ ضابطہ دیوانی کسی ایک غیر ملکی ضابطہ سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ فرانس اور اٹلی کے مختلف ضابطوں پر مبنی ہے، علاوہ بریں انکی

بعض دفعات البانیا کے مخصوص معاشرتی مسائل سے متعلق ہیں، مثلاً شادی سے پہلے نسبت کا توڑ دینا یا فریقین میں سے کسی ایک کی نااہلی کے باعث اولاد نہ ہونے پر طلاق حاصل کر لینا، جہاں تک ملکی قوانین کا تعلق ہے، البانیا میں اسلامی قانون کا نفاذ تقریباً موقوف ہو گیا ہے،

"ع ز"

بایاں ہاتھ

دنیا میں ۴ سے لیکر ۸ فی صدی آدمی ایسے رہے ہیں، جو اپنا کام زیادہ تر بائیں ہاتھ سے کرتے تھے، ان کو بائیں ہاتھ کے استعمال میں ویسی ہی آسانی ہوتی تھی، جیسی دوسروں کو داہنے ہاتھ کے استعمال میں ان میں سے بعض بڑے بڑے آدمی بھی تھے، مثلاً مصر کے بہتیرے فراعنہ، روم کے اکثر قیاصرہ، بائبل کے نبیا مین، سکندر اعظم، شارلیمین اور مائیکل انجیلو (اٹلی کا مشہور آرٹسٹ اور شاعر) موجودہ زمانہ میں اس قسم کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت شہنشاہ جارج ششم کی ہے، ان میں یہ بات بھی ہے کہ اپنے دونوں ہاتھوں کو یکساں آسانی کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں،

اہل سائنس کے ہاں اس امر میں اختلاف ہے، کہ بعض لوگ بائیں ہاتھ کے استعمال میں زیادہ آسانی کیوں محسوس کرتے ہیں، کچھ ماہرین فن کا خیال ہے، کہ یہ ایک کسبی چیز ہے، بعض کہتے ہیں، کہ یہ ایک پیدائشی خصوصیت ہے، پہلے گروہ کے نزدیک اس کا تعلق مندرجۂ ذیل باتوں سے ہے،:-

بچپن میں بچہ کو کس طرح گود میں لیتے ہیں، اُسے تربیت کیونکر دی جاتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ دوسروں کو دیکھ کر وہ ایسا کرنے لگا ہو، دوسرا گروہ اس خصوصیت کا تعلق جسم انسانی کی ترکیبی ساخت سے بتاتا ہے، وہ اس کے متعدد اسباب بیان کرتا ہے، مثلاً جسم کے دونوں نصف کی غیر مساوی تقسیم جو مرکز ثقل کو اسکی جگہ سے منتقل کر دیتی ہے، دماغ کے دونوں پہلوؤں میں خون کی غیر مساوی رسد، دماغ کے ایک پہلو کا فعلی غلبہ، اور ایک آنکھ کا بہ نسبت دوسری آنکھ کے زیادہ قوی ہونا، چنانچہ

…ا گیا ہے کہ تقریبًا ۵۰ فی صدی بائیں ہاتھ والے "بائیں آنکھ والے" بھی ہوتے ہیں، اور تقریبًا
…فی صدی داہنے ہاتھ والوں کی داہنی آنکھ بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے،

ساخت کے لحاظ سے کاسۂ سر کا ایک بازو دوسرے بازو سے چھوٹا یا نیچا ہوتا ہے، جن
…وں کے کاسۂ سر کا داہنا حصہ زیادہ ابھرا ہوتا ہے، عمومًا ان کے جسم کے تمام داہنے حصہ میں
…ہ قوت ہوتی ہے، پھر بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایسے لوگ زیادہ تر بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں، اکی
بعض ماہرین نفسیات کے نزدیک یہ ہے کہ دماغ کے داہنے نصف کرہ کا غلبہ بائیں ہاتھ والوں
اور بائیں نصف کرہ کا داہنے ہاتھ والوں میں ہوتا ہے، اسی بنا پر یہ نظریہ بھی قوی معلوم ہوتا ہے
…چیز بہت کچھ پیدایشی اور موروثی ہے، چنانچہ ایسے خاندانوں میں جہاں والدین میں سے ایک
…نون بائیں ہاتھ والے ہیں، بائیں ہاتھ والے بچوں کا اوسط (۱۷،۳۴) فی صدی پایا گیا ہے، اور
خاندانوں میں جہاں والدین میں سے کوئی بھی بائیں ہاتھ والا نہیں ہے، یہ اوسط صرف (۲/۱)
…مدی ہے، اگر ماں باپ دونوں بائیں ہاتھ والے ہیں، تو بچہ بھی تقریبًا ہمیشہ بائیں ہاتھ
…ا ہوتا ہے،

اکثر ماہرین نفسیات اس رائے پر متفق ہیں کہ بچوں سے بائیں ہاتھ کے استعمال کی عادت
…ڑانی نہیں چاہئے، ان کا خیال ہے کہ اگر کسی بچہ کو اس کی اس عادت کے خلاف کرنے پر مجبور کیا جائے گا
…میں اُسے فطرۃً آسانی معلوم ہوتی ہے، تو وہ اعصابی کمزوری اور بے آرامی محسوس کرنے لگیگا
…خانوں میں بائیں ہاتھ والوں کے اوسط کی زیادتی ٹھیک اسی سبب کا نتیجہ بتائی جاتی ہے، تجربہ سے
…ر ہوتا ہے کہ اگر ایسے بچوں کو ان کی عادت کے خلاف کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے، تو ان میں
…(۱۱) فی صدی لکنت کرنے لگتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ یہ تبدیلی اُن اعصاب کے فعل میں خلل انداز ہوتی
…، جن سے پڑھنے لکھنے اور گفتگو میں کام لیا جاتا ہے، لیکن اس مسئلہ میں بھی بعض علماے نفسیات

کو اختلاف ہے، مثلاً نیویارک کے ڈاکٹر لوئی بش (Louis E. Bisch) کی رائے ہے کہ ایسا کرنے سے کوئی مضرت نہ ہوگی، انکا خیال ہے کہ بچہ صرف عارضی طور پر لکنت کرنے لگے گا، اور شکایت آسانی سے رفع کیجا سکتی ہے،

فاضل ڈاکٹر سیموئیل اورٹن نیویارک (Samuel T. Orton) کا بیان ہے کہ ہر سو بچوں میں تقریباً چالیس فطری طور پر بائیں ہاتھ والے ہوتے ہیں، ان میں سے دس تو اپنی فطرت پر قائم رہتے ہیں، اور تیس اسے تربیت کے سبب سے بدل دیتے ہیں، ڈاکٹر موصوف نے ایسے پانچسو سے زیادہ واقعات کے مطالعہ میں یہ دیکھا ہے، کہ بیسیوں والدین نے اپنے بچوں کی عادت بدل دی اور انھیں بائیں ہاتھ کے بجائے داہنے ہاتھ کے استعمال پر لگا دیا، صرف تین والدین ایسے ملے جنھوں نے اسکے برعکس کوشش کی،

(ل۔ ڈ) "ح ز"

ابن رشد

مشہور مسلمان اندلسی حکیم جو مسلمانوں میں ارسطو کے فلسفہ کا بہترین شارح سمجھا جاتا ہے اور جس کی تصنیفات مدتوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں، سوانح اور اس کے فلسفہ پر تبصرہ، اور اسی ضمن میں مسلمانوں کے علم کلام و فلسفہ پر بھی ریویو، اور یورپ میں اسلامی علوم کی اشاعت کی تاریخ اور فلسفہ جدیدہ و قدیمہ کا موازنہ بھی آگیا ہے، ابن رشد کے متعلق اتنا بڑا ذخیرۂ معلومات کسی مشرقی زبان میں کیا مغربی زبان میں بھی نہیں مل سکتا،

ضخامت ۳۰۹ صفحے قیمت: ۔ سے ر

"منیجر"

اخبارِ علمیہ

جسمانی صحت اور دماغی قوت

جو لوگ اپنی بعض جسمانی کمزوریون کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتے، انھیں مندرجہ ذیل واقعات سے اپنے اندر جوشِ عمل پیدا کرنا چاہئے:

ماہرینِ نفسیات کی ایک جماعت، اپنے تجربات کی بنا پر بیان کرتی ہے، کہ برخلاف عام رائے کے بہترین دماغ اور بہترین قابلیتیں، بہترین دماغی صحت سے نہیں، بلکہ اکثر جسمانی یا اعصابی نقائص سے پیدا ہوتی ہیں، یہ گروہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں موجودہ زمانہ کی سب سے زیادہ ممتاز مثال امریکہ کے پریزیڈنٹ روزولٹ کو پیش کرتا ہے، روزولٹ ۱۹۲۱ء میں شدید اعصابی کمزوریوں کا شکار ہوگیا تھا، لیکن محض اپنے آہنی عزم کی قوت سے جدوجہد کرتا ہوا دس سال بعد ریاستہائے متحدہ امریکہ کا صدر ہوگیا، ڈاکٹر ڈونلڈ لیرڈ (Donald Laird) اوستادِ نفسیات کالگیٹ یونیورسٹی امریکہ کا خیال ہے کہ اگر روزولٹ اس مرض میں مبتلا نہ ہوگیا ہوتا، تو وہ صدارت تک ہرگز نہ پہونچتا، اس خیال کی تائید میں وہ دکھاتے ہیں، کہ پریزیڈنٹ روزولٹ کی موجودہ سیاسی زندگی نسبۃً کس قدر ہموار اور جوش و حوصلہ سے خالی ہے، حالانکہ اب اسکی صحت بہت اچھی ہے، بمقابلہ اسوقت کے جب وہ مریض تھا، لیکن اسی حالت میں انتہائی جوش و خروش کیساتھ ترقی کے لئے کوشش کرتا تھا، ڈاکٹر موصوف امریکہ کے ممتاز ترین طلبہ کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ

طلبہ اعلیٰ ترین ذہن و دماغ کے مالک تو ضرور تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ جسمانی اور اعصابی کمزوریوں اور دماغی الجھنوں میں بھی مبتلا تھے ان کی بعض شکایتیں یہ تھیں: مرگی کے دورے، لنگڑاپن، کمزور اور بیمار جسم، بدصورت داغدار چہرے، اور مختلف دماغی الجھنیں، ڈاکٹر لیرڈ ایسے کمزور اشخاص کی حیرت انگیز ترقی کی توجیہ انگلستان کے مشہور فلسفی فرانسس بکن (Francis Bacon) کے اس قول سے کرتے ہیں "جس شخص میں کوئی ایسا نقص مستقل طور پر ہوتا ہے، جو دوسروں کی نظروں میں اُسے حقیر کر دیتا ہے، وہ اپنے اندر اس حقارت سے نجات پانے کے لئے ایک دائمی تازیانہ کی خلش بھی محسوس کرتا رہتا ہے" لارڈ بائرن (Byron) کا ایک پیر ٹیڑھا تھا، لیکن یہی نقص ہمیشہ اُسے ادب اور شاعری میں امتیاز حاصل کرنے کے لئے ابھارتا رہتا تھا، علاوہ بریں وہ تیراکی میں بھی بڑا مشاق تھا، کانٹ کو نقرس کی شکایت تھی، مگر اسی کمزوری کی وجہ سے وہ عزلت پسند ہو گیا اور پھر فلسفہ پر ایک زبردست کتاب لکھی، جو دنیا کی مشہور ترین فلسفیانہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، نٹشے کو جسم کے شدید درد سے تکلیف رہا کرتی تھی، لیکن یہی تکلیف اُس تصنیف کا باعث ہوئی، جس نے دنیا کے سامنے فوق الانسان (Super-man) کا نظریہ پیش کیا، بیتھاون (Beethoven) کا چہرہ داغدار، ناک چھوٹی، اور بدصورت تھی، دمہ اور بہرے پن کی بھی شکایت تھی، ان تمام باتوں کی اُسے ہر وقت کوفت رہا کرتی تھی، مگر انہی نقائص کے احساس نے اُسے نہ صرف جرمنی بلکہ دنیا کے ممتاز ترین طرح سازوں کی صف میں جگہ دلوائی اور اس نے بعض ایسے گیت تصنیف کئے، جو اپنا جواب نہیں رکھتے، اسی طرح سیزر، سقراط، مولیری (سترہویں صدی کا مشہور فرانسیسی ڈراما نویس) رشلو (سترہویں صدی میں فرانس کا زبردست وزیر اعظم) موزارٹ (اٹھارہویں صدی میں آسٹریا کا ممتاز طرح ساز اور ماہر موسیقی) اور شلر (اٹھارہویں صدی کا مشہور جرمن شاعر اور ڈراما نویس) ان سب کو مرگی کے دورے ہوا کرتے تھے،

مختصرات سائنس

امریکہ کے ریڈیو کارپوریشن نے ایک حیرت انگیز ایجاد پیش کی ہے، جس سے تیز موٹر چلانے والے فوراً متنبہ کر دیئے جاتے ہیں، دو برقی انگیں موٹر کی رفتار و کمیتی رہتی ہیں، اور بجلی کے جس خزانہ سے ان کا تعلق ہوتا ہے، وہاں موٹر کی رفتار کا اندازہ صحیح صحیح درج ہوتا رہتا ہے، جوں ہی رفتار حد سے زیادہ تیز ہوئی، یہ طلسمی ایجاد دو میں سے ایک بات کرتی ہے، یا تو ایک سرخ جھنڈی موٹر ڈرایور کے سامنے لا دیتی ہے، جس پر لکھا ہوتا ہو کہ "تمھاری رفتار حد سے زیادہ تیز ہے" یا کسی پولیس مین کو آواز دیتی ہے،

شہر کے رہنے والے ہر منٹ گرد کے (۹۰۰۰۰۰۰۰۰) ذرے سانس کے ذریعہ اپنے پھیپھڑوں تک پہونچاتے رہتے ہیں، یہ ذرّے صرف خوردبین سے دیکھے جا سکتے ہیں، ان میں سے (۹۰۰۰۰۰) ذرّے پھیپھڑوں میں رہ جاتے ہیں، اور ان سے صحت کیلئے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے،

انسان کے شدید ترین دشمنوں میں سے ایک دشمن موسم بھی ہے، امریکہ میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۳۵ء تک (۵۲۲۴) آدمی آندھیوں سے ہلاک ہوے، اور (۲۳۰۰۰۰۰۰۰) ڈالر کی جائداد تلف ہوئی، طوفانوں سے اور زیادہ نقصان پہونچا، یعنی اسی مدت میں (۳۰۵۹۷۰۰۰۰) ڈالر کی جائداد تباہ ہوگئی، لیکن سب سے زیادہ بربادی سیلاب سے ہوئی، ۱۹۰۳ء سے ۱۹۳۵ء تک (۳۰۰۰) آدمی ہلاک ہوئے، اور (۱۶۵۰۰۰۰۰۰۰) ڈالر کی جائداد کا نقصان ہوا،

قلب کی بیماری

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اچانک موت قلب کی بیماریوں سے واقع ہوتی ہے، بہتیرے آدمی جنکو ہائی بلڈ پریشر کی شکایت ہے قلب کے حملوں سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں، وہ سُن چکے ہیں کہ اس مرض سے قلب کی حرکت دفعتہً بند ہوجاتی ہے، لیکن جدید ترین تحقیقات یہ ہے کہ ہائی بلڈ پریشر کوئی تشویشناک مرض نہیں ہے، بہت سے لوگ اس کے ہوتے ہوئے بیس تیس، اور چالیس سال تک بھی زندہ رہتے ہیں، قلب کی بیماری سے جو موتیں واقع ہوتی ہیں، ان میں صرف (۷) سے (۱۰) فی صدی تک اچانک ہوتی ہیں، ان میں بھی بہت کم ایسی ہوتی ہیں، جن کے آثار پہلے سے ظاہر نہ ہوجائیں، تاہم قلب کی بیماریاں ایسی نہیں ہیں جن پر خاص توجہ نہ کی جائے، ۱۹۳۵ء میں تین لاکھ امریکن اسی میں ہلاک ہوگئے، ۱۹۳۶ء کے آخر تک بیس لاکھ امریکن قلب ہی کے مریض تھے، امریکہ میں امراضِ قلب کی کثرت تمام دوسرے امراض سے زیادہ ہے، مرنے والوں میں مردوں کا شمار بمقابلہ عورتوں کے سہ چند رہتا ہے، قلب کی بیماریوں میں جتنے آدمی آج مر رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں نہیں مرے، پانچ سال سے ۹ سال کی عمر تک جو موتیں قلب کی بیماریوں سے واقع ہوتی ہیں، ان کا شمار اتفاقی حوادث اور نمونیا کی موتوں سے جن میں لوگ سب سے زیادہ ہلاک ہوتے ہیں، کچھ ہی کم رہتا ہے، دس سال سے چودہ سال کی عمر تک تمام دوسرے اسباب سے زیادہ قلب کی بیماریاں موت کا سبب ہوتی ہیں، پندرہ سے چونتیس سال کی عمر تک اموات کے لحاظ سے قلب کی بیماریاں دوسرے درجہ پر اترآتی ہیں، اسکے بعد آخر عمر تک اور امراض سے زیادہ امراضِ قلب سے موت واقع ہوتی ہے،

"ع ز"

پیشکشِ تہنیت

بتقریبِ جشنِ سیمیں

اعلیحضرت نظام الملک آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

از

یحییٰ اعظمی

سزد امروز اگر خاکِ دکن بر خویشتن نازد — کہ بر اوجِ کمالش گنبدِ چرخِ کہن نازد

خوشا وقتے کہ اندر سینہ می رقصد دلِ کشور — خوشا روزے کہ بر خود اینچنیں ملک و وطن نازد

مبارک "جشنِ سیمیں" آں شہِ اقلیمِ دانش را — کہ بر ذاتِ ہمایونش جہانِ علم و فن نازد

جہانبانے کہ مشرق تا بہ مغرب گردِ او گردد — جہاندارے کہ بر ذاتش ز کشمر تا دکن نازد

چناں آئین و اسرار و رموزِ سلطنت داند — کہ بر تدبیرِ او امروز اعصار و زمن نازد

بلے فرماں دہی زیبد چنیں فرمانروائے را — کہ بر نظمِ امورش مملکت بر خویشتن نازد

بریں چشم و چراغِ دودمانِ "آصفی" آرے — روا باشد اگر دیہیم و اورنگِ دکن نازد

نہ تنہا ہند بر جود و نوالش مفتخر آمد — عرب نازد، عجم نازد، ختا نازد، ختن نازد

زعالش فرات و نیل شو رِ زندگی دارد   بہ بحرِ بیکرانش دجلۂ وگنگ و جمن نازد

زبذل و جودِ او چوں شیخ یکساں بہرۂ اندوزد   بدورِ عدلِ عثمانی سزد گر برہمن نازد

چناں از آبیاری آب و رنگے تازہ افزاید   کہ گل بر رنگ و بوے خویش در صحن چمن نازد

سریر آرائی ملکِ ہنر او را ہمی زیبد   کہ بر منشورِ علم و حکمتش اقلیمِ فن نازد

ادیبے سحر پردازے کہ بر ہر حرفِ رنگینش   قلم نازد، زبان نازد، ادب نازد، سخن نازد

بسیطِ خاک را دیوانِ اشعارش بوجد آرد   اگر بزمِ فلک بر نظمِ پروین و پرن نازد

زبس نطقِ گہر بارش جواہر پارہ ہا ریزد   بریں نسبت ہمی زیبد اگر دُرِ عدن نازد

فروغِ بزمِ امکان است و می زیبد اگر بر وے   جہانِ آب و گل نازد، نظامِ جان و تن نازد

الٰہی باغِ گیتی از وجودش خرمی گیرد   چمن تا بر شقیق و ارغوان و نسترن نازد

نسیمِ لطفِ حق باشد چمن آراے اقبالش   صبا تا بر بہارِ لالہ و سرو و سمن نازد

نگہدار اے خدا آں شاہِ آصفجاہ سابع را

کہ بروے عہدِ حاضر نازد و عصرِ کہن نازد

———

مطبوعات جدیدہ

مرقع سخن شائع کردہ سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن تقطیع بڑی ضخامت ۴۹۲ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن،

سلسلۂ ادبیات اردو حیدر آباد کو جاری ہوئے ابھی زیادہ زمانہ نہیں گذرا لیکن اس قلیل مدت میں متعدد مفید کتابیں شائع کر چکا ہے، حال میں اُس نے اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے جشن سیمیں کی یادگار میں مرقع سخن کے نام سے دکن کے پچیس مشاہیر شعراء کا تذکرہ شائع کیا ہے، اس کی تالیف میں جامعہ عثمانیہ کے متعدد اساتذہ، طلبہ، فارغین اور دوسرے اہل قلم کی کوششیں شریک ہیں، یہ تذکرہ پانچ دوروں پر تقسیم ہے، پہلا دور ۱۱۵۰ھ سے ۱۲۰۰ھ تک، دوسرا ۱۲۰۰ھ سے ۱۲۲۵ھ تک، تیسرا ۱۲۲۵ھ سے ۱۳۰۰ھ تک، چوتھا ۱۳۰۰ھ سے ۱۳۳۰ھ تک، پانچواں ۱۳۳۰ھ سے عہد حاضر تک، ہر دور کے شروع میں ایک تمہید ہے، جس میں اس دور کی ادبی خصوصیات کا تذکرہ ہے، اس کے بعد اس عہد کے چند مشاہیر شعراء کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ، اور اس پر تبصرہ ہے، اور شعراء کے تذکرہ کے ساتھ اون کے اور ہم عصر دکنی اور شمالی ہند کے وہ ہم عصر شعراء جو اوس عہد میں دکن گئے یا جن کی شہرت شمالی ہند میں تھی، نام دیدیے گئے ہیں، اس طرح یہ تذکرہ گویا دکن کی شاعری اور اس کی تدریجی ترقی کی پوری تاریخ ہے،

پہلے دور میں شاہ سراج الدین سراج، درگاہ قلی خاں قلی سالار جنگ، میر نوازش علی شیدا، شاہ تجلی علی تجلی، دوسرے دور میں شیر محمد خان ایمان، ماہ لقا بائی چندہ، محمد صدیق قیس، مہاراجہ چندو لال شادان

تیسرے دور میں میر شمس الدین محمد فیض، محمد بدر الدین خان منظم الملک بدر، گردھاری پرشاد محبوب نواز ونت باقی،
میر احمد علی عصر، محمد فیاض الدین خان مسرت جنگ فیاض، میر اصغر حسین ناجی، چوتھے دور میں ڈاکٹر احمد حسین
مائل، سید جلال الدین توفیق، سید رضی الدین حسن کیفی، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، محمد عزیز الدین خان عزیز، غلام
مصطفےٰ رسا، پانچویں دور میں میر محمد علی مسرور، محمد حبیب الدین صغیر، سید امجد حسین امجد، میر تراب علی خان
سعید اور محمد بہبود علی صفی کے حالات ہیں، حالات کے ساتھ ان کے اور ان کے اکثر ہم عصر دکنی شعرا،
فرمانروایان دکن اور متعدد ادب و شعر کے قدر دانوں کی تصاویر بھی دیدی گئی ہیں، جنسے معنوی خوبیوں
کیساتھ یہ تذکرہ حسن ظاہر کا بھی مرقع بن گیا ہے،

رسولِ مقبول، مؤلفہ جناب مولینا عتیق احمد صاحب صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۰
صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ مکتبۂ قاسم العلوم دیوبند،

یہ سیرت کا رسالہ چھوٹے بچوں کے لئے لکھا گیا ہے، جو سلسلۂ مطبوعات مجلس دار التالیف دیوبند
کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس میں ابتدا میں پیغمبر کی ضرورت تمثیلی پیرایہ میں سمجھائی گئی ہے، اور
مشاہیر انبیاء اور ان کی کتابوں کے نام بتائے گئے ہیں، اس کے بعد عرب جاہلی سے لیکر وفات
نبوی تک مختصر سیرت پاک ہے، پھر اخلاق نبوی کا مختصر تذکرہ ہے، انبیاء کے متعلق ضروری عقائد
ہیں، آخر میں آنحضرت صلعم کے متعلق غیر مذاہب کے اکابر کی رائیں ہیں، کتاب کی زبان میں بچوں کی
خاطر سہولت کی گو کوشش کی گئی ہے، پھر بھی عربی کے موٹے موٹے لفظ بے اختیار قلم
سے نکل گئے ہیں، جن کے معنی کہیں کہیں حاشیوں میں لکھ دیئے گئے ہیں، درسی کتابوں کے طرز پر
ہر بیان کے آخر میں اس کا خلاصہ اور مشقی سوالات دیدیئے گئے ہیں، اور یہ اچھا کیا گیا ہے،
اتنا افسوس ہے کہ طرز بیان اور تمثیل میں انبیاء علیہم السلام کی جو حیثیت ظاہر کی گئی ہے، وہ نہ اکابر
کی سطح کے مطابق ہے، اور نہ حقیقت سے قریب تر ہے، واقعات میں بھی غلطیاں ہیں، تاہم بچوں

آنحضرت صلعم کی پھوپھی بتایا گیا ہے، (صفحہ ۲۴) حالانکہ وہ آپ کی دایہ اور خادمہ تھیں، حضرت خدیجہؓ کا مال لیکر جہاں پہلی دفعہ آپ گئے، اس کی نسبت لکھا ہے کہ آپ نے دمشق و شام وغیرہ ملکوں میں فروخت کیا، اس ایک فقرہ میں تین غلطیاں ہیں، دمشق ملک نہیں، دمشق آپ کا جانا ثابت نہیں، اس سفر میں شام کے سوا آپ کا کسی اور ملک میں جانا مذکور نہیں، اس طرز کے اور بھی مسامحات ہیں، ضرورت ہے کہ دیوبند کے مرکز سے جو چیز نکلے وہ اسکی سطح کے مطابق ہو،

نظامِ عمل، مولفہ مولانا محمد عبد الحامد قادری بدایونی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت، اوسط، قیمت :- عہ، پتہ :- محمد عابد القادری صاحب دار التالیف مولوی محلہ بدایوں،

یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، مسلمانوں کے لئے ان کی پیدائش سے لیکر موت تک کا نظام العمل ہے، اس میں اسلامی عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، رسوم، حکومت، تجارت وغیرہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے متعلق جن کی ایک مسلمان کو ضرورت ہوسکتی ہے، قرآنی احکام، احادیثِ نبوی، اسوۂ صحابہ اور فقہی مسائل دیدیئے گئے ہیں، آیاتِ قرآنی اور احادیث کا ترجمہ بھی ساتھ ساتھ ہے، ص ۱۵۰ میں "غریب" کو مفلس کے شاید ہم معنی سمجھا گیا ہے،

ہمارے نبی کے صحابہؓ، مؤلفہ مولینا اعجاز الحق صاحب قدوسی، تقطیع چھوٹی، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اوسط، قیمت :- ۸؍

مسلمانوں کے لئے صحابہ کرام کے اعمالِ حسنہ بہترین اسوۂ زندگی ہیں، اسی ضرورت کو پیش نظر رکھ کر دار المصنفین نے سیر الصحابہ اور اسوۂ صحابہ شائع کی، مولانا اعجاز الحق صاحب نے چھوٹے بچوں کی تعلیمی ضرورتوں کا خیال کر کے صحابۂ کرام کے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی اسوۂ حسنہ لیکر آسان زبان

سب جمع کر دیئے ہیں جو بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے بہترین نصاب ہے،

فردوسِ خیال ازجناب محمود صاحب اسرائیلی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۴ صفحات،
کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

فردوسِ خیال جناب محمود صاحب اسرائیلی کے اردو اور فارسی رباعیات اور قطعات کا مجموعہ ہے، اس میں اخلاق و حکمت مذہب و معاشرت اور مختلف عقائد و خیالات پر حکیمانہ رباعیاں اور قطعات ہیں، آخر میں چند مزاحیہ قطعات ہیں، خیالات میں حکمت اور کلام میں پختگی نمایاں ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اربابِ ذوق میں قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا

حیات حافظ خواجہ قطب الدین احمد، مرتبہ جناب حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۹ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط پتہ نیجر نامی پریس لکھنؤ

خواجہ قطب الدین احمد مرحوم لکھنؤ کے خاندانِ خواجگان کے پرانے باوضع بزرگوں میں تھے لکھنؤ کا مطبع نامی انہی کا قائم کیا ہوا ہے جس سے متعدد گراں پایہ اور نایاب کتابیں شائع ہوئیں، انکے فرزند رشید حکیم خواجہ شمس الدین احمد صاحب نے انکے سوانح حیات مرتب کئے ہیں، گو ایسے اشخاص کے سوانح لکھنا جنکا پبلک زندگی اور قومی و ملکی معاملات کو کوئی خاص تعلق نہیں رہا ہو عام فائدہ اور دلچسپی کی چیز نہیں تاہم یہ سوانح عمری اس حیثیت سے لوگوں کے لئے بڑی سبق آموز ہے کہ خواجہ صاحب مرحوم نے محض اپنی محنت اور دیانت سے ایک معمولی حالت سے اتنی ترقی کی جو دوسروں کیلئے ایک اچھے نمونہ کا کام دے سکتی ہے،

شیدلا اور دوسری کہانیاں- از پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن پروفیسر جامعہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۰ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

یہ کتاب چھ روسی کہانیوں شیدلا چھوٹے کی کہانی، کسان اور لومڑی، عقاب اور مکڑی، فلسفی اور مالی، شیر اور انسان کا مجموعہ ہے جو بچوں کیلئے لکھا گیا ہے چھوٹی کہانیاں دلچسپ نصیحت آمیز اور بچوں کے پڑھنے کے لائق ہیں،

(م)

سیر الصحابہ

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ
سکتے ہیں، وہ حضرات صحابۂ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان
م کو انجام دیا، اور اردو میں صحابۂ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث
یر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور
یت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو
ج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں حسب ذیل
ن جن کا مجموعہ ستے رہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف عنٹ ر میں یہ دس
دیں کامل نذر کیا تی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد	قیمت	جلد	قیمت
جلد اول، خلفائے راشدینؓ،	[illegible]	جلد ششم، سیر الصحابہؓ ششم،	[illegible]
جلد دوم، مہاجرینؓ اول،	[illegible]	جلد ہفتم، سیر الصحابہؓ ہفتم،	[illegible]
جلد سوم، مہاجرینؓ دوم،	[illegible]	جلد ہشتم، سیر الصحابیاتؓ،	[illegible]
جلد چہارم، سیر الانصارؓ اول،	[illegible]	جلد نہم، اسوۂ صحابہؓ اول،	[illegible]
جلد پنجم، سیر الانصارؓ دوم،	[illegible]	جلد دہم، اسوۂ صحابہؓ دوم،	[illegible]

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۵۷   اپریل ۱۹۳۶ء

معارف

مجلسِ دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت فی پرچہ

[illegible]

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتب خیرہ جس کا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کی موجودہ ضروریات کو سامنے رکھ کر صحت و اہتمام کے ساتھ مرتب کیا گیا اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیلِ دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے،

تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں لکھی گئی ہیں، پھر اُن معجزات کی تفصیل ہے جو بروایت صحیحہ ثابت ہیں اس کے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں کوشش کی گئی ہے کہ ان میں قرآن پاک ہی سے اسلام کے صحیح عقائد پیش کئے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کی عبادات سے اُن کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ/ حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد عہ/ حصہ سوم [illegible] تقطیع کلاں [illegible] حصہ چہارم تقطیع خورد [illegible] حصہ پنجم [illegible] تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]

حصہ [illegible] تقطیع کلاں [illegible]

[illegible]

جلد ۳۹	ماہ محرم الحرام ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۷ء	عدد ۴

مضامین

شذرات

مارچ کا آخری ہفتہ ہماری تعلیمی کانفرنس علی گڈہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کا تھا، ۲۶ سے لیکر ۲۹ تک دن رات کانفرنس کے کئی کئی شعبون کے اجلاس ہوتے رہے، ان مین سے شعبۂ تعلیم ابتدائی، شعبۂ تعلیم ثانوی، شعبۂ تعلیم اعلیٰ شعبۂ مدارس اسلامیہ، شعبۂ علوم وفنون اسلامی، شعبۂ اردو، شعبۂ اقتصادیات وغیرہ شعبون کے الگ الگ جلسے الگ الگ صدرنشینون کے زیرصدارت مختلف تاریخون مین ہوئے، جہانتک عالمانہ مقالون اور فاضلانہ خطبون کا تعلق ہے کانفرنس کا یہ اجلاس بیحد کامیاب ہوا، اگراہل کانفرنس ان مقالون اور خطبون کا ایک مجموعہ جلدازجلد شائع کرسکین تو قوم کے ہاتھون مین وہ آئینہ دیدینگے، جس سے اس کو اپنے چہرہ کا ہرخط وخال نمایان نظرآئیگا،

کانفرنس مین سب سے پہلی اور سب سے اہم تجویز مسلم یونیورسٹی مین ایک صنعتی کالج کے قیام کی تھی، جس کیلئے قوم سے تیس لاکھ کا مطالبہ کیا گیا تھا، مگر مجوز صاحب کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نہ یہ صنعتی کالج قائم کرنا چاہتے ہین، اور نہ سنجیدہ طور سے انھون نے اس کو پیش کیا ہے، بلکہ مقصود یا تو چندہ تھا، یا قوم کے مطالبہ کی دفع الوقتی؛ اس لئے یہ تجویز صرف سنادی گئی، اس کے عملی طریقون اور شکلون پر گفتگو نہین ہوئی،

مسلمانون مین انگریزی تعلیم کے بدیر رواج پانے اور نئی تعلیم مین پیچھے رہجانے کا حقیقی سبب مدتون تک یہ بتایا جاتا رہا ہے کہ علماے کرام نے اس کی سخت مخالفت کی تھی، لیکن چند سال کے بعد جب مسلمان صنعتی تعلیم مین

پیچھے رہجائینگے تو معلوم نہین اس کا الزام کس کے سر دھرا جائیگا، کیونکہ معلوم رہے کہ علماے کرام نے صنعتی تعلیم کے کسی شعبہ کی تعلیم کو ابھی تک حرام نہین قرار دیا ہے، بااین ہمہ سرکاری منصب کے خواہشمندون کی جماعت مین ابھی تک ادھر توجہ نہین کی جارہی ہے،

زمانہ روز بروز یہ ثابت کر رہا ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا معیار یہ نہین ہے کہ اس مین کتنے جج، کتنے ڈپٹی، کتنے انسپکٹر اور کتنے وکیل ہین، یہ غلامون کی ذہنیت تھی اور ہے کہ ہم غلام آپس مین اس پر فخر کرتے ہین کہ ہم مین سے کتنون کو بادشاہ کی طرف سے زرین طوق اور زرین کمر اور زرین تمغے ملے ہین، ترقی کا معیار یہ ہے کہ ہم مین کتنے عالم، کتنے محقق، کتنے مجاہد کتنے کارفرما پیدا ہوئے ہین، ہم مین زندگی کی طاقت کتنی پیدا ہوئی ہے اور ہماری زندگی کے مختلف شعبون مین کتنی چہل پہل اور عملی رونق آئی ہے،

کانفرنس نے اس سلسلہ مین ایک اچھا کام یہ کیا ہے کہ مسلمانون کے پچھلے پچاس سال کے تعلیمی کاروبار اور آگے کے پروگرام پر اہلِ فکر اصحاب سے مبسوط و مدلل مضمون لکھوائے ہین، ان مین سے بعض بعض مضمون بہت اچھے ہین، اور اس قابل ہین کہ ان کی روشنی مین ہم آیندہ کا پروگرام طے کرسکین،

ہم کو مسلمانون کی زندگی کی ہر روش مین یہ نظر آرہا ہے کہ ان مین اور ان کے رہنماؤن مین زمانہ کے اثرات کا بُعد بڑھتا جاتا ہے، قوم کے نوجوان کہین اور جارہے ہین اور ان کے بوڑھے رہنما کہین اور جانا چاہتے ہین، دونون کے ذوق، میلان، اور منزلِ مقصود کے تخیل مین اتنا فرق پیدا ہوگیا ہے کہ دونون کا ہم سفر بنا سخت مشکل بلکہ محال ہوتا جاتا ہے، یہی سبب ہے کہ نوجوان اپنے اکثر رہنماؤن کے ساتھ عقیدت اور ان کی اطاعت چھوڑ رہے ہین، اور رہنما اپنی قوت وطاقت کھو رہے ہین، اب موقع ہے کہ علماے روشنضمیر آگے بڑھین،

اور نوجوانون کی رہنمائی کا صحیح فرض انجام دین،

علی گڈھ کانفرنس مین امسال ایک علمی و تعلیمی نمائش بھی تھی علمی حصہ مین بہت سے شاہی فرامین، اردو اور فارسی کی قلمی کتابین، اور خوشنویسون کے ہاتھون کے قطعے، اور مصورون کے ہاتھون کی تصویرین تھین، اردو کی قلمی کتابین ہمارے دوست ڈاکٹر سید حفیظ صاحب (الہ آباد) کی اور فارسی کتابین مولوی ظفر حسن صاحب سپرنٹنڈنٹ محکمۂ آثار قدیمہ آگرہ کی تھین، ان مین سے دو کتابین خاص کر ذکر کے قابل ہین، ایک شہزادہ دارا شکوہ کا فارسی دیوان جس مین شہزادہ کا تخلص قادری تھا، اور دوسرا تزک عالمگیری معلوم نہین یہ دوسرا نسخہ کیا تھا،

بہت دنون سے جی چاہتا تھا کہ اسلامیہ اسکول **اٹاوہ** کو جس کی تعریفین اکثر کانون سے سنا کرتے تھے، اپنی آنکھون سے دیکھین علی گڈہ سے واپسی مین ۳۰ مارچ کو اٹاوہ اترے، اسکول کو دیکھا، اس کے تینون بورڈنگ دیکھے، اس کا کتبخانہ اور تاریخی نمائش خانہ دیکھا، وہان کے استادون سے ملنا ہوا، لڑکون کا رہنا سہنا دیکھا، خوشی ہوئی کہ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا، مولوی بشیر الدین صاحب جیسے انتھک کام کے دھنی منیجر، اور مولوی سید الطاف حسین صاحب جیسے نیک، سادہ اور محنتی ہیڈ ماسٹر اگر ہمارے دو چار اسلامی اسکولون کو بھی مل جاتے تو ہماری تعلیمی درماندگی بہت کچھ کم ہو جاتی،

اہل علم کو یہ سنکر خوشی ہوگی کہ دائرۂ معارف نعمانیہ حیدرآباد کی طرف سے مولانا ابو الوفا قندھاری نے قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الآثار تصحیح و تعلیق کے بعد مصر سے چھپوا کر شائع کی ہے، کتاب الخراج کے بعد قاضی صاحب کی یہ دوسری کتاب اہل علم کے حلقہ تک پہنچی ہے،

مقالات

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیاے کرام کے اوصاف غالبہ

انبیا کے اوصاف کمالی

خلیل اللہ کے لغوی معنی "خدا کے دوست" کے ہیں، اور یہ حضرت ابراہیمؑ کا لقب ہے، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے انبیاے کرام اللہ تعالیٰ کے دوست نہ تھے کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہو سکتا ہے جو خدا کا دوست نہ ہو، پھر صرف حضرت ابراہیمؑ ہی خلیل اللہ کیوں ہوں،

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا لقب کلیم اللہ مشہور ہے، جس کے معنی ہیں "خدا سے باتیں کرنیوالا" "جس نے خدا سے باتیں کیں"، لیکن کیا کوئی پیغمبر ایسا بھی ہے جس سے خدا نے کسی نہ کسی طرح باتیں نہ کی ہوں، پھر حضرت موسیٰؑ ہی کلیم اللہ کیوں کہلائیں،

اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کہتے ہیں، حالانکہ تمام انبیاء اور نہ صرف انبیاء بلکہ ہر انسان کی روح خدا ہی کی روح ہے، پھر صرف حضرت عیسیٰؑ کو روح اللہ کیوں کہیے،

اسی طرح اگر کوئی شخص حضرت محمد رسول اللہ صلعم کو بتخصیص شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کہے تو ایسا کہنا کیونکر درست ہوگا، درآنحالیکہ ہر نبی شہادت دینے والا نیکوکاروں کو بشارت سنانے والا گنہگاروں کو تنبیہ کرنے والا، خدا کی طرف پکارنے والا، اور روشنی بخشنے والا چراغ

بن کر آیا؟

عام لوگوں کو یہ شبہ اسلئے پیش آتا ہے، کہ وہ زبان کے ایک نکتہ سے بہلو تہی کرتے ہیں، وہ نکتہ یہ ہو کہ ہر شخص کو اس کے صرف اسی وصف سے ملقب کیا جاتا ہو، جو وصف اس میں بمرتبۂ کمال ہوتا ہو، بات ہر شخص کرتا ہے، اسلئے لغت کے لحاظ سے ہر شخص ابو الکلام ہو، مگر استعمال میں ابو الکلام اسی کو کہیں گے جسمیں کلام کی خوبی، برجستگی، یا طول وجہ کمال ہو،

آنکھیں اور ہاتھ کس انسان کے پاس نہیں اسلئے اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) سبھی ہیں، مگر قرآن پاک نے اسکو خاص طور سے انبیاے کرام کا وصف قرار دیا، اور فرمایا۔

واذکر عبدنا ابراھیم واسحاق	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور
ویعقوب اولی الایدی والابصار	اسحاق اور یعقوب کو یاد کر وجو ہاتھوں
(ص ۴)	اور آنکھوں والے تھے،

ہاتھ عمل کے لئے اور بصارت علم کے لئے ہے، اس سے مقصود انسان کی عملی اور علمی قوتوں کا کمال ہے، چونکہ حضرات انبیاءؑ کی عملی اور علمی دونوں قوتیں مرتبۂ کمال پر ہوتی ہیں، اس لئے تمام انسانی طبقوں میں اولی الایدی والابصار (ہاتھوں اور آنکھوں والے) کے لقب کے وہی مستحق قرار پائے،

یہی سبب ہے کہ اللہ تعالی نے مختلف انبیا علیہم السلام کو مختلف اوصافِ کاملہ سے یاد فرمایا حضرت ابراہیمؑ کی نسبت فرمایا،

واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (نساء)	اور خدا نے ابراہیم کو دوست بنایا،

حضرت موسیٰ کی نسبت ارشاد ہوا،

وکلم اللہ موسیٰ تکلیما۔	اور اللہ تعالی نے موسیٰ سے بہت سی
(نساء ۲۳)	باتیں کیں،

حضرت اسماعیلؑ کو فرمایا،

اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ (مریم-۴) اسمٰعیل وعدہ کے سچے تھے،

حضرت ایوبؑ کے متعلق ارشاد باری ہے،

اِنَّا وَجَدْنٰہُ صَابِرًا، (ص) ہم نے اسکو صابر پایا،

غور کیجئے کہ انبیاؑ میں کون نہیں جس سے خدا نے دوستی نہیں کی، یا خدا نے اس سے باتیں کین یا وہ وعدہ کا سچا نہ تھا، یا حق کی راہ میں وہ صابر نہ ٹھہرا، لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے دوستی کے وصف سے صرف حضرت ابراہیمؑ کو، ہم کلامی کے وصف سے صرف حضرت موسیٰؑ کو، صدق وعدہ کے وصف سے صرف حضرت اسماعیلؑ کو، اور صبر کے وصف سے صرف حضرت ایوبؑ کو ممتاز فرمایا، حالانکہ خود قرآن کہتا ہے، کہ

وَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ (اے رسولؐ آپ بھی ویسے ہی صبر کیجئے جیسے

مِنَ الرُّسُلِ (احقاف ۵) ہمت والے رسولوں نے کیا ہے،

مگر اس عموم کے باوجود تمام انبیا میں سے مخصوص طور پر صرف حضرت ایوبؑ ہی کو صابر کیکر یاد فرمایا گیا، جس کے یہ معنی نہیں کہ نعوذ باللہ دوسرے انبیا، اس صبر کے وصف سے معرا تھے، بات یہ ہے کہ گو ہر شخص کو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر قسم کی استعدادیں ملتی ہیں، مگر ان میں سے ایک ہی دو استعدادوں کا کمال نصیب ہوتا ہے، بالقوی استعدادوں کی فعلیت زمانہ کے اقتضا، حالات کی مناسبت، وقت کی ضرورت اور پیش آمدہ واقعات کے مطالبہ کی بنا پر ہوتی ہے، جہاد کا حکم ہر پیغمبر کو ہوا، مگر ہر ایک کی زندگی میں اس کے مناسب حالات پیش نہیں آئے، اسلئے حضرت موسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلعم کی پاک زندگیوں میں جہاد کے جو مناظر پیش آئے، وہ دوسرے پیغمبروں کے سامنے پیش نہیں آئے،

غرض کسی شخص میں کسی وصف کا موجود ہونا اور بات ہے، اور اس وصف کے عملی ظہور کے مواقع پیش آنا، اور ان کے مطابق اس وصف کا بمرتبۂ کمال ظاہر ہونا اور بات ہے، انبیا کا کسی وصف خاص سے ملقب اور ممتاز ہونا پہلے اوصاف کی بنا پر نہیں، بلکہ دوسرے اوصاف کی بنا پر ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ، حضرت موسیٰؑ کلیم اللہ، حضرت عیسیٰؑ روح اللہ، حضرت اسمٰعیلؑ صادق الوعد، اور حضرت ایوبؑ صابر ٹھہرے، کیونکہ حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے نسلاً بعد نسلٍ دوستی کا جو وعدہ فرمایا، اور جس کی علامت کے طور پر ان کی اولاد در اولاد کو نبوت و برکت سے سرفراز فرمایا، یہ دوستی کا کمال کسی نبی کو عنایت نہیں ہوا، حضرت موسیٰؑ کو کوہ طور پر جس طرح ہم کلامی کا شرف بخشا گیا، وہ کسی اور نبی کے حصہ میں نہیں آیا، حضرت عیسیٰؑ کو روح الٰہی کا فیضان جس کمال کے ساتھ ملا، وہ کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا، چنانچہ فرمایا،

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	یہ پیغمبر ان میں سے بعض کو بعض پر ہم نے
عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ	برتری دی، ان میں سے کوئی تو ایسے
وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ وَاٰتَيْنَا	ہیں جن سے خود اللہ نے کلام کیا، اور
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ	بعض کے درجے بلند کئے، اور مریم کے
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ط	بیٹے عیسیٰ کو کھلی نشانیاں دیں، اور
(بقرہ - ۳۴)	روح القدس سے ان کی تائید کی،

اس پاک آیت میں تین پیغمبروں کا وصفِ امتیاز بیان کیا گیا، پہلے حضرت موسیٰؑ کا کہ ان کو کلیمیت ملی، اور سب سے آخر میں حضرت عیسیٰؑ کا کہ ان کو معجزات اور روح القدس کی تائید بخشی گئی، دونوں کے بیچ میں ایک پیغمبر کا ذکر ہے، جس کو درجوں اور مرتبوں کی بلندی ملی، یہ بیچ کے پیغمبر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی شریعت وسط اور صراطِ مستقیم اور موسویت اور عیسویت

میں معتدل ہے، اسلئے آپ کا ذکر بھی ان دونوں کے بیچ میں ہے،

ہمارے رسول اللہ صلعم کو درجوں اور مرتبوں کی جو بلندی ملی، اسکی تفصیل اور تشریح جتنی بھی کیجائے کم ہے

اور قرآن پاک میں جابجا اسکی تشریح ہے، منجملہ اس کے ایک یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کلیمیت اور حضرت عیسیٰؑ کو تائید بروح القدس کی جو فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی فضیلتیں ہیں، اور ہمارے رسول کو جن درجوں اور مرتبوں کی فضیلت عطا ہوئی، وہ شخصی کے علاوہ دینی وعمومی ہیں، آپ کو جو بالذات فضیلت بھی عطا کی گئی، مثلاً خاتمیت، وہ بھی آپ کی کتاب، آپ کی شریعت، اور آپ کی امت کو شامل ہے، آپ کے دین کو عموم بخشا گیا، آپ کو نبی الامم اور نبی الانبیاء دونوں بنایا گیا، آپ کے دین پر دین الٰہی کے ہر گوشہ کی تکمیل کی گئی، آپ کی کتاب کو خاتم الکتب اور ناسخ الکتب بنایا گیا، اور قیامت تک کیلئے اسکی حفاظت کا وعدہ کیا گیا، اور آپ کی امت کو آخر الامم کا لقب ملا، ع

ہر چند وصفت می کنم لیکن ازاں بالاتری

بایں ہمہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں، کہ نعوذ باللہ آنحضرت صلعم کو خدا نے ہم کلامی کا شرف نہیں بخشا، یا روح القدس کی تائید عطا نہیں ہوئی، یہ دونوں باتیں آپ کو بھی ملیں، لیکن یہ باتیں آپ کا وصف امتیازی نہیں بنائی گئیں، بلکہ اور دوسری دوسری باتوں کو آپکا وصف امتیازی ٹھہرایا گیا، مثلاً فرمایا:۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۔ (فتح-۱)	ہم نے تجھکو گواہ اور خوشخبری سنانیوالا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا،
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۔ (احزاب)	اے پیغمبر ہم نے تجھ کو گواہ اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانیوالا، اور خدا کی طرف پکارنے والا اور روشن کرنیوالا چراغ بناکر بھیجا،

یہ آپ کے منجملہ دیگر امتیازی صفات کے چند امتیازی صفات ہیں، جن کا یہ منشا نہیں کہ ان صفات سے دیگر انبیاء علیہم السلام خالی تھے، بلکہ یہ ہے کہ ان اوصاف کمالیہ کا یہ اجتماع ان کی ذات میں اس درجۂ کمال میں نہ تھا، جو محمد رسول صلعم کی ذاتِ پاک میں تھا، چنانچہ پورے قرآن میں کسی خاص پیغمبر کے یہ اوصاف بہ تخصیص نام لیکر سوائے حضرت محمد رسول اللہ صلعم کے نہیں قرار دئے گئے، کیونکہ مقامِ مدح میں وہی اوصاف بیان کئے جاتے ہیں، جو کسی موصوف کے اوصافِ امتیازی اور کمالی ہوتے ہیں جنکو اوصافِ غالبہ کہتے ہیں،

اسی نکتہ کو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ اپنے رسالے تحذیر الناس میں یوں بیان فرماتے ہیں

> مگر کوئی ملقب ہوتا ہے تو اپنے اوصافِ غالبہ کے ساتھ ملقب ہوتا ہے، مرزا جان جاناں صاحبؒ اور شاہ غلام علی صاحبؒ اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور شاہ عبدالعزیز صاحبؒ چاروں صاحب جامع بین العلم والفقر تھے، پر مرزا صاحب اور شاہ غلام علی صاحبؒ تو فقیری میں مشہور ہوئے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب علم میں، وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کے علم پر ان کی فقیری غالب تھی، اور ان کی فقیری پر ان کا علم، اگرچہ ان کے علم سے اُنکا علم، یا ان کی فقیری سے ان کی فقیری کم نہ ہو، سو انبیاء میں علم عمل سے غالب ہوتا ہے اگرچہ ان کا عمل اور ہمت اور قوت، اوروں کے عمل اور ہمت اور قوت سے غالب ہو بہرحال علم میں انبیاء اوروں سے ممتاز ہوئے ہیں، (ص ۵۰)

آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

> "نبوتِ کمالاتِ علمی میں سے ہے، اور آپ جامع العلوم ہیں، اور انبیاء باقی جامع نہیں، (ص ۵۰)

غرض یہ ہے کہ مقامِ مدح میں خاص خاص انبیاء علیہم السلام کے وہی اوصاف

جاتے ہیں، جن میں ان کو دوسروں پر امتیاز اور فضیلت حاصل ہو، اسی بنا پر آنحضرت صلعم کی مدح میں جو شاہد و مبشر و نذیر و داعی الی اللہ و سراج منیر کے الفاظ باطلاق آئے ہیں، ان کا یہی مقصد ہے، کہ آپ میں یہ اوصاف مجتمعہ ایسے مرتبۂ کمال پر تھے، جو کسی اور نبی میں نہ تھے،

اوصافِ کمالی کے علم کے طریقے، انبیاء علیہم السلام کے یہ امتیازی اوصاف دو طریقوں سے معلوم ہوتے ہیں، ایک تو یہ کہ بنص صریح ان کا اظہار ہو، جیسے حضرت موسیٰ کیلئے کلیمیت، حضرت عیسیٰ کے لئے تائید بروح القدس یا حضرت اسماعیلؑ کیلئے صدق وعد، اور حضرت ایوبؑ کے لئے صبر، دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لفظوں میں اس وصف کی تصریح نہ ہو، مگر ان کی زندگی کے عملی کارناموں میں وہ وصف نمایاں نظر آتا ہو، جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت نوح علیہما السلام میں نذیریت کا، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام میں مبشریت کا کمال،

نذیریت کے کمال کے یہ معنی ہیں، کہ ان میں خدا کی قہاری و جباری اوصاف کا ظہور زیادہ ہو، اور کمال مبشریت کے یہ معنی ہیں، کہ خدا کے فضل و کرم اور رحمت عام کا رنگ زیادہ نمایاں ہو، جیسا کہ خدا نے آنحضرت صلعم کو مبشر وغیرہ لکھکر فرمایا، تو وہیں اسکی تصریح فرمائی،

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا،	اور ایمان والوں کو خوشخبری سنا دیجئے کہ ان کے لئے خدا کی طرف سے بڑی مہربانی (فضل) ہے،
(احزاب - ۶)	

کمالِ نذیریت میں اللہ تعالیٰ کے قہر و عذاب کا پہلو اس کے فضل و کرم سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے، جیسے نوح علیہ السلام اپنی ہزار سالہ تبلیغ کی ناکامی سے جب مایوس ہوئے، تو اُن کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ خدا کی بارگاہ میں کفار کی پوری نسل کی بربادی و ہلاکت کی دعا مانگی، عرض کی :-

رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ	اے میرے پروردگار تو زمین پر کافروں

دَیَّارًا اِنَّکَ اِنْ تَذَرْھُمْ یُضِلُّوْا	میں سے کوئی گھر نہ باقی و سلامت چھوڑ
عِبَادَکَ وَلَا یَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا	بیشک اگر تو ان کو چھوڑے گا، تو وہ
کَفَّارًا، رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ	تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے، اور
وَلِمَنْ دَخَلَ بَیْتِیَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِیْنَ	ان کی اولاد جو ہوگی وہ بھی بدکار اور
وَالْمُؤْمِنٰتِ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِیْنَ	سخت کافر، اے میرے رب مجھے اور
اِلَّا تَبَارًا۔	میرے والدین کو، اور جو میرے گھر
(نوح - ۲)	میں با ایمان آئے، اور مومن مردوں اور
	مومن عورتوں کو بخش دے، اور ظالموں

[illegible]

اس آیت میں نذیریت اور بشیریت دونوں کے جلوے ہیں، مگر غور کیجئے کہ نذیریت کا غلبہ بشیریت سے کتنا زیادہ ہے، اہل ایمان کے لئے صرف مغفرت کی دعا کے ساتھ ساتھ پورے روئے زمین کے کافروں اور ان کی پوری نسل کی ہلاکت کی دعا ہے، اور پھر انہی کی کامل تباہی و بربادی کی خواہش پر دعا کا خاتمہ ہے، اور آخر ساری قوم تباہ و برباد ہوگئی،

حضرت موسیٰ اہل فرعون کے حق میں یہ دعا مانگ کر اپنی نذیریت کی شان کا کمال ظاہر فرماتے ہیں:۔

رَبَّنَا اِنَّکَ اٰتَیْتَ فِرْعَوْنَ وَ	ہمارے پروردگار تو نے فرعون اور
مَلَاَہٗ زِیْنَۃً وَّاَمْوَالًا فِی	اس کے درباریوں کو شان و شوکت
الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا رَبَّنَا لِیُضِلُّوْا عَنْ	اور دولت دنیا میں دی ہے، اے ہمارے
سَبِیْلِکَ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓی اَمْوَالِھِمْ	پروردگار تاکہ تیرے راستہ سے بھٹکا دیں اے ہمارے
وَاشْدُدْ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْا	پروردگار ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو

حَتّٰی یَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ۔	سخت کردے تو وہ ایمان نہ لائیں، یہانتک کہ
(یونس۔۱۰)	دردناک عذاب دیکھ لیں،

اس کے بالمقابل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صفت بشیر کا کمال ملاحظہ ہو، کہ اللہ تعالیٰ اُن سے اُن لوگوں کی نسبت جب دریافت کرے گا، جو ان کے بعد شرک میں مبتلا ہوئے، تو موقع پاکر عرض کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے اپیل کرتے ہیں،

مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ	میں نے اُن سے وہی کہا جو تونے
بِهٖۤ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّیْ وَرَبَّكُمْ	حکم دیا کہ میرے اور اپنے رب کو پوجو
وَكُنْتُ عَلَیْهِمْ شَهِیْدًا مَّا دُمْتُ	اور جب تک میں ان کے درمیان تھا
فِیْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ كُنْتَ اَنْتَ	اون کو دیکھتا بھالتا تھا، اور جب تونے
الرَّقِیْبَ عَلَیْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ	مجھے وفات دی، تو ہی ان کا نگہبان
شَیْءٍ شَهِیْدٌ، اِنْ تُعَذِّبْهُمْ	تھا، اور تو ہر چیز کی خبر رکھتا ہے،
فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ	اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے
لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ	بندے ہیں، اگر تو اُن کو معاف کردے
(مائدہ۔۱۶)	تو تو قدرت اور حکمت والا ہے،

اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی کی یہ تحریک اُن کے حق میں ہے، جن کی نسبت حضرت عیسیٰؑ خود ہی نذیری فرما چکے ہیں،

اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ	بیشک جو کسی کو خدا کا شریک بنائیگا،
اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ	تو اللہ نے جنت اُس پر حرام کردی ہے
النَّارُ (مائدہ۔۱۰)	اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے،

گویا یہ ان کی بخشش کے لئے بھی رحمتِ الٰہی کی سلسلہ جنبانی فرماتے ہیں، ظہورِ محمدی کی بشارت

کا پیغام لے کر بھی وہ آئے ملاور کہا،

مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِي اس رسول کی بشارت لیکر آیا ہوں جو

اسْمُهُ أَحْمَدُ، جو میرے بعد آئے گا، اور جسکا نام احمد ہے،

حضرت ابراہیمؑ کی بشریت — اس سے زیادہ جمالِ بشارت حضرت ابراہیمؑ کے روے اقدس میں ہے، وہ

مجسم خیر و برکت لے کر آئے، نبیوں اور رسولوں کے مورث قرار پائے، اسماعیلؑ واسحاقؑ کے خاندانوں

کی برکتیں انہی کے ذریعہ اتریں اور آدم کے سارے گھرانوں کو ان کے ذریعہ ہدایت کی روشنی ملی، بنی اسمٰعیل میں

رحمۃ للعالمین علیہ السلام کے ظہور کی دعا انھوں نے کی،

دعاے خلیل و نوید مسیحا

اور دونوں مُبَشِّر!

(باقی)

الجہاد فی الاسلام

اس کتاب میں اسلامی جہاد کی حقیقت بتائی گئی ہے، اسلام کے قوانین صلح و جنگ

کی تفصیل کرکے دوسرے مذاہب کے قوانین جنگ سے ان کا مقابلہ کیا گیا ہے، اور موجودہ

یورپین قوانین جنگ پر تبصرہ کرکے ان پر اسلامی قانون کا تفوق ثابت کیا گیا ہے، اور

مخالفین کے تمام شکوک و شبہات زائل کئے گئے ہیں،

ضخامت :- ۲۰۹ صفحے، لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ، قیمت :- ؏

"منیجر"

رامچندر جی کی کہانی

از

جناب سبطین احمد صاحب بی، اے، بدایوں،

(۴)

افسانہ کے افراد متعلقات | پہلے عرض کیا جاچکا ہو کہ مسٹر ونکٹا رتنام کی تصنیف کا مطالعہ کرنے سے پہلے یہ امر ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ہندی تمدن اور ہندو روایات خالص آریہ قوم کی تخلیق نہ تھیں، بلکہ اس کے برعکس ایسی شہادتیں موجود ہین جو ظاہر کرتی ہین، کہ ہندو تہذیب کے بہت سے آئین اور ہندو ادبیات کی بعض روایتیں دوسری قوموں اور دوسرے ممالک کا عطیہ ہیں، اس صورت میں رامائن کے افسانہ کو بدیسی چیز سمجھنا قرائن کے خلاف نہیں کہا جاسکتا،

مسٹر ونکٹا رتنام کے تخریبی استدلال کا ملخص جو اس مضمون کی دوسری اشاعت میں پیش کیا گیا تھا یہ امر واضح کرچکا ہے کہ رامائن مختلف اور متضاد بیانات سے بھری ہوئی ہے، اور اکثر واقعات باہم مربوط نہیں کئے جاسکتے، لہذا یہ قرینہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے واسطوں سے گذرکر وہ ہندوستان پہنچی، دوسرے ہندوستان کے قدیم آثار میں کوئی شہادت اس کے بیان کی تصدیق کرنے والی نہیں ملتی جس کی بنا پر اسکو کسی ہندوستانی راجہ سے متعلق کہا جاسکے، تیسرے رامائن کی قدامت مشتبہ ہے لہذا اس کا سنہ تصنیف مصر کے رامیسز ثانی سے قبل نہیں سمجھا جاسکتا، ان بحثوں کے بعد وہ موافقات جو

ونکٹا رتنام کا نظریہ قبول کرنے سے روک سکتے تھے، ہٹ جاتے ہیں، اب تعمیری استدلال کا جائزہ لینا باقی رہ جاتا ہے، جو زیادہ تر لغوی اور لسانی تحقیق پر مبنی ہے،

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ تاریخ کا آخری ذریعۂ اطلاع الفاظ ہی ہوتے ہیں، تحریری اور تعمیری آثار، کتبے اور عمارتیں ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد مورخ کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اس وقت وہ لغات سے مدد لیتا ہے، اور اُن کی زبان سے بھولا ہوا افسانہ سنتا ہے، لیکن مسٹر ونکٹا رتنام کی تحقیق کے نمونے پیش کرنے سے پہلے رامیسز ثانی سے تعارف ضروری ہے،

مصر کے تمدن کی تاریخ مسیح علیہ السلام سے چار یا پانچ ہزار سال پہلے شروع ہوتی ہے، یہ مسئلہ نزاعی ہے، کہ قدیم مصری قوم وہیں کی رہنے والی تھی، یا کسی دوسرے ملک سے جاکر آباد ہوئی تھی، چار یا پانچ ہزار قبل مسیح سے لیکر سکندر کی فتوحات تک، مصر میں تقریباً تیس شاہی خاندان حکمران رہے، ان میں بعض ایک دوسرے کے ہمعصر اور ایک ہی وقت میں ملک کے مختلف حصوں پر قابض تھے، شمالی مصر کے سلاطین کا پایۂ تخت اکثر شہر منفس رہا، جنوبی حکومتوں کا صدر مقام شہر طب تھا، ان تمام خاندانوں میں اٹھارھویں اور انیسویں سلسلے زیادہ مشہور تھے، رامیسز ثانی کا تعلق اٹھارھویں سلسلے سے ہے، اور اور اس کا دورِ حکومت تیرھویں صدی قبل مسیح تھا، مگر یہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ فراعنۂ مصر کے سن بہت مشتبہ ہیں، اور بعض قیاسات میں صدیوں کا تفاوت ہے،

رامیسز کا خاندان تو عروج خاندان تھا، جس کے اقتدار کی شروعات اسکے دادا رامیسز اوّل سے ہوئی، رامیسز اوّل کا جانشین اس کا بیٹا سیتی ہوا، جس کے بعد رامیسز ثانی تخت پر بیٹھا، رامیسز کی فتوحات کا حال مسپرو کی اس عبارت سے ظاہر ہے،

پھر اس کی توجہ ڈیلٹا کی طرف مبذول ہوئی، شام میں فراعنہ کے مقبوضات کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے، اور شام کے قریب حطیوں کی ایک زبردست سلطنت عروج پا رہی تھی، چنانچہ سترہویں

خاندان کے آخری فرعون مجبوراً تنفس شہر میں زیادہ قیام رکھتے تھے (جہاں سے شامی علاقوں کی نگہبانی زیادہ آسان تھی) رامیسز ثانی کو محسوس ہوا کہ خاکنائے سویز کے قریب کسی مضبوط مقام پر قبضہ رکھنا نہایت ضروری ہے تاکہ وہاں حفاظت کے ساتھ قیام کیا جاسکے، چنانچہ زالو کے قریب ایک سرسبز اور صحت بخش مقام پر اوس نے قلعہ بنایا، جس کا نام اپنے نام پر رکھا، اور جس کا حال اس زمانہ کے شاعر ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں، یہ قلعہ ایک سرحدی چوکی کا کام دیتا تھا، جہاں سے بادشاہ دشمنوں پر نگاہ رکھ سکتا تھا.......''

''رامیسز ثانی کے دوسرے اور چوتھے سال جلوس میں دو مرتبہ خاکنائے عبور کرکے فوج کشی کی گئی، ان دونوں مہمات کے مقصد بغیر خون بہائے پورے ہوگئے، چوتھا سال جلوس ختم ہوا تھا، کہ خاطی قوم نے بغاوت شروع کی جس کی وجہ سے دونوں ریاستوں میں اَن بَن ہوگئی، اور ایک باقاعدہ جنگ وجدال کی نوبت پہونچ گئی، ختیا سرو نے اپنے بھائی مزاسرو کو قتل کرکے حکومت پر قبضہ کرلیا تھا، اور وہ سپاہیوں کو جمع کر رہا تھا، رامیسز نے حملے سے پہلے ہی دفع دخل مقدر کی ٹھان لی، اوس نے لشکر فراہم کیا جس میں مصریوں کے علاوہ لیبیا اور ایتھوپیا کے لوگ بھی شامل تھے، اس سپاہ نے دریا کو زالو کے قریب عبور کیا، اور کنعان کے ملک سے تیزی کیساتھ گزر کر لطانی کی وادی میں اور بعد ازاں دریائے اورنتش کی وادی میں پہنچ گئی، ختاسرو، لبنان کے جنگلوں میں چھپا ہوا پڑا تھا، اس کے جاسوس صحیح اطلاعیں پہنچا رہے تھے، رامیسز حرکت کرکے ...... پہونچا جہاں دو بدویوں سے اطلاعات حاصل کرنے کی کوشش کی ...... رامیسز نے خاندانی لشکر لیکر حملہ کیا، دشمن کی حربی گاڑیاں اسکو گھیر گھیر لیتی تھیں، آٹھ مرتبہ اوس نے دھاوا کیا، اور دشمن کی صفیں درہم برہم کر دیں، ایک مرتبہ وہ بالکل تنہا رہ گیا، مگر اپنی بہادری اور اوسان ٹھکانے رہنے کے سبب سے بچ گیا، ختاسرو پسپا ہوا، کیونکہ مقابلہ بے سود تھا، ...... رامیسز نے ارادہ کرلیا کہ اس مہم کے واقعات مثلاً جاسوسوں کی مار پیٹ، شامیوں کا فرار ہونا، اور قادیش شہر کا حوالہ کیا جانا، ابو سنبل، الکسر اور رامیسیم

وغیرہ مقامات پر مندروں کی دیواروں پر منقوش کر دیئے جائیں، پنٹر کی نظم بھی انھی واقعات کو بیان کرتی ہے؛

قادیش کی نسبت پروفیسر پیٹری لکھتا ہے کہ

"قادیش کے متعلق پہلا سوال تو یہ ہے کہ وہ کہاں واقع تھا، بعض نے اس کا محل وقوع جھیل

نبی مندو پر بتایا ہے، اور بعض نے اس بنا پر کہ قادیش تصویر میں پانی سے گھرا ہوا دکھایا گیا ہے، اس جزیرہ کو

قرار دیا ہے، جو جھیل کے اندر واقع ہے؛

یہ تھی وہ مہم جو مسٹر ونیکٹا رتنام کے بقول رامائن کی بنیاد اولین ہے، جہاں تک حربی نقل و حرکت کا

تعلق ہے، رامیسز کی مہم راجندر جی کے سفر سے پوری مطابقت رکھتی ہے، جس طرح رام اپنے دارالسلطنت سے

روانہ ہو کر گنگا عبور کرتے ہیں، پھر ڈنڈک ارن یام نامی جنگل میں داخل ہوتے ہیں، یہانتک کہ ہندوستان

کے سرحد پر لنکا کا محاصرہ کیا جاتا ہے، اور راون قتل ہوتا ہے، اسی طرح رامیسز شہر منفس سے روانہ ہو کر

دریائے نیل کو عبور کرتا ہے، اور تنتاک کے بیابان میں داخل ہوتا ہے، اور سرحد پر پہنچکر قادیش کا محاصرہ

کرتا ہے، جو دریا سے گھرے ہوئے ایک جزیرہ پر واقع ہے، یہاں تک کہ ختا سر قتل ہو جاتا ہے،

اس شامی جنگ کے علاوہ رامیسز نے مصر کے جنوب میں ایتھوپیا یا نیوبیا پر بھی حملہ کیا تھا، ابو سمبل

وغیرہ میں مندروں کی دیواروں پر دکھایا گیا ہے، کہ نیوبیا کے مفتوح سردار اس کے سامنے کھڑے ہوئے

ہیں، اور ان میں جنوب کے رہنے والے حبشی بھی ہیں، مال غنیمت اسکے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، جس میں

اور جانوروں کے علاوہ بندر بھی شامل ہیں، مسٹر ونیکٹا رتنام کے بقول صدیوں بعد رامیسز کی نسبت جو افسانے

مشہور ہوئے، ان میں یہ دونوں لڑائیاں ایک داستان میں گوندھ دی گئیں، اور چونکہ ہر افسانہ بغیر جنس

عشق کے دخل کے بے تمک معلوم ہوتا ہے، کسی شاعر نے جنگ کا سبب بصنعت حسن التعلیل رامیسز کی

ملکہ کی چوری کو قرار دیدیا، اور یہ خیال غالب یونانیوں کی اس روایت سے اُڑا لیا گیا جس کو ہومر کی ایلیڈ نے

حیات دوام نصیب ہو چکی ہے،

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، کتاب کا اصل استدلال مصری اور ہندی ناموں کی تطبیق ہے، اور یہی مصنف کی اَن تھک محنت کا کارنامہ ہے، ان تمام ناموں کو پیش کرنا تو اس مضمون کے حدود سے باہر ہے، چند مقامات اور افراد کا تطابق بہ طور نمونہ حاضر کیا جاتا ہے،

ابتدا رام ہی سے کرنا چاہئے، مصنف کے بقول ہندی رام مصری رامیسز کی دوسری شکل ہے، رام کو ہندوستانی کہنے سے سب سے پہلے تو یہ بات مانع ہے، کہ ہندوستان میں کوئی تاریخی شہادت یا کوئی یادگار ایسی باقی نہیں، جسکو یقین کے ساتھ رام کے ساتھ علاقہ ہو، برخلاف اس کے رامیسز کے مجسمے اور بہتر شاعری کی نظم جس کے نسخے پیپرس کے پتوں پر لکھے ہوئے آج بھی موجود ہیں، رامیسز کے وجود پر ناقابلِ انکار شہادتیں ہیں، پھر ہندوستانی رامائن میں رام کا جو حلیہ بیان کیا گیا ہے، وہ رامیسز کے مجسموں پر پورا اترتا ہے

اس نظریہ کی تائید اس امر سے ہوتی ہے، کہ رام کا لفظ ہندی نہیں، بلکہ سامی الاصل ہے چنانچہ اسیریا کے شاہی خاندان میں ایک بادشاہ اس نام کا مذکور ہے، رام کی اصل غالبًا شہر طب کے مصری دیوتا کا نام ہے، جو ہیروغلفی رسم الخط میں "امن رع" پڑھا گیا ہے، چونکہ ہیروغلفی الفاظ بائیں جانب سے دائیں طرف کو اور دائیں طرف سے بائیں جانب کو دونوں طرح پڑھے جا سکتے ہیں، اس لئے "آمن رع" کو "رع آمن" بھی پڑھ سکتے ہیں جس کا ہندی تلفظ، رامان یا راما ہوگا، ہندوستانی دیوتا سندر "رآمن" یا "سندر رمن" بھی جس کے نام پر اب تک لوگ بچوں کو یہ نام دیتے ہیں، اصل میں مصر کے اس دیوتا کو سمجھنا چاہئے جس کو "آمن رع سندر" یا بہ تغیر ترتیب "رع آمن سندر" کہتے تھے طب کا ایک کتبہ ٹیورن میں موجود ہے جسکے لکھنے والے اسی "رع آمن دیوتا" کے پجاری ہیں،

ہندوستان میں رام کی پیدائش ایک پراسرار صورت سے واقع ہونا بیان کی جاتی ہے، جو اس امر کی تحقیق کی طرف اشارہ کرتی ہے، کہ رامیسز کا خاندان ایک نو عروج خاندان تھا چنانچہ مصریات کا ماہر پروفیسر بیزی لکھتا ہے :-

"اس خاندان کی ابتدا نا معلوم سی ہے، پہلے رامیسز نام کا ایک وزیر آمن ہوتیپ کے عہد میں مذکور ملتا ہے، رامیسز اوّل اور اس کا بیٹا سیتی غالباً شاہی خاندان سے رشتہ رکھتے تھے"

بال کھنڈ میں سیتا اور رام کی شادی کے وقت رام کا جو نسب نامہ دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ وشنو سے برہماجی پیدا ہوئے، برہما کے لڑکے اکش وشو تھے، اور اکش وشو کا بیٹا دسرتھ یعنی رام کا باپ تھا، اس نسب نامہ سے بھی رام کے غیر ہندوستانی اور سامی ہونے کا پتہ چلتا ہے، کیونکہ مصنف کے بقول یہ امر قریب قریب تحقیق ہو چکا ہے کہ برہماجی حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا دوسرا نام ہے، اور اکش وشو اسحاق کی دوسری شکل ہے[1]

ڈراوڑی زبانوں میں رام کا لفظ اپنی زیادہ صحیح صورت میں موجود ہے، مثلاً تامل اور ملایالم زبانوں میں رام کو "رامن" بولتے ہیں، جو "رع آمن" کی بجنسہٖ نقل ہے، مصری "رع آمن" کا نون سنسکرت نے جو آخری حروف کو غیر ساکن رکھنے کی عادی ہے، حذف کر دیا، اور میم کی حرکت قائم رکھی، چنانچہ رام بنا لیا، اس لغوی بحث سے کافی قرائن یہ باور کرنے کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں، کہ رام کسی سامی النسل فرمانروا کا نام تھا، اور اس لفظ کی اصل بھی سامی زبان کا کوئی لفظ ہے، رامیسز میں اگرچہ ایک ٹکڑا زیادہ ہے لیکن رام اور رامیسز کو ایک شخص سے منسوب سمجھنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ رامیسز وہ شخص ہے جس کو بہت سے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا، مس ایڈورڈس کہتی ہے،

مصری تاریخ میں رامیسز ثانی ہمیشہ سے ایک مرکزی شخصیت رہا ہے، اور رہے گا، اس کو یہ امتیاز درجہ کچھ تو استحقاقاً اور کچھ اتفاقاً حاصل ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔ اس کی تقدیر میں تھا کہ مرنے کے بعد دوسروں

---

[1] برہما کا ماخذ ہے، "برہم ہتی" جس کے معنی ہیں، وہ جو آدمیوں کی تعداد بڑھاتا ہے، اور کتاب پیدائش میں حضرت ابراہیمؑ سے کہا گیا ہے، کہ اب تیرا نام ابرم نہیں، بلکہ ابراہام ہوگا، کیونکہ میں نے تجھ کو بہت سی قوموں کا باپ بنایا ہے، (دنیکتا رتنام)

کی شہرت غصب کرنے ہی نہیں، بلکہ صحیح نام فراموش ہوجاتا، اور مختلف حرفی ناموں سے یاد کیا جانا بھی مقدر تھا یہی وہ رامیسز ہے جس کی عظمت اور شوکت نے اُس کی ذات کو ایک افسانہ کا ہیرو بنا دیا، یہ افسانہ ہندوستان پہنچا، اور بہت سی تحریف و تصریف کے بعد کسی ہندی شاعر نے اسکو نظم کر دیا،

رامائن کا دوسرا زبردست کردار سیتا جی ہیں، رامائن کا بیان ہے، کہ یہ نام اسلئے پسند کیا گیا تھا کہ جنک نے ہل چلاتے وقت ان کو پایا تھا، بہ الفاظ دیگر وہ کسی عورت کے بطن سے پیدا نہ ہوئی تھیں، بلکہ دھرتی ماتا کی اولاد تھیں، لیکن سیتا ایک بہت ہی قدیم مصری نام ہے، جو دوسرے مصری ناموں کے ساتھ اکثر لگا ہوا ملتا ہے، مثلاً سیتھ ہوتر زمین اور گائے کی دیوی کو کہتے تھے، سیت آمن" اٹھارہویں خاندان میں جس سے رامیسز کا تعلق تھا، بعض شہزادیوں کا نام ہے، سیتا تما ایک مطانی بادشاہ کا بھی نام تھا، چنانچہ یہ ایک قدیم لفظ ہے، جس کے معنی زمین یا زمین کی دیوی کے ہیں، آج بھی یہ نام مصر میں رائج ہے، اور شاید ہندوستان سے زیادہ وہاں اب بھی دولتمند خواتین کے نام کے ساتھ عزت اور ادب کے لحاظ سے اسکو لگا دیا جاتا ہے، قاہرہ میں آج بھی ایک مسجد "سیتا زینب" کی مسجد کہلاتی ہے،

طل العمرنا کے محفوظ خطوط سے معلوم ہوتا ہے، کہ مطانی بادشاہ دسرتھ کی بہن مصر کے فرعون آمن ہوتپ ثالث کو بیاہی گئی تھی، اور اس سے ایک لڑکی سیت آمون تھی، جو دسرتھ کی بھانجی اور مصر کے موحد فرعون آمن ہوتپ چہارم کی بہن تھی،

طبس کے پجاریوں نے آمن ہوتپ کو کافر ٹھہرایا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ یادگاروں میں جہاں کہیں اس کا نام تھا مٹا دیا گیا، اس کے بعد مصر کے سلاطین میں دوسرا مشہور فرمانروا رامیسز ثانی ہوا، رامیسز ثانی کے باپ سیتی اول نے آمن ہوتپ چہارم کی پوتی سے شادی کی، اور یوں یہ نیا خاندان قدیم سلطانی خانوادہ سے منسلک ہو گیا، مرور زمانہ سے دسرتھ، سیتا اور رامیسز کے باہمی رشتے تو فراموش

---

[1] املا مشتبہ ہے۔

ہوگئے، لیکن ان ناموں کے گرد بہت سے روایات اور افسانے پیدا ہو گئے، چنانچہ بودھی روایت میں سیتا جی کو رام کی بہن بتایا گیا ہے، جو اس قیاس کی تائید کرتا ہے، کہ رامائن کا افسانہ کسی دور دراز ملک اور بہت گذرے ہوئے زمانہ کے چند واقعات کی بگڑی ہوئی صورت ہو، ممکن ہے کہ رامیسز کی بی بی کا نام بھی سیتا ہو اور یہ بھی ممکن ہے، کہ وہ اسکی بہن بھی ہو، کیونکہ فراعنۂ مصر بہنوں سے شادیاں کر لیتے تھے، دوسرا قیاس جو مسٹر ونکٹا رتنام کے نزدیک زیادہ قرین عقل ہے، یہ ہے کہ سیتا سے مراد کوئی حصۂ ملک ہوگا، جو شامی سردا نے غصب کر لیا ہوگا، کیونکہ سیتا کے اصل معنی زمین ہیں،

رام کا حریف مقابل راون ہے، جو رامائن کے تمام افراد میں سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے، کیونکہ وہ ایک برہمن اور ویدوں کا مفسر بھی بتایا جاتا ہے، راون کا ماخذ سنسکرت کا لفظ "راو" بتایا جاتا ہے جس کے معنی ہیں چلانا یا پکارنا، اسکی توجیہ کی گئی ہے کہ ایک مرتبہ راون اور شیو میں جنگ ہوئی، راون نے اس پہاڑ کو جس پر شیو جی بیٹھے ہوئے تھے، اکھاڑ کر آسمان کی طرف پھینک دیا، شیو جی نے غصہ میں پاؤں کے انگوٹھے سے پہاڑ کو دبایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پھر زمین پر آگرا، اور راون کا ہاتھ اسکے نیچے دب گیا، اور وہ چلانے لگا، آخر شیو جی نے ترس کھا کر راون کا ہاتھ نکال دیا، اسوقت سے راون شیو کا معتقد ہو گیا، اور جب ہی سے راون کہلایا، "دس کنتھ" اور "دس گریو" اس کا لقب ہے، کیونکہ رامائن کے مطابق وہ دس سر والا انسان تھا، جب رامچندر جی سے جنگ ہو رہی تھی، تو ایک سر کٹنے کے بعد اس کی جگہ نیا سر پیدا ہو جاتا تھا، یہانتک کہ رام کی تلوار نے ایک سو ایک[۱] سر کاٹ ڈالے، رامائن نے راون کو پولستیا کی اولاد بتایا ہے، اور "سر یا دیو" اور راکشش کے لقب سے یاد کیا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ وہ ایک جابر اور ظالم فرمانروا تھا، اب پولستیا لفظ فلسطینی کی ہندوانی شکل ہے، اور اس قیاس کی تائید اس تاریخی واقعہ سے ہوتی ہے، کہ انسائیکلوپیڈیا ببلکا کے بقول فلسطینی رامیسز سوئم کے زمانے میں تمام شمالی شام کو فتح کر چکے تھے، اور اغلب ہے کہ حطیوں کی طاقتور سلطنت انہی کے ہاتھوں برباد ہوئی، ان کے بعض لوگ

حطیوں کی طرف سے رامیسز دویم کے مقابلہ میں شریک جنگ رہے تھے، ان واقعات کی روشنی میں راون کو فلسطینی سلطان یقین کرنا چاہئے،

لفظ راون غالباً لبنان کی دوسری شکل ہے، ل اور ر قریب المخارج ہیں، اور ایک دوسرے سے بدل جاتے ہیں، یہی حال ب اور و کا ہے، لہذا لسانی قواعد کے تحت لبنان کو راون بن جانا بہت آسان ہے، اور لبنان ایک پہاڑ یا اس علاقہ کے حاکم کا نام تھا یا سمجھ لیا گیا،

ابوسمبل واقع نیوبیا میں پہاڑ کی چٹان کاٹ کر جو مندر تعمیر کیا گیا ہے، وہاں رامیسز کے کارنامے آج بھی تصویروں کی زبان سے سنے جاسکتے ہیں، کہیں قیدی قطار در قطار سامنے کھڑے ہیں، اور رامیسز کی خون آشام تلوار اپنی پیاس بجھا رہی ہے، اور کہیں اُن کے سر کے بال رامیسز پکڑے ہوئے ہے، حامی اور سردار سب حضور میں حاضر ہیں، لبنان کے حاکم ختا سر وکے دس سردار بھی موجود ہیں، یہ ہے صحیح تفسیر راون کے دس سروں کی،

راماین کے افسانے میں ایک اور اہم شخصیت والی کی ہے، جو جنوبی ہند میں بندروں کا بادشاہ ہے، سوگریو کے خوش کرنے کے لئے رامچندر جی والی کو قتل کر دیتے ہیں، یہ فعل اس سیرت کے خلاف ہے جو راماین میں رام کی دی گئی ہے، مگر یہاں اخلاقی پہلو سے بحث نہیں، البتہ یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ اصلی رامچندر (یعنی رامیسز) ایک فاتح اور ملک گیر سلطان تھا، نہ کہ ایک مقدس نیک سرشت رشی، دوسرے یہ بے سبب آزردن، اور بلاوجہ خون ناحق ناقابل یقین ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ خود افسانہ نگار حالات سے باخبر نہیں، اور اس کا سبب بجز اسکے کیا ہو سکتا تھا، کہ وہ ایک سُنی سنائی روایت کو نظم کر رہا تھا جس کے بعض واقعات نہ معلوم تھے اور نہ تحقیق ہو سکتے تھے،

نیل کے پہلے آبشار کے قریب فلی نام ایک جزیرہ واقع ہے، اس کے قریب کلب شاہ نامی شہر ہے جس کا مشہور مندر مستحکم چٹان کاٹ کر بنایا گیا ہے، یہاں سے آدھے میل پر اسی قسم کا ایک معبد اور ہے

جسکو بیت والی کہتے ہیں، یہ مندر رامیسز ثانی کی تعمیر ہے، جس کی دیواروں پر رامیسز نے نیوبیا والوں کے خلاف اپنی لڑائیوں کے کارنامے نقش کرادیئے ہیں، یہاں ایک تصویر میں دکھایا گیا ہے، کہ رامیسز کے سامنے نیوبیا والے تحفے اور نذریں پیش کررہے ہیں، جن میں بندر بھی شامل ہیں، بندروں کی موجودگی کچھ حیرت انگیز نہیں، کیونکہ مصر میں اس جانور کو مذہبی نقطۂ نظر سے کافی عظمت حاصل تھی، آشوریہ کے بعض آثار میں بھی ان کی تصاویر پائی گئی ہیں، مصر میں ابوسمبل کے مندر میں بھی لنگوروں کی تصویریں موجود ہیں، قیاس یہ قائم ہوتا ہے، کہ نیوبیا کے بوزنہ پرستوں سے رامیسز کی ایک جنگ ہوئی، یہ جنوبی لڑائی اور شام میں لنبان والی جنگ ایک سلسلہ میں مربوط ہو کر ایک افسانہ بن گئیں، رامائن نگار نے غالبًا والی کو سنسکرت "والا" سے ماخوذ سمجھ کر جس کے معنی دم ہیں، والی اور اس کی قوم کو بندر قرار دیدیا،

اسی طرح رامائن میں جو مقامات مذکور ہیں، اُن کی اصل بھی مصری معلوم ہوتی ہے، ہندوستان میں جس وقت یہ افسانہ پہنچا ہوگا، مقامات کے نام اصل مصری یا ان کی بگڑی ہوئی صورت ہوں گے، ہندی شاعر نے جب اس داستان کو ہندوستان کے ساتھ منسوب کرکے لکھنا شروع کیا، تو یہاں جو مقامات کچھ ملتے جلتے نام والے نظر آئے وہ مصری مقامات کی جگہ قائم کردیئے، اجودھیا جو ہندوستان میں ایک چھوٹا سا قصبہ تھا، ایگو دان کا قائم مقام ہوگیا، اور ایگو دان پلوٹارچ کے بقول شہر منفس کا دوسرا نام تھا، یہ ہندی نام تو افسانہ میں داخل ہوگیا، لیکن وہ حالات اور کیفیات جو مصری نام سے وابستہ تھیں، ہندوستانی مقام پر صادق نہ آئیں، لیکن ہندوستانی ذہنیت رامائن کے ترنم میں ایسی محو رہی، کہ اس تشتر گربگی کو محسوس نہ کرسکی، اصلی ایگو دان واقعی کبھی ایک زبردست بستی تھا، مس ایڈورڈس لکھتی ہے،

"آج وہ منفس کہاں ہے، جسکو ہیرو ڈوٹس، اسٹرابو اور عبداللطیف نے دیکھا تھا، آج وہ کھنڈر کہاں باقی ہیں، جو قرون وسطیٰ میں بھی اتنی دور تک پھیلے ہوئے تھے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک آدمی آدھے دن میں پہنچتا تھا، آج جہاں ابوالہول نصب ہے، کبھی یہیں تاہ کے مندر کا دروازہ تھا

راماین میں اجودھیا کی عظمت کو جو بیان دیا گیا ہے، وہ اجودھیا پر نہیں بلکہ ایگروان پر صادق آتا ہے

راماین اجودھیا کو نسل انسانی کے مورث منوجی کا بنایا ہوا بتاتی ہے، ظاہر ہے کہ ان بستیوں میں جو ہندستان

کے غلامیہ قوم نے آباد کیں، یا ان کا مرکز رہیں اجودھیا سے کہیں زیادہ قدیم مقامات موجود تھے، مثلاً تیج اور

گنگا کے درمیان ہستنا پور کی بستی جو آریوں کا مستقر رہ چکی تھی زیادہ حق رکھتی تھی، کہ منوجی کی تعمیر کہی جاتی، لیکن

یہ ناموزونیت ایک بدیسی داستان کو ہندی بنانے کا لازمی نتیجہ تھا، منفس کے متعلق قدیم مصری عقیدہ تھا، کہ اس

کو منا نے جو مصریوں کے نزدیک دنیا کا سب سے پہلا انسان تھا آباد کیا تھا، منفس یا ایگروان کی جگہ افسانے

میں اجودھیا کا نام داخل ہو گیا، لہذا عظمت اور قدامت کی نسبت وہ تمام روایات جو منفس کے متعلق صحیح تھیں

اب اجودھیا پر نہیں جچتیں

یہ چند نمونے مسٹر ونیکٹا رتنام کی تحقیقات کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مصنف

کا دعویٰ قطعی حد تک ثابت ہے، خود مصنف کہتا ہے کہ میں تاریخ کی عدالت میں حاضر اور فیصلہ کا منتظر

ہوں، مسٹر ونیکٹا رتنام کے نظریہ میں سب سے بڑی کمی یہ ہے، کہ رامائن کی کوئی جنگ کسی خاتون یا ملکہ

کو دشمن سے چھین لینے کی خاطر نہیں لڑی گئی، لیکن افسانوں کی نشو و نما واقعات کو ٹھکرا دیتی ہے، ایک

چھوٹے سے بیج سے جس طرح بڑھ کے بڑا برگد پیدا ہو سکتا ہے اسی طرح ذرا سی حقیقت چھوٹا سا واقعہ بے

سروپا داستانوں کی بنیاد بن جاتا ہے، حسن و عشق کی چاشنی کے بغیر داستان میں مزہ نہیں پیدا ہوتا،

بالخصوص تمام بڑے بڑے سورما جن کے فوجی کارنامے آنے والی نسلوں کی نگاہ میں اُن کو غیر فانی

بنا دیتے ہیں ایسے افسانوں کا مرکز بن جاتے ہیں، جن میں عورت کے حُسن کو دخل ضرور ہوتا ہے، واردات

محبت کی رنگینی پر عجوبہ آفرینی مستزاد ہو جاتی ہے، چنانچہ دنیا کے تمام مشہور افسانے اس کا ثبوت

ہو سکتے ہیں، اور مثالوں کو چھوڑ دیجئے، اُن افسانوں کو لیجئے جو دکن میں اہل بیت رسول کے

متعلق گڑھے گئے، مثلاً یہ ہے واقعۂ کربلا کا انتقام لینے کے لئے یزید اور محمد بن حنفیہ کو مقابل

کیا گیا ہے، اور زنگبار، فرنگ، حبش اور ترکستان کے بادشاہ ایک نہ ایک جانب سے شریک جنگ ہیں،
اسی طرح خاور نامہ میں حضرت علیؓ کو بہت سے جادوگر دل، مردم خوار قوموں، بلور، لوہے اور سونے
کے شہروں میں رہنے والوں سے لڑایا ہے، ان خاص مثالوں کو پیش کرنے سے یہ دکھانا مقصود ہے
کہ جب اہلبیت پاک کے متعلق انسان کی خیال آرائیاں اس حد تک پہنچ سکتی ہیں، تو ایک بھولے بسرے
عہد کے متعلق کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا، حضرت علیؓ اور یزید تو تاریخی عہد کے لوگ ہیں، اور ان کی نسبت یہ
دروغ گوئی اس قوم نے کی ہے، جو سیر اور تاریخ میں دنیا کی معلم اور بہترین مواد کی مالک تھی، رامچندر
تو ایک نامعلوم عہد کی موہوم ہستی تھا، جسکو افسانہ نگار کی بیرحم طبع آزمائی سے بچانے کے لئے نہ کوئی
سیرت نگار موجود تھا، نہ مورخ،

مجمع الادب اسمٰعیل کالج جوگیشوری

انعامی مقابلہ

اسمٰعیل کالج میں ۷ رفروری کو جو "یوم دلی" منایا گیا تھا، اوسکی کی دلچسپی صورت سے مستقل و مفید بنانیکے لئے مجمع الادب نے یہ طے کیا ہے کہ ملک کے ادیبوں، انشا پردازوں اور مضمون نگاروں سے درخواست کیجائے کہ وہ مندرجۂ ذیل موضوع پر اظہار خیال فرمائیں، جو مضامین سب سے اچھے سمجھے جائیں گے، ان کیلئے معقول انعامات پیش کئے جائینگے، انشا پردازوں کے علاوہ تمام طلبہ سے بھی درخواست کیجاتی ہے کہ وہ اس موضوع پر لکھیں، طلبہ کے مضامین میں سے بھی سب سے اچھے دو مضامین میں اول کو ایک سونے کا اور دوسرے کو چاندی کا تمغہ دیا جائیگا، موصولہ مضامین میں کچھ چند مضامین ایک کتاب کی صورت میں شائع کئے جائینگے، مضامین مندرجۂ ذیل پتہ پر یکم جولائی ۱۹۳۷ء تک پہنچ جانا چاہئیں، طلبہ کو اپنے مضامین اپنے کالج یا اسکول کے افسر کے ذریعہ روانہ کرنا چاہئیں، کوئی ایسا مضمون جو کہیں پڑھا جا چکا ہو، روانہ نہ کیا جائے، (۱) اردو ادب و شاعری میں دلی کا درجہ (۲) ولی سے پہلے گجرات، دکن اور شمالی ہند میں اردو کا درجہ (۳) دلی کی لسانی، ادبی، سماجی اور شعری خدمات (۴) موجودہ اردو ادبیات پر دلی کا اثر۔ مجمع الادب اسمٰعیل کالج جوگیشوری، نجیب اشرف ندوی صدر شعبۂ اردو

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر معتضد ولی الرحمٰن صاحب ایم اے

(۲)

۲ - ذات کی ماہیت،

اُس ذات کے متعلق ہمارا کیا خیال ہے، جس کی عِلّی توانائی یہاں کام کر رہی ہے، ؟ کیا یہ کہیں سے بھی نہیں آتی، ؟ کیا اسکی کوئی تاریخ نہیں. جو اس کی موجودہ فعلیت کو متعین کرتی ہے، ؟ کیا یہ ایسی ناقابلِ احصار قابلیت کی حامل ہے، جو طرقِ عمل کا انتخاب یا ان کا رد اس طرح کرتی ہے کہ اسکے ارتقاء کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے، ؟ اختیاریت ذات کے عدم تسلسل کے اقرار پر مجبور ہے، اس کے نزدیک ذات بذاتِ خود ایک حقیقی علت ہے، یہ اصلی معنوں میں فعلیت کو پیدا کرتی ہے، کیا ذات کی یہ تاویل قابلِ قبول ہے، ؟ اسی سوال کا ہم کو جواب دینا ہے، یہ تو یقینی ہے کہ ذات خود اپنے آپ کو پیدا نہیں کرتی، اور یہ سب تسلیم کریں گے، کہ یہ اپنی ہستی کے اوائل میں کسی فعلیت کو بھی پیدا نہیں کیا کرتی، نہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی شہادت ہے، کہ اپنی ذی شعور زندگی کی ابتداء میں یا وجود میں آنے سے قبل ذات یہ سوچنے کےلئے سر جھکا کر بیٹھتی ہے، کہ وہ کس قسم کی ذات بننا پسند کرے گی، جب اس میں شعور بیدار ہوتا ہے، تو یہ پہلے ہی سے ایسی فعلیتوں کا مجموعہ ہوتی ہے، جو ایک مخصوص راستے میں بہت تیزی کے ساتھ حرکت کر رہا ہے، جہاں تک ہم معلوم کر سکتے ہیں، وہ ایک خاص

وقت میں شروع ہوتی ہے، ایک مخصوص جسمانی ونفسی فطرت سے بہرہ ور ہوتی ہے، ایک مخصوص ماحول میں داخل ہوتی ہے، اور ایک خاص تعلیم وتربیت کا نقش قبول کرتی ہے، جن تصورات یا نصب العینوں کی وجہ سے وہ بعد میں ابتدائی حالت میں ترمیم کرتی ہے، یا اون سے تجاوز کرتی ہے، ان کا سرچشمہ بھی اس عمرانی تاریخی زندگی میں ہوتا ہے، جسے وہ اختیار کرتی ہے، تم نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے سوال کرو، کہ "اگر میں کسی اور زمانہ اور ملک میں، اور کسی والدین سے پیدا ہوتا، اگر میں مخالف جنس کا ہوتا، اگر میرے جسمانی وذہنی خصائص فطرۃً مختلف ہوتے اور اگر میری عقلی، اخلاقی اور مذہبی تربیت کسی اور طرح کی ہوتی، تو میری ذات کیسی ہوتی؟" اسکے بعد پھر اپنے آپ سے پوچھو کہ "میں یہ دوسری ذات کیوں نہیں؟" تو اس کا واحد جواب یہ ہوگا، کہ جو ذات کہ اب میری ہے، وہ مختلف حالات کا نتیجہ ہے،

ذہنی زندگی میں تعین کے اس تخیل کو داخل کرنے کی مخالفت زیادہ تر اس بنا پر کیجاتی ہے، کہ اس طرح عالم شعور میں تعین کی وہ قسم منتقل ہو جاتی ہے، جو میکانکی تعامل میں بروئے کار آتی ہے، اس خیال کو تسلیم کر لینے سے ذات ایک منفعل نقطہ بن جاتی ہے، جو خارجی اعمال کو آگے کی طرف بڑھاتا ہے، لیکن یہ خیال شخصیت کی زندگی کے تمام پیچیدہ باطنی اعمال اور تعمیری فعلیتوں کے مفہوم کو کلیۃً کھو دیتا ہے، تفکر اور خود تنقیدی، خود رہنمائی، اور ذات کی اخلاقی جد وجہد کی ترقی انسانی آزادی کے لازمی شرائط ہیں، اور یہ آزادی معقول بصیرت ہیں، اور اس کی وجہ سے تعین کا نتیجہ اور ذات کی رکن ہوتی ہے، یہ اپنے تجربوں، اپنے خیالات، اور اپنے علم سے مرکب ہوتی ہے، ہمارا دعوی صرف اسقدر ہے کہ یہ ترکیب کسی قیاسی اور بے اصول طریقے سے نہیں ہوتی، بلکہ واقعہ یہ ہے، کہ چونکہ عمل علم لازماً معقول، منتظم، اور ضروری عمل ہوتا ہے، اسلئے انسانی آزادی جبر کی صورت میں متصور کیجانی چاہئے، درخت کو سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی نشو ونما میں مجبور محض ہے لیکن

اس وجہ سے ہم ان کو منفعل کچھ نہ کرنے والا اور محض خارجی قوتوں کا نتیجہ نہیں سمجھتے، درخت اپنی زندگی اور نشو ونما کے تمام اعمال کی آلی وحدت ہوتا ہے، اور جب یہ تعمیری کام کرنا بند کر دیتا ہے، تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح ہم حیوان کے متعلق بھی یہ سمجھتے ہیں، کہ وہ اپنی فعلیت سے علحدہ ہو کر نہیں، بلکہ خود اپنے حیرت انگیز جبلی اعمال کی وجہ سے معین ہوتا ہے، ذات بھی اپنی اُن تمام فعلیتوں کی آلی وحدت ہے، جو حیوانی زندگی کی فعلیتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ بھرپور اور متنوع ہوتی ہیں، اور جس طرح غیر آلی فطرت کے میکانکی ضوابط نباتی زندگی، اور اس زندگی کے ضوابط عالم حیوانی کی پیچیدہ تر زندگی کے لئے غیر موزوں ہیں، اسی طرح ہمارا خیال ہے، کہ ذی شعور اور استدلال کرنے والی ذات کی فعلیتوں کے اظہار کے لئے اور زیادہ پیچیدہ ضوابط کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ ذات ہستی کے ان اولی مدارج سے بہت بلند ہے، اگر ذات کے اندر تعاقبات واقعات کے لئے "ضروری" ہے، لازمی ہے، تو "یہ ضروری" ہے، وہ نہیں، جو اُن تعاقبات کی یکسانیت کو ظاہر کرتا ہے، جن سے ایک مادی جسم دوسرے مادی جسم کے ساتھ ٹکرانے سے حرکت کرتا ہے، یہ محض میکانکی قوتوں کا مجموعہ نہیں، بلکہ اپنے اسی اظہارات میں یہ نصب العینوں اور تصورات سے معین ہوتا ہے، اور اس تعین میں فعل کی علت غائی، اس کی علت فاعلی بھی ہوتی ہے، ان تخیلات قیمت کی کشش کی وجہ سے، جو اغراض کو تحدی کرتے ہیں، اور ہم کو اپنا فرمانبردار بناتے ہیں، یہ تعین کائنات میں وہ واحد مقام ہے، جہاں ہم نہایت وضاحت کیساتھ غائی اور فاعلی تعلیل کی عینیت مشاہدہ کرتے ہیں،

۷۔ غائی اور فاعلی تعلیل کا اتحاد،

مختصر یہ کہ ہماری تعین ان غایتوں کے تصورات سے ہو سکتی ہے، جو خود اپنے تحقق کے محرکات بھی ہوتی ہیں، تصورات فاعلی کی قوتیں بھی ہوتے ہیں، یہی واقعہ ہماری آزادی کا حقیقی منبع ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عقل میں تجاوز کرنے کا ایک اصلی عنصر شامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم اس وقت کی غلامی سے خلاصی پاتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ غلامی سے خلاصی پانے کا یہی انسانی طریقہ ہے، لیکن اختیاریت کا حامی یہ فرض کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے، کہ ہر وہ چیز جو غائی تعلیل کے دائرے کے اندر ہوتی ہے، وہ علت فاعلی کے دائرے سے خارج ہوتی ہے، یہی فرض آزادی اور وجوب کے متعلق تفکر کی مقبول عام ثنویت کا سرچشمہ ہے، یہ کبھی نہیں ہوتا کہ ایک آیندہ واقعہ من حیث ہی موجود اور گذشتہ واقعات سے علحدہ ہو کر علۃ فاعلی ہو جائے، یہ خصوصیت صرف آیندہ واقعے کے موجودہ استحضار میں ہوتی ہے، "غایت" اگر کوئی اثر کر سکتی ہے، تو صرف اس طرح کہ وہ موجودہ تصور بن جائے اور یہ تصور مقدم عناصر سے تعمیر کیا جاتا ہے، انسان امکانی ضرورت کے لئے کب پس انداز کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف اس وقت جب اس ضرورت کا خیال پیدا ہوتا ہے، اور یہ بھی اتنا ہی یقینی ہے کہ اس کا یہ موجودہ خیال زمانہ گذشتہ کی پیداوار ہے، اگر ہم کسی جوان آدمی میں کسی ایسے نصب العین کے ذریعہ سے بلند نظری پیدا کرنا چاہتے ہیں، جو زمانہ آیندہ میں قابلِ حصول ہوگا، تو اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ نصب العین اسکی موجودہ حالتِ نفس سے متعلق ہو، مقدم عمل اخلاقی تعین کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا میکانکی عمل کے لئے، اگر ایک انجن کو بوسٹن سے نیویارک کی طرف ایسی طاقت سے حرکت دینے کی کوشش کرو، جو نیویارک میں پیدا کی گئی ہے، اور کسی طرح بوسٹن میں منتقل نہیں کی گئی، تو یہ کوشش جسقدر مہمل ہو گی، اسی قدر مہمل یہ خیال ہوگا، کہ زمانہ آیندہ کا کوئی واقعہ اس واقعے پر مقدم تصور کی حیثیت سے داخل ہوئے بغیر فعل پر اثر کرے گا، شعور کی ادنی سطح پر اس تمام عمل کی مثال عضوی جبلتوں کی کارفرمائی میں ملتی ہے، بچوں کی پرورش گھونسلہ بنانے کی علت فرض کیجاتی ہے، لیکن یہ علت صرف اسی وقت کام کرتی ہے، جب ان عضوی اعمال میں مستحضر ہوتی ہے، جو رفتہ رفتہ گھونسلہ بنانے کی فعلیت کو معین کرتے ہیں،

اب اگر کہا جائے کہ ذات کی زندگی کو اس کی صحیح آفرینش سے مسلسل فرض کرنے سے انسان فطرت کا جزو بن جاتا ہے، تو اس کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے، کہ ایسی صورت میں ہمیں فطرت کے تخیل کو اتنا بھرپور بنانا پڑے گا، کہ روحانی اعمال کی گنجایش نکل آئے۔ اس طرح ذات منفعل نہیں ہو جاتی، بلکہ متمول ہو جاتی ہے[1]، اس میں تو شبہہ ہی نہیں کہ انسان کے خود اپنی رہنمائی میں زندگی بسر کرنے، اپنے ہیجان اور اشتہا پر متصرف ہونے اور صداقت اور نیکی کی خواہش کرنے کی وقعت اور قیمت میں اس عقیدے سے کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، کہ یہ تمام اعمال قانون کی گرفت میں ہیں، برعکس اس کے اپنی زندگی کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھنا اپنی وقعت کو کم کرنا ہے،

یہ ملحوظ رہنا چاہئے، کہ آزادی کا مسئلہ کم از کم عوام کے تفکر میں ارادے کی ماہیت کے متعلق غلط خیال کی وجہ سے پیچیدہ ہو جاتا ہے، اکثر فرض کیا جاتا ہے کہ ارادہ ایک قوت ہے، جو ذات سے بالکل علحدہ ہے، اور یہ کہ یہ صرف انتخاب سے بروے کار آتا ہے، اور اس کے بعد ساکن و جامد ہو جاتا ہے، یہ گویا ایک ڈائنمو ہے، جو عندالضرورت استعمال کے لئے تیار رکھا جاتا ہے، ارادے کی ماہیت و نفسیت کے متعلق یہ عقیدہ ناقابلِ قبول ہے، ارادہ ان معنوں میں ذات کا ممیز حصہ نہیں

---

[1] ذہنی اور جسمانی اعمال کے تعلق کے مسئلے پر یہاں چند الفاظ کتنا موزوں ہوں گے، اس پر تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں ہے، میں صرف اپنے عقیدے کو مختصرا بیان کرتا ہوں، میرا خیال ہے کہ ذات یعنی ذہن اور جسم ایسے معنوں میں ایک وحدت ہیں، جو کسی ثنوی نظریے کی سمجھ میں نہیں آسکتے، تمام شعوری حالتیں جسمانی اعمال بھی ہوتی ہیں، اگر ہمارا موجودہ علم مناسب ہوتا، تو ہم تمام ذہنی تجربوں کو طبیعی ضوابط کی شکل میں اور اس کے برعکس بیان کر سکتے، لیکن جس علم سے یہ ممکن ہوتا، وہی علم ہماری ذہنی زندگی کے طبیعی ضوابط کو نہایت وضاحت کے ساتھ ان تمام ضوابط سے تمیز کرتا، جن میں دوسری قسم کی ہیئتوں یا اشیا کی کیفیتوں کو بیان کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ ان کے معنون اور ان کی قیمت کو کلیۃً ان شعوری تجربات کے ذریعے

جن میں کہ متقدمین ماہرین نفسیات اسکو بیان کرتے تھے، ہمارے نزدیک بحالت کوشش فعل حقیقت میں یہ ذی فکر و ذی حیثیت ذات ہے، چنانچہ اس وقت کا میرا ارادہ میری مجموعی ذات ہے جو میرے تمام میلانات عادات حسیات، خواہشات، مقاصد اور نصب العینوں کو حاوی ہے اور جو اسوقت اپنا اظہار یعنی کوشش اور جد و جہد میں کر رہی ہے،

۸- اختیاریت اور عمل (Practice.) کی مغایرت،

اختیاریت پر شاید سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ حقیقۃً موجودہ مسائل عمل کے سامنے بالکل بے بس ثابت ہوتی ہے، اگر نظری مقاصد ذات کو مسلسل اور لازماً متعین کرنے کی پرزور تائید کرتے ہیں تو عملی مقاصد کی تائید بھی اتنی ہی پرزور ہے، اگر اخلاقی زندگی مسلسل ترقی پذیر نہیں، اگر اس کے ماضی اور حال کے تعلق میں کوئی انقطاع ہے، تو ایک اچھا درخت بُرا پھل لا سکتا ہے، اور ہم اخلاقی زندگی میں جو سے گندم اور گندم سے جو کی توقع رکھ سکتے ہیں، آج اچھا بیج بونا کل کو بیکار ثابت ہو سکتا ہے، بدی اس خیال سے کیجا سکتی ہے کہ اس سے کوئی حرج واقع نہ ہوگا،

(بقیہ حاشیہ ص ۲۷۱) کے اندر رہتا تھا جن کا ایک اظہار طبیعی اعمال کی صورت میں ہوتا ہے، (مصنف) یہ بہت پرانی اور فلسفیوں کے لئے بہت پریشان کن بحث ہے، زمانہ حال میں پلانک کے نظریہ مقادیر (Quantum Theory.) اور آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت نے اسکی شکل ذرا بدل دی ہے، یعنی طبیعیات میں مادے کی ماہیت بھی اب وہ نہیں رہی، جو پہلے سمجھی جاتی تھی، فعلیاتی نفسیات (Physiological psychology) اور خصوصاً انسان نما مشینوں (Robots) کی ایجاد نے دوسری طرف نفس کے وجود کو مشتبہ کر دیا ہے، غرض یہ عجیب تماشا ہے کہ بقول برٹرنڈ رسل مادی علوم میں تو مادہ غائب ہو رہا ہے، اور نفسی علوم میں نفس، یا یوں کہو کہ مادہ اور نفس کی تفریق مٹ رہی ہے، نفس وجسم کے تعلق کے متعلق ایک نئے خیال کے لئے دیکھو رسالہ مانسٹ بابت جنوری ۱۹۳۰ء میں مورٹن پرنس کا مضمون On mind Body Problem and The survival of Consciousness After death. (مترجم)

اس طرح انسانی عمل کی توقعات اور اس عمل پر اعتماد کا خاتمہ ہو جاتا ہے، ثواب و عذاب، جوانوں کی تربیت، تعلیم، حکومت، عمرانی کوشش، ذمہ داری، یہ سب کے سب ایک پوشیدہ وجہ، تعیین پر مبنی ہیں، اگر سزا کا کوئی اخلاقی جواز ہے، تو صرف یہ کہ یہ بدکار کی اصلاح کی خاطر ہوتی ہے، یا دوسروں کو بدکاری سے روکنے کے لئے دونوں صورتوں میں آیندہ فعل کی تعیین اس کا مقصد ہے، لیکن اگر خطا وصواب میں سے کسی ایک کے انتخاب کے دوسرے موقع پر بدکار اپنی اُس آزادی سے فائدہ اٹھائے، جو اس کے ماضی سے بالکل منقطع ہے، تو سزا بالکل بے اثر رہ سکتی ہے، اور اس حالت میں وہ ایک بے ضرورت اور مبنی بر شرارت ایذا رسانی بن جاتی ہے، یہ بے اثری ان تمام اشخاص تک پھیل سکتی ہے، جن کو اس سے متاثر کرنا مقصود تھا، یہ صحیح ہے کہ سزا اکثر بے اثر ہو سکتی ہے، اور فی الواقع ہوتی ہے، لیکن جبریت کا اصرار ہے کہ اس کی بھی ایک وجہ ہے، ہماری شان کے شایان یہ بات ہے کہ ہم اس وجہ کو معلوم کرنے کیلئے ہاتھ پاؤں ماریں کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں، اور ناکامی کو انسانی فطرت کی ستم ظریفی کی طرف منسوب کریں، اس میں کسے شبہ ہو سکتا ہے کہ خاندان، مدرسے، اور سلطنت میں بدکاروں کے خلاف کارروائی کی تمام ترقی جبریت کے اصول کے استعمال کا نتیجہ ہے، جس کے مطابق فعل کا کوئی جزو بھی بلا وجہ نہیں ہوتا، اعمال پر اثر ڈالنے کی حد تک جزار کا حال بالکل وہی ہے، جو سزا کا ہے، جزار کی موثریت بھی تمام تر اصول جبریت ہی پر مشروط ہے،

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ والدین بچے کے لئے بہترین ماحول کیوں تلاش کرتے ہیں،؟ وہ اسکی صحت کی طرف سے فکر مند کیوں ہوتے ہیں،؟ وہ تعلیم و تربیت کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں،؟ ظاہر ہے کہ محض اس وجہ سے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہر سبب اسکی تشکیل پذیر زندگی کو خاص شکل دینے پر قادر ہے، لیکن اگر آزادی، عدم تعیین اور اختیاریت کے ہم معنی ہے، تو پھر اہم ترین فیصلے کے وقت یہ تمام احتیاطیں بیکار ثابت ہوں گی، حکومت کی تمام مشین کے پس پردہ جو نظریہ کام کرتا ہے، وہ

یہ ہے کہ انسان کی تعیین محرکات سے ہوتی ہے، لہٰذا امید و بیم اور جزا و سزا کے مناسب محرکات مہیا کئے جانے چاہئیں، عمرانی جد و جہد کے لئے کوئی چیز اتنی مہلک نہیں، جتنا یہ عام مسلّم اور معمول بہ عقیدہ کہ انسان ایسے افعال صادر کر سکتا ہو، جن کی کوئی علت نہیں، جو ترقی پذیر ذہنی و اخلاقی زندگی کے تسلسل کو توڑتے ہیں، اور جو عمرانی تاریخی واقعات کے عظیم الشان نظام سے بے تعلق ہوتے ہیں اختیاریت کو بالعموم ذمہ داری کے خیال سے قبول کیا جاتا ہے، لیکن اس میں ذمہ داری کا حال کچھ بہتر نہیں، بہ قول ہارٹ مان اگر کوئی شخص اس آزاد ارادے کا مالک ہو، جس کی اختیاریت قائل ہے، تو سوسائٹی اس کے ساتھ وہی سلوک کرے گی، جو وہ مجنونوں کے ساتھ کرتی ہے، کیونکہ اس کے افعال بھی سزا اور اخلاقی ترغیب کے دائرے سے اتنے ہی خارج ہوں گے، یہ قول مبالغہ آمیز نہیں، اس قسم کے آزاد ارادے کے امکانات کے سامنے ہر شخص لرزہ بر اندام ہو گا۔ اختیاریت کا قائل خود پر زور الفاظ میں اصرار کرتا ہے کہ افعال بلا محرک اور غیر معین ہوتے ہیں، جو ذہنی زندگی کے تسلسل میں اچانک رونما ہوتے ہیں، اور اس میں وہ بالکل نئی تخلیق دکھائی دیتے ہیں، اس دعوے کے مطابق وہ توجیہ و تعریف سے کلیتہً خارج ہو جاتے ہیں، کسے معلوم ہے کہ ایک غیر مجبور اور غیر معین ارادہ عمل و سیرت میں کیا کیا انقلاب پیدا کرے گا، ؟ تم اپنے ایک دوست کے خلوص، اس کی عزت اور ہمدردی پر کامل اعتماد رکھتے ہو، اگر اس دوست پر ایسے آزاد ارادے کا دورہ پڑے، تو وہ بدترین دشمن بن جا سکتا ہے، اپنے دوستوں اور ہم نشینوں پر ہمارا اعتماد اسی یقین پر مبنی ہے، کہ ان کا عمل کسی لحاظ سے بھی قیاسی یا اتفاقی نہیں ہوتا، بلکہ یہ ان کی سیرت کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، مختصر یہ کہ اختیاریت اخلاقی شعائر اور اخلاقی نظام کو صرف اس طرح محفوظ رکھ سکتی ہے، کہ وہ اس عقیدے کو نظری میدان کے بعض عام مسائل تک محدود کر دے، لیکن جب نظریے سے عمل کے معینی واقعات کی توجیہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، تو یہ گونگا اور بیکار ہو جاتا ہے، عملاً آزاد ارادے کا حامی اکثر قائلینِ جبریت میں سے سب سے

زیادہ مجبور ہوا کرتا ہے،

اگر ہم اخلاقی مدد اور ترقی کے منبع کو تلاش کرتے ہیں، تو ہم اپنے آپ کو باور کرا سکتے ہیں، کہ وہ یا تو موجودہ محرکات کی تقویت میں ہوتا ہے، یا ان محرکات کے بجائے نئے اور موثر محرکات کی تعمیر میں، لیکن ان دونوں اعمال میں سے کوئی بھی مقدمات سے غیر متعلق فرض نہیں کیا جا سکتا، ان سے جو تغیر واقع ہوتا ہے، وہ مناسب طور پر کامیاب اثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، عام طور پر یوں کہنا چاہئے کہ ہم اپنی اخلاقی مدد اور بصیرت کو بعض مخصوص علتوں کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، ہماری ابتدائی تربیت یا تجربات کے تلخ سبق، یا کسی شریف شخصیت کے اثر میں سے کوئی بھی نہ بار آور نہ بن سکتا ہے جسکا پھل ہم ممنونیت کیساتھ بعد میں کھاتے ہیں، اس میں شبہہ نہیں کہ بعض مثالوں میں اخلاقی قوت کے حصول کا ان منافع تک کھوج نہیں لگایا جا سکتا، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان کی کوئی علت نہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ بعض غیر اہم تجربات ایک عقیدے کی پرورش کرتے ہیں، اور غیر شعوری بصیرتیں اس کی آبیاری کرتی ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دن یہ عقیدہ پھوٹ کر ایک مصمم ارادے کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور تمام زندگی کی رو بدل دیتا ہے، زیادہ غور و تامل سے معلوم ہوتا ہے، کہ اخلاقی قوت کے ایسے اضافے عسیر التحلیل تو ضرور ہوتے ہیں، لیکن گذشتہ تجربے سے بے تعلق نہیں ہوتے، اسکے برعکس گذشتہ تجربے سے ان کے تعلقات اتنے مقامات پر روشن ہوتے ہین کہ ہم ان کو ان تجربات کا سلسلہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں،

لیکن اگر ہم اس عقیدے سے انکار کر دیں، کہ ارادہ اپنے انتخابات میں تعین کرنے والے حالات سے آزاد ہے، تو کیا آزادی کے تخیل کی اہمیت باقی رہتی ہے، ؟ یا کیا ہم کو اس نصب العین کو ترک کر دینا پڑتا ہے، جو ہمیشہ سے نوعِ انسان کے اعلیٰ مقاصد کا جامع ہے،

(باقی)

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خاں طاہر مرحوم

(۴)

کاتب الحروف کی حیات مستعار کی مختصر سرگذشت

سطور بالا میں جو کچھ میں نے بیان کیا، وہ تو میری زندگی کی یکرخی تصویر ہے جب اس تصویر کے دوسرے رُخ پر نگاہ ڈالتا ہون تو مجھ کو بجز تاریکی کے کوئی شے نظر نہیں آتی، ؎

شکل ہستی و عدم آئینہ دکھلا تا ہے
کہ ادھر سب نظر آتا ہے ادھر کچھ بھی نہیں

البتہ اس حیاتِ دور روزہ کی طول طویل شبہاے سیہ بختی میں کبھی کبھی روشنیٔ امید کی ایک خفیف جھلک بھی نظر آجایا کرتی ہے، مگر اس کی مثال ایسی ہے جیسے صحرا میں کسی ندی کے کنارہ پر کرم شب تاب کی چمک جو نہ رہنمائی کا کام دے سکتی ہے، اور نہ باعثِ تسکینِ خاطر ہوسکتی ہو، میری زندگی کی تمامتر سرگذشت تو مختصراً صرف ان دو شعروں میں پوشیدہ ہے، ؎

مختصر حال چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اس کو خواب نہیں

آگ تھے ابتداے عشق میں ہم
اب ہوے خاک انتہا ہے یہ

لیکن اگر تکمیل سوانح اور درس عبرت کے لئے اسکی تفصیل کی بھی کسی قدر ضرورت ہو، تو

اس میں بھی کچھ عذر نہیں سُن لیجئے،

حلیہ | میں خلقۃً نحیف الجثہ، احمر اللون، اخف اللحیہ، کشادہ چشم و ابرو اور متوسط القامت واقع ہوا ہوں اور جب سے میں نے اس سرائے ناپائدار ہستی میں قدم رکھا، اسی وقت سے نحافت جسمانی اور پیش آنے والے امراض و اسقام کے آثار نمایاں ہونے لگے، پھر جب میں سنِ شعور کو پہنچا تو ایک قلیل مدت تک اگرچہ میری صحت معمولی طور پر اچھی رہی، تاہم تقریباً سولہ برس کی عمر ہی سے مجھ کو نوازل اور بعض امراض مزمنہ سے سابقہ پڑا، جس سے بہ مشکل جانبری نصیب ہوئی، مگر نجات حاصل نہیں ہوئی، اس سلسلۂ علالت نے مجھ کو زمانہ دراز تک تعلیم کی برکتوں سے محروم رکھا، اور درس و تدریس سے ایک گونہ بیگانگی رہی، اگر میری والدہ محترمہ کی علمی قابلیت اور دینداری اور حضرت والد مرحوم کا فیض صحبت و تربیت اور میرے محترم استاد مولنا محمد احسن صاحب بلگرامی رحمۃ اللہ علیہ کا معجز نما طریقۂ تعلیم میری دستگیری اور رہنمائی نہ کرتا، تو شاید عمر بھر میں جاہل محض رہتا، یہ والدین او استاذ مرحوم ہی کے انفاس گرامی کی برکت تھی، کہ باوجود گوناگوں امراض و وحشت خاطر کے کچھ نہ کچھ سلسلۂ تعلیم جاری رہا، اور ان کے اسوۂ حسنہ کی روشن عملی مثال نے مجھ کو ضلالت و جہالت محض کے ظلمات سے باہر نکالا، جب میں نے عنفوانِ شباب کی منزل میں پہلا قدم رکھا، اور عربی و فارسی میں کسی قدر شُد بُد ہو گئی، تو میں نے ہر طرف سے اپنے کو سامانِ عیش و تنعم اور برگ و ساز جاہ و تحشّم کے گھرا ہوا پایا، دنیا کے نشۂ عروج و اقبال کا اقتضار تو عام طور پر یہی ہوا کرتا ہے، کہ آدمی دین و دنیا کے فرائض سے بے خبر ہو کر یا تو ہمہ تن عیش پرست اور راحت پسند بن جاتا ہے، اور فسق و فجور و لہو و لعب اور شغل چنگ و چغانہ اور دور بادہ و پیمانہ میں شب و روز مشغول و منہمک رہا یا دنیا طلبی کے حرص و ہوس سے مغلوب ہو کر بلا اندیشۂ جائز و ناجائز ہمہ وقت اکتسابِ زر و سیم و جمعِ مال و متاع و استحصالِ مراتب عزو جاہ میں اپنی عمر کا گرانقدر حصہ ضائع کیا کرتا ہے،

عَلَى الْمَرْءِ عَارٌ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدَهُ وَأَنْتَ يَا مَغْرُورُ مُجْتَمِعٌ لِلْخِزْيِ

نہ ہوش دین کے باقی رہو نہ دنیا کے ترسی نگاہ مصیبت کا سامنا ٹھہری

بہت ممکن تھا کہ میرا بھی یہی حال ہوتا، کیونکہ ارباب حرص وآز اور پرستاران جاہ وہوس کی نگاہ ظاہر بین میں کمالِ انسانی اور سعادت بشری کا یہی منتہا اور آخری سرحد ہے، لیکن حضرت والد مرحوم (جن کا قلب مصفا انوار ایمان سے روشن اور جن کی نگاہ دقیقہ رس فطرت انسانی کی رمز شناس تھی) مجھ کو ہمیشہ اپنے قول وعمل سے متنبہ کرتے رہتے تھے، کہ خبردار کبھی مال ومتاع اور جاہ وحشمت دنیوی کے دام فریب میں نہ آنا، حُبُّ الدُّنیا رأسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ دنیا کی محبت تمام گناہوں اور غلط کاریوں کی اصل وبنیاد ہے،

غافل مشو ز عشوۂ دنیا کہ ایں عجوز مکارہ می نشیند ومحتالہ می رود

طلب آخرت کے ساتھ تو انسان مال ومتاع اور عز وجاہ دنیا بھی حاصل کر سکتا ہے، اگر طلب دنیا کے ساتھ نعیم آخرت اور روح وریحان رضاے الٰہی کبھی ہاتھ نہیں آیا کرتی، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے، إِنَّ اللّٰهَ يُعْطِي الدُّنْيَا عَلَى نِيَّةِ الْآخِرَةِ وَلَا يُعْطِي الْآخِرَةَ عَلَى نِيَّةِ الدُّنْيَا ؎

عزیزے کہ از درگہش سرتبافت بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت،

انسان کی سعادت وشرف کا مدار تزکیۂ روح، تہذیب باطن، محاسن اخلاق، اتباع حق اور طلب رضاے الٰہی پر ہے، نہ چند روزہ دنیاے فانی کے جاہ وثروت ومال ومنال پر، عیاذاً باللہ تعالیٰ إِيَّاكَ وَالتَّنَعُّمَ فَإِنَّ اللّٰهَ لَيْسُوا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ، ؎

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے،

دولت دنیا کہ تمنا کند باکہ وفا کرد کہ با ما کند

ان کلمات حکمت آیات و ارشادات سراپا ہدایات پر غور کرنے اور عمل کرنے کی طرف اس زمانۂ عنوان شباب اور ایامِ غفلت و بے نیازی میں توکیا توجہ ہو سکتی تھی، مگر یہ ضرور ہے، کہ حضرت والد مرحوم کے مواعظ و نصائح دل پر کچھ نہ کچھ اثر کئے بغیر نہ رہے، رفتہ رفتہ جس قدر عمر بڑھتی جاتی تھی، اسی قدر نئے نئے سامان دلکشی اور خود آشوبی کے طبیعت پر مستولی اور محیط ہوتے جاتے تھے، یہاں تک کہ جوانی کا پوری قوت کیساتھ آغاز ہوا، اور جوش شباب کے دلفریب جذبات نے جنکو الشَّبابُ شُعبَةٌ مِنَ الجنون کہا جاتا ہے، دل و دماغ پر ہر طرف سے ہجوم کیا، تو تمناہاے خفیہ نے نمایاں ہو کر دل میں چٹکیاں لینی شروع کیں اور زبان سے بے اختیار نکلنے لگا، ؎

راست می گویم و از گفتۂ خود دلشادم بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

چونکہ قدرت نے پہلے ہی سے میری طبیعت کو مہر و محبت کے آب و گل سے سرشت کیا تھا،

معمارِ وجود ارنہ زدے رنگ تو از حسن در آب محبت گل آدم کہ سرشتے،

اسلئے اس بادِ تند کے پرزور جھونکوں نے میرے معصوم صفت دل کے نازک پودے کو متحرک زیر و زبر کرنا شروع کردیا، کریشۃ بارض فلاۃ یقلبہا الریاح ظہراً لبطن، ؎

صد نخل آرزو بہ دلم جا گرفتہ بود طوفان عشق آمد و بر یک دگر شکست

کچھ دنوں تک یہ سوزِ نہانی اخگر زیرِ خاکستر کی طرح دل میں دبا رہا، لیکن جب سوز و گداز نے دل میں تپش پیدا کی، تو یہ نالہاے زیر لبی تسلی بخش نہ رہے، اور "نی کل واد یہیمون" کی بیاباں گردی اور حسن و عشق کی داستان میں عمر کا ایک معتد بہ حصہ برباد ہوگیا،

نالہاے خانگی دل را تسلی بخش نیست در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

اگرچہ میں نہ کوئی اصطلاحی شاعر ہوں اور نہ سخن طرازی و سخن سنجی کا مجھکو دعوی ہے، لیکن بدو فطرت سے طبع موزوں ضرور ساتھ لایا ہوں، اور ابتداے تعلیم سے ذوق شعر و سخن کی چاشنی کا لذت آشنا

ہوں، اسلئے برسوں کوچۂ شعر و سخن کی خاک اُڑانا پڑی، اور جلوت و خلوت میں شب و روز اسی سوز و ساز اور ہجوم ناز و عرض نیاز میں زندگی کے دن کاٹنا پڑے، ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال — جلوت ہی ہم سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

گلستاں کے باب پنجم میں حضرت سعدی شیرازی رح فرماتے ہیں، کہ "در ایام جوانی چنانکہ افتد ودانی باشاہدے سیرے وسرے داشتم" خیر وہاں تو ایک شاہد تھا، مگر جب اس صنم کدۂ ہستی کو آنکھ کھول کر دیکھا، تو ہر طرف ایک عجیب و غریب عالم حیرت نظر آیا، ایک دل ہزار آرزو، ایک سر ہزار سودا، ایک صید ہزاروں صیاد، ایک جان فگار اور ہزاروں ناوک سوفار ؎

کہاں کہاں میں بچاؤں کہاں کہاں دیکھوں — ہے خار زار محبت میں آبلہ دل کا

غرض برسوں اس فن کی کوچہ گردی، اور اس بادۂ مردآزما کی شور و مستی میں بسر ہوئے ہر وقت ایک نہ ایک جلوۂ ہوش رُبا سامنے تھا، اور جس طرف نظر اٹھتی تھی، ایک ایک زلف و گیسو کا دام فریب پھیلا نظر آتا تھا، اگر ایک پھندے سے دل کو بہ مشکل رہائی نصیب ہوتی تھی، تو دوسرے پھندے میں دل الجھ کر رہ جاتا تھا ؎

ہے ترا سلسلۂ زلف بھی کتنا دل بند — پھنسنے سے پہلے بھی مشکل تھا چھٹنا دل کا

تالیف دیوان و تذکرۂ بزم سخن، اسی عالم جوش و خروش اور مشغلۂ شعر و سخن میں غزلیات و اشعار فارسی و اردو کا ایک بڑا ذخیرہ جمع اور مرتب ہو گیا تھا، جو شاید دو کلیات ضخیم کے برابر ہوتا، مگر اسکے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب دل ان رنگ رلیوں سے پھیکا پڑا، تو وہ مجموعۂ غزلیات و اشعار بھی تاراج دست تغافل اور نذر آتش کر دیا گیا ع

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولی

خدا جانے کس طرح ابتدائی عمر کے معدودے چند اشعار اور غزلیں فارسی اور اردو کی بعض اوراق میں لکھی ہوئی پڑی رہ گئی تھیں

ان کو بعض احباب نے ترتیب دیکر فارسی غزلیات و اشعار کا مجموعہ بنام خرمن گل اور غزلیات و اشعار اردو کا مجموعہ بنام نالۂ دل طبع کرا کے شائع کر دیا، سچ یہ ہے کہ فارسی اور اردو کلام دونوں محتاج نقد و نظر و انتخاب تھے، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو ان پر نظر ثانی کرنے کی نوبت نہیں آئی اسی ابتدائی زمانہ میں ایک تذکرہ شعرائے اردو کا میں نے مرتب کیا اور اس کا نام بزم سخن رکھا، یہ تذکرہ ۱۲۹۸ھ میں چھپکر شائع ہو چکا ہے،

تالیف گلگشت گلستاں | اسی اثنا میں مجھ کو گلستان سعدی کے تتبع پر ایک کتاب تالیف کرنے کا خیال پیدا ہوا، اور میں نے قریبًا ایک باب گلستاں کے طرز پر لکھا، جس کا مسودہ اب تک میرے پاس موجود ہے، مگر بعض دیگر اشغال و افکار پیش آجانے کے سبب سے یہ ارادہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، اور یہ باب بھی غیر مطبوعہ رہا، میں نے اس کتاب کا نام گلستاں کے نام پر دبستاں تجویز کیا تھا، مگر حضرت والد محترم نے یہ خیال کر کے کہ کہیں غلطی سے لوگ اسکو گلستاں کا جواب نہ سمجھیں، جس طرح کہ مولینا جامی رح نے بہارستان اور حکیم قاآنی نے پریشان اور خوانی نے خارستان لکھی ہے، یہ کتاب تو در حقیقت حضرت سعدی رح کی زبان و کلام کا تتبع ہے نہ جواب اسلئے انھوں نے اس کا نام گلگشت گلستان رکھنا زیادہ موزوں و مناسب سمجھا،

تالیف موارد المصادر | اسی زمانہ میں ایک کتاب مصادر فارسی میں استاذ مرحوم کی مدد سے تالیف کی، حضرت والد مرحوم نے اس کا نام موارد المصادر للصادر والوارد رکھا، اور اس میں مصادر عربی کا اضافہ کیا، یہ کتاب بھی زیور انطباع سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے،

بزم مشاعرہ کا انعقاد | حضرت والد محترم نے ہم دونوں بھائیوں کی ادبی قابلیت اور سخن طرازی و سخن فہمی کی لیاقت بڑھانے کے لئے ایک بزم مشاعرہ محل سرکاری پر قائم کی تھی، جو ہر ماہ کے آغاز میں ایک مرتبہ منعقد کیجاتی تھی، ہم دونوں بھائی بھی اپنی اپنی غزلیں لکھ کر لیجاتے تھے، اور

میرے محترم مرحوم دوست منشی امجد علی صاحب اشہری ساکن قصبۂ کچھوچھہ ان غزلوں کو پڑھکر مشاعرہ میں سنایا کرتے تھے،

چونکہ والد مرحوم کو ہم لوگوں کی اصلاحِ حال اور درستی مآل کا خیال بدرجۂ اتم رہا کرتا تھا، جسوقت ان کو شعر وسخن میں میرا سخت انہماک اور زلف وخط وخال کے مضامین میں میرا ہمہ وقت مشغول رہنے کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے جذباتِ نفسانی کے مدّ وجزر کو ملحوظ رکھکر بحکم الشُّعَرَاءُ یَتَّبِعُھُمُ الْغَاوٗن مجھکو ہر وقت مگر شعر وسخن میں مصروف رہنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، اور مطالعہ کتب حدیث و تصوف و رقاق کے جانب توجہ دلائی،

تالیف کتاب خطیرۃ القدس میں نے اسی زمانہ میں کتب حدیث شریف سے متعدد احادیث قدسیہ جمع کرکے ان کو ایک رسالہ کی صورت میں مرتب کیا، اور اسکو حضرت والد محترم کے ملاحظہ میں پیش کیا، والد مرحوم نے نہایت پسند کیا، اور اس کا نام خطیرۃ التقدیس رکھا اور خود اپنی قلم سے اس کا دیباچہ تحریر کیا، یہ مجالۂ نافعہ ماہ ربیع الاول ۱۳۲۱ھ میں چھپکر مشتہر ہوا، یہ زمانہ میری زندگی کا بہترین زمانہ تھا، اسی زمانہ سے کتب دینیات اور علوم وکتاب وسنت کے جانب میلانِ خاطر پیدا ہوا، اور زیادہ وقت اسی قسم کی کتابوں کے مطالعہ میں گذرنے لگا، مگر افسوس ہے کہ یہ مبارک مشغلہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا، حضرت والد مرحوم کی وفات کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہوگیا، ؎

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

والد مرحوم کے زمانہ حیات تک مجھ کو بجز مشاغلِ علمی معاملاتِ دنیا کے کسی کاروبار سے سروکار نہ تھا، ان کی وفات کے بعد جب اپنے حال پر نظر کی تو اپنے کو طرح طرح کے مشکلات وافکار میں مبتلا پایا، اور تمام خانگی وملکی وقومی ومذہبی معاملات کا مدار اپنے ہی دوشِ ناتواں پر پایا، ؎

بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف اور اس ضعیف سے کل کام دوجہاں کیلئے

خدا ہی خوب جانتا ہے کہ کتنے دن اور کتنی راتیں اور کتنا وقت اضطراب و بیداری اور تردد و قلق کے ساتھ معاملات دنیوی کی گتھیوں کے سلجھانے اور تدبیر منزل نظم و نسق انتظام خانہ داری اور بند و بست جاگیر وغیرہ کی کشمکش میں گزارنا پڑا، جب اس طرف سے کسی قدر فراغت حاصل ہوئی تو پھر وہی قدیم ذوق شعر و سخن غالب آیا، اور زیادہ وقت اسی میں صرف ہونے لگا، یا انیمہ نہ اب وہ اگلا سا جوش و خروش دل میں باقی تھا، نہ ویسا اطمینان اور فراغ خاطر حاصل تھا، جب اپنے ماحول پر غور کیا، تو نہ وہ اگلی سی علمی صحبتیں باقی پائیں، نہ وہ بابرکت دینی مجلسیں نظر آئیں جہاں شب و روز قال اللہ و قال الرسول کا ذکر رہا کرتا تھا، چند ہی سال میں شہر کی کایا پلٹ ہو چکی، اور مغربی طرز خیالات و معاشرت کی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں، بیرونی ممالک کے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد روز بروز ریاست میں بڑھ رہی تھی،

انقلاب خیالات اور علوم جدیدہ کی طرف میلان خاطر

میرے حلقۂ احباب میں بھی بعض تعلیم یافتہ لوگ شامل ہوگئے تھے، ان کی وجہ سے مجھ کو بھی یورپ کے علوم جدیدہ کی جانب میلان خاطر پیدا ہوا، تاریخ یورپ اور فلسفہ و سائنس مغربی سے کان آشنا ہوئے، یہاں سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا، جسقدر میری معلومات میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، اسی قدر مشرقی علوم سے بیگانگی، اور مذہبی خیالات میں پستی و تساہل ترقی کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ذات و صفات باری تعالیٰ، حشر و نشر، دوزخ و جنت، حساب و کتاب، گناہ و ثواب، خطاب و عتاب، روح و مادہ، تکوین حیات، تخلیق کائنات ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی، جس پر میرا عقیدہ علی حالہ قائم رہا ہو، اور دل میں یہ خیال نہ آنے لگتا ہو سے

خرید ارسی ہو شہد و شیر قصر حور غلماں کی غم دیں بھی اگر سمجھو تو ایک دھندا ہے دنیا کا

مغرب کی نظر فریب روشنی نے میری نگاہ خیرہ کر دی، فلاسفۂ مغرب کی تیز روشنی کے

سامنے علمائے اسلام کی تحقیقات مغلس کا چراغ نظر آنے لگی، اور بے ساختہ منہ سے نکلنے لگا،

عالمان را ہست علم ورہ بہ اوج راز نیست ہست مرغ خانہ را بال و پر پرواز نیست

خبر زندہ دلی نیست اہل مدرسہ را کہ دل بیان مگس درکتاب می میرد

برسوں میں اسی صحرائے پرخار کی خاک بیزی اور اس کے کانٹوں سے عطر گلاب کھینچنے کی سعی لاحاصل میں لگا رہا، یہ چند سال مجھ پر ایسے گذرے ہیں کہ میں گویا الحاد و زندقہ کے نارِ جحیم کے کنارے پر پہونچ چکا تھا، اور قریب تھا کہ میں طعمۂ آتش ہوجاؤں،

سرسید مرحوم کی تالیفات کا مطالعہ اور اُن سے خط وکتابت کا آغاز

اسی اثنا میں مجکو سرسید احمد خاں بہادر مرحوم کی تالیفات کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، اور میں نے ان سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری کیا، اور ان سے تفسیر احمدی خطبات احمدیہ، اور مجموعہ لکچرز منگا کر ان کو اوّل سے آخر تک پڑھا، اور ایک ہزار روپیہ تعمیر اسٹریچی ہال کی مد میں ارسال کیا،

مولینا شبلی کی تصانیف کا اثر اور انکا ورود بھوپال

اسی عرصہ میں حضرت مولینا شبلی کی کتاب المامون طبع ہوئی، اور بھوپال میں خاصکر اس کتاب نے ایک عام ذوق تاریخ اسلام کے مطالعہ کا پیدا کر دیا، اور جو مخالفت تحریک علی گڈھ اور سرسید سے عام طور پر برپا تھی اوس کا آہستہ آہستہ ازالہ صرف سلسلۂ تصانیف علامہ شبلی و دیگر اسلامی تاریخی کتب کی اشاعت و عام مطالعہ سے ہوتا گیا، حضرت علامہ سے اس عرصہ میں خط وکتابت رہی اور بہ اصرار وہ بھوپال طلب کئے گئے، انکی اول تشریف آوری سرسید کے حیدر آباد ڈیپوٹیشن کے موقعہ پر ہوئی، غریب خانہ نور محل میں ان کا قیام رہا، اور یہیں انھوں نے اپنا مشہور قصیدہ فارسی جسکا مقطع ہے ع

شہ نظام است بزیبد کہ نظامی باشم

طبع کرایا، اللہ اللہ کیا پر لطف صحبتیں تھیں، قریباً تمام علماء و شعرائے بھوپال سے مولینا کے علمی مباحث، بزم

جس نے بھوپال جیسے قدامت پرست مقام پر ایک عام ہیجان بپا کر کے دورِ اصلاح کا آغاز کر دیا،

سرسید مرحوم کا ورود بھوپال دہم جولائی ۱۸۹۱ء کو سرسید مرحوم نے مجھکو ایک خط لکھا، اور میری تحریک پر بھوپال میں آنے کی خواہش ظاہر کی، اور مجھ سے مشورہ لیا، بعد ازاں ستمبر ۱۸۹۱ء میں وہ بھوپال رونق افروز ہوئے، اُن سے دو چار ملاقاتوں کی عزت حاصل ہوئی، اور بہت سے مسائل زیر نظر پر انکی رائے عالی سے مزید روشنی پڑی، بست وچہارم مئی ۱۸۹۷ء میں سرسید مرحوم نے مجھ کو ازراہِ عنایت دو جلدیں تہذیب الاخلاق کی اپنے خط کیساتھ ارسال کیں، اور نہایت مہربانی وشفقت آمیز الفاظ میں تحریر فرمایا کہ یہ دونوں جلدیں میری ملکیت ہیں کالج سے انکو کچھ علاقہ نہیں، اس لئے بطور نذر آپ کی خدمت میں مرسل ہیں امید ہے کہ آپ قبول فرمائیں گے،

امداد مدرستہ العلوم، زمانۂ اقامتِ بھوپال میں رئیسۂ عالیہ خلد مکان نے دس بارہ ہزار روپیہ کالج کی امداد میں سرسید مرحوم کو عطا فرمائے پھر بلحاظ مزید شفقت دو دو ہزار روپیہ میاں عالمگیر محمد خانصاحب میاں صدر محمد خانصاحب مرحوم، برادر معظم مرحوم اور کاتب الحروف کی جانب سے امدادِ کالج میں رئیسۂ عالیہ نے مرحمت فرمائے،

شرکتِ کانفرنس، وقتِ مراجعت علیگڈھ سرسید مرحوم نے مجھسے وعدہ لیا کہ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ علیگڈھ میں جو بماہ دسمبر ۱۸۹۱ء میں ہونے والی ہے، بذاتِ خود شریک ہوکر مسلمانان ہند کی قومی وتعلیمی معاملات میں سرگرمی اور اسلامی شان وعظمت کے آثار کالج کی حالت اور تعلیم کی روز افزوں ترقی کو اپنی آنکھ سے معائنہ کرون، اور اسکی امداد میں کوشش کرون چنانچہ مین نے حسب وعدہ علیگڈھ پہونچکر شرکتِ کانفرنس کی عزت حاصل کی، اگرچہ سرسید مرحوم کو اسوقت مصروفیت بہت تھی، تاہم دو ایک بار ان کے فیضِ صحبت اور خیالات سے مستفید ہونے کا زرین موقع ملا، یازدہم دسمبر ۱۸۹۵ء میں سرسید مرحوم نے مجکو تحریر فرمایا کہ میں آپ کو اپنا دلی دوست اور معین و مددگار اس

قومی کام کو سمجھتا ہوں جس کے انجام پر میں نے اپنی عمر صرف کی ہے، اور مجھ کو امید ہے کہ آپ ہمیشہ اس کام کے مددگار رہیں گے،

اسلامیہ کلب بمبئی کی ممبری اسی سال حسن اتفاق سے اسلامیہ کلب بمبئی کا میں ممبر منتخب کیا گیا، اور آنریبل سر فاضل بھائی وسرام نے بذریعہ خط مورخہ یازدہم مارچ ۱۸۹۵ء میں مجھ کو مطلع فرمایا، اگرچہ مجھ کو اس کے کسی سالانہ جلسہ میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملا، مگر میں نے اسلامیہ کلب کے مقاصد کو مدنظر رکھکر ایک خطبۃ البیان کے نام سے چھپوا کر سکریٹری اسلامیہ کلب بمبئی کے پاس ارسال کیا، اور اسکی بقیہ تمام جلدیں میں نے کالج کے حق میں وقف کرکے سرسید مرحوم کی خدمت میں روانہ کر دیں،

سرسید مرحوم نے مجھ کو ٹرسٹی بنانے کی خواہش کی بعد ازاں سرسید مرحوم نے مجھ کو تحریر فرمایا کہ میں آپ کو کالج کا ٹرسٹی بنانا چاہتا ہوں، ہاں یا نا جو منظور ہو، اس سے جلد مطلع کیجئے، میں نے اس کے جواب میں یادآوری و مہربانی کا شکریہ ادا کرکے اور افسوس کیسا تھ بعض مجبوریوں کا اظہار کرکے جو اس وقت لاحق حال تھیں، معذرت کی اور لکھا کہ یہ تو میری عین آرزو تھی، اور ٹرسٹی ہونا میرے لئے ہرطرح عزت کا باعث تھا، مگر بعض وجوہ سے مجبوراً میں اپنی اس دلی تمنا کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتا ہوں، اور کالج کی جو مدد و کوشش میرے امکان میں ہے، اس کے کرنے کے لئے نہایت مسرت کیساتھ میں اب بھی موجود ہوں اور آیندہ بھی رہونگا، اور جب کبھی مجھکو ذرا بھی موقع ملے گا، تو بلاتامل حاضر خدمت ہو کر جو ارشاد ہوگا، اسکی تعمیل اپنے لئے باعث عزت خیال کرونگا،

ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کی ممبری اسی زمانہ میں حضرت شمس العلماء علامہ شبلی مرحوم نے ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے سالانہ جلسہ میں میرے ممبر بنائے جانے کی تحریک کی، اور مسٹر آزملڈ پروفیسر علی گڈھ کالج نے تائید کی، جو ممبروں کے اتفاق رائے سے منظور ہوئی،

(باقی)

حیدرآباد دکن

کے

اردو اخبارات اور رسائل

از

جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل ایف آر اے ایس، ام آر اے ایس

(۲)

سنہ ۱۹۰۸ء میں مولوی ظفریاب خان نے "ادیب" ماہوار جاری کیا، اوس کی ترتیب وغیرہ اور مالی امداد بھی مولینا سید خورشید علی (ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی وغیرہ) کیا کرتے تھے کئی سال تک ادیب جاری رہا،

سنہ ۱۹۱۰ء میں دکن لا رپورٹ کے نام سے ایک قانونی ماہوار رسالہ جاری ہوا جسکے اڈیٹر ابتدأ مسٹر اصغر بیرسٹر (جسٹس نواب اصغر یار جنگ بہادر) مولوی غلام اکبر خان (جسٹس نواب اکبر یار جنگ بہادر) وغیرہ تھے، یہ رسالہ اب تک جاری ہے،

سنہ ۱۹۱۱ء میں نواب ممتاز یار الدولہ نے مدرسہ آصفیہ ملک پیٹھ سے ایک ہفتہ وار اخبار آصفیہ گزٹ جاری کیا، جو دو سال تک نکل کر بند ہوگیا،

سنہ ۱۹۱۱ء ہی میں ماہوار صحیفہ جو مولوی اکبر علی کی ادارت میں نکل رہا تھا، روزنامہ ہوگیا، جو اب تک موجود ہے،

سنہ ۱۹۱۱ء ہی میں مولوی محمد علی خان ناظم نے عثمان گزٹ ہفتہ وار جاری کیا، جو جلد ہی بند ہوگیا،

سنہ ۱۹۱۱ء ہی میں مستقر ضلع بیدر سے ایک ہفتہ وار اخبار بیدر گزٹ کا اجرا ہوا،

سنہ ۱۹۱۲ء میں امیر حسن صاحب نے معارف کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا جو ایک سال تک جاری رہ کر بند ہوگیا،

سنہ ۱۹۱۲ء ہی میں احمد اللہ بیگ اور رگھوناتھ راؤ درد نے ادیب الاطفال کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو چند مہینوں تک جاری رہ کر بند ہوگیا،

سنہ ۱۹۱۲ء میں میں حکیم نادر علی نے گلدستۂ نادر ماہوار جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۲ء ہی میں انجمن محبوبیہ کوٹلہ عالیجاہ سے احمد علی جودت نے دربار کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۳ء میں راے گوبند پرشاد نے شاہد سخن کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۴ء میں نواب عماد الملک بہادر کوتوال بلدہ نے پولیس گزٹ جاری کیا جو حیدرآباد کی کوتوالی ہی سے متعلق تھا،

سنہ ۱۹۱۴ء ہی میں ہز اکسلنسی سر مہاراجہ یمین السلطنۃ کی سرپرستی میں تزک عثمانیہ ماہوار جاری ہوا،

سنہ ۱۹۱۴ء ہی میں مولوی غلام محمد وفا اور رگھوناتھ راؤ درد نے تاج نکالا جو اس عہد کا واحد معیاری رسالہ تھا، مسلسل دو سال تک جاری رہکر یہ رسالہ سنہ ۱۹۱۶ء میں بند ہوگیا، اور پھر اپریل سنہ ۱۹۲۴ء سے دوبارہ جاری ہوا، مگر ایک ہی سال نکل کر پھر بند ہوگیا، جس کے بعد یہی ایک معیاری رسالہ تھا،

سنہ ۱۹۱۵ء میں مولینا ہوش بلگرامی نے ذخیرہ ماہوار جاری کیا، اور حیدرآباد میں ایک علمی اور ادبی فضا پیدا کر دی، ترتیب رسالہ کا ڈھنگ بھی نہایت اچھا رکھا، بڑے اعلیٰ پایہ کے

مضامین شائع کئے،

سنہ ۱۹۱۶ء میں مولٰنا نظام شاہ لبیب نے افادہ ماہوار جاری کیا، جو اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا،

سنہ ۱۹۱۷ء میں حکیم بشیر احمد صاحب نے ایک طبّی ماہوار رسالہ المعالج جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۷ء ہی میں مولوی رحمت اللہ صاحب مددگار معتمد (حال نواب رحمت یار جنگ بہادر کوتوال بلدہ) نے محکمۂ مالگذاری سے وقائعِ مال جاری کیا، جو محکمۂ مالگذاری اور موسمی رپورٹ اور دیگر تفصیلات کا حامل ہوتا تھا،

سنہ ۱۹۱۷ء ہی میں ترلوکی ناتھ سہائے نے نظائر برٹش انڈیا کے نام سے ماہوار رسالہ جاری کیا جس میں پریوی کونسل اور عدالتہائے برٹش انڈیا کے فیصلے ترجمہ کرکے شائع کئے جاتے تھے،

سنہ ۱۹۱۸ء ہی میں عبدالرب صاحب کوکب نے بچوں کے لئے ایک ماہوار رسالہ آتالیق جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۸ء میں مولوی مظہر حسین صاحب ناظم زراعت سرکار عالی نے ایک تدریجی ماہوار رسالہ رہبر مزارعین جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۸ء ہی میں غالبًا مولوی نصیر الدین ہاشمی نے انجمن ثمرۃ الادب سے ثمرۃ الادب ماہوار رسالہ جاری کیا،

سنہ ۱۹۱۸ء ہی میں ایک ماہوار رسالہ شعلہ جاری ہوا، جو جلد ہی بند ہوگیا،

سنہ ۱۹۱۸ء ہی میں عبدالوہاب صاحب عندلیب نے ایک مذہبی ہفتہ وار رسالہ واعظ جاری کیا، جو سنہ ۱۹۱۹ء سے ہفتہ وار نکلنے لگا،

سنہ ۱۹۱۹ء میں صغرا بیگم صاحبہ اہلیہ ہمایوں مرزا بیرسٹر نے ایک نسوانی ماہوار رسالہ النساء جاری کیا جو مدت تک جاری رہا،

۱۹۲۰ء میں پنڈت وشنو مادھو راؤ نے ایک قانونی ماہوار رسالہ دوست جاری کیا،

۱۹۲۰ء ہی میں مرغوب الدین صاحب بی اے نے ایک تعلیمی ماہوار رسالہ نونہال جاری کیا

۱۹۲۱ء میں مولوی سید احمد محی الدین بی اے نے اخبار رہبر دکن روزانہ جاری کیا

جو اب تک جاری ہے،

۱۹۲۱ء ہی میں مولوی عبدالحق بی اے معتمد انجمن ترقی اردو نے اورنگ آباد سے رسالہ

اردو سہ ماہی جاری کیا،

۱۹۲۲ء ہی میں مولوی مرزا رفیق بیگ نے ایک صنعتی و حرفتی ماہوار پرچہ نمایش کے نام سے

جاری کیا جو عرصہ تک کامیابی کیساتھ چلتا رہا، مگر ۱۹۲۹ء کے بعد ایک آزاد نے اس پرچے کو اپنے ہاتھ

میں لے کر نہ صرف علمی و ادبی بنانا چاہا، بلکہ ذاتی بغض و عناد کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی نمایش ہی کے

اوراق استعمال کئے گئے، جسکا نتیجہ یہ نکلا کہ پرچہ بند ہو گیا،

۱۹۲۲ء ہی میں ابوالمکارم محمد انوار اللہ صاحب نے ایک ماہوار رسالہ ترقی جاری کیا، جو

نہایت ٹھوس اور معیاری رسالہ تھا، اس کے لکھنے والے بھی نہایت قابل اور تجربہ کار تھے، نواب

سید خورشید علی ناظم دفتر دیوانی و مال و ملکی اس کے سرپرست تھے، اور قلمی و مالی امداد آخر تک کرتے

رہے، یہ پرچہ حسن اور تاج کے بعد جاری ہوا تھا، مگر اس نے اس مردہ حسن میں جان ڈال دی تھی

جو ایک مدت پہلے جاری تھا، افسوس ہے کہ ابوالمکارم صاحب کی علالت اور ذاتی مصروفیتوں کی وجہ سے

ترقی کو روبہ انحطاط ہونا پڑا،

۱۹۲۲ء ہی میں ایک زنانہ رسالہ مریم بیگم صاحبہ اہلیہ ولی الدین صاحب نے خادمہ کے نام سے

ماہوار جاری کیا،

۱۹۲۲ء ہی میں مولوی سید محمد ضامن کنتوری نے لسان الملک کے نام سے ایک ماہوار رسالہ

جاری کیا، جو لحاظ مضامین و ترتیب نہایت بلند پایہ تھا،

۱۹۲۳ء میں مولوی غلام محمد وفا نے رسالہ تاج کو جو اس سے پہلے مکمل کر بند ہوچکا تھا دوبارہ جاری کیا، مگر افسوس ہے کہ ایک ہی سال کے بعد یہ رسالہ پھر بند ہوگیا، تاج کا نقش ثانی نقش اول سے ہر طرح اعلیٰ تھا،

۱۹۲۳ء ہی میں نظام کالج اردو میگزین سہ ماہی جاری ہوا، جس کے معتمد نواب طاہر علی خان بی، ایچ ڈی تھے اور اڈیٹر محمد امیر خان صاحب غربت، یہ رسالہ ایک سال تک جاری رہا،

۱۹۲۳ء میں سید محمود یداللہی صاحب نے الصدق کے نام سے ایک ماہوار رسالہ مہدوی حضرات کے لئے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں ایک تعلیمی ماہوار رسالہ المعلم کے نام سے مولوی محمد عظمت اللہ خان بی اے اور مولوی سید محمد حسین جعفری بی اے نے جاری کیا، جو اب مولوی سجاد مرزا ام اے صدر کلیۃ المعلمین کی ادارت میں جاری ہے،

۱۹۲۳ء ہی میں جناب رومی نے ایک ہفتہ وار اخبار راز جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں سراج الدین صاحب نے ایک مذہبی ماہوار رسالہ معلم العلوم کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں سراج الدین صاحب نے اور ایک ماہوار مذہبی رسالہ توحید کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں مولوی سید باقر حسین طارق نے ایک مذہبی ماہوار النور کے نام سے جاری کیا،

۱۹۲۳ء ہی میں ابو العلاء نور محمد صاحب نے ایک مذہبی رسالہ صراط المستقیم کے نام سے جاری کیا،

سنہ ۱۹۲۳ء میں محب اللہ خان بہادر عالی رفاعی نے ایک انجمن ارباب اردو کے نام سے قائم کرکے اس کے زیر انتظام تحفہ ماہوار جاری کیا، جو نہایت عمدگی سے ایک سال تک نکلتا رہا، مگر منتظم رسالہ کی بے عنوانیوں کی وجہ سے نواب عالی نے اس رسالہ کو دوسرے شخص کے حوالہ کردیا، مگر وہ بھی جاری نہ رکھ سکے، تحفہ بھی ایک ٹھوس علمی و ادبی رسالہ تھا، جس نے حیدرآباد کے علمی ذخیرہ میں خاصا اضافہ کیا،

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں سکندرآباد سے افضل شریف صاحب نے ارتقا، جاری کیا، جو ڈیڑھ دو سال تک جاری رہا،

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں سکندرآباد سے اور ایک ماہوار رسالہ رہبر تعلیم جاری ہوا، جو تعلیمی رسالہ تھا،

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں ابوالمکارم انوار اللہ صاحب نے ترجمان کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جو ایک ہی اشاعت کی حد تک رہا،

سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں دور ترقی کے نام سے ڈاکٹر جیلانی بیگ صاحب نے ایک ماہوار رسالہ چھپوایا مگر وہ پریس سے باہر نہ آسکا،

سنہ ۱۹۲۵ء میں رائے بھوانی پرشاد نے سائین کی صدا کے نام سے ایک ماہوار مذہبی اخلاقی رسالہ جاری کیا،

(باقی)

تلخیص و تبصرہ

کیا ہم دوسروں کے دل کی بات معلوم کر سکتے ہیں

مندرجۂ بالا عنوان سے ایڈوین ٹیل (Edwin Teale.) کا ایک نہایت دلچسپ مضمون رسالہ پاپولر سائنس بابت مارچ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا ہے جس میں ٹیلی پیتھی (Telepathy) کے مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے ٹیلی پیتھی کے معنی ہیں خیالات کا بغیر حواس خمسہ کی مدد کے ایک شخص کے دماغ سے دوسرے شخص کے دماغ تک منتقل ہونا خواہ وہ دوسرا شخص کتنے ہی زیادہ فاصلہ پر کیوں نہ ہو، نفسیات کا یہ حیرت انگیز پہلو اب تک تحقیق کی روشنی میں نہیں آیا تھا، چند سالوں سے اہل سائنس نے اس پر توجہ کی ہے، اور اب دنیا کے ہر حصہ میں اس پر تجربے کئے جا رہے ہیں، امریکہ کے سائنس والوں نے خصوصیت کیساتھ اس مسئلہ میں زیادہ دلچسپی لی ہے، مضمون کا خلاصہ حسب ذیل ہے:-

میرے ایک دوست نے خواب میں دیکھا کہ اس کا لڑکا جو ایک دور دراز مقام پر کالج میں تعلیم پا رہا تھا، فٹ بال کھیلنے میں گر گیا، اور اس کا ٹخنہ ٹوٹ گیا، دو روز بعد لڑکے کا خط آیا کہ میرے ٹخنے میں موچ آگئی ہے، لیکن دوسرے روز ایک خط اور آیا، جس میں لکھا تھا کہ ایکسرے سے معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ٹخنہ ٹوٹ گیا ہے،

چند روز ہوئے جزیرہ ہوائی سے اطلاع آئی کہ بریان (L. W. Bryan.) نامی ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ ایک سپاہی پریشانی کی حالت میں کوہ آتش فشاں ماونالوا

(Mauna Loa.) کے کنارے مارا مارا پھر رہا ہے، واقعہ یہ تھا کہ فوج کا ایک سپاہی گم ہو گیا تھا، اور ایک ہفتہ سے لوگ اوسے جنگلوں میں تلاش کر رہے تھے، بیدار ہونے کے بعد بریان فوراً پہاڑ کے اس حصہ پر پہونچا، اور ٹھیک اسی مقام پر سپاہی کو پایا، جہاں خواب میں اسے دیکھا تھا،

اس قسم کے واقعات کی توجیہ کیا ہو سکتی ہے، ؟ کیا وہ محض اتفاقی واقعات ہیں؟ یا کیا وہ انسان کی سریع الاعتقادی، اور توہم پرستی کا نتیجہ ہیں. ؟ کیا وہ سراسر دھوکا اور فریب ہیں، یا کیا وہ دماغ کے کسی ایسے حصہ کا وجود ثابت کرتے ہیں، جس کی تلاش و تحقیق ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اور جس سے مستقبل کے لئے بڑے بڑے امکانات ہیں، ؟ دنیا کے ہر حصہ میں ماہرین سائنس ان سوالات پر بحث کر رہے ہیں، اور مختلف ملکوں میں ٹیلی پیتھی پر تجربے کئے جا رہے ہیں، چنانچہ پچھلے چند مہینوں میں حیرت انگیز تحقیقات ہوئی ہیں،

ہم میں سے اکثر آدمیوں کو ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں، جن کی توجیہ ہم نہیں کر سکتے، کبھی کبھی ایک لمحہ کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ جو چیز اس وقت پیش آ رہی ہے، اس سے قبل بھی پیش آ چکی ہے، کبھی کبھی ہم کسی ایسے شخص کا خیال کرنے لگتے ہیں، جس کو ہم نے مہینوں یا سالوں سے نہیں دیکھا ہے، اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں اس سے ملاقات بھی ہو جاتی ہے، اکثر ایک ہی ایجاد کے پیٹنٹ کے لئے متعدد درخواستیں تقریباً ایک ہی وقت میں آ جاتی ہیں، ایک روز ایک عورت سو کر اٹھی، تو اس کے دل میں یہ بات جمی ہوئی تھی، کہ ایک دور کا ہمسایہ جو بیمار بھی نہیں تھا رات کو مر گیا، چند گھنٹوں کے بعد اطلاع پہونچی کہ وہ ہمسایہ دراصل رات کو مر گیا،

تقریباً ہر کتب خانہ میں ایسی کتابیں موجود ملیں گی، جن میں اس قسم کے محیر العقول تجربات درج ہوں گے، لیکن شک کرنے والا یہ کہہ سکتا ہے، کہ یہ واقعات ثبوت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جو خواب

یا پیش بینی صحیح ثابت ہوتی ہے، اُسے تو مشہور کر دیا جاتا ہے، مگر ہزاروں پیش بینیاں جو صحیح ثابت نہیں ہوتیں ان کا ذکر بھی کبھی نہیں ہوتا، مثلاً اس ہسپانی عورت کا واقعہ جس نے خواب میں دیکھا تھا، کہ لاٹری میں اس کا نمبر انعام حاصل کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور انعام اُسی کو ملا، تمام دنیا کے اخباروں نے اس واقعہ کی اشاعت کی، بعد کو ایک سائنس داں نے تفتیش کر کے معلوم کیا کہ اس عورت کے علاوہ سو آدمیوں نے اور بھی جو اس لاٹری میں شریک تھے، خواب دیکھا تھا کہ ان کا نمبر انعام حاصل کریگا لیکن انھیں انعام نہیں ملا، لہذا اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ضروری ہے، کہ کامیاب اور ناکامیاب دونوں قسم کی پیش بینیاں سامنے رکھی جائیں،

حال کے تجربہ کرنے والے اسی نقطۂ نظر سے تمام اعداد و شمار جمع کر رہے ہیں، ٹیلی پیتھی کے متعلق مختلف سائنس دان مختلف طریقوں سے تجربے کر رہے ہیں، لیکن اس وقت تک سب سے زیادہ کامیاب ڈیوک یونیورسٹی (شمالی کارولینا، امریکہ) کے پروفیسر ڈاکٹر رائن (Rhine) کا تجربہ ثابت ہوا ہے، اور ان کے تجربے سے جو نتائج حاصل ہوئے ہیں، وہ ٹیلی پیتھی کی تحقیق میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں، ڈاکٹر موصوف اس نتیجہ پر پہونچے ہیں، کہ ہر شخص میں ٹیلی پیتھی کی قابلیت کچھ نہ کچھ ہوتی ہے، اور بعض آدمیوں میں یہ قوت خاص طور پر ودیعت ہوتی ہے، نیز یہ قابلیت خاندانوں میں وراثۃً منتقل ہوتی رہتی ہے، یہ بھی دیکھا گیا ہے، کہ تکان، پریشانی، اور منشیات کے استعمال کا اثر بھی ٹیلی پیتھی کی قابلیت پر پڑتا رہتا ہے، مثلاً تجربہ سے پہلے معمول نے جب کوئی نشاط انگیز اور مدر چیز استعمال کی تو ان میں ٹیلی پیتھی کی قوت بڑھ گئی، اور جب کوئی ایسی چیز استعمال کی جس سے طبیعت میں سستی اور اداسی پیدا ہوتی ہے، تو اس قوت میں بھی ضعف محسوس ہونے لگا،

چند روز ہوئے میں نے ڈاکٹر رائن کے معمل میں جا کر دیکھا کہ ٹیلی پیتھی کے متعلق ایک نہایت حیرت انگیز تجربہ کیا جا رہا ہے، بالائی منزل کے ایک کرہ میں ایک شخص گھڑی لئے ہوئے ایک میز

کے قریب بیٹھا تھا، میز پر تاش کے پچیس پتوں کی ایک چھوٹی سی گڈی رکھی ہوئی تھی، پتوں پر حسب ذیل پانچ قسم کے نشانات تھے: ایک ستارہ، ایک صلیب، چند موج نما لکیریں، ایک مستطیل اور ایک دائرہ، ہر نشان کے پانچ پانچ پتے تھے، اس شخص نے گڈی میں سے ایک پتا اٹھایا اور ساٹھ سکنڈ تک اس کو غور سے دیکھتا رہا، جوں ہی سکنڈ کی سوئی ساٹھ کے عدد سے گزری اس نے وہ پتا رکھکر دوسرا پتا اٹھایا، اسی طرح ساٹھ ساٹھ سکنڈ تک وہ یکے بعد دیگرے تمام پتوں کو غور سے دیکھتا رہا ٹھیک اسی وقت تین ہزار میل کے فاصلہ پر کیلی فورنیا کے ایک محل میں ایک دوسرا شخص ایک ہاتھ میں پنسل اور دوسرے ہاتھ میں ویسی ہی گھڑی لئے ہوئے خاموش بیٹھا ہوا تھا، جس وقت پہلا شخص کوئی پتا اٹھا کر اسے دیکھتا اسی وقت یہ دوسرا شخص بھی نوٹ کرتا جاتا، کہ اس کے خیال میں کس نشان کا پتا منتخب کیا گیا ہے، ڈاکٹر رائن کا خیال یہ ہے کہ اگر دوسرے شخص نے محض حسن اتفاق سے صحیح نشان کا پتہ نوٹ کیا ہے: تو ایسا اتفاق زیادہ سے زیادہ بیس فی صدی ہو سکتا ہے، لیکن جب کامیابی بیس فی صدی سے زیادہ ہو، تو سمجھنا چاہئے کہ حسن اتفاق کے علاوہ اور کوئی پر اسرار شے بھی کار فرما ہے، اور اسی کو ہم ٹیلی پیتھی کہتے ہیں،

اب آیئے ان کے نتائج پر نظر ڈالیں، ڈیوک یونیورسٹی کے ایک طالب علم کی ابتدائی (۶۰۰) کوششوں میں (۲۳۸) کامیاب ثابت ہوئیں، اس سے بھی زیادہ کامیاب ایک دوسرا طالب علم ثابت ہوا، اس نے (۱۱۲۵۰) بار تجربہ کیا، اور شروع سے آخر تک اوسطاً ہر پچیس پتوں میں نو پتے صحیح نوٹ کئے، ایک بار اس نے مسلسل (۲۵) پتے یکے بعد دیگرے صحیح نوٹ کئے، ڈاکٹر رائن کے ایک لاکھ تجربوں میں جو درجنوں معمولوں پر کئے گئے ہیں، اوسطاً پچیس میں سات سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئے ہیں،

ریاستہائے امریکہ میں اس وقت کم از کم ایک درجن کالج اور یونیورسٹیاں ڈاکٹر رائن کے تجربوں میں شریک ہیں، چنانچہ اسی سلسلہ میں ہارورڈ یونیورسٹی کے محقق ڈاکٹر اسٹا بردکس

(Estabrooks) کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا، تجربہ کے وقت انھون نے تاش کا ایک پتا اٹھایا، اتفاق سے فونٹن پن کی روشنائی اس پر گر گئی، جس سے پتا خراب ہوگیا چونکہ گڈی قیمتی تھی، ڈاکٹر موصوف پتے کے خراب ہو جانے سے بہت جھلائے، بہرحال اس کے بعد جب اونھون نے اپنے معمول کے اندراجات کا معائنہ شروع کیا، تو اونھوں نے دیکھا، کہ اس پتے کا اندراج بالکل صحیح کیا گیا ہے، نیز اس کے متعلق حاشیہ پر ایک خاص نشان بھی بنا دیا گیا ہے، اس نشان کی وجہ معمول نے یہ بیان کی کہ اس پتے کے نوٹ کرنے کا خیال میرے ذہن میں ایسی معمولی شدت کے ساتھ پیدا ہوا کہ میں نے سوچا، کہ اس کے انتخاب کے وقت ضرور کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے، ڈاکٹر رائن کو ٹیلی پیتھی کی تحقیق کا خیال ایک خاص واقعہ سے پیدا ہوا وہ یہ ہے:-

ایک عورت نے رات کو خواب میں دیکھا کہ اس کے بھائی نے اپنے کھلیان میں جاکر جو نو میل کے فاصلہ پر تھا، پستول سے خودکشی کر لی ہے، وہ چیختی ہوئی اٹھی، اور اسی وقت رات کو اپنے شوہر کے ساتھ بھائی کے کھلیان پر پہنچی، وہاں پہنچکر دیکھا، کہ گولی سر سے پار ہوگئی ہے، جیسا کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا، اور لاش ٹھنڈی ہو چکی ہے، "ع ز"

فینلینڈ کے مسلمان

فینلنڈ یورپ کے اخیر کنارون میں سویڈن کے پاس ایک ملک ہے، جہاں پہلے کوئی مسلمان نہ تھا، لیکن جب روس کے اشتراکی انقلاب سے مجبور ہو کر روس کے اکثر مسلمان آس پاس کے ملکوں میں نکل گیے، جہاں اون کی مذہبی آزادی کے لئے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا، تو ان مسلمانوں میں بڑی تعداد جو تاتاری تھی، اپنے اصلی وطن ایدل اور ال کو چھوڑ کر یورپ کے شمالی ملکوں میں جاکر بس گئی پھر یہاں سے بڑھکر فینلینڈ میں رہ پڑی، ان میں سے بعض تجارت کے ذریعہ پہلے سے فینلنڈ کے اصلی باشندون

کے ساتھ راہ و رسم رکھتے تھے،

ان مسلمانون کے روس سے چلے جانے، اور فنلنڈ میں رہ پڑنے کے بعد سے ان کے واقعات اور حالات معلوم کرنے کی مشرقی مسلمانوں میں سے کسی نے کبھی کوشش نہیں کی، مجھے جہانتک علم ہے استاذ محقق بشر فارس پہلے مشرقی شخص ہیں جنھون نے ادھر توجہ کی، اور فنلنڈ کے مسلمانون کے حالات معلوم کرکے اس پر ایک مضمون لکھا،

آج کل فنلنڈ کے مسلمانوں کی تعداد سات سو کے قریب ہے، اتنے کم ہونے پر بھی ان میں پورا اتحاد اور اتفاق ہے، وہ مذہب اسلام پر برابر قائم ہیں، اور اس کی تعلیمات کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، وہ اپنے اخلاق و آداب اور چال چلن کی بہتری کی وجہ سے فنلنڈ کے اصلی باشندوں کی نگاہوں میں کافی عزت و حرمت رکھتے ہیں، اور ہمیشہ عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں،

فنلنڈ کی حکومت نے ۲۴ ر اپریل ۱۹۲۵ء کو باقاعدہ طور پر مسلمانوں کو اپنی رعایا تسلیم کر لیا ہے، نیز حکومت نے فنلنڈ کی انجمن جمعیۃ اسلامیہ کو بھی جسکو وہاں کے معزز مسلمانوں نے اپنی جمعیت کو متحد و متفق رکھنے کی غرض سے فنلنڈ کے پایۂ تخت ہلسنگفورس میں قائم کیا تھا، قانونی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے، آجکل اس انجمن کے صدر سید ظہور طاہر ہیں،

یوں تو مسلمان فنلنڈ کے سترہ شہروں میں بستے ہیں، مگر ان کی بڑی تعداد ہلسنگفورس تمپری، اور توآکو میں رہتی ہے، تقریباً سب کے سب تجارت پیشہ ہیں، اور لین دین کے معاملات میں اپنی سچائی اور ایمانداری کے لئے مشہور ہیں،

فنلنڈ کی حکومت نے وہاں کے مسلمانون کو وہ سب شہری اور ملکی حقوق دیئے ہیں، جو وہاں کی اور قوموں اور اصلی باشندوں کو حاصل ہیں، ان پر حکومت کی ملازمتون کا دروازہ کھلا ہے، اور مسلمان ہر قسم کی ملازمتون کے امیدوار ہو سکتے ہیں،

فنلینڈ کے مسلمانوں کا ایک باقاعدہ امام بھی ہے، جو آجکل حکیم ولی احمد ہیں، یہ فنلینڈ کے پایۂ تخت ہلسنجفورز میں رہتے ہیں، اور ارشاد و افتاء کا کام انجام دیتے ہیں، شادی بیاہ اور ترکہ کے معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں، اور پیدا ہونے اور مرنے والے مسلمانوں کا حساب رکھتے ہیں، اور ان سب کیساتھ مذہبی تعلیم اور اساتذہ کے انتخاب کے شعبوں کی نگرانی بھی کرتے ہیں،

مسلمانوں کے شادی بیاہ کے تمام معاملات شریعتِ اسلامیہ کے احکام کے مطابق انجام پاتے ہیں، زیادہ تر نکاح آپس ہی میں ہوتا ہے، کبھی کبھی بعض مسلمان ان عیسائی عورتوں سے بھی شادی کر لیتے ہیں، جو مذہبِ اسلام قبول کر چکی ہوتی ہیں،

فنلینڈ کے مسلمان اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا بہت زیادہ خیال رکھتے ہیں، چنانچہ اس غرض سے انھوں نے کئی مذہبی مدرسے قائم کئے ہیں، جہاں لڑکوں کو ہفتہ میں دو تین گھنٹے ترکی زبان میں مذہبِ اسلام اور اسلامی اور ترکی تاریخ پڑھائی جاتی ہے، نماز روزہ وغیرہ کے مسئلے سکھائے جاتے ہیں، قرآن مجید حفظ کرایا جاتا ہے، اور فنِ تجوید کی تعلیم دیجاتی ہے،

دینی مدرسوں میں سب سے بڑے دو مدرسے ہیں، ایک ہلسنجفورز میں ہے، اور دوسرا ٹمبری میں، انجمن جمعیۃ اسلامیہ انھی مدارس کے طالب علموں کے سامنے وقتاً فوقتاً دینی، وطنی اور تاریخی مسئلوں پر خطبے دیا کرتی ہے، تاکہ ان طالب علموں کی نظر وسیع ہو، اور آیندہ چلکر مذہب و قت کی خدمت انجام دے سکیں،

فنلینڈ کے مسلمانوں میں اب تک قومیت کا جذبہ کارفرما ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت وہ خطوط و رسائل ہیں، جو جمعیۃ اسلامیہ کے سکریٹری سید ابراہیم عارف اللہ نے ۱۹۳۳ء میں فنلینڈی زبان میں اپنی قوم کے نام شائع کئے ہیں، جن میں ان ترکوں کی مدد اور حمایت کی پرزور درخواست کی ہے جو روس کے اشتراکیوں کے پنجۂ ظلم میں گرفتار ہیں،

فنلینڈ کے مسلمان ترکی حروف تہجی کو جدید لاطینی رسم الخط کے ساتھ استعمال کرتے ہیں، اور اسلامی عیدوں کے علاوہ ترکی اور قومی جشن بھی مناتے ہیں، خاصکر میلاد النبی کے جلسوں کا بڑا اہتمام کرتے ہیں،

علاوہ از مسلمان اپنے گھروں پر کثرت سے میلاد النبی کے جلسے کرتے ہیں جنمیں عموماً تمام مسلمان شرکت کرتے ہیں،
ان جلسوں میں تلاوتِ قرآن کے بعد امام ترکی زبان میں ایک مناسب خطبہ دیتا ہے،

فینلنڈ میں مسلمانوں کی تین چھوٹی مسجدیں پائی جاتی ہیں جنمیں جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے، اور جہاں مسجدیں نہیں ہیں وہاں کسی ایک شخص کے مکان پر جمع ہو کر نماز پڑھائی جاتی ہے عید الفطر یا عید الاضحیٰ کے علاوہ اور کسی نماز میں مسلمان عورتیں شریک نہیں ہوتیں،

مسلمان عورتوں کو فینلنڈ کی عورت کی طرح ہر قسم کی آزادی حاصل ہے سوائے اسکے کہ وہ ناچ اور گانوں وغیرہ میں شریک نہیں ہوتیں، اور اسلامی احکام کی اتباع کرتی ہیں فینلنڈ کی قانون کے مطابق مسلمان عورت بھی وہاں کی دوسری قوموں کی عورتوں کی طرح سترہ سال کی عمر سے پہلے نکاح نہیں کر سکتی۔

سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہو کہ فینلنڈ کے مسلمان شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں قطعاً نہیں استعمال کرتے بیس سال کے عرصہ تک کوئی ایسا مسلمان نہیں ملا جو شراب یا کسی نشہ آور چیز کے استعمال کرنے کے جرم میں فینلنڈ کی پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہو"

"ع ی"

خلافت اور ہندوستان

آغازِ اسلام سے اس عہد تک مسلمانانِ ہند اور خلفاے اسلام سے جو تعلقات رہے ہیں، ان کی تشریح اور سلاطینِ ہند کی تاریخ، سکوں اور کتبوں سے ان تعلقات کا ثبوت، ضخامت ۱۰۴ صفحے قیمت :- ۸ ر

دنیا اسلام اور خلافت

موجودہ عہد میں خلافتِ عثمانیہ کے قیام و بقا کے لئے دنیا کی مسلمان قومیں کیا جدوجہد کر رہی ہیں، مصنف کے سفر یورپ کے دلچسپ معلومات ہیں، ضخامت ۵۰ صفحے، قیمت ۳ ر

"منیجر"

اخبار علمیہ

طبی امداد بذریعہ ریڈیو

ریاستہائے متحدہ امریکہ کے محکمۂ صحت عامہ نے جہاز کے مسافروں کی طبی امداد کا ایک نہایت قابلِ قدر انتظام کیا ہے، اگر کوئی مسافر جہاز پر بیمار ہو جائے، اور ڈاکٹر کی عدم موجودگی یا مرض کی صحیح تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے مریض کو افاقہ نہ ہو رہا ہو، تو جہاز کا کپتان فوراً ریڈیو پر "ڈاکٹر" (Medico) کی اطلاع کرتا ہے، جب کسی جہاز سے ریڈیو پر "ڈاکٹر" (میڈیکو) کی آواز سنائی دیتی ہے، تو اسکی حد کے اندر ریڈیو کے تمام دوسرے پیغامات فوراً موقوف کر دیئے جاتے ہیں، اس ناگہانی اطلاع کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ کسی جہاز پر کوئی مسافر سخت بیمار ہو گیا ہے، اور ڈاکٹر علاج کے لئے موجود نہیں ہے، اس اطلاع کے پاتے ہی کوئی ریڈیو اسٹیشن جو بحری پیغامات حاصل کرتا رہتا ہے، جہاز کے کپتان سے مریض کا حال دریافت کر کے اُسے فوراً ہی ٹیلی فون کے ذریعہ سے محکمۂ صحت عامہ کے قریب ترین بحری ہسپتال میں پہونچا دیتا ہے، ہسپتال کے ڈاکٹر جمع ہو کر مرض کی تشخیص کرتے ہیں، نسخہ تجویز کرتے ہیں، اور اپنی رائے سے اس ریڈیو اسٹیشن کو بذریعہ ٹیلیفون مطلع کر دیتے ہیں، ریڈیو اسٹیشن یہ پیغام فوراً جہاز کے کپتان تک پہنچا دیتا ہے، اس طرح پندرہ منٹ کے اندر طبی مشورہ حاصل ہو جاتا ہے، جب سے یہ انتظام شروع ہوا ہے، بے شمار آدمیوں کو شدید ترین امراض سے نجات مل چکی ہے، اور ہزاروں جانیں بچائی جا چکی ہیں،

اس کے علاوہ محکمۂ مذکور نے امریکہ کے تمام بڑے بڑے بندرگاہوں پر جہاز کے کپتانوں اور جہازرانوں کے لئے ڈاکٹری کی ابتدائی تعلیم کے لئے بھی جس سے فوری طبی مدد پہنچائی جاسکے لکچروں کا انتظام کیا ہے،

عکسی کتب خانے

عنقریب ایک ایسی مشین رائج ہو جانے والی ہے، جو علمی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دے گی، کتابوں کی ضخامت کم کرنے کے لئے امریکہ میں ایک جدید قسم کا کیمرا ایجاد کیا گیا ہے، جس میں سینما کے فلم کی طرح اخباروں اور کتابوں کے فوٹو نہایت چھوٹے پیمانہ پر تیار کئے جاتے ہیں، اتنے چھوٹے پیمانہ پر کہ مطبوعات کی موجودہ ضخامت گھٹ کر ۱/۱۰۰ رہ جائیگی، برٹش میوزیم، نیویارک پبلک لائبریری اور امریکہ کے بعض دوسرے کتب خانوں میں اس کیمرے کا استعمال شروع ہو گیا ہے، اور پرانے اخباروں کے فائل اس کے ذریعہ محفوظ کئے جارہے ہیں، چنانچہ نیویارک پبلک لائبریری میں اخبار نیویارک ہیرلڈ ٹربیون (Herald Tribune) کے مکمل فائل کا مطالعہ صرف چند فٹ لمبی فلم پر کیا جاسکتا ہے، فلم تیار کرنے کے بعد ایک مشین میں لگا دی جاتی ہے، جس کے زیریں حصہ میں ایک پردہ لگا ہوتا ہے، اس پردہ پر خطوط اپنے اصلی سائز سے بھی بڑے دکھائی دیتے ہیں، اور بالکل اتنے ہی صاف، یہ مشین چھوٹے چھوٹے کتب خانوں کی دسترس سے بھی باہر نہیں ہے، پورا جسیں تصویریں لی بھی جاسکیں، اور دیکھی بھی جاسکیں، پچاس ڈالر میں خریدا جاسکتا ہے، بڑی اور بہترین قسم کی مشین کی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے، گھر کے استعمال کے لئے چھوٹی چھوٹی مشینیں امریکہ اور یورپ کے بازاروں میں آگئی ہیں،

آثارِ حیات

روس کے بعض محققین جو مشرقی سائبیریا میں طبقاتِ ارض کا مطالعہ کر رہے ہیں بیان کرتے ہیں

کہ ایسی زمین میں بھی جو صدیوں سے برف کے نیچے دبی ہوئی ہے، حیات کے آثار پائے جاتے ہیں، اور اس کے اندر ایسے کیڑے برآمد ہوئے ہیں جنہیں زندگی کی استعداد ابھی باقی ہے، ان لوگوں نے برف سے ڈھکی ہوئی زمین کے چند ٹکڑے ایک گہرے گڈھے سے کھود کر نکالے، اور پگھلنے کے لئے ان کو آب مقطر میں چھوڑ دیا، اس کے بعد خوردبین سے معائنہ کرکے دیکھا کہ اس میں جھینگا مچھلی کی شکل کے چھوٹے چھوٹے زندہ کیڑے موجود ہیں، ماہرین سائنس کا اندازہ ہے کہ یہ کیڑے برف کے نیچے ایک خوابیدہ حالت میں کم از کم تین ہزار برس سے موجود ہیں،

برقی کمبل

امریکہ کے ایک موجد نے ایک ایسا کمبل تیار کیا ہے جس کی بناوٹ میں برقی تار لگے ہوئے ہیں سوتے وقت بجلی کی بیٹری سے جو پلنگ کے سرہانے رکھی رہتی ہے، ایک تار کے ذریعہ اس کا تعلق قائم کر دیا جاتا ہے، باہر سردی خواہ کتنی ہی شدید ہو، سونے والا آرام سے سوتا رہتا ہے، مشین میں یہ رعایت بھی رکھی گئی ہے کہ کمبل کو جسقدر گرم کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن اگر کمبل حد سے زیادہ گرم ہو جائے تو برقی رو خود بخود منقطع ہو جاتی ہے، اور سونے والے کو تکلیف نہیں ہوتی، یہ کمبل دھویا بھی جا سکتا ہے، اور اس کے استعمال کرنے میں ڈھائی تین آنہ رات سے زیادہ بجلی کا خرچ نہیں ہے

سوویٹ روس کے کتبخانے

سوویٹ روس میں اسوقت (۹۶۲۰۹) رجسٹرڈ کتب خانے ہیں، اس تعداد میں (۳۶۰۴۷) پبلک لائبریریاں، (۲۵۲۵۷) دیہی کتب خانے، اور (۵۹۴) بچون کے مخصوص کتب خانے شامل ہیں، ان میں کتابوں کی مجموعی تعداد چھ کروڑ ساٹھ لاکھ ہے،

برقی ٹائپ رائٹر

حال میں ایک جدید قسم کا برقی ٹائپ رائٹر ایجاد کیا گیا ہے، جس میں وقت اور زحمت کو بچانے کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے، کاغذ اور کاربن کے اوراق ایک کشتی میں رکھ کر اس ٹائپ رائٹر کے سامنے رکھدیئے جاتے ہیں، اور یہ خود بخود ان کو کھینچ کر مشین میں لگا لیتا ہے، ٹائپ کرنے والے کو یہ زحمت نہیں کرنی پڑتی کہ ایک ورق کے ختم ہونے کے بعد دوسرا خود بخود مشین میں لگ جاتا ہے،

انگریزی حروف تہجی

اب تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ انگریزی حروف تہجی کی اصل فنیشین (Phenician) ہے لیکن حال کی تحقیقات سے یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے، ۲۵ سال قبل شام کے علاقہ راس شمرا میں جو مٹی کی تختیاں برآمد ہوئی تھیں، ان کے کتبوں کے مطالعہ سے اب تحقیق ہوا ہے کہ وہ حروف یونانی حروف سے ملتے جلتے ہیں، نہ کہ فنیشین حروف سے، اور انگریزی حروف انہی سے ماخوذ ہیں،

خطرہ کی گھنٹی

موٹر ڈرائیور جو دور کی مسافت میں کبھی کبھی اونگھنے لگتے ہیں، اور اونگھنے کی وجہ سے اکثر حادثات پیش آجاتے ہیں، ان کے لئے خطرہ کی گھنٹی ایجاد ہوئی ہے، یہ گھنٹی ڈرائیور کے گلے میں بندھی رہتی ہے، جوں ہی وہ اونگھتا ہے، اس کی ٹھوڑی گھنٹی کے بٹن پر لگتی ہی اور وہ گھنٹی بجنے لگتی ہے،

"ع ز"

باب التقریظ والانتقاد

ضرب کلیم

پتہ: مکتب خانۂ طلوعِ اسلام، ۲۵ میکلوڈ روڈ لاہور، قیمت مجلد عہ، غیر مجلد ۱۲؍ صفحات ۱۸۲۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی اردو نظموں کا یہ تازہ مجموعہ چند مہینے ہوئے چھپ کر شائع ہوا ہے، شذرات میں اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، مگر اب تنقید کی حیثیت سے اس کو ناظرین کے سامنے پیش کرنا ہے، اس مجموعہ میں ڈیڑھ سو نظمیں ہیں، جن کو اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنون لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب اور محراب گل افغان کے چند عنوانوں پر تقسیم کیا گیا ہے، کتاب کا آغاز اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال خلد اللہ ملکہ کے سرنامہ سے کیا گیا ہے، ہر عنوان کے تحت میں متعدد نظمیں ہیں، جن میں شاعر نے حقائق کے چہرہ سے پردہ اٹھایا ہے، اور جیسا کہ کتاب کی لوح پر نقش ہے، یہ دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے؛ یا یوں کہئے کہ دورِ حاضر پر ایک حکیم شاعر کے نقطۂ نظر سے فلسفیانہ تبصرہ ہے،

ضرب کلیم کے اقبال، بانگِ درا والے اقبال نہیں، بانگِ درا میں جذبات ہیں، ضرب کلیم میں حقائق ہیں، حکیم شاعر نے بڑے بڑے مذہبی قومی سیاسی اور تمدنی مسائل پر شاعری کے پردہ میں اپنی سنجیدہ رائے ظاہر کی ہے،

مجموعہ کے ہر شعر کی بندش نہایت سادہ، برجستہ، تکلفات سے پاک اور حشو و زوائد سے خالی ہے، مختصر سے مختصر لفظوں میں بڑے سے بڑے خیال کو خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے،

افسوس ہے کہ غزل کی طرح ان نظموں کے چند شعروں کو نقل کرکے ان کی خوبی کی داد نہیں دیجا سکتی، جب تک پوری پوری نظمیں نقل نہ کی جائیں، اور یہ ایک رسالہ کی بساط سے باہر ہے ضرورت ہے کہ مسلمان اسکو خریدیں اور پڑھیں،

جنوری کے جامعہ میں ایک فاضل نقاد نے جو اقبال کے اس مجموعہ کو بھی تلی رائیں، روشن تعلیمات اور بے پردہ حقائق" ماننے کے باوجود اپنے مسلک کی بنا پر شاعر کے چند خیالات سے اختلاف کیا ہے، اقبال نے اس میں مہدی کے عنوان سے چند شعروں کی ایک نظم لکھی ہے،

قوموں کی حیات انکے تخیل پہ ہے موقوف — یہ ذوق سکھاتا ہے ادب مرغِ چمن کو

مجذوب فرنگی نے بانداز فرنگی — مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار — نومید نہ کر آہوئے مشکین ختن کو

اس پر نقاد مذکور کا یہ حسن ظن ہے کہ اس شعر میں "اقبال کا روئے سخن انہی کی طرف ہے کیونکہ مہدی کے عقیدے کے **قرآنی** ہونے سے سب سے پہلے انہی نے علی الاعلان انکار کیا ہے"؟

لیکن کیا یہ واقعہ ہے،؟ مہدی کے عقیدے کے "قرآنی" ہونے سے تو علی الاعلان انہی کو کیوں ہمارے اہل سنت کو انکار ہے، منکرین حدیث تو منکرین حدیث، اہل حدیث تک بھی کسی قرآنی مہدی کے یعنی کسی ایسے مہدی کے جس کا ذکر قرآن پاک میں ہو قائل نہیں، جو سنی مانتے ہیں وہ روایات کی بنا پر مانتے ہیں قرآن کی بنا پر نہیں اب رہا روایات کی عدم صحت کی بنا پر انکار تو آج سے صدیوں پہلے ابن خلدون اپنے مقدمہ میں انکار کرچکا ہے اور سرسید اور انکے ساتھیوں کا مسلک بھی ہمیں معلوم ہے اس پر ایک آدھ رسالے بھی اسی زمانہ میں لکھے جاچکے ہیں اور انگریزوں اور مہدی سوڈانی کی خونریز جنگ کے بعد سے تو مہدی سے انکار تقرب شاہی کا بڑا ذریعہ رہا، اسلئے اس میں بھی نقاد کو اوّلیت کا شرف حاصل نہیں،

شاعر کا مقصد تو یہاں مہدی کے تخیل سے پرمین (فوق البشر) کا نظریہ ہے، جس سے نطشے نے

جرمن قوم کے سامنے ایک ترقی یافتہ آیڈیل قوم کا نمونہ پیش کر کے اس پر ترقی کی راہیں کھولدیں اسی طرح شاعر کے خیال میں مسلمانوں کو چاہئے کہ مہدی کے آیڈیل نمونہ کے مطابق اپنے کو بنانے کی کوشش کریں، یعنی اس تخیل سے مفید کام لیا جائے، غرض اس شعر کو ظہورِ مہدی کی پیشینگوئی کی واقعیت و عدم واقعیت سے کوئی تعلق نہیں،

اسی کتاب میں "الہام اور آزادی" کے عنوان سے اقبال کی دوسری نظم ہے، جس میں ایک شعر ہے،

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے، غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

ظاہر ہے کہ اس میں کھلا ہوا اشارہ مدعیِ قادیان کی طرف ہے، مگر نقاد موصوف اس کو حاکمیت و محکومیت کو نبوت کا معیار سمجھنے لگے ہیں، اور یہ انکشاف فرماتے ہیں کہ "اکثر انبیاء علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے ہیں، جس کے خاص علل و اسباب ہیں"

لیکن اول تو سیرِ انبیاء سے ان میں سے اکثر کو محکوم اقوام میں سے ثابت کرنا مشکل ہے، پھر اصلی بات یہ ہے کہ شاعر کا مقصد یہاں نبوت سے نہیں دعوائے تجدید سے ہے، تیسرے یہ ہے کہ اس نے محکوم قوم اور حاکم قوم نہیں بلکہ آزاد شخص اور محکوم شخص کہا ہے، آزاد قوم اور محکوم قوم نہیں چنانچہ شاعر پہلے کہتا ہے :-

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز

دیکھیے بندۂ آزاد کہا ہے حاکم قوم کا فرد نہیں کہا ہے، اسکے بعد دوسرا شعر ہے،

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہاں بھی محکوم شخص کہا ہے، محکوم قوم کا فرد نہیں کہا ہے، شاعر کا مقصود یہ ہے کہ غلامانہ ذہنیت کیساتھ دعوائے تجدید و الہام بربادی کا موجب ہے، اور آزادی کی دعوت کیساتھ جو تجدید عمل میں آئے وہ قوم کی زندگی کا سبب ہوتا ہے، شاعر نے اسی کتاب میں ایک نظم امامت پر لکھی ہے، جس کے بعض

اشعار یہ ہیں

ہے وہی تیرے زمانہ کا امام برحق — جو تجھے حاضر و موجود سے بیزار کرے

دے کے احساس زیاں تیرا لہو گرما دے — فقر کی سان چڑھا کر تجھے تلوار کرے

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اسکی — جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

اسی کتاب میں "پنجابی مسلمان" کے عنوان سے یہ چند شعر ہیں،

مذہب میں بہت تازہ پسند اسکی طبیعت — کرلے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد

تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا — ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے — یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

اقبال اپنی قوم کے نباض ہیں، انھوں نے جو کچھ جانا ہے، اسکو نظم میں ادا کیا ہے، مگر ظاہر ہے کہ تاویلی فرقہ کے کسی علمبردار پر یہ حقیقت کتنی شاق ہو سکتی ہے، اسلئے نقاد مذکور نے اپنی طرف سے ایک شعر اس میں اضافہ کرکے ایسے فرقہ کے لئے تسلی کا سامان پیدا کرنا چاہا ہے، نقاد شاعر کی تضمین ملاحظہ ہو

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر — بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

ہمارا قیاس ہے کہ اس شعر میں نقاد شاعر کا روئے سخن خود اپنی اور اپنے مسلک کی طرف ہے، جسکو وہ شاید سمجھتے ہیں کہ پنجاب میں فروغ ہو رہا ہے، لیکن اگر ہمارے اس قیاس کو خاکساری کے خلاف سمجھا جائے، تو قادیان کے مسلک کیطرف اشارہ ہو سکتا ہے کہ اسکو بھی پنجاب میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی تھی، واللہ اعلم بالصواب۔ "م"

مقالات شبلیؒ حصہ دوم

مولینا کے ادبی مضامین کا مجموعہ، ضخامت ۲۰۳ صفحے، قیمت ۱۲؎ "منیجر"

ہندوستانی رسالوں کے

چند

سالنامے اور خاص نمبر

الفرقان شہید نمبر مرتبہ جناب مولینا منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۴۴۴ صفحات

کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت قسم اول ۱؍ قسم دوم ۸؍ پتہ:۔ دفتر الفرقان، بریلی،

الفرقان عرصہ سے علم و مذہب اور اصلاح عقائد و رسوم کی مفید خدمت انجام دیرہا ہے، چند مہینے ہوئے اس نے اس مقدس جماعت کے سرگروہ حضرت مولینا اسمٰعیل شہید اور حضرت مولینا سید احمد بریلوی رحمہما اللہ کی یادگار میں الفرقان کا شہید نمبر نکالا ہے، ان دونوں جلیل القدر ہستیوں نے اسلامی ہند کے اس دور زوال میں جب کہ ایک طرف مسلمانوں کی ظاہری سطوت کا چراغ گل ہو رہا تھا، اور دوسری طرف ہندی عقائد و رسوم نے اسلام کی صورت مسخ کردی تھی، ہندوستان میں ان کے خلاف علمی اور عملی جہاد کا علم بلند کیا، اور اسی راہ میں جام شہادت پیا، اگر یہ جہاد کامیاب ہوگیا ہوتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ کچھ اور ہوتی، لیکن یہ کسقدر افسوس کا مقام ہے، کہ خواص اور اہل علم کے علاوہ اچھے خاصے پڑھے لکھے مسلمان ان شہدائے حق کے حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اور بعض بے بصیرت جماعتوں نے ان کے متعلق عجیب گمراہ کن خیالات پھیلا دیئے ہیں، اسلئے ضرورت تھی کہ ان کے اعمال جلیلہ اور صحیح حالات کو مسلمانوں کے سامنے پیش کیا جائے، الفرقان کے فاضل اڈیٹر شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے شہید نمبر نکال کر اس ضروری فرض کو ادا کیا، اگرچہ یہ حالات ان بزرگوں کے کارناموں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں، تاہم سرسری واقفیت کیلئے کافی ہیں، گو ان بزرگوں کے پرانے طرز کے سوانح حیات موجود ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ کوئی باہمت بزرگ

موجودہ مذاق کے مطابق تذکرۃ الشہیدین کے نام سے ان کے حالات مرتب فرمائیں، اور ہم کو اس اعلان سے خوشی ہے کہ اسی خانوادۂ سیادت کے ایک نوجوان سعادتمند عالم مولینا ابوالحسن علی صاحب ندوی مدرس دارالعلوم ندوہ نے اس خدمت کو انجام دیدیا ہے، اور وہ عنقریب شائع ہوگی، الفرقان کے اس نمبر کے آخر کے بعض مباحث میں قلم الفرقان کے سنجیدہ طرز سے ہٹ گیا ہے، جو عموماً ایسی تحریروں میں ہوا کرتا ہے،

ادب لطیف سالانہ نمبر، مرتبہ جناب چودھری برکت علی و مرزا ادیب بی اے،

تقطیع بڑی، ضخامت ۲۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر ادب لطیف لوہاری روڈ، لاہور،

ادبی رسالوں میں ادب لطیف نہایت سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے، گذشتہ سال اس نے افسانہ نمبر نکالا تھا، اس سال کا سالنامہ اس نے ہر حیثیت سے افسانہ نمبر سے بڑھا دیا، ہر ذوق کے مضامین کا اچھا مجموعہ فراہم کیا گیا ہے، علمی اور سنجیدہ مضامین میں "ڈیڑھ سو برس پہلے کی علمی تحقیق" "مغل شہزادی جہان آرا" دنیا تذکرۂ مفید اور پر از معلومات ہیں، "مشرق پر مغرب کی یلغار" اور "ہسپانیہ میں اسلام کے نقش قدم" اگرچہ سرسری ہیں لیکن عام افادہ سے خالی نہیں، ان کے علاوہ بعض اور علمی مضامین ہیں لیکن وہ بعض نامور علماء کے مضامین سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، افسانوں میں "پریم کتھا" "آخری قدم" "شکستہ رباب" "موتمر" "ملکۂ مقرمیہ" "تین پیسہ کی چھوکری" "لاشوں کا شہر" "پڑھنے کے لائق" اور "صبح کی ڈاک" اور "درس حیات" خاصے دلچسپ ہیں، نظم کی چاشنی بھی ہے، لیکن نثر کے مقابلہ میں اس کا مزہ پھیکا ہے،

عالمگیر کا سالنامہ مرتبہ حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۱۲ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول ۳۵ء کا سالنامہ بڑے اہتمام کے ساتھ نکالا ہے، علمی، تحقیقی، ادبی افسانے ہر قسم کے مضامین کا اچھا ذخیرہ فراہم کیا ہے، ان میں مولینا عنایت رسول مرحوم چریا کوٹی کا مضمون

"غاران کی تحقیق" "تحقیق اور تبرک دونوں حیثیتوں سے لائق مطالعہ ہے، "شاہزادہ مراد بخش" "اردو نثر پر ایک نظر" "کولمبس" "خیام کے محاسن" اگرچہ سرسری ہیں، لیکن عام معلومات کے لئے خاصے ہیں، اول الذکر مضمون کے بعض پہلوؤں پر ہندوستانی میں اس سے زیادہ مبسوط اور تفصیل سے لکھا جا چکا ہے، عربوں کی جہازرانی کی اشاعت کے بعد "ابن ماجد" کے حالات اردو دان طبقہ کے لئے نئے نہیں ہیں، افسانوں میں "زمین کی تحریک" "آنسوؤں کی بوندیں" "پر عظمت" "ہر فرعونے راموسیٰ" "جہازی لٹیرن" "ایثار محبت" "قاہرہ کی ایک رات" "ناخواندہ مہمان" اور "موت کی دولھن" دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، نظموں کا حصہ بھی خاصہ ہے،

ہمایوں کا سالنامہ مرتبہ جناب شبیر احمد صاحب، بیرسٹر ایٹ لا، تقطیع اوسط ضخامت ۱۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ؍ پتہ:- لارنس روڈ لاہور،

ہمایوں جس سلامت روی کی چال چل رہا ہے، اسکی مثال بعض پرانے زمانہ کے رسائل کے علاوہ نئے دور میں نہیں مل سکتی، اسکی ترقی و تنزل میں کوئی فرق نہیں، اس کا ۳۶ء کا سالنامہ اگرچہ ظاہری زیبائش اور ضخامت میں گذشتہ سالناموں کے مقابلہ میں ہلکا ہے، لیکن معنوی اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں معلوم ہوتا، خصوصاً فاضل اڈیٹر کے قلم سے "بزم ہمایوں" میں اردو ہندی مسائل اور "جہان نما" میں سیاسیات عالم پر نہایت مفید تبصرہ ہے، اسی قلم کا مضمون "تجزیہ نفس" بھی لائق مطالعہ ہے، ان مفید مضامین کے علاوہ عام دلچسپی کے لئے افسانوں کا چٹخارہ بھی شامل ہے، "زہرہ کا عشق" "الٹ پھیر" اور "نابخت جوڑے" دلچسپ افسانے ہیں نظم کا حصہ بھی غنیمت ہے،

مشورہ آگرہ نمبر، مرتبہ جناب ضیاء اکبرآبادی تقطیع اوسط ضخامت سوا پانسو صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت مرقوم نہیں، پتہ دفتر مشورہ کٹرہ حاجی حسن آگرہ،

ارض اکبرآباد، دو متضاد اوصاف یعنی جنت سازی و جنت فروشی، اور شعر و ادب کی ایسی برابر کی حامل ہے، کہ دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا مشکل ہے مشورہ ان دونوں کمالات کا تحریری

مرقع اور آگرہ کی تجارتی، صنعتی اور ادبی ڈائرکٹری ہے، ایک حصہ میں آگرہ کی جنت سازی اور جنت فروشی کے جملہ متعلقات پر تفصیلی معلومات ہیں، دوسرے حصہ میں مختلف طبقات کے مشاہیر کا مختصر تذکرہ ہے، تیسرے حصہ میں آگرہ کی مختلف صنعتوں کا تذکرہ، اور یہاں کے علماء وکلاء اطباء تجار، صناع، اور اہل حرفہ کے نام اور پتے ہیں، چوتھے حصہ میں انہی طبقات کے ہندوؤں کے حالات ہیں، پانچویں حصہ میں جو آٹھ دوروں پر تقسیم ہے، یہاں کے قدیم وجدید شعراء اور ادباء کے حالات ہیں جس میں مشہور صوفی بزرگ حضرت ابو العلاء احراری المتوفی ۱۰۶۱ھ سے لیکر صبیح اکبرآبادی المولود ۱۳۳۶ھ خلف مدیر رسالہ تک کے تمام ادوار کے شعراء، اور ادیبوں کے حالات، ان کے کلام کا نمونہ اور بعض کی تصاویر ہیں، غرض یہ رسالہ اکبرآباد کے متعلق ہر قسم کے معلومات کا ذخیرہ بلکہ کتب خانہ ہے،

صدائے نسواں خلیل نمبر مرتبہ راجہ غلام احمد صاحب فرل وانور صاحب بزمی تقطیع اوسط، ضخامت ۱۳۶ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اوسط، قیمت مذکور نہیں، پتہ دفتر صدائے نسواں دہلی،

ابھی دوہی تین مہینہ ہوئے صدائے نسواں کا عید نمبر نکل چکا ہے، اب اوس نے خلیل نمبر نکالا ہے، جو ایک نسوانی رسالہ کو دیکھتے ہوئے بہت کامیاب ہے، مذہبی اصلاحی افسانے ہر قسم کے مفید اور دلچسپ مضامین ہیں، جن کو مرد اور عورت یکساں دلچسپی کیساتھ پڑھ سکتے ہیں لیکن خاص عورتوں کے فائدہ کے مضامین کی کمی ہے،

حکیم حاذق کا سالنامہ (سنگ جواہر) مرتبہ جناب حکیم محمد عبد الرحیم صاحب تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحات، کاغذ کتابت خراب، دفتر رسالہ حکیم حاذق، گجرات پنجاب،

یہ سالنامہ جملہ ضروری طبی معلومات کا ذخیرہ ہے اس میں عورتوں، مردوں، بچوں کے جملہ علامت الورود امراض اوران کے علاج پر مضامین اور مختلف امراض کے مجربات، ادویہ اوران کے خواص پر کافی معلومات اور مضامین ہیں، طبی نقطہ نظر سے بظاہر نہایت مفید معلوم ہوتا ہے، جس سے عام اطباء بھی فائدہ اٹھاسکتے ہیں

نئے رسالے اور اخبارات

مجلہ طیلسانئین (سہ ماہی) مرتبہ مجلس طیلسانئین جامعہ عثمانیہ تقطیع اوسط ضخامت ۱۵۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ سے عثمانی، پتہ:- دفتر طیلسانئین بازار گھانسی، حیدرآباد،

جامعہ عثمانیہ نے ایک قلیل مدت میں اپنے طلبہ اور فارغین کی جس صلاحیت واستعداد کا ثبوت دیا ہے، اس کا ایک نمونہ مجلہ عثمانیہ ہے، جو کئی سال سے نہایت کامیابی کیساتھ نکل رہا ہے، دوسرا تازہ نمونہ مجلہ طیلسانئین ہے، یہ رسالہ فارغین جامعہ عثمانیہ نے نکالا ہے، اس میں بیشتر انہی کے مضامین ومقالات شائع ہوا کرین گے، ابھی اس کا صرف ایک ہی نمبر نکلا ہے، جس سے اس کے مستقبل کا اندازہ ہوتا ہے، تمام مضامین معیاری، مفید اور پراز معلومات ہیں، امید ہے، اس کا معیار بلند سے بلند تر ہوتا جائے گا، اور وہ بہت جلد ہندوستانی زبان کے بلند پایہ رسائل میں ممتاز درجہ حاصل کریگا "طیلسانئین" کیلئے اگر کوئی خوبصورت اور ہلکا لفظ ہو سکتا، تو بڑا اچھا ہوتا، جسم ادب پر یہ لبادہ بڑا بھاری ہے،

بہارستان (ماہوار) مرتبہ جناب اختر صاحب وارثی تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت اعلیٰ قیمت سالانہ للعہ ششماہی عاز فی پرچہ ۳ر پتہ دفتر بہارستان محلہ عالی خورد جالندھر،

بہارستان ایک علمی وادبی رسالہ ہے، ابھی اس کے صرف تین نمبر نکلے ہیں، اور ہر نمبر اپنے ماقبل سے بڑھ کر ہے، مضامین کے اعتبار سے وہ اکثر رائج الوقت رسالوں سے بلند ہے، وہ محض تفریحی لٹریچر پیش نہیں کرتا، بلکہ ادبی اور تفریحی مضمونوں کے ساتھ اس میں مفید علمی اور تاریخی مضمون بھی ہوتے ہیں، اگر اسکی یہ رفتار قائم رہی، تو وہ بہت جلد ہندوستانی زبان کے سنجیدہ رسائل کی صف

میں آجائے گا،

شاہراہ۔ (ماہوار) مرتبہ جناب مولوی فصیح الزمان صاحب صدیقی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت صرف ۴ر محصولڈاک، پتہ دفتر شاہراہ لال باغ نمبر ۱۲ متصل مسجد مولوی خیرالدین بمبئی،

یہ ایک مذہبی اخلاقی اور اصلاحی رسالہ ہے، جس کا مقصد صرف مسلمانوں کی اصلاح اوران کی مذہبی خدمت ہے، اسی لئے اُس نے اپنی کوئی قیمت نہیں رکھی، اس کے مقصد کے لحاظ سے بیشتر مضامین مذہبی اور اصلاحی ہوتے ہیں، تاریخی مضامین اور افسانے بھی نظر آتے ہیں، لیکن مذہبی رنگ لئے ہوئے ایک حصہ شعروشاعری کا ہے، مگر اس میں زیادہ تر منقولات ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ مخلص خادم مسلمانوں میں مقبول ہوگا،

ہمدرد جامعہ۔ (ماہوار) مرتبہ جناب ناظم صاحب ہمدرد جامعہ تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحات کاغذ کتابت و طباعت بہتر ہمدردان جامعہ کے پاس مفت بھیجا جاتا ہے، پتہ :- جامعہ ملیہ دہلی،

کئی سال ہوئے جامعہ کے بعض مخلص کارکنوں نے جامعہ کی مالی حالت درست کرنے کے لئے ہمدردان جامعہ کے نام سے اس کے مالی معاونین کا ایک حلقہ قائم کیا تھا، یہ رسالہ اسی کا آرگن ہے جس میں جامعہ کے حالات اور قومی تعلیم پر مفید مضامین ہوتے ہیں، اور حلقہ کی ہر مہینہ کی آمدنی کا گوشوارہ ہوتا ہے،

حکیم دکن (ماہوار) مرتبہ جناب حکیم انیس احمد صاحب خیرآبادی تقطیع اوسط ضخامت ۴۸ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت سالانہ عارفی پرچہ ۴ر پتہ یونانی طبی بورڈ حیدرآباد دکن،

یہ رسالہ اعلیٰ حضرت کے جشن سیمیں کی یادگار میں حیدرآباد کے یونانی طبی بورڈ نے جاری کیا ہے،

اس میں طب یونانی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفید اور پراز معلومات مضامین اور امراض و علاج کے متعلق مفید معلومات ہوتے ہیں، امید ہے کہ یہ رسالہ حیدرآباد میں طب یونانی کی مفید خدمت انجام دیگا،

مسجد، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب سید سرور شاہ صاحب گیلانی، تقطیع اوسط اخباری ضخامت غیر معین، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ ؎ششاہی ؎سہ ماہی ؎ پتہ، دفتر مسجد مصری شاہ لاہور

اسلام کے عہد زرین میں مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز مسجد تھی، ان کے جملہ قومی اور مذہبی امور اس ایوان الٰہی میں طے ہوتے تھے، لیکن اور شعبوں میں مسلمانوں کے انتشار کیساتھ ساتھ مسجد کی مرکزیت بھی جاتی رہی، سید ولایت شاہ گیلانی نے مساجد کو دوبارہ ان کی حیثیت پر لانے کے لئے اُن کی تنظیم کی تحریک شروع کی ہے، یہ اخبار اسی تحریک کا آرگن ہے، اس تحریک کے فرائض نہایت مفید اور وسیع ہیں، جس میں مساجد کی ظاہری تنظیم کے ساتھ ائمۂ مساجد کی تعلیم و تربیت، ان کا صحیح انتخاب، خطبات کی وحدت، ان کو مفید بنانا، بیت المال کا قیام، زکوٰۃ کی تحصیل اور اسکی تنظیم، مساجد کے متعلق قرآنی مکاتیب، اور کتب خانوں کا قیام وغیرہ بہت سے اہم اُمور داخل ہیں، اگر یہ مفید تحریک مسلمانوں میں مقبول ہوجائے، تو ان کی بہت سی اجتماعی گتھیاں آسانی کے ساتھ سلجھ سکتی ہیں، اس تحریک کی اشاعت کے ساتھ یہ اخبار جمعہ میں پڑھنے کے لئے ہر ہفتہ کسی مفید مذہبی موضوع پر ایک خطبہ بھی دیتا ہے، اسکے علاوہ مختلف مفید مذہبی مضامین اور معلومات پیش کرتا ہے، بقدر ضرورت سیاسی خبریں بھی ہوتی ہیں،

صبح دکن، (ہفتہ وار) مرتبہ جناب احمد عارف صاحب و علی اشرف صاحب تقطیع اوسط، اخباری ضخامت ۱۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت سالانہ ؎ ششماہی ؎ فی پرچہ ۱؎ پتہ:۔ غالبًا دفتر صبح دکن حیدرآباد کافی ہوگا،

اعلیٰ حضرت کے جشن سیمیں کے برکات میں سے ایک برکت یہ بھی ہے، کہ اسکی یادگار میں مملکت آصفیہ میں متعدد اچھے اخبارات و رسائل کا اضافہ ہوا، انہی میں ایک صبح دکن ہے، اگرچہ ابھی اس کے

صرف چند ہی نمبر نکلے ہیں، لیکن وہ ہندوستانی زبان کے کسی بہتر سے بہتر ہفتہ وار سے کم نہیں، مضامین کے تنوع، انتخاب اور ترتیب سے سلیقہ مندی نمایاں ہے، علمی ادبی یا تاریخی مضامین، موجودہ سیاسی، اقتصادی اور دوسرے اہم مسائل حاضرہ پر تبصرہ، مملکت آصفیہ، برطانوی ہند اور بیرونی ممالک کی خبریں وغیرہ جملہ اخباری مضامین کے لحاظ سے پڑھنے کے لائق اخبار ہے، امید ہے کہ وہ دکن اور بیرون دکن ہر مقام پر قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا،

ندیم (ہفتہ وار) مرتبہ جناب محمود الحسن صاحب صدیقی، بی اے علیگ، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، ٹائٹل دیدہ زیب، قیمت سالانہ سے، ششماہی ۳/ فی پرچہ ۱/، پتہ ندیم بھوپال،

سرزمین بھوپال میں ہمیشہ سے علم و ادب کا مذاق رہا ہے، اور مختلف اوقات میں یہاں سے متعدد اچھے رسائل نکل چکے ہیں، لیکن ادھر عرصہ سے سناٹا تھا، اب ندیم پھر نوید ادب لیکر نکلا ہے، یہ ایک علمی و ادبی اخبار ہے، بقدر ضرورت سیاست سے بھی علاقہ رکھتا ہے، ہر ہفتہ علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی ہر رنگ کے اچھے مضامین پیش کرتا ہے، اہم سیاسی اخبار کا خلاصہ بھی دیتا ہے، امید ہے کہ یہ اخبار صاحب ذوق طبقوں میں مقبول ہوگا،

مسلم یونیورسٹی گزٹ (ہفتہ وار) مرتبہ وائس چانسلر در حم علی صاحب ہاشمی، تقطیع اوسط اخباری، صفحات کی تعداد متعین نہیں معلوم ہوتی، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ للعہ پتہ: مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

مسلم یونیورسٹی کے لئے کسی ایسے اخبار کی بڑی سخت ضرورت تھی، جو مسلمانوں کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرتا رہتا، وائس چانسلر صاحب نے اس ضرورت کا احساس کرکے آغاز سال (۱۹۳۷ء) سے مسلم یونیورسٹی گزٹ کے نام سے یہ ہفتہ وار جاری کیا ہے، جس میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے حالات

ہندوستان کی مختلف قوموں کی تعلیمی اور تمدنی سرگرمیاں، اور سیاست وحکمت پر مضامین اور عالم اسلامی کی خبریں ہوا کریں گی، ابھی غالباً ابتدائی مراحل کیوجہ سے ان مقاصد کی پوری پابندی نظر نہیں آتی، مگر امید ہے کہ وہ بہت جلد مسلم یونیورسٹی کے معیار پر آجائے گا، چند صفحات انگریزی کے بھی ہوتے ہیں،

قوم (ہفتہ وار) مرتبہ جناب ابوسعید عبد القیوم صاحب، تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۲ صفحات، قیمت مرقوم نہیں، پتہ نمبر ۵ ۱۵ ابریلی اسٹریٹ بنگلور،

یہ اخبار بنگلور سے نکلتا ہے، ہفتہ وار اخباروں میں خاصہ ہے، ہفتہ بھر کی سیاسی خبریں اور مختلف ممالک کے اہم سیاسی حالات دیتا ہے، کبھی کبھی بعض مستقل اور مفید مضامین بھی نظر آتے ہیں، اہم حوادث پر تبصرہ ہوتا ہے، مجموعی حیثیت سے پڑھنے کے لائق ہوتا ہے،

آئینہ (ہفتہ وار) مرتبہ جناب قاضی محمد حامد صاحب حسرت، تقطیع اخباری ضخامت ۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت سالانہ سے ششماہی ہے، سہ ماہی عارضی ہر چار، پتہ دفتر آئینہ فیض آباد،

یہ اخبار ابھی تھوڑے دنوں کو جاری ہوا ہے، اگرچہ وہ ظاہری شکل وصورت میں اچھے ہفتہ وار اخبارات سے کم نہیں ہے لیکن خبروں اور مضامین کے لحاظ سے ابھی بالکل ابتدائی منزل میں ہے، سیاسی خبروں کا حصہ بہت کم ہوتا ہے کبھی کبھی ادبی مضامین اور عام معلومات کی بعض چیزیں بھی نظر آتی ہیں، لیکن ابھی اسکو بہت ترقی دینے کی ضرورت ہے،

شیرازہ (ہفتہ وار) مرتبہ جناب محمود فضل صاحب بی اے تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۱۰ صفحات کاغذ معمولی کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ سے ششماہی ہے، پتہ برکت علی روڈ دل محمد اسٹریٹ لاہور

شیرازہ ایک ادبی اور مزاحیہ اخبار ہے، بیشتر مضامین میں خاصی ظرافت کی چاشنی ہوتی ہے لیکن کہیں کہیں ذرا تیز ہو کر پھیکی پڑ جاتی ہے، خوش قسمتی سے اسکو سالک صاحب جیسے صاحب سلوک بزرگ اور سندباد جہازی جیسے تجربہ کار دریائی مسافر کی رہبری کا فخر ہے، حوادث وافکار اور اشارات خصوصیت کیساتھ زیادہ پر لطف ہوتے ہیں، امید ہے کہ زندہ دل اصحاب اس پیغام طرب کا گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے،

مطبوعاتِ جدیدہ

قنوطیت یعنی فلسفہ یاس

از جناب میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا استاذ فلسفہ جامعہ عثمانیہ، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۰۰ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت معلوم نہیں، مصنف سے ملے گی۔

یہ مسئلہ کہ دنیا میں رجائیت اللذت اور خیر زیادہ اور اصل شے ہی، یا قنوطیت الم اور شر زمانہ قدیم سے مختلف فیہ چلا آتا ہے، ہر دور میں دونوں خیال کے حکما رہے ہیں، اور دوسرے خیال کے حکما کی تعداد زیادہ ہے حتیٰ کہ یہ مادی دور بھی جبکہ ساری دنیا تعیش اور مادیات کے سیلاب میں بہی چلی جا رہی ہے، ایسے حکماء سے خالی نہیں، فاضل مصنف نے اس کتاب میں فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں اخلاقی نظری، اور تاریخی دلائل اور حکمائے مغرب کے اقوال وآراء سے دکھایا ہے، کہ اصل شے یاس اور قنوط ہے، دنیا اسباب الم سے بھری ہوئی ہے، جہاں سکون ومسرت کا نام نہیں، پھر ان دلائل پر تنقید کرکے ان کی قوت دکھائی ہے، آخر میں حقیقی مسرت کا راز ظاہر کیا ہے، اگرچہ اس کتاب میں اس مسئلہ پر خالص فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بحث ہے، لیکن ایک حد تک یہ مسئلہ مذہبی بھی ہے، دنیا کے تقریباً تمام مذاہب نے مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے، بعض مذاہب کی تو یہ اساسی تعلیم ہے، کہ دنیا صرف دار المحن ہے، جہاں لطف ومسرت کا نشان نہیں، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ رنج والم کے ہجوم کے مقابلہ میں حقیقی مسرت کا وجود بہت کم ہے، جو چیزیں ہم کو بظاہر سامانِ مسرت معلوم ہوتی ہیں، وہ بھی محض آنی اور اعتباری ہیں اوران کا خمیازہ ان سے کہیں زیادہ سخت ہی، لیکن اس حقیقت کو مان لینے کے بعد کارخانہ عالم درہم ہوا جاتا تھا، اس لئے بعض مذاہب نے اس میں یہ اعتدال پیدا کر دیا، کہ اگرچہ دنیا دار المحن ہے لیکن خالق تو نہیں

کی پابندی سے سکون قلب حاصل ہوسکتا ہے، اور یہی اصل حقیقت ہے، اسی حقیقت کو لائق مصنف نے نہایت دلنشین اور فلسفیانہ انداز میں پیش کیا ہے، موقع بہ موقع حکیمانہ اشعار کی آمیزش نے انداز بیان کو زیادہ موثر بنا دیا ہے، کتاب اس لائق ہے کہ نہ صرف فلسفہ کی حیثیت سے بلکہ ایک دلکش حقیقت کی حیثیت سے اس کا مطالعہ کیا جائے،

مقالہ تحفظ علوم قدیمہ از جناب سید محمد ہاشم صاحب ندوی رکن دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر پتہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن

یہ مقالہ مولینا ہاشم صاحب ندوی نے آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس کے میسور کے اجلاس میں پڑھا تھا اس میں علوم وفنون کے آغاز ان کی عہد بعہد کی ترقی اور تنزل کی اجمالی سرگزشت بیان کی گئی ہے پہلے علم وفن کے قدیم گہواروں، بابل، فارس اور یونان کی علمی ترقی وتنزل کے مختصر حالات ہیں، پھر اسلامی دور میں امویہ دمشق، عباسیہ بغداد اور امویہ اندلس کے علمی خدمات اور ان کے عہد کی علمی ترقیوں کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ہے، اس سلسلہ میں ابن رشد اور ابن سینا کے فلسفہ اور اسکے اثرات بھی آگئے ہیں، پھر عربی کتابوں کے لاطینی تراجم، مشرقی علوم سے مستشرقین کی دلچسپی، یورپ میں ابن رشد اور ابن سینا کے فلسفہ کی اشاعت ومقبولیت، مشرقی سوسائٹیوں اور درسگاہوں کے قیام اور بعض مستشرقین کے علمی خدمات کا تذکرہ ہے، پھر ان کے اثر سے مصر میں مشرقی علوم سے دلچسپی، اور نوادر کتب کی طبع واشاعت کا مختصر ذکر ہے، پھر ہندوستان کے مشرقی علوم کے اداروں کے حالات ہیں، اس ضمن میں بعض ان علماء کے نام بھی آگئے ہیں، جنھوں نے اپنے ذاتی شوق سے نوادر کتب شائع کئے، آخر میں دائرۃ المعارف کی جو ہندوستان میں عربی نوادر کتب کی اشاعت کا تنہا ادارہ ہے، تاریخ اور اس کے تفصیلی حالات، اس کے کارکنوں اور رفقاء کے نام اور اسکے مطبوعات کی فہرست ہے، اس طرح یہ مقالہ علوم کی تاریخ پر ایک مفید تبصرہ ہے،

علامہ شبلی بحیثیت شاعر از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی تقطیع اوسط

ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ سپید دبیز ٹائپ صاف و روشن قیمت مرقوم نہیں، پتہ قاضی احمد میاں اختر جوناگڈھ کاٹھیاوار،

مولینا شبلی کی علمی خدمات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت پر اب تک کسی نے مستقل نہیں لکھا، قاضی احمد میاں نے اس مقالہ میں جسکو انھوں نے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کے جلسہ میں پڑھا تھا، اس فرض کفایہ کو ادا کیا ہو، یہ مقالہ مولینا مرحوم کی شاعری پر سیر حاصل تبصرہ ہے، مولینا مرحوم کی شاعرانہ فطرت اور ان کی شاعری کے محرکات اور اسباب کو دکھانے کے بعد انکی اردو شاعری پر جس کا بڑا حصہ بلکہ تقریباً کل مذہبی قومی سیاسی اور تاریخی نظموں اور بعض وقتی منظومات پر مشتمل ہو، تفصیلی تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ اگرچہ اس صنفِ شاعری کے موجد دوسرے بزرگ تھے، لیکن اس خشک اور بے مزہ واقعہ نگاری میں مولینا نے شاعرانہ لطافتیں اور آب و رنگ پیدا کرکے اس کو واقعی شاعری بنا دیا، اس سلسلہ میں مولینا کے سیاسی خیالات اور اس عہد کے بعض واقعات بھی آگئے ہیں، جو بجائے خود مولینا کے خدمات کا ایک اہم پہلو ہیں، آخر میں مولینا شبلی اور مولینا حالی کی شاعری کا موازنہ کرکے دونوں کا فرق واضح کیا گیا ہے،

تقریر سیرت، مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء تقطیع اوسط، ضخامت ۲۶۲ صفحات کاغذ معمولی کتابت وطباعت اچھی قیمت ۱۲؍، پتہ دفتر اخبار انصاری بلیماران دہلی،

مولینا احمد سعید صاحب نے ناگپور کے جلسۂ سیرت کے موقع پر یہ تقریر فرمائی تھی، جسے اب ادارۂ اخبار انصاری نے کتابی صورت میں شائع کیا ہو، اس میں مذہب، اخلاق، تہذیب، معاشرت کی دینی تعلیمات اور سیاست و اقتصادیات وغیرہ کے مسائل حاضرہ بیان کئے گئے ہیں، رنگ واعظانہ ہو، جا بجا لطیفوں چٹکلوں اور قصص و حکایات کی آمیزش نے اسکو زیادہ پرلطف بنا دیا ہو، مولینا کی تقریر کے قدردانوں کیلئے جنھیں خود انکی زبان سے سننے کا کم موقع ملتا ہو یہ کتاب دلچسپ تحفہ ہو، اس تقریر سیرت میں چند صفحے اردو شعر و ادب پر ہیں، ان میں مشہور شاعر جرأت کا نام بھی امان لیا گیا ہو، حالانکہ تذکروں میں قلندر بخش لکھا ہو، زیب النساء کی طرف جو شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ حقیقت میں صیدی کا ہے،

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۵۷ مئی سنہ ۱۹۳۷ء

معارف

مجلس المصنفین دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۳۹ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۷ء

مضامین

شذرات

ذیحجہ ۱۳۵۵ھ کے معارف مین "ذبح عظیم" پر جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کو پڑھکر میرے ایک خیرخواہ دوست نے مجھے لکھا ہے کہ آپنے "ذبح عظیم" کی تفسیر رویائے تمثیلی مانکر روحانی قربانی کرنے مین غلطی کی ہے، اس سے بعض اسلامی مسائل پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہے، جب مین نے اس نظر سے مضمون مذکور کو پڑھا تو مجھے بھی اپنی غلطی محسوس ہوئی اور ظاہر ہوا کہ میرا اصلی مقصود واضح نہین ہوا، بلکہ نقصِ تعبیر سے مضمون مذکور مین تضاد سا پیدا ہوگیا ہے، یعنی یہ کہ ایک طرف بعض مفسرین کی تفسیر کے مطابق "ذبح عظیم" سے سنتِ اضحیۂ اسلام کو مراد لینا صحیح بتایا ہے، اور آگے بڑھکر اس سے روحانی قربانی مراد لی ہے، مین اپنی اس غلطی سے شرمندہ ہون، خدا معاف فرمائے،

میرا اصلی مقصود یہ تھا کہ "ذبحِ عظیم" کی صحیح تفسیر جانور کی وہی قربانی ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ذبیح بیٹے کے بدلہ مین کی تھی اور جو ملتِ ابراہیم مین سنت قرار پائی، مگر یہ قربانی درحقیقت جس طرح ان مقدس باپ بیٹون کی ربانی اطاعت و فرمانبرداری اور جانسپاری کی تمثیل تھی، ایسے ہی آج بھی اسلام مین یہ قربانی مسلمانون کے انہی جذبات کی تمثیل ہے، یہی وجہ ہے کہ قربانی کرتے وقت حضرت ابراہیمؑ والی یہ دعا ہم پڑھتے ہین،

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ	میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کیلئے
رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ	ہے جو عالم کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہین
أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (انعام - ۲۰)	اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور مین فرمانبردارون مین پہلا ہون

عام مسلمان کہتے ہیں وانا من المسلمین (اور مین مسلمانون میں سے ہون) کیونکہ اس راہ کی اولیت و پیشوائی حضرت

ابرہیم کیلئے ہے اور عام مسلمان اس مین ان کے متبع اور پیرو ہیں،

اور اسی لئے اللہ تعالی نے مسلمانون کی قربانی کی غرض و غایت مسلمانون کی دلی کیفیت یعنی تقوی کو قرار

دیا ہے، فرمایا،

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ — خدا کو قربانی کا گوشت اور خون نہین پہنچتا

يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ، (حج - ۵) — بلکہ تمھارا تقوی پہنچتا ہے،

ہمارے ہان تاریخ ہند کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اسکی پہلی جلد تاریخ سندھ پر مشتمل ترتیب پا چکی ہے، آب

غزنویہ کا دور زیر تالیف ہے بمبئی کے ایک مرحوم مسلمان ہیڈ ماسٹر کے ترکہ سے اسکی تیسری جلد کے لئے پروفیسر سید

نجیب اشرف ندوی کے ذریعہ سے مرحوم کے عزیزون نے پانچ سو روپیے دینا منظور کیا ہے، جس مین سے

ڈھائی سو کا چک دفتر میں وصول ہوچکا ہے، اللہ تعالی مرحوم کو مغفرت، اور ان کے عزیزون کو اسکا اجر عطا فرمائے،

صحابہ رضی اللہ عنہم کے بعد اسلام کی تاریخ کا سب سے درخشان عہد حضرات تابعینؒ کا ہے، سیر الصحابہ کے بعد

دار المصنفین کے رفیق مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب نے تابعین کے سوانح پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے

جو اس سال پریس مین چھپنے کو جارہی ہے،

سلف امت نے خدا اُن پر رحمت فرمائے اپنے پچھلون کے لئے علم و فضل کی جو یادگارین چھوڑی

ہین حق یہ ہے کہ وہ اسلام کا معجزہ ہین، علماے اسلام مین جس قدر اپنے بزرگون کے متروکات کی قدر بڑھتی

جاتی ہے، یہ کنز مخفی" اپنے گوشون سے نکل کر وقف عام ہو رہا ہے، افسوس ہوتا ہے کہ زمانہ کی ناقدری سے جب ان علوم میں خزان کا دور ہے، ان کی کتابوں کی اشاعت کا موسم بہار ہے،

اسلام کے مسائل مالیہ میں ایک مدت تک صرف قاضی ابو یوسفؒ کی کتاب الخراج لوگون کے ہاتھون مین رہی، کچھ سال ہوے کہ اسی بحث پر ۱۳۴۷ھ مین یحییٰ بن آدم قرشی المتوفی ۲۰۳ھ کی کتاب الخراج مطبعۂ سلفیہ مصر سے چھپ کر شائع ہوئی، اس کے بعد دائرۃ المعارف حیدرآباد سے قاضی ابو یوسف اور امام زفر کے شاگرد ہلال بن یحییٰ بن مسلم رائی کی کتاب الوقف منظر عام پر آئی، اور اب ابو عبید قاسم بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ کی کتاب الاموال شائع ہوئی ہے، ازہر کے ایک فاضل عالم محمد حامد الفقی نے اس کی تصحیح کی ہے اور اس پر مفید حاشیے لکھے ہین، اسلام کے مالی مسائل پر ایسی وسیع اور مفید تصنیف کوئی نہیں شائع ہوئی، تعجب ہوتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے کیسے کیسے اچھے اور اچھوتے مضمونون پر کیسی عمدہ عمدہ کتابین لکھی ہیں،

مارچ کے شذرات مین انگریزی اسکولون اور کالجون کے مسلمان طالب علمون مین عربی زبان کی تعلیم کی نسبت جو کچھ لکھا گیا تھا، اسکی نسبت ہم سے پوچھا گیا ہے کہ عربی صرف و نحو کو آسان طریقہ سے پڑھنے کی کیا صورت ہے، اس کا مفصل جواب تو مستقل مضمون کا طالب ہے، مگر مختصر یہ ہے کہ صرف و نحو کو نظری کے بجاے عملی حیثیت سے پڑھایا جاے جس کا ایک اسلوب خاص مولانا حمید الدین صاحب کی اسباق النحو اور ہماری دروس الادب مین بتایا گیا ہے، دار العلوم ندوہ، اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر مین اس کا کافی کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے،

مقالات سیرت

خلیل اللہ کی بشریت

حضرات انبیائے کرام کے اوصاف غالبہ

(۲)

نمرود کی آگ اُن کے لئے ٹھنڈی ہو جاتی ہے، اور ندا آتی ہے، کہ سلامتی ہو ابراہیم کی سَلٰمًا عَلٰی اِبْرٰهِیْمَ بت پرست باپ کو سمجھاتے ہیں نہیں مانتا، اور کفر پر اڑا رہتا ہے، تو اس کو خدا کا ڈر بلکے لفظوں میں سناتے ہیں،

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یَّمَسَّكَ	اے میرے باپ میں ڈرتا ہوں کہ
عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ	تجھے رحمت والے خدا کی طرف سے کوئی عذاب
لِلشَّیْطٰنِ وَلِیًّا،	نہ چھوئے تو تو شیطان کا ساتھی بنے،

(مریم ۳)

باپ نے یہ سن کر بیٹے کو سزا کی دھمکی دی، اور گھر سے نکل جانے کا حکم دیا، بیٹا اب بھی باپ کی خیرخواہی میں مصروف ہے، سلام کرتا ہے، اور اپنے خدا سے اس کے گناہوں کی معافی کیلئے دعا کا وعدہ کرتا ہے،

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ سَاَسْتَغْفِرُ	ابراہیمؑ نے کہا تم پر سلامتی ہو، میں
لَكَ رَبِّيْ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا وَ	تمہارے لئے اپنے رب سے دعا مانگونگا
اَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ	کہ تمہارے گناہ معاف فرمائے، وہ
دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ عَسٰى	مجھ پر مہربان ہے، اور میں تم سے اور
اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا	تمہارے معبودوں سے الگ ہوتا ہوں
(مریم ۳)	اور اپنے رب سے دعا کرتا ہوں، اور
	امید ہے کہ میں اس دعا میں بے نصیب نہ رہونگا

حضرت ابراہیمؑ نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا، اور بارگاہ الٰہی میں عرض کی،

رَبَّنَا اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَ	اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے
لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَوْمَ يَقُوْمُ الْحِسَابُ،	ماں باپ اور ایمان والوں کو اس دن
(ابراہیم ۶)	بخشدے جب حساب کتاب قائم ہو،

یہ بشارت کی پے درپے التجا کافر باپ کے حق میں ہے، اور جب آنحضرت صلعم کو اور مسلمانوں کو مشرکوں کی مغفرت کی دعا مانگنے کی ممانعت آئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے اس فعل کی توجیہ فرمائی،

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ	اور ابراہیمؑ کا اپنے باپ کی مغفرت
لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَا	کی دعا مانگنا نہ تھا، مگر وعدہ کے سبب
اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ	جو اُس نے اس سے کیا تھا، پھر جب
لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ	ابراہیمؑ پر ثابت ہوگیا، کہ وہ اللہ کا دشمن
لَاَوَّاهٌ حَلِيْمٌ (توبہ ۱۴)	ہے تو وہ اس سے الگ ہوگیا، بیشک ابراہیم بڑے نرم دل اور بردبار تھے

اس آیت پاک سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا اس توقع میں تھی کہ ان کا باپ مسلمان ہو کر رحمتِ الٰہی کا مستحق ٹھہرے، لیکن ان کی یہ توقع درست نہیں نکلی، دوسری بات یہ کہ حضرت ابراہیمؑ چونکہ کمال بشریت سے ممتاز تھے، اس لئے خدا نے ان کی نرم دلی اور بردباری کی تعریف فرمائی،

اس طرح حضرت لوطؑ کی قوم کی تباہی کی خبر جب مہمان فرشتوں نے ان کو سنائی تو ان کو بڑا صدمہ ہوا، اور بارگاہِ الٰہی میں اس کی طرف سے عرض معروض کرنے لگے، تو خدا نے پھر ان کی نرم دلی اور بردباری اور حق ظاہر ہونے کے بعد انکے رجوعِ حق کی مدح فرمائی،

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ	تو جب ابراہیم سے خوف جاتا رہا،
الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى	اس کو (اولاد کی) بشارت مل چکی ہم
يُجَادِلُنَا فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ	سے لوطؑ کی قوم کے بارے میں جھگڑنے لگا،
لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ	بیشک ابراہیم بردبار، نرم دل اور رجوع
اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ	کرنے والا تھا، (خدا نے فرمایا) اے
اَمْرُ رَبِّكَ وَاِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ	ابراہیم اس خیال کو چھوڑ دے، تیرے
عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ،	رب کا حکم آچکا، اور لوطؑ کی قوم کو وہ عذاب
(ہود - ۷)	آنے ہی والا ہے، جو واپس نہ ہوگا،

حضرت ابراہیمؑ قوم لوطؑ کی طرف سے کیونکر جناب باری سے جھگڑنے لگے، ایک دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ حضرت لوطؑ کو پیش کر کے رحمتِ الٰہی کے خواستگار ہوئے،

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ	جب ہمارے فرشتے ابراہیم کے
بِالْبُشْرٰى قَالُوْۤا اِنَّا مُهْلِكُوْۤا اَهْلِ	پاس (اولاد کی) بشارت لے کر آئے،

هٰذِهِ الْقَرْيَةِ إِنَّ أَهْلَهَا كَانُوا ظَالِمِينَ قَالَ إِنَّ فِيهَا لُوطًا قَالُوا نَحْنُ أَعْلَمُ بِمَنْ فِيهَا لَنُنَجِّيَنَّهُ وَأَهْلَهُ إِلَّا امْرَأَتَهُ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ

(عنکبوت ۴)

انھوں نے بیان کیا کہ ہم اس آبادی کے رہنے والوں کو ہلاک کرنے آئے ہیں، بیشک وہ ظالم ہیں، ابراہیم نے کہا اس گاؤں میں لوط ہیں، انھوں نے کہا کہ ہم کو خوب معلوم ہے، جو اس میں ہیں، ہم ان کو اور ان کے گھر والوں کو بچا لیں گے، لیکن انکی بیوی

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے اسی عرض و معروض کا یہ نتیجہ تھا کہ حضرت بارگاہِ الٰہی سے ان کو یہ خوشخبری سنائی گئی، اور ہمیشہ کے لئے یہ قانونِ الٰہی قرار پایا کہ ایک کی بُرائی کا بوجھ دوسرے پر لادا نہ جائے،

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

(نجم ۳)

کیا انھیں بتایا نہیں گیا، جو موسیٰ کے اور اس ابراہیم کے صحیفوں میں ہے، جس نے پورا حق ادا کیا، کہ کوئی شخص دوسرے شخص کا بوجھ نہیں اٹھائیگا، اور یہ کہ انسان کے لئے نہیں ہے، بلکہ

سورۂ انعام کے آخر میں حضرت ابراہیمؑ کے تعلق سے یہ آیت پھر آتی ہے، آنحضرت صلعم کو ارشاد ہوتا ہے، کہ کہدے کہ ہم تو ابراہیم کے دین کے پیرو ہیں، جس کا مسلک یہ تھا،

قُلْ إِنَّنِي هَدَانِي رَبِّي إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ دِينًا قِيَمًا مِلَّةَ

کہدے کہ مجھے میرے رب نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے، سیدھا دین ابراہیم

إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ	کو دین جو موحد تھا، اور مشرکوں میں سے
الْمُشْرِكِينَ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي	نہ تھا، کہدے کہ میری نماز میری قربانی
وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ	میرا جینا، میرا مرنا، عالم کے پروردگار
الْعَالَمِينَ، لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ	اللہ کے لئے ہے، اس کا کوئی شریک
أُمِرْتُ وَأَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ قُلْ	نہیں، اور اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے
أَغَيْرَ اللَّهِ أَبْغِي رَبًّا وَهُوَ رَبُّ	اور میں مسلمانوں کا پہلا ہوں، کہدے
كُلِّ شَيْءٍ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ	کہ کیا خدا کے سوا کسی اور کو پروردگار
إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ	چاہوں، حالانکہ وہی تو ہر شے کا رب
وِزْرَ أُخْرَىٰ،	ہے، اور ہر جان کی کمائی اسی پر ہے
(انعام - ۲۰)	کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا بوجھ

یہ سب وہی باتیں ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کے صحیفے میں تھیں، اور ان کا اعادہ صحیفۂ محمدی میں کیا جا رہا ہے،

میرا خیال ہے کہ توراۃ کا صحیفۂ پیدائش ہی حضرت ابراہیمؑ کے اس عرض و معروض کی پوری تفصیل ہے، جو انھوں نے حضرت لوطؑ کی قوم کے بارہ میں بارگاہ الٰہی میں پیش کی۔

"ابراہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا، تب ابراہام نزدیک جاکے بولا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کرے گا، شاید پچاس صادق اس شہر میں ہوں، کیا تو اسے ہلاک کرے گا اور ان پچاس صادقوں کی خاطر جو اس کے درمیان ہیں اس مقام کو نہ چھوڑے گا، ایسا کرنا تجھے بعید ہے، کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا، اور خداوند نے کہا کہ اگر میں سدوم (قوم لوط کا شہر) میں شہر کے درمیان پچاس صادق پاؤں تو میں ان کے واسطے تمام مکان کو

چھوڑ دوں گا، تب ابراہام نے جواب دیا اور کہا، اب دیکھ میں نے خداوند سے بولنے میں جرأت کی، اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں، شاید پچاس صادق سے پانچ کم ہوں، کیا ان پانچ کے واسطے تو تمام شہر کو نیست کرے گا۔ اور اس نے کہا اگر میں وہاں پینتالیس پاؤں تو نیست نہ کروں گا، پھر اوس نے اوس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس پائے جائیں، تب اوس نے کہا کہ میں اُن چالیس کے واسطے نہ کروں گا، پھر اوس نے کہا میں منت کرتا ہوں، کہ اگر خداوند خفا نہ ہوں تو میں پھر کہوں، شاید وہاں تیس پائے جائیں، وہ بولا اگر میں وہاں تیس پاؤں تو میں یہ نہ کروں گا، دیکھ میں نے خداوند سے بات کرنے میں جرأت کی، شاید وہاں بیس پائے جائیں، وہ بولا میں بیس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا، تب اوس نے کہا میں منت کرتا ہوں کہ خداوند خفا نہ ہون، تب میں فقط اب کی بار پھر کہوں، شاید وہاں دس پائے جائیں، وہ بولا میں دس کے واسطے بھی اُسے نیست نہ کرونگا، جب خداوند ابراہام سے باتیں کر چکا، تو چلا گیا، اور ابراہام اپنے مقام کو پھرا "

(باب ۸ - ۲۳ سے ۳۳ تک)

تورات کے اس بیان سے اس جدال کی پوری تفصیل معلوم ہوتی ہے، جو وہ بار بار سدوم کے گنہگاروں کو بچانے کے لئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے تھے، اور اس نرم دلی، بردباری، اور رجوع حق کی تصدیق ہوتی ہے، جس سے قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کو متصف کیا ہے، اور ان آیاتِ الٰہی کی تصدیق ہوتی ہے، جن کو قرآن نے صحیفۂ ابراہیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے، اور حضرت ابراہیمؑ کی اس شانِ بشریت کا اظہار ہوتا ہے، جو جلالِ الٰہی کا پرتو تھی،

حضرت ابراہیمؑ جب کعبہ کی تعمیر سے فراغت پاتے ہیں، اور اپنی اولاد کو اس کی پاسبانی کے لئے بارگاہِ الٰہی میں پیش کرتے ہیں، اور دعا کرتے ہیں، کہ اس بے آب ودانہ بنجر زمین میں خداوندا اسکو تیرے گھر کی پاسبانی اور تیرے دین کی حفاظت کی خاطر بساتا ہوں، خداوندا ان کو روزی دینا، ان میں

اپنا رسول بھیجا، ان کو بتوں کی پوجا سے بچانا،

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ	اور جب ابراہیم نے کہا کہ اے
ھٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ	میرے پروردگار اس شہر کو امن والا
اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ رَبِّ اِنَّھُنَّ	بنا، اور مجھے اور میری اولاد کو اس
اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ	سے بچا، کہ وہ بتوں کو پوجیں، خداوندا
تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ	ان بتوں نے بہت لوگوں کو گمراہ
فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ٥	کیا، تو جو میری پیروی کرے وہی
(ابراہیم - ۶)	مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی
	کی، تو بے شک تو بخشنے والا رحمت والا

یہ خدا کی بخشش و رحمت کی تحریک کن کے لئے ہو رہی ہے، ان کے لئے جو بت پرست ہو کر ان کی نافرمانی کریں،

یہ ہے حضرت ابراہیمؑ کی بشری شان،

صحابہ میں ان کے جلوے، اوپر کی سطروں میں انبیاء علیہم السلام کی نذیریت اور بشیریت کی جو تشریح کی گئی ہے، وہ میری نہیں بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان حق ترجمان سے ادا ہوئی ہے، غزوۂ بدر میں جب کفار قریش گرفتار ہو کر آئے، تو آنحضرت صلعم نے صحابہ سے مشورہ طلب کیا حضرت عبد اللہ بن رواحہؓ نے کہا کہ ان کو آگ میں جلا دیا جائے، اور حضرت عمرؓ نے کہا ان کو قتل کر دیا جائے، لیکن حضرت ابو بکرؓ نے عرض کی کہ یا رسول اللہ یہ آپ کے خاندان اور قوم کے ہیں، ان پر رحم فرمائیے، آپ نے ان دونوں فریق کے مشورہ کو سنکر فرمایا، کہ ایک فریق اپنے پہلے بھائیوں نوحؑ اور موسیٰؑ کی طرح ہے، نوحؑ نے کہا تھا پروردگار زمین پر کافروں

میں سے کسی گھر بسانے والے کو مت چھوڑ" اور موسیٰ نے کہا ہمارے پروردگار ان کی دولت مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے" اور دوسرا فریق ابراہیم کی طرح ہے، ابراہیم نے کہا جس نے میری پیروی کی، وہ مجھ سے ہے، اور جس نے میری نافرمانی کی، تو تو بخشنے والا اور رحم والا ہے" اور عیسیٰ کی طرح ہے، کہ عیسیٰ نے کہا کہ اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں، اور اگر تو ان کو معاف کر دے تو تو قدرت والا اور حکمت والا ہے، (مستدرک حاکم ۳ ص ۲۱ و ۲۲)

اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے عبد اللہ بن رواحہ اور حضرت عمرؓ کو حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی نذیری شان، اور حضرت ابو بکرؓ کو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی بشیری شان کی مثال ظاہر فرمایا اس تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ بشیریت و نذیریت کے کمال سے کیا منشا ہے،

عام طور سے ہر نبی نذیر اور بشیر ہے، | اس بیان سے کسی کو یہ شبہہ نہ ہو کہ اس مضمون کا منشا نعوذ باللہ یہ ہے کہ کوئی نبی صرف مبشر یا کوئی نذیر صرف اس معنی میں ہوتا ہے، کہ ایک صرف بشارت سناتا ہے، اور دوسرا صرف انذار کرتا ہے، بلکہ یہ منشا ہے کہ کسی نبی میں عام وصف انذار کے ساتھ مبشریت کا کمال ہوتا ہے، اور کسی میں مبشریت کے عام وصف کے ساتھ نذیریت کا کمال ہوتا ہے، ورنہ خود اللہ تعالیٰ نے بلا استثناء تمام پیغمبروں کو مبشر و نذیر ایک ساتھ فرمایا ہے، لیکن اس بشیریت و نذیریت کے معنی واضح بھی فرما دیئے ہیں جو عام وصف بشیر و نذیر کی حقیقت ہیں، فرمایا،

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا	اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو لیکن
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ .	بشارت سنانے والے اور ڈر سنانے والے

یہ بشارت کیا ہوتی ہے، اور یہ ڈر سنانا (انذار) کیسے ہوتا ہے، آیت بالا کے ساتھ ہی اس بشارت اور انذار کی یہ تشریح ہے،

فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ	تو جو ایمان لایا اور اچھے کام کئے

عَلَیۡھِمۡ وَلَا ھُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ وَالَّذِیۡنَ | تو ان کو نہ ڈر ہوگا، اور نہ غم، اور
کَذَّبُوۡا بِاٰیٰتِنَا یَمَسُّھُمُ الۡعَذَابُ | جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا،
بِمَا کَانُوۡا یَفۡسُقُوۡنَ ۝ | ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سے
(انعام - ۵) | عذاب چھوئے گا،

لیکن بشیریت یا نذیریت کے اوصافِ غالبہ جن پیغمبروں کو ملتے ہیں، ان کی بشیریت اور نذیریت کی شان اس سے بہت بلند ہوتی ہے، جس کی مثالیں ایک طرف حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ میں، دوسری طرف حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ میں نظر آتی ہیں، اور دونوں کا مجموعہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ پاک میں، صلوٰت اللہ علیھم اجمعین،

یہ جمال وجلال کے پرتو ہیں، کسی نبی میں شانِ نذیری کا غلبہ، اور کسی نبی میں شانِ بشیری کا کمال باہم ایک دوسرے پر ترجیح کا سبب نہیں، انبیاء علیہم السلام کے یہ دونوں اوصاف اللہ تبارک وتعالیٰ کی شانِ جلال وجمال کے مظہر ہیں، کسی میں جلالی شان کی چمک زیادہ ہوتی ہے، اور کسی میں جمالی شان کی، جب اور جس زمانہ میں حکمتِ الٰہی کا اقتضاء جلال یا جمال میں جس شانِ کمال کا اظہار ہوتا ہے، وہ اسوقت کے پیغمبروں میں ظاہر فرماتا ہے، دونوں اسکی شانیں ہیں، اور دونوں اس کے اسماے حسنیٰ،

اَلۡمَلِکُ الۡقُدُّوۡسُ السَّلٰمُ الۡمُؤۡمِنُ الۡمُھَیۡمِنُ الۡعَزِیۡزُ الۡجَبَّارُ الۡمُتَکَبِّرُ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ۝

عالمگیر کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب رفیق دارالمصنفین

"جسمانی ہمت اور بروت کے علاوہ اس نے اوائل زندگی ہی سے بادشاہت کی مشقتوں اور خطروں کو اپنا شیوہ بنا لیا تھا، اور اس عظیم الشان عہدہ کے لئے احترام ذات، معرفت ذات اور ضبط نفس سے اپنے کو تیار کیا، بادشاہوں کے لڑکوں سے بالکل مختلف، اورنگ زیب ایک وسیع النظر اور صحیح الطبع عالم تھا، اور زندگی کی آخری سانس تک کتابوں سے محبت کرتا رہا، اگر ہم قرآن شریف کے ان متعدد نسخوں کو نظر انداز بھی کر دیں جنکو اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک عابد کی سرگرم ریاضت کیساتھ لکھا، تو بھی ہم اسکو فراموش نہیں کر سکتے، کہ وہ ایک مشغول حکمراں ہونے کے باوجود اپنی قلیل فرصت کو عربی کی فقہ اور مذہبی کتابوں کے مطالعہ میں شوق سے گذارتا، اور پرانے اور نادر مخطوطات مثلاً نہایہ، احیاء العلوم اور دیوان صائب کو کتابوں کے ایک کامل عاشق کی ہوس سے ڈھونڈتا، اس کے کثیر رقعات اس کی فارسی شاعری اور عربی ادب پر قدرت کی دلیل ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ اپنے ہر ایک خط کو مناسب اشعار و اقتباسات سے مزین کرتا ہے، عربی اور فارسی کے علاوہ وہ ترکی اور ہندی بھی آزادی کے ساتھ بول سکتا تھا، یہ اسی کی جودت طبع اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے پاس ہندوستان میں مسلمانوں کے قانون کا سب سے بڑا خلاصہ فتاویٰ عالمگیری ہے جو نہایت مناسب طور پر اسی کے نام کیا گیا تھا

منسوب ہے، اور جس نے مابعد کے عہد میں ہندوستان میں اسلامی انصاف کو واضح طور پر صاف کرکے آسان کردیا ہے[۱]

یہ الفاظ اورنگ زیب کے اس سیرت نگار کے ہیں جس نے اس کے خلاف تعصب اور عداوت کا اظہار کرنا اپنی زندگی کا واحد اور معنی خیز مقصد سمجھا ہے، ایک مخالف مورخ کی مذکورۂ بالا رائے عالمگیر کے علم کے حسن ذوق کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہے، مگر اس مختصر بیان کی تشریح کے لئے ہم تفصیلات کی دلچسپی میں ضرور پڑیں گے، گو اس موضوع پر اہل قلم مختلف پیرایوں میں اظہار خیال کرچکے ہیں[۲] ڈر ہے کہ کہیں تکرار نہ پیدا ہوجائے،

اورنگزیب کے فطری علمی ذوق کی جلا لائق اور قابل اساتذہ کی تعلیم و تربیت سے ہوئی جن استادوں سے اورنگزیب نے فیض حاصل کیا وہ یہ تھے،

مولینا عبد اللطیف سلطانپوری[۳]، ہاشم گیلانی[۴]، ملا موہن بہاری[۵]، علامی سعد اللہ[۶]، مولینا سید محمد قنوجی[۷]، ملا شیخ احمد معروف بہ ملا جیون[۸]، شیخ عبد القوی[۹]، دانشمند خان،

مولینا عبد اللطیف معقولات اور منقولات میں مہارت تامہ رکھتے تھے، ہاشم گیلانی کا ذکر شاہجہاں کے دربار کے فضلاء کے سلسلے میں آچکا ہے، وہ علم معقولات اور منقولات کے علاوہ طب اور ریاضی کا ممتاز عالم تھا، ملا موہن بہاری حافظ تھے، علامی سعد اللہ کا بھی ذکر آچکا ہے، مولینا سید محمد قنوجی ریاضی اور ادب کے ماہر تھے، ملا جیون تفسیر اور فقہ کے جید عالم تھے اپنی تفسیر احمدی اور نور الانوار کی وجہ سے اب تک ہندوستان میں مشہور ہیں،

---

[۱] اورنگ زیب جلد پنجم از جادو ناتھ سرکار صفحہ ۴۶۲، [۲] اورنگ زیب کی تعلیم و تربیت اور انشاء و ادب پر جناب سید نجیب اشرف صاحب ندوی ام اے سابق رفیق دار المصنفین (حال پروفیسر اسماعیلیہ کالج بمبئی) نے مقدمۂ رقعات عالمگیر میں نہایت فاضلانہ ابواب لکھے ہیں، موجودہ مضمون کی ترتیب میں ان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، [۳] تذکرۂ علماء ہند صفحہ ۱۲۳ [۴] عبد الحمید لاہوری جلد اول حصہ دوم صفحہ ۶۵، [۵] مآثر الکرام صفحہ ۲۲، [۶] احکام عالمگیری صفحہ ۴، [۷] تذکرۂ علماء ہند صفحہ ۲۰۳، [۸] مآثر الکرام صفحہ ۱۷، [۹] مآثر الامراء جلد اول صفحہ ۲۲۵،

دانشمند خان کو تصوف و اخلاق پر عبور تھا، اورنگ زیب نے امام غزالی کی احیاء العلوم اسی سے پڑھی، اورنگ زیب امام غزالی کی کتابوں سے خاص ذوق رکھتا تھا، ایک رقعہ میں شہزادہ اعظم شاہ سے ان کی ایک تصنیف تبر المسبوک کی فرمایش تاکید کے ساتھ کرتا ہے[۱]، عالمگیر نے چار زبانیں سکیھیں، عربی فارسی، ترکی اور ہندی، عالمگیر نامہ میں ہے:-

"آن زبان سروش بخت و اقبال اگرچہ اکثر اوقات بزبان سلیس لیع فارسی تکلم می نماید لیکن ترکی چغتائی را بنہایت خوب می دانند و با ترکان بدان زبان سخن می کنند و با جمعی از اہل ہند کہ فارسی نمی دانند یا نیکو نمی توانند گفت بضرورت زبان بلغت ہندی می کشایند"[۲]

اس تعلیم و تربیت کا جو لازمی نتیجہ ہونا چاہئے تھا، وہ ہوا، تبحر علمی، کثرت مطالعہ اور وسیع النظری میں اورنگزیب تمام تیموری حکمرانوں پر فوقیت اور افضلیت رکھتا تھا، عالمگیر نامہ میں اس کے علم و فضل کا اعتراف ان لفظوں میں ہے:-

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات قدسیہ وجیہہ گشتہ، تتبع علوم دینیہ از حدیث و تفسیر عربیہ و فقہ شریف حنفیہ است، از بس بممارست مراتب شرعیہ و استکشاف عقائد اصلیہ و مسائل شرعیہ اشتغال ورزیدہ اند، قوت حافظہ اشرف مخزن این حقائق شدہ و بسیاری از کتب طریقت و سلوک و اخلاق چون احیاء العلوم و کیمیائے سعادت و دیگر تصانیف عرفا و اکابر و رسائل و مؤلفات علمائے باطن و ظاہری بمطالعہ ہمایون رسیدہ.... عضلات و کشف اسرار آن فرمودہ اند و بالفعل نیز بعد فراغ از نظم مہام سلطنت و سروری تمہید مراسم دین پروری و عدالت گستری باین شرائف اشتغال بہ یوشگی دارند"[۳]

---

[۱] التبر المسبوک فی اخلاق الملوک چھپ گئی ہے، اسمیں امام نے سلاطین کے ضروری اخلاق و عادات اور طرز سیاست پر گفتگو کی ہے، [۲] احکام عالمگیری، [۳] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵، [۴] ایضاً ص ۱۰۹۱

اسی چیز کو مآثر عالمگیری کا مصنف ان مختصر الفاظ میں پیش کرتا ہے :-

"از کمالات کسبیہ آنحضرت کہ زینت بخش حالات وہبیہ گشتہ تتبع علوم دینیہ از تفسیر و حدیث و فقہ است و تصانیف امام حجۃ الاسلام محمد غزالی رحمۃ اللہ علیہ و انتخاب مکتوبات شرف الدین یحیٰی منیری و شیخ زین الدین قدس سرہما و قطب محی شیرازی رحمہ اللہ و از ین قبیل کتب دیگر ہموارہ بمطالعہ درآمد"[1]

اورنگزیب حافظ قرآن بھی تھا، اور یہ سعادت تیموری بادشاہوں میں صرف اسی کو حاصل تھی، اور سب سے بڑھکر تعجب کی یہ بات ہے کہ اورنگزیب نے کلام پاک اس وقت حفظ کیا، جب وہ اپنی عمر کے تینتالیسویں سال میں تھا، اور یہ دولت صرف ایک سال کے اندر جمع کی، ۱۰۷۵ھ میں حفظ کرنا شروع کیا اور ۱۰۷۶ھ میں ختم کیا، سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ سے ابتدا کی اور لوح محفوظ سے اختتام کی تاریخ نکلتی ہے، اورنگ زیب کے ایک درباری شاعر نے اس موقع پر یہ شعر کہا،

توحامی شرع و حامی تو شارع
توحافظ قرآن و خدا حافظ تو[2]

عالمگیر نامہ میں ہے :-

"واز جلائل فضائل آں خدیو یزداں پرست توفیق حفظ تمام کلام مجید ربانیت درمین اوان سلطنت و جہانبانی و زمان اشتغال بامور ملک رانی و کشورستانی کہ ہیچ یک از سلاطین اسلام و دین پرور درشاہ پاستانی را ایں خصیصۂ سعادت چہرۂ آرای دولت نگشتہ و عزیمت ایں مقصد بلند و داعیہ ہمت پسند درخاطر نگذشتہ بلکہ کمتری از ارباب فضل و کمال و اصحاب علم و معرفت را ایں کرامت و شرف دست نداده اگرچہ ہم از مبادی حال دولت و اقبال برخی

[1] مآثر عالمگیری ص۵۳۲، اس بیان کی تائید انہی الفاظ کے ساتھ مراۃ العالم مصنفہ بختاور خان سے ہوتی ہے (قلمی نسخہ دارالمصنفین) ص۵۲ [2] ص۵۳۲ و عالمگیر نامہ ص۱۰۹۱ و مراۃ العالم قلمی نسخہ،

از سور کریمۂ قرآنی و بسیاری از آیات بینات فرقانی محفوظ خاطر اقدس بود لیکن حفظ مجموع کلام الله
از آن بادشاہ خدا آگاہ بعد جلوس بر اورنگ حشمت وجاہ اتفاق افتاد و چون بہ نیروی تائید ربانی این
خطرۂ الٰہی و داعیۂ آسمانی بر باطن تقدس موطن پرتو افگند بمیامن ہمت بادشاہانہ و عزیمت خسروانہ
و یاوری توفیق کردگار و مساعدت بخت سعادت آثار در عرض اندک وقتی و مختصر فرصتی مجموع کلام مجید
و فرقان حمید با رعایت مراتب قرات و شرائط تجوید و ادراک شان و نزول آیات بینات و تفسیر معانی
و فہم اسرار و نکات آن بر لوحۂ حافظۂ اشرف کہ لوح محفوظ اسرار غیبی است مرتسم گشت، چنانچہ
تاریخ شروع آن حفظ شریف را حروف کریمہ سنقرئک فلا تنسی بحساب جمل پردہ از رخ می کشاید
و تاریخ اتمامش از اعداد لوح محفوظ جلوۂ ظہور می نماید[1]

اورنگ زیب فن خطاطی میں ید طولیٰ رکھتا تھا، یہ فن اوس نے سید علی خان الحسینی جواہر رقم[2] اور عبدالباقی حداد[3] (عبداللہ) سے سیکھا چنانچہ اسکو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے میں کامل مہارت تھی، منشی کاظم مصنف عالمگیر نامہ لکھتا ہے،

"از رتبۂ خط و حسن تحریر آن شہنشاہ فلاطون فطنت سکندر نظیر کہ صفحات روزگار و اوراق
دفاتر لیل از آن زینت پذیر است خامۂ نکتہ پرداز چہ دو فن را چہ یارائے دم زدن بقدرت
کلک بدائع آثار معنی استادی و سحر نگاری را چنان بر کرسی نشانیدہ اند کہ دست استادان
اقالیم سبعہ خط بدان نتواند رسید و برشحۂ فیض انامل دُربار نہال موزون قلم را در خوشنویسی
شاخ و برگی بخشیدہ کہ یکتایان صنعت خط از تتبع آن شیوہ جز خجلت ثمری نتوانند چید، خط
نسخ آن حضرت کہ رقم نسخ خط یاقوت و صیرفی تواند بود، در غایت پختگی و مزہ و متانت و اسلوب
است و کمال قدرت در نوشتن آن دارند، اکثر اوقات توفیق ثواب اندوزی کتابت کلام الله

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۲۔ [2] تاریخ خوشنویسان ہند ص ۵۷۔ [3] ایضاً ص ۱۲۵۔

از ضمائم عبادات و کرائم عادات آں شہنشاہ دین پناہ است،....... خط نستعلیق آنحضرت بے تنا

اطرازی مدح طرازی و اغراق نکتہ پردازی دراں رتبہ است کہ قطعہائے کہ درعین ایام ذوق

وسرگرمی مشق رقم پذیر خامہ اشرف گشتہ بقطعہائے خوب استادان کہ عمر گرانمایہ صرف تحصیل

آن سرمایہ ساختہ بتکمیل امرے دیگر نپرداختہ اند در نظر خط شناسان مبقر مشتبہ می شود،

وشکستہ نستعلیق در غایت مغزداری و صفامتانت و پختگی می نویسند"[1]

مآثر عالمگیری میں ہے،

" خط نسخ آنحضرت در غایت متانت و اسلوب بود و کمال قدرت در نوشتن آں داشتند

وخط نستعلیق و شکستہ نیز بغایت خوب نوشتند"[2]

بختاور خان مراۃ العالم میں لکھتا ہے،

"در نوشتن اقسام خطوط مہارت اندوختہ" (موجودہ دار المصنفین قلمی)

اورنگ زیب نے خطاطی کا فن محض ذاتی زیب و زینت کے لئے نہیں سیکھا تھا، بلکہ اس کے ذریعہ سے کسب سعادت دین اور معاش دنیا کیا کرتا تھا، وہ فرصت کے اوقات میں عموماً صبح کو پانچ بجے سے سات بجے تک اور سہ پہر کو ۲ ½ بجے سے ۵ ½ تک کلام مجید کے نسخے اپنے ہاتھوں سے لکھا کرتا تھا جس کا سلسلہ ایام شہزادگی سے لیکر آخر عمر تک جاری رہا، عالمگیرنامہ میں ہے،

"در ایام میمنت انجام بادشاہزادگی مصحفی مجید بخط مبارک صورت اتمام دادہ آنرا با دیگر شرائف تحف و رغائب و مبلغی خطیر برسم نذر و آئین نیاز بمکہ معظمہ و کعبہ مشرفہ زاد ہا اللہ

---

[1] عالمگیرنامہ صفحہ ۱۰۹۳، [2] مآثر عالمگیری صفحہ ۵۳۲ و مراۃ العالم قلمی۔ [3] اور کا بیان ہے کہ اس میں کئی ہزار روپے خرچ ہوئے "قرآن مجید بخط اقدس صورت ترتیب پذیرفتہ، و مبلغ ہفت ہزار روپیہ بر لوح و جدول آں صرف شدہ بمکہ شریفہ ترسیل یافتہ"

قدر او جلالہ فرستادند کہ دران حرم محترم و بقعۂ مکرم برکات تلاوتش بروزگار خجستہ آثار عائد گردد و بعد از جلوس بر سریر سلطنت و اقبال با وجود کثرت مشاغل صوری و معنوی و نظم و پرداخت امور دینی و دنیوی و فرط توجہ اشتغال بحراست و پاسبانی جہانیان و تاسیس قواعد عدل و احسان عزیمت نگارش مصحفی دیگر از خاطر انور سر بر زدہ شروع دران مقصد والا فرمودند و ہر روز بعد فراغ از اشغال ضروریۂ دین و دولت و تنظیم مہام ملک و ملت و اداے وظائف طاعت و عبادت شطری از اوقات میمنت قرین بتحریر سطری چند از کتاب مبین مصروف ساختہ در عرض اندک وقتے بدستیاری تائید و مددگاری بخت سعید جلدی، دیگر از مصحف مجید باتمام رسانیدہ سواد آن جاوید اندوختند، وسواے این دو مصحف کریم مکرر بتحریر پنجسورہ و دیگر سور قرآنی موفق گشتہ اند[1]"

اورنگزیب کے ہاتھوں کے لکھے ہوئے کلام پاک کے نسخے آج بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں، ایک نسخہ اعلیٰ حضرت حضور نظام دکن کی ملکیت ہے، دوسرا جناب مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دیوانی حیدرآباد کے پاس ہے، تیسرا نواب صاحب مانگرول کے پاس ہے، جس کا عکس جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے شائع بھی کر دیا ہے، مگر یہ نسخہ مشکوک ہے، ایک پنج سورہ وکٹوریہ میموریل کلکتہ میں ہے[2]

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے ملک اور سب سے بڑی مملکت کے شہنشاہ نے کلام پاک کے انہی نسخوں کے ہدیہ کی رقموں کو اپنی آخرت کی نجات کا ذریعہ سمجھا، چنانچہ اپنے وصیت نامہ میں لکھتا ہے:

چہار روپیہ و دو آنہ از وجہ کلاہ دوزی نزد آیہ بیگہ محلدار است بگیرند، وصرف کفن این بیچارہ نمایند، و سہ صد و پنج روپیہ از وجہ کتابت قرآن در حرف خاص است، روز وفات بفقرا بدہند[3]

---

[1] عالمگیر نامہ ص۱۰۹۲ [2] تفصیلات کیلئے دیکھو مقدمہ رقعات عالمگیری از سید نجیب اشرف صاحب ندوی ام اے،

[3] سر کار احکام عالمگیری ص۱۳ طبع ثانی، بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی،

عالمگیر کی بہترین علمی یادگار اسکے رقعات ہیں جن کے ادب وانشاء کی داد ہر زمانہ میں اہل علم وکمال نے دل کھول کر دی ہے، آیات قرآن مجید، احادیث نبوی، اور سعدی، حافظ، نظیری اور نظامی کے اشعار کو اس برجستگی اور خوبی سے اپنے رقعات میں نقل کرتا ہے، کہ وہ سب کے سب ادبی شہ پارے بن گئے ہیں، جنکے پڑھنے میں بڑی گھلاوٹ اور لطافت محسوس ہوتی ہے،

معاصر مورخوں نے اس کے ادب وانشاء کی تعریف اس طرح کی ہے،

"نکتہ دانی ومعنی شناسی ورابطہ ومناسبت وکیسی آن حضرت، بمراتب نثر وانشائے انواع کلام در مرتبہ ایست کہ سخن سنجان معنی طراز وفصاحت پیشگان نکتہ پرداز از فیض تعلیم وارشاد آن مظہر کمالات قدسی عمرہا استفادہ دقایق ورموز سخن میتوانند کرد، ہرگاہ باداے منشورخشیان بلاغت گستر، انشا نامہ میفرمایند، بحسن تقریر دلپذیر بنوعے تمہید مطلب وتلقین مدعی می نمایند کہ اگر نگارندہ قوت حافظہ را درج آن درشاہوار ولالی آبدار ساختہ بنگارش ہمان الفاظ گہرنثار بنظم وتالیفی کہ از زبان حق بیان استماع نمودہ اکتفا نماید، از تجشم فکر وتکلف انشاء مستغنی است وچون مسودہ آن درست می شود، بمطالعۂ اشرف رسیدہ، از قلم بدائع رقم آن شہنشاہ نکتہ رس ہوشمند، چنداں بتصرفات مرغوب واصلاحہاے دلپسند زینت می یابد کہ ادیب اریب از ملاحظہ آن بعجز وقصور معترف گشتہ، سرمایہ بصیرت دراسلوب وقواعد سخن وپیرایۂ خبرت ومہارت دراں حق می اندوزد، وہمچنیں مناشیر جلالت نشانی کہ منشیان بلاغت آثار بنام شاہزادہاے کامگار بخت بیدار وعمدہاے ایں دولت پائدار می نویسند نخست مسودۂ آن بنظر انور درآمدہ بزیور اصلاح بادشاہانہ مزین میشود"[1]

مآثر عالمگیری کا مصنف اختصار کیساتھ اسی چیز کو اسطرح لکھتا ہے:-

---

[1] عالمگیر نامہ ص ۱۰۹۵

"آنحضرت را در مراتب نثر و انشا دستے تمام بود و در عبارت نظم و نثر بہرۂ تمام"[۱]

یہ تو درباری مورخین کے بیانات ہیں لیکن بیسویں صدی کے ممتاز انشاء پرداز اور نکتہ سنج بھی آپ کے ادب کی تعریف اسی لسانی کے ساتھ کرتے ہیں، مولینا شبلی رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں کہ

"عالمگیر تیغ و قلم دونوں کا مالک تھا، اسکی انشاء پردازی کی داد مخالفوں تک نے دی ہے۔ اس کے رقعے باوجود اس کے کہ واقعات کا ذخیرۂ قصہ طلب حوالوں کا مجموعہ اور جغرافیہ اطلاعوں کی یادداشت ہیں، تاہم ادائے مطلب کی قدرت، عبارت کی سادگی، فقروں کی ہمواری، مطالب کا اختصار، پہلو بہ پہلو جملے، دلنشیں ترکیبیں نہایت حیرت انگیز ہیں"[۲]

مولینا آزاد "بادل ناخواستہ" لکھتے ہیں، کہ

"عالمگیر نے دل معتدل اور زبان قادر البیان پائی تھی اسئے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا یا سامنے لکھواتا تھا، کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا، وہ پچاس برس سلطنت کرکے ۱۱۱۸ھ میں فوت ہوا، اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے، کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا، اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم، دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے بھی ملک رانی کے پیچوں میں الجھے ہوئے ہیں، مگر عبارت صاف ہے، اور لفظ لفظ میں محاورے کا نمک دیا ہوا ہے۔ تمام انتظامی ہدایتیں، اور اکثر اخلاقی نصیحتیں ہیں، کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں، اس کی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دوں تو مضایقہ نہیں، اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین اور اس کے حالی عبارت اسکی جتنی پڑھنے میں سہل ہے، اتنے ہی لکھنے میں دشوار ہے"[۳]

عالمگیر کے خطوط کی ہمہ گیری کے متعلق مرتب "رقعات عالمگیر" کی رائے ہے، کہ

---

[۱] ماثر عالمگیری ص ۵۳۲، [۲] مضامین عالمگیر ص ۱۴۲ معارف پریس، [۳] نیرنگ خیال،

"اورنگ زیب کے خطوط...... گلہائے رنگا رنگ کے بہترین مجموعہ ہیں، کہیں ذاتی حالات کے متعلق اظہار خیال ہے، تو کہیں سیاسی و معاشرتی واقعات پر تنقید، کہیں شوقِ وصال بے چین کئے ہوئے ہے، تو کبھی درد فراق نے مضطر کر رکھا ہے، کسی جگہ کسی کی شادی یا ولادت کی خوشی ہے، تو کہیں کسی کی موت کا ماتم، کسی جگہ کسی افسر کی سفارش ہے، تو کہیں تنبیہ، اگر ایک خط عمارتوں اور قلعوں کے مفصل حالات سے مملو ہے، تو دوسرا باغوں اور چمنوں کی رنگین بیانی سے پُر، کہیں عتاب ہے، تو کہیں عنایت، کبھی گرمجوشی ہے، تو کبھی سرد مہری کہیں الزامات کی صفائی ہے، تو کہیں دوسرے کے خلاف شکایت، غرضکہ وہ کونسی چیز ہے، جو اس مجموعہ میں نہیں ہے، پھر وہ کونسی شے ہے، جس میں حقیقت نگاری کیساتھ کمال ادب کو جگہ نہیں دی گئی ہو۔"[1]

عالمگیر کی دوسری علمی یادگار، **فتاوی عالمگیری** ہے، اس نے محسوس کیا کہ حنفی مذہب کے فقہی مسائل مخلوط طور پر تمام پھیلے ہوئے ہیں کہیں ایک جگہ مرقوم نہیں، اسلئے کوئی ایک خاص کتاب جو تمام مسائل پر حاوی ہو، موجود نہیں چنانچہ جب کوئی فقہی مسئلہ درپیش ہوتا تھا، تو اس پر فتوی دینے کے لئے تمام کتابوں کی چھان بین کرنی پڑتی تھی، جو صبر آزما اور دشوار کام ثابت ہوتا تھا، انہی مشکلوں کا لحاظ کرکے عالمگیر نے ہندوستان کے ممتاز علماء کے ایک گروہ کو حکم دیا، کہ فقہ کی تمام کتابوں سے "متفق بہا مسائل" کا انتخاب کرکے ایک کتاب تیار کریں، اس گروہ کے صدر شیخ نظام مقرر ہوئے، علماء کے لئے وظائف کی منظوری ہوئی، آٹھ سال کی مدت میں یہ کتاب تیار ہوئی، اور اس میں دو لاکھ روپے صرف ہوئے،

[1] مقدمۂ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ص ۵۵-۵۶ ہم نمونے کیلئے اورنگزیب کے رقعات کو یہاں پیش کرنا ضروری نہیں سمجھتے، کیونکہ مولف ہذا نے اورنگزیب کے خطوط پر ادبی حیثیت سے نہایت ہی مبسوط ناقدانہ اور فاضلانہ بحث کی ہے، ملاحظہ ہو مقدمۂ رقعات عالمگیر ص ۵۵ تا ۹۱،

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب نے علماء و طلبہ کو فقہ کی تمام کتابون سے بے نیاز کر دیا ہے، اس کتاب کی تیاری کا حال عالمگیر نامہ کا مصنف اس طرح لکھتا ہے :-

"چون ہمگی ہمت والانہمت شریعت پیرائے آن خدیو دین پرور حق پژوہ مصروف است، بآنکہ کافۂ مسلمین در احکام دین متین بمسائلے کہ اکابر علماء و ائمۂ مذہب شریف حنفی بدان فتوی دادہ معمول بہا و معمول علیہا دانستہ عمل نمایند، و مسائل مذکورہ در کتب فقہ و نسخ فتاوی بنا بر اختلاف فقہاء و علماء بار وایات ضعیفہ و اقوال مختلفہ آنہا مخلوط است و معہذا مجموع آنرا یک کتاب حاوی نیست، و تا کتب مبسوطہ بسیار فراہم نیاید و کسی را دستگاہی وسیع بضاعتی کامل و قدرت واستحضاری وافی، در علم احکام فقہ نباشد انکشاف حق صریح و استنباط مسئلہ مفتی بہا و حکم صحیح نمی تواند نمود، لاجرم بر ضمیر مہر انوار کہ در امور دین و دولت بفتوی الہام کار گذار است پرتو این عزیمت تافت کہ جمعے از علمائے پایہ سریر اعلیٰ کتب معتبرہ و نسخ مبسوطہ آن فن را کہ در کتاب خانۂ خاصۂ شریفہ بر وزگاران از اطراف و اکناف عالم فراہم آمدہ جلوہ گاہ انظار تتبع ساختہ از روی تحقیق و تدقیق و خوض و غور انیق بجمع و تالیف آن مسائل پردازند، و از مجموع آن نسخۂ جامعہ مرتب سازند تا ہمگنان را انکشاف مسئلہ مفتی بہا در ہر باب بمراجعت آن کتاب بسہولت و آسانی دست دہد، و قضاۃ و مفتیان اسلام از جمیع کتب و دفاتر شتی، و تتبع و تصفح جمیع نسخ فتاوی مستغنی باشند و سرکردگی و اہتمام این مہم صواب انجام بفضیلت مآب شیخ نظام کہ جامع فضائل معقول و منقول است تفویض یافت کہ کمر سعی و اجتہاد و تمشیت این امر بستہ باتفاق سایر اہل فضل و دانش و جمع تالیف ان مسائل نماید و گروہے از فضلاء و علماء کہ در پایۂ اورنگ خلافت بودند، بدان شغل شریف مامور شدند و در اطراف و اکناف کشور فضل پرور ہندوستان بہر جا کسی بصیت اشتہار و مہارت در علوم موسوم بود، بموجب یرلیغ ہمایون بجناب والائے سلطنت

حاضر آمدہ بموافقت آن صحیح تعین یافت و ہمگی آن فریق بوظائف شایستہ و مواہب ارجمند کامیاب گشتہ بتقدیم آن امر مشغول شدند و از کتبی کہ تمشیت آن امر را در کار شود نسخ بسیو از کتاب خانۂ خاصۂ شریفہ بفضلا حوالہ رفت و ہر سال مبلغے خطیر در وجوہ وظایف و انعامات عملہ و ممارسان این شغل جلیل و خطب نبیل از خزانۂ احسان بادشاہی صرف می شود، وچوں آن کتاب مستطاب صورت اتمام گیرد، وپیرایۂ اختتام پذیرد جہانیاں را از سایر کتب نقلی مغنی خواہد بود برکات اجر و ثوابش ابد الآباد در نسخۂ حسنات شہنشاہ مؤید قدسی ملکات ثبت و مرقوم گشت[۱]؛

عالمگیری دربار کے شعراء، عالمگیر کے دربار میں کوئی ملک الشعراء نہیں تھا، اس سے عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ عالمگیر کو شعر و شاعری سے نفرت تھی، اس لئے اس عہدہ کو اپنے دربار سے برطرف کر دیا، مگر اہل نظر یہ کیونکر یقین کر سکتے ہیں، جب کہ اس کے اکثر خطوط اشعار اور لمبی لمبی نظموں سے مزین نظر آتے ہیں[۲]، یہی نہیں بلکہ سعدی، حافظ، نظامی، نظیری، صائب، ملاشاہ اور فانی کشمیری کے دیوان کو خاص طور سے پڑھتا تھا اور ان کے اشعار زبانی یاد رکھتا تھا، بخشی الممالک مخلص خاں نے ایک بار دیوان صائب پیش کیا، جس میں ایک لاکھ اشعار تھے، عالمگیر صائب کے اشعار کو پڑھکر جو معرفت و معنویت میں ڈوبے تھے بہت ہی محظوظ ہوا، اور اس دیوان کو محبوب رکھنے لگا، اس میں سے مندرجۂ ذیل غزل ایک مدت تک اپنی مجلس میں بار بار پڑھا کر سنتا تھا،

خم چو گردید قدا فراختہ می باید رفت	پل بریں آب چو شد ساختہ می باید رفت
ہرچہ در کار بر و ساختنش خود ساز نیست	گو مشو کار جہان ساختہ می باید رفت
این سفر ہیچو سفر ہائے دگر صائب نیست	رخت ہستی ز خرد انداختہ می باید رفت

(ملاحظہ ہو مآثر عالمگیری انتالیسواں سال جلوس)

[۱] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶ و مآثر عالمگیری ص ۵۳۰ [۲] مثال کے طور پر بعض نمونے ملاحظہ ہوں، ایک خط میں لکھتا ہے،

جو اشعار اسکو پسند آتے تھے، وہ خود اپنی بیاض میں لکھ لیتا تھا، اور اکثر اوقات اپنے لڑکوں کی بیاض میں بھی بالالتزام لکھوا تا تھا، ایک رقعہ میں لکھتا ہے،

"ہدایت اللہ زریں رقم بگوئید، کہ این رباعی در بیاضے کہ بیاد دست شہزادہ کام بخش مرحمت می شود، بخط خود بنویسد، ؎

آتش بدو دست خویش در خرمن خویش   من خود زدہ ام چہ نالم از دشمن خویش

کس دشمن من نیست منم دشمن خویش   اے وائے من و دست من و دامن خویش

(رقائع عالمگیر ص۵۲)

علالت اور حتی کہ بستر مرگ پر بھی عالمگیر کی زبان پر اشعار ہوتے تھے، سنہ ۱۱۱۶ھ میں ایک بار بیمار پڑا، تو ضعف کی حالت میں یہ اشعار ترنم کے ساتھ پڑھ رہا تھا،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۵)

"خان جہان بہادر درگذشت، اناللہ وانا الیہ راجعون، سبحان اللہ آدمی چہ قدر غافلست؟ ونفس تا کجا بر دغالب؟ درین ایام صوبہداری دکن می خواست دبجہ دلگرمی آرزوے آن می کرد؟ آرے کار نفس بدتر ازین است، ؎

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست،   شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست،

عالمے را لقمہ کرد و درکشید،   معدہ اش نعرہ زنان ہل من مزید

دوزخ است این نفس و دوزخ اژدہاست   کو بدریا ہا نگردد کم و کاست،

ہفت دریا را درآشامد ہنوز،   کم نگردد سوزش ایں خلق سوز،

سنگہا و کافران سنگ دل،   اندرآیند اندران خوار و خجل،

ہم نگردد ساکن ایں چندیں غذا،   تا ز حق آید مراو را ایں ندا،

سیر گشتی سیر گوید نے ہنوز،   این است آتش اینست تابش اینست سوز

بہشتاد و نود چوں در رسیدی — بسا سختی کہ از دوراں کشیدی

دراں جا چوں بصد منزل رسانی، — بود مرگے بصورت زندگانی

امیر خاں نے جو اسوقت مقرب خاص تھا، عالمگیر کو اشعار پڑھتے سنا تو عرض کیا کہ نظامی گنجوی نے ان ابیات کی تمہید میں یہ بیت کہی ہے،

پس آں بہتر کہ خود را شاد داری — دراں شادی خدا را یاد داری،

عالمگیر نے اس شعر کو کئی بار سنا، پھر اپنی بیاض میں لکھوایا، اور مدت تک پڑھا[۱] بستر مرگ پر یہ شعر اکثر اسکے ورد زبان رہتا تھا،

بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم، — دگرگوں می شود احوال عالم[۲]،

---

[۱] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۱۱ھ [۲] ایضاً واقعات ۱۱۱۸ھ

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۶)

حق قدم بر وے نہد از لا مکاں — آنکہ او ساکن شود از کن فکاں

چونکہ جزو و دوزخ است ایں نفس ما — طبع کل دارد ہمیشہ جز وہا،

ایں قدم حق را بود کو را کشد، — غیر حق خود کے کماں اورا کشد،

تو تے خواہم زحق در پاشگاف — تا بسوزن بر کنم ایں کوہ قاف،

او تعالیٰ توفیق کرامت کند و ازیں نیزہ روزہ رہائی بخشد. بحرمۃ محمد و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام

(رقائم عالمگیر مرتبہ چودھری نبی احمد سندیلوی ص ۱۰۹)

۲- ایک بار شہزادہ بیدار بخت (خلف اکبر محمد اعظم) نے اپنی محبوبہ بیگم شمس النساء رضیہ سید ممتاز خان کو غصہ کی حالت میں پاجی کی لڑکی کہا، خوددار بیگم نے شہزادہ سے بولنا چھوڑ دیا، عالمگیر کو خبر ہوئی، تو بیدار بخت کو اس دلچسپ انداز میں خط لکھا،

صبحدم مرغ چمن با گل نوخاستہ گفت — ناز کم کن کہ دریں باغ بسے چوں تو شگفت

یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ وہ خود بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کرتا تھا، ہم کو اس کا صرف ایک شعر مل سکا ہے، اور وہ یہ ہے،

غم عالم فراوان ست ومن یک غنچہ دل دارم	چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیابان را[1]

ان حقیقتوں کی موجودگی میں یہ کہنا کہاں تک درست ہے، کہ عالمگیر کو شعر وسخن سے دلچسپی نہیں تھی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ عملی اور کار فرما دل و دماغ لیکر آیا تھا، وہ تفریحی مشاغل کا شیدا نہ تھا، اسکی سنجیدہ اور متین طبیعت شعراء کی مبالغہ طرازیوں، خوشامدانہ مداحیوں، اور جھوٹی بناوٹی باتوں کو نہیں پسند کرتی تھی، چنانچہ مرآۃ العالم میں ہے۔

"و در مراتب نثر دانشا دستے تمام داشت و در مہارت نظم ہم بہرہ تمام اما بود اری مستشہد صادق کریمہ والشعراء یتبعھم الغاؤن متمسک گشتہ توجہ باستماع شعر ندارند"

---

[1] بحوالہ بادشاہ نامہ عالمگیری از ذکار اللہ صفحہ ۷۷۵،

رقعیات عالمگیر میں ہے :

(بقیہ حاشیہ) گل بخندید کہ از راست نرنجم، لیکن،	ہیچ عاشق سخن تلخ بمعشوق نگفت،

بآں نور الابصار واضح باد کہ در ایام جوانی کہ اصطلاح پواج مصاحبان شما جوانی دیوانی می گوئید مارا ہم دراں ایام این تعلق باشخصیکہ نہایت تبحر داشت بہم رسیدہ بود تا حیات محبت ادرا بانجام رسانیدیم و گاہے آزردہ نکردیم دیگر آن کہ باسادات لفظ باجی گفتن محض باجی گریست، کسے اگر سید را باجی بگوید البتہ باجی نخواہد شد، اگر از نوشتۂ محلدار و ناظر رضامندی آن سیدہ نشود بعتاب، بلکہ عقاب گرفتار خواہید شد، جزا بما کانوا یعملون (ایضاً صفحہ)

۳- شاہزادہ محمد اعظم کو ایک موقع پر تنبیہ کرتا ہے،

عجب از آں فرزند کہ صحبت با ہیچ اثر نہ کردہ؟ از احتیاط و دوربینی ہزار مرحلہ دور افتادہ الحزم سوء الظن بخاطر نیاوردہ و از آیت وَلَا تُلْقُوا بِاَیْدِیکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ بہرہ نیافتہ،

مرغے کہ زیرک است درین بوستاں سرا	گل را خیال چنگل شہباز می کند،

تا بشنیدن اشعار چہ رسد الا شعر کہ متضمن موعظت باشد،

نہ کردہ بہر رضائے خدائے عز وجل نہ چشم سوے غزال و نہ گوش سوے غزل

مآثر عالمگیری کا مصنف بھی یہی لکھتا ہے،

اما بمو اے مستشہد صادق کریمہ الشعراء یتبعھم الغاوٗن تمسک گشتہ توجہ باستماع شعر بے فائدہ نداشتند یا بشنیدن اشعار مدح چہ رسد، الا شعرے متضمن موعظت باشد،

نکردہ بہر رضائے خدائے عز وجل نہ چشم سوے غزال و نہ گوش سوے غزل[۱]

ایک بار سلطان شادماں نے اس کی مدح میں مندرجۂ ذیل قصیدہ اسکے سامنے پڑھا،

آن کیست کو ز حلقۂ لعت نشاں دہد در خواب اگر دہد بطریق گماں دہد،

آب حیات خضر کہ عمریست جاودان تا کے ز حسرت لب لعل تو جاں دہد

---

[۱] مآثر عالمگیری ص ۳۲-۵۳۲،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۸)

خوں می چکد ز زخم نمایاں زخندہ اش، کبکے کہ بے ملاحظہ پرواز می کند،

مردے در تہوری و بے باکی نیست بلکہ در خود شکنی ست۔

کمال مردی و مردانگی ست خود شکنی ست بوس دست کسے را کہ این کمان شکند،

۴- ایک دوسرے رقعہ میں لکھتے ہیں:-

بفرزند عالیجاہ عرضداشت کند کہ ایشان استشفاع تقصیر اعتبار خان کردہ اند، احتمال قوی کہ سید اللہ درویش نوشتہ باشد بنویسید کہ عبد القادر بیدل دریں مقام دو مصراع دلچسپ گفتہ،

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن

اجابت از در حق بہر استقبال می آید

(وقائع عالمگیر ص ۱۲۲)

فکرِ سخن طراز کہ خضریست فی المثل، / خود در عدم رود چو نشان زان میان دہد

ابرِ قلم کہ آبِ سیہ می چکد از و، / رنگِ سخن ز وصف لبِ گل رخاں دہد

قدِ تو در خرام بگلگشت بوستان / صد پیچ و خم ز شرم بسرو چماں دہد

آنجا کہ اوست نالۂ عاشق کجا رسد، / گر بال جبرئیل بمرغِ فغاں دہد

از چشم جانستانش چو خواہم حیاتِ نو / مژگان جواب من بزبانِ سناں دہد

گر دل بستاند از نگہِ عشوہ آفریں / صد دل عوض ز طرۂ عنبر فشاں دہد

چوں شیشۂ شراب کہ با محتسب دہند / کس دل چرا بدستِ تو نامہرباں دہد

نازم بچہرہ اَ کہ بہنگامِ مے ز عکس / رنگینی بہار بفصلِ خزاں دہد

ہر چیز را بجا صفتے آفریدہ اند، / کے سرمہ در گلو اثرِ زعفراں دہد

من خود ز درد یار خوشم ورنہ روزگار / کے ایں قدر الم بدلِ شادماں دہد

چشمش با بروان و مژہ گشت عالمی / کس ترک مست را ز چہ تیر و کماں دہد

زلفش مزور یست مکن اعتبار او، / از عشوہ گر دلی بتو شب درمیاں دہد

مضمونِ دلنشیں کہ رسد از جہانِ غیب / یاد از حلاوتِ سخنِ پاستاں دہد

مرد آن بود کہ گر ہمہ عالم بد و دہند / دل کم دہد بشادمی و غم تا کہ جاں دہد

ما جاں بنقد مہر و وفا دادہ ایم بس / دیوانہ نیستیم کہ جانی بناں دہد

شاید مراد من کہ نہ خواہم ز آسماں / اورنگ زیبِ عادلِ گیتی ستاں دہد

شاہی کہ از برائے سرِ دشمنانِ دین / بہر نثار گوہرِ تیغ یماں دہد

بہرام صولتے کہ ز بیمش بپئے گریز، / گردوں عنان خود بر کہکشاں دہد

تا ارض بر سکون و سما در تحرک است / تا چترِ آفتاب ز مشرق نشاں دہد

زیبندہ باد بر سر اورنگ سلطنت

تا ابر و مہر راتب دریا و کان دہد

باوجودیکہ اورنگزیب اپنی مدح سرائی کو مطلق پسند نہ کرتا تھا، اور شاعروں کی قصیدہ خوانیوں کو فعلِ عبث سمجھتا تھا، چنانچہ شادماں کو آئندہ مدح سرائی کرنے سے منع کیا، لیکن ان میں سے بعض اشعار کو شاعرانہ نقطۂ نظر سے بہت پسند کیا، اور بار بار پڑھوا کر سنا، چنانچہ مراۃ الخیال میں ہے،

سلطان شادماں قصیدہ مشتمل بر مدح گفتہ بسمع مبارک رسانید و بعض ابیاتش پسند خاطر فیض افتاد، و بتکرار استماع فرمودند[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ باوجود اس ذوقِ شعری کے ملک الشعراء کے عہدۂ جلیلہ کو دربار سے کیوں تخفیف کر دیا، یہ سوال ذرا غور طلب ہے، دیکھنا یہ ہے کہ اس عہد کے ممتاز ترین شعراء کون تھے موسوی خان، شیخ ناصر علی سرہندی نعمت خاں عالی، عاقل خاں رازی، ملا اشرف ماژندرانی وغیرہ وغیرہ ان میں کوئی ایسا نہ تھا، جو فیضی، طالب آملی، قدسی اور ابو طالب کلیم کا مدمقابل ہو سکتا تھا، پھر ان میں کسی کو ملک الشعراء کے خطابِ فائقہ سے سرفراز کرکے ان نادرۂ روزگار شعراء کی صف میں کھڑا کر دیا جاتا، تو کیا عالمگیر کے علم و ادب کے بلند اور اعلیٰ ذوق پر حرف گیری نہیں ہوتی،؟ (رباني)

[1] مراۃ الخیال ص ۲۵۲، ۲۵۳،

رقعاتِ عالمگیر

اورنگ زیب اور عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانہ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کئے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے متعلق بیسیوں حقائق کا انکشاف ہوتا ہے، ضخامت ۷۰۴ صفحات، چھپائی، لکھائی، کاغذ، بالخصوص ٹائٹل نہایت دلفریب قیمت: ۵ سے

"منیجر"

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر معتمد ولی الرحمن صاحب ایم اے

(۳)

۵۔ آزادی اور جبریت میں عدم تناقض

آزادی کے اہم معنی بلاشبہہ تعریف و توجیہ طلب رہ جاتے ہیں، ان میں سے پہلے معنی تو گویا آزادی کا سلبی پہلو ہے یعنی ارادے پر خارجی موانع کا فقدان، دوسرے معنی اخلاقی آزادی یا زندگی کی حقیقی آزادی ہے، پہلے معنوں میں ایک فعل اسوقت آزاد کہلاتا ہے، جب یہ ہماری مرضی اور خواہش کے مطابق ہو، جب اس کے ذریعے سے ہم شعورًا اپنے مقصد کا اظہار کریں، اور خارجی رکاوٹیں، یا کسی اور کا ارادہ ہمارے ارادے میں مزاحم نہ ہو، ان ہی معنوں میں ہم تیز رَو ندی کو عبور کرنے میں آزاد ہوں، بہ شرطیکہ بارش سے اس کا پُل بہ نہ گیا ہو، اسی میں ایک شکار کا پہاڑ کی چوٹی تک تعاقب کرنے میں آزاد ہوں، بہ شرطیکہ ہماری طاقت جواب نہ دے چکی ہو، ہم ایک جائداد خریدنے میں آزاد ہوں، بشرطیکہ ہم اس کے مالک کو اسکے بیچنے پر آمادہ کرسکیں، ان معنوں میں بدکار اپنے افعال میں اتنا ہی آزاد ہے، جتنا کہ نیکو کار، بہ شرطیکہ سوسائٹی یا خارجی قوتیں اس کی مزاحم نہ ہوں آزادی کے ان معنوں میں بدکار اور نیکو کار جو کچھ چاہیں کر سکتے ہیں، جبریت کا دعوی ہو کہ ان دونوں میں کوئی جو کچھ کرتا ہو، اس کے لئے کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے،

اگر مذکورۂ بالا آزادی کو ہم موانع کی آزادی کہیں، تو اخلاقی آزادی یا زندگی کی آزادی کا اہم ترین تخیل قابل غور رہ جاتا ہے، اگر بدکار موانع سے اتنا ہی آزاد ہو جتنا کہ نیکوکار، تب بھی وہ اخلاقاً آزاد نہیں، کیونکہ اس میں اور خود اس کی فطرت اور اس کے اخلاقی نظام میں تنازع ہے، اخلاقی آزادی حسب خواہش عمل کرنے کو اتنی ہی متضمن ہے جتنی کہ شہری آزادی، جس طرح سلطنت میں صرف وہ اشخاص حقیقۃً آزاد ہوتے ہیں، جو معقول قوانین کے پابند ہوں، اسی طرح وہ اخلاقاً آزاد صرف اسوقت ہوتے ہیں جب انکا عمل ایک حقیقی اخلاقی معیار کے اقتضار سے معین ہو، جس حد تک کوئی خطا اور ثواب کے متعلق متذبذب رہتا ہے، یا بدی کیساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہے، اسی حد تک وہ اخلاقاً آزاد نہیں ہوتا، کیونکہ اس حالت میں بدی اسکو کھینچتی ہے، اور اس پر اثر کرتی ہے، اور کوئی شخص جسقدر زیادہ کشش بدی کی محسوس کرتا ہے، اسی قدر زیادہ وہ اس کا محکوم ہوتا ہے، اخلاقی آزادی اصلی معنوں میں اخلاقی غلامی کی ضد ہے، نیک زندگی کا تجربہ آزادی ہے، اور بد زندگی کا تجربہ غلامی، مختصر یہ کہ سلبی معنوں میں آزادی اُن ادنی ہیجانات اور خواہشات کی قوت سے آزادی کے ہم معنی ہے جو ذات کی ترقی اور اس کے توازن کو تباہ کرتے ہیں، اخلاقی آزادی ایک داخلی توازن پیدا کرتی ہے، اس میں ذات کے تمام ملکات کا منصفانہ اظہار ہوتا ہے، یہ گویا اس فساد اور بے ترتیبی کی ضد ہے، جو متقابل اشتہاآت منظم اور زیر تصرف نہ ہونے کی صورت میں ہماری فطرت میں پیدا کرتے ہیں، یہ آزادی عقل کے قاعدے سے حاصل ہوتی ہے، جس کے مطابق ہمارے جزئی اور متنازع مقاصد و خواہشات ہماری زندگی کے مرکزی مقصد کے محکوم ہو جاتے ہیں، اخلاقاً آزاد صرف وہ زندگی ہوتی ہے، جس نے اپنی وحدت کو اور اس طرح توازن اور تسکین کو حاصل کر لیا ہے، لیکن اس اخلاقی آزادی کو زندگی کی آزادی کہنا بہتر ہوگا، نہ ارادے کی آزادی، کیونکہ اس میں ایک ایسا ارادہ شامل ہے، جو زندگی کے مقصد کی خاطر قیمت کے قوانین سے معین ہوتا ہے، عام مذہبی نقطۂ

میں اس واقعہ کو ضمناً تسلیم کیا گیا ہے، خدا کی فطرت کا جو عام تخیل ہے، اس کے مطابق وہ کلیتہً مجبور بھی ہے، اور کلیتہً آزاد بھی، اسپنے انتخاب میں وہ نیکی پر مجبور ہے، وہ بدی کا ارادہ، اور دو متبادل طریقوں میں سے بُرے طریق کا انتخاب نہیں کر سکتا، ایسا کرنا خود اس کی فطرت کے منافی ہے یعنی ایسا کرنے سے وہ خدا ہی نہیں رہتا، اس کے ساتھ ہی اس نصب العین خیر کے معین ہونے سے حیات خداوندی کی کامل آزادی، توازن اور تسلی پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی آزادی کا نصب العین بھی آزاد یعنی غیر مجبور وغیر معین ارادہ نہیں، بلکہ زندگی کی ایسی آزادی ہے، جو صادق بصیرت سے معین کئے ہوئے ارادے سے حاصل ہو، ہماری اخلاقی آزادی، قانون کی حکومت سے آزادی کے ہم معنی نہیں آزاد ہونے کے باوجود ہم اسی ملک کے باشندے رہتے ہیں، اور ایک مکمل منتظم نظام حکومت کے تمام اقتضاآت کے تابع ہوتے ہیں، لیکن اخلاقاً آزاد شخص نے اپنی فرمانبرداری کو غیر منظم ہیجان وخواہش سے عقل وصداقت کے قانون کی طرف منتقل کیا ہے، اب "ہم غلام عورت کی اولاد نہیں، بلکہ آزاد عورت کی اولاد ہیں"

ظاہر ہے کہ اس اخلاقی آزادی کا درجہ ہر شخص میں مساوی نہیں ہوتا، بلکہ اس کی انفرادی زندگیوں کی تکمیل کے مطابق بے شمار درجے ہوتے ہیں، اس عقیدے سے غلط تر عقیدہ اور کوئی نہیں ہو سکتا، کہ ہر شخص پیدایش کے وقت آزادی کی پوری مقدار کا حامل ہوتا ہے، جو تمام عمر اس سے چھینی نہیں جا سکتی، ہماری آزادی مکمل نہیں ہوتی، یہ معرض تکوین میں ہوتی ہے، جو شخص حیوانات کی طرح ہر دم بدلنے والے ہیجانات واشتہاآت کا محکوم ہے، اور خود اپنی مجموعی زندگی سے ان کے تعلق اور ان کے معنون کا لحاظ نہیں کرتا، وہ اخلاقی آزادی میں بہت کم حصہ رکھتا ہے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ غلام ہے لیکن تمام نمو پذیر ذوات جنہیں عمر یا عادت نے عمل کے راستے کو آخری طور پر معین نہیں کیا ہے، آزادی ایک ترقی کرنے والا عمل ہوتا ہے، اور بڑھنے والی قوت ہوتی ہے، آہستہ آہستہ تجربے کے سکھائے ہوئے

سبق عقل بن جاتے ہیں، متنازع خواہشات پر رفتہ رفتہ غلبہ حاصل ہوتا ہے، اور زندگی کے تمام حصے اسکے مرکزی مقصد کے مطابق ہو جاتے ہیں،

اب ہم علم اور اخلاقی آزادی کے اہم تعلق کو معلوم کر سکتے ہیں، جس عمل سے آزادی حاصل کیجاتی ہے، وہ روشنی طبع کا عمل ہے، صداقت، اخلاقی تعلقات، اور اخلاقی قوانین کا واضح ادراک، فطرتِ انسانی اور اسکی حقیقت کا فہم یہ وہ چیزیں ہیں، جو انسان کو آزاد کرتی ہیں، ان کے علاوہ التباس وخطا سے بچنے کو بھی اخلاقی آزادی کہا جا سکتا ہے، انسانی آزادی کو حیوانی زندگی کی خودروی سے متمیز کرنے کی وجہ یہ ہے، کہ انسان میں سیکھنے اور اپنے علم کو رہنمائی اور خود تعینی کا باطنی اصول بنانے کی قابلیت بہ درجۂ اولی ہوتی ہے، بغیر نصف کرہ (Hemisphere) کی مچھلی کے مقابلے میں ہم زیادہ حقیقی معنوں میں خود اپنی تعیین کرنے والے فاعل ہیں، کیونکہ مچھلی کی خلقت تو ایسی ہوئی ہے، کہ وہ تو چارے کو دیکھ کر اس کو کھانے پر مجبور ہے، خواہ وہ تھوڑی ہی دیر پہلے اس ہک سے آزاد ہوئی ہو جو اس چارے کے اندر چھپا ہوا ہے، اس کے برعکس ہم اس گلاس کو جو ہونٹ تک جا چکا ہے، واپس میز پر رکھ سکتے ہیں، اور اپنے کام اور اپنی شہرت پر اس کے اثر کو غور کر سکتے ہیں، وسیع تر اور بہتر زندگی کے تخیلات اتفاقی واقعات سے نہیں، بلکہ اپنے منتظم اعمال سے تعمیر کئے جاتے ہیں، جو ذہنی زندگی میں واقع ہوتے ہیں، یہی اعلیٰ ذات ہمارے تفکر میں مستحضر ہو کر ایک کھینچنے اور مجبور کرنے کی قابلیت بنجاتی ہے، دوسرے الفاظ میں یہی اخلاقی زندگی میں تعیین کرنے والی قوت کہلاتی ہے، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اسی طرح غایت علتِ فاعلی کی شکل اختیار کر لیتی ہے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے اخلاقی انتخابات ہمارے خیالات کے دائرے کے اندر محدود رہتے ہیں، کوئی شخص وہ نیکی منتخب نہیں کر سکتا جس سے وہ لاعلم ہے، غلامانہ اور اخلاقاً غیر آزاد روح کی پہلی ضرورت یہ ہے کہ وہ صاف طور پر ایک ایسی بہتر زندگی کو معلوم کرلے، جو موجودہ زندگی پر فوقیت رکھے، عمل میں تغیر کرنے کے لئے ذہن کا تغیر پہلی شرط

ہے، یہ ایک اہم بات ہے، کہ جن مذاہب اور فلسفوں نے اخلاقی زندگی کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی ہے، اُن سب نے بدی سے نجات حاصل کرنے کو روشنی طبع پر مشروط کیا ہے "جب صداقت تم کو آزادی دلائے تب تم حقیقۃً آزاد ہو" لہذا صرف متعلم کی حیثیت سے انسان آزاد ہوسکتا ہے، صرف علم کے ذریعہ سے وہ اپنے ماضی سے تجاوز کر سکتا ہے، کسی محدود اور اصطلاحی معنوں میں نہیں، بلکہ وسیع ترین معنوں میں، علم فطرتِ انسانی کا تجاوز کرنے کا اصول ہے، لیکن یہ تجاوز ذہنی زندگی کے معین طور پر مربوط اعمال سے بچنے کے ہم معنی نہیں، یہ در اصل ان اعمال میں اور ان کی مدد سے ترقی کے مساوی ہے،

۱۰۔ جبریت پر بعض اعتراضات کا جواب

ابھی بعض ان مشکلات اور اعتراضات کا جواب دینا باقی ہے، جو اختیاریت پیش کرتی ہو، سب سے پہلا اعتراض یہ ہے، کہ ہمیں تسلیم ہے کہ جبریت میں اخلاقی ترقی کی گنجایش ہے، لیکن کیا یہ عقیدہ آزادی کے اس شعور کے متناقض نہیں، جو ہر عمل کے انتخاب کے وقت ہم میں سے ہر ایک کے تجربے میں آتا ہے؟

جواباً کہا جاسکتا ہے کہ اگر مذکورہ احساس شعور کا عام واقعہ ہو بھی، تب بھی اس غیر ناقدانہ احساس کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی، اب اگر یہ صحیح ہے کہ ہم میں ان معنوں میں آزاد ہونے کا شعور ہے جن میں کہ لفظ آزادی کو یہاں استعمال کیا گیا ہے، تو بھی بہ حیثیت علمی ثبوت کے اس احساس کی اتنی ہی قیمت ہے جتنی اس احساس کی کہ سورج زمین کے گرد گھومتا ہے، فلکیات کے لئے ہے"، دوسری بات یہ ہے کہ ایسے شعور کی عمومیت مشکوک ہے، ممکن ہے یہ ان لوگوں میں عام ہو، جن کی تعلیم ایسے خاص نظریوں کے زیر اثر ہوئی ہے، جن کی وجہ سے ان کے ذہن اس عقیدے کی طرف مائل ہوجاتے ہیں، لیکن جن لوگوں کی تعلیم مختلف نظریوں کے زیر اثر ہوئی ہے، ان میں یہ نا پید ہے، آخری بات یہ ہے، کہ شعور کا یہ فتوی جہاں کہیں، اور جس درجے میں بھی پایا جاتا ہو، ہر صورت میں اس کی ایسی نفسیاتی توجیہ ممکن ہے، جو جبریت کے

عین مطابق ہوتی ہے مستقبل کی طرف سے لاعلم رہنے کی صورت میں فیصلے کے وقت تک ہم اپنے انتخاب کو طبعاً غیر معین سمجھتے ہیں، جہاں تک ہمارا موجودہ علم ہماری مدد کرتا ہے، یہ فیصلہ امکانات میں سے کسی ایک کے مطابق ہو سکتا ہے، جب ہستیاں عالم الکل نہیں، ان کے لئے اس قسم کا ابہام ناگزیر ہے، بہت سے متبادل طرق عمل میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ صادر کرنے میں ہمیں کسی قدر دقت کیوں نہ پیش آئی ہو، لیکن اتنا ظاہر ہے کہ اس فیصلہ کرنے کے وقت ہماری ذات ایسی تھی، کہ کوئی اور فیصلہ صادر نہ کر سکتی تھی، ہم کو یہ سمجھنا چاہئے، کہ اعمال کے سلسلے میں ایک عمل دوسرے کو معین کرتا ہے، بلکہ درحقیقت ذات اپنے اعمال کو یکے بعد دیگرے معین کرتی ہے،

جبریت پر ایک اور اعتراض یہ ہے کہ اس کے مطابق ہمارے گذشتہ اعمال عام اس سے کہ وہ اچھے تھے، یا برے، اس سے مختلف نہ ہو سکتے تھے، جیسے کہ وہ تھے، کل کے برے کام پر آج ہم پچھتاتے ہیں، لیکن وہ لازمی اور ناگزیر تھا، گذشتہ اعمال کے وجوب و ضرورت کے خلاف اختیاریت بغاوت کرتی ہے، اور پھر احساس آزادی کی طرف مرافعہ کرتی ہے، جو اس کے نزدیک صدور فعل سے پہلے بھی ہوتا ہے، اور بعد میں بھی، اس کا دعویٰ ہے کہ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا فعل اس سے مختلف ہو سکتا تھا،

لیکن اگر ہم اپنے گذشتہ عمل پر غور کریں، تو کیا اس وقت کے داخلی و خارجی حالات کو پیش نظر رکھنے کے بعد بھی ہمیں کبھی ایسا معلوم ہوا ہے، کہ ہمارا عمل مختلف ہو سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، جب ہم اس معاملے پر بعد میں غور کرتے ہیں، تو ہمارا احساس یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم ویسے ہی خارجی حالات میں دوبارہ عمل کریں تو ہمارا فعل مختلف ہو سکتا ہے، اور کیوں؟ محض اس وجہ سے کہ ہم باطناً بدل چکے ہیں، اگر کوئی شخص اُن ہی حالات میں دوبارہ عمل کرے، جن میں کہ کل کا ماسوف علیہ عمل ہوا تھا، تو نتیجہ بلا شبہہ مختلف ہوگا، اسکی وجہ یہ ہے کہ آج کے وسیع تر تجربے اور نئے خیالات و احساسات کے مطابق اس عمل پر پچھتایا جاتا ہے، یہانتک کہا جا سکتا ہے کہ اس انتخاب کے پانچ منٹ بعد ہی پھر وہی صورت حالات پیدا ہوتی، تو بھی

ہمارا عمل مختلف ہوتا، اس کی وجہ بھی وہی ہوتی، میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم سنجیدگی کے ساتھ اپنے آپ سے یہ سوال کریں، کہ آیا ہمارا فعل بالکل اسی صورتِ حالات میں اسی احساس وعلم ونقطۂ نظر کیساتھ، اور بعد کے تجربے کی روشنی کے بغیر اس سے مختلف ہوسکتا تھا، جیسا کہ وہ زمانہ گذشتہ میں تھا، تو ہم بلا تامل جواب دیں گے، کہ ایسا نہیں ہوسکتا، اور یہ کہ ہمارا انتخاب بالکل وہی ہوگا،

اب رہ گیا یہ واقعہ کہ اشخاص گذشتہ افعال کے متعلق کہا کرتے ہیں، کہ "وہ مختلف ہوسکتے تھے" تو اس کا معاملہ اس طرح ہے کہ کسی فعل کے متعلق فیصلہ کرنے سے قبل ہم ایک یا دو متنازع راستوں کو واقعۃً ممکن سمجھتے ہیں، اس طرح کے دُہرے امکان کا خیال تمام شک، بحث اور تذبذب کی لازمی شرط ہے، ان میں سے کسی ایک تبادل راستے کو پہلے ہی سے ممکن سمجھ لو، تو تمام بحث فوراً ختم ہوجاتی ہے، اور یقین عدم یقین کی جگہ لے لیتا ہے اور فیصلہ تذبذب کی اب صرف ایک راستہ باقی رہ جاتا ہے، اور ہم اپنے آپ کو اس کی سمت میں مجبور پاتے ہیں، لیکن ہماری حالت یہ ہوتی ہے، کہ صدورِ فعل سے قبل ہم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے کہ دو تبادل راستوں میں سے ہم کس کا انتخاب کریں، یہ تذبذب شعور میں دو طریق عمل کے حقیقی امکان کی صورت میں باقی رہتا ہے، پھر جب ہم اس معاملے پر نگاہ دالیں ڈالتے ہیں، تو ہم اس سے پہلے کی ذہنی حالت کو اس عام قول میں ظاہر کرتے ہیں، کہ "یہ مختلف ہوسکتا تھا" یہ عجیب بات ہے، کہ ہم یہی فقرہ ان واقعات کے متعلق بھی استعمال کرتے ہیں، جن کو سب عقلمند آدمی متفقاً لابدی کہتے ہیں، مثلاً کسی نیچے یا کھلاڑی کے خطرناک کرتب کے بعد ہم کہا کرتے ہیں "کہ تمھاری ٹانگ ٹوٹ جاتی" ظاہر ہے کہ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہوتا، کہ ان تمام حالات میں، جو اس خاص وقت تھے، یہ نتیجہ حقیقۃً ممکن تھا، اگر نظامِ فطرت میں یہ ممکن ہوتا، تو یقیناً ظاہر ہوجاتا، بلکہ ہمارا مطلب صرف یہ ہوتا ہے، کہ اس واقعہ سے قبل ایسے حالات موجود تھے، جن کی وجہ سے ہمیں تشویش ہوگئی تھی، اس سبب سے کہ ہم نتیجے سے لاعلم تھے، اس کے علاوہ ہمارا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر یہ افعال جاری رکھے گئے، تو ان کا

انجام اچھا نہ ہوگا، کیونکہ عوارض حالات اور خود اپنے عضلات پر ہمارا تصرف ایک ہی سا نہیں رہتا، بہرحال یہ فقرہ کہ "یہ مختلف ہو سکتا تھا" دونوں صورتوں میں مساوی معنی رکھتا ہے،

۱۱- قسمت اور جبریت

جن لوگوں نے جبریت کے پورے معنوں کو اخذ نہیں کیا ہے، وہ معترض ہیں کہ یہ قسمت کے لئے ایک نرم اصطلاح ہے، اور یہ کہ یہ دونوں عقائد اخلاقی جد وجہد کے لئے مساوی طور پر مہلک ہیں، لیکن دو اہم نکتے ایسے ہیں، جن کی وجہ سے جبریت اور قسمت میں فرق ہو جاتا ہے، اوّل قسمت عام طور پر غلطیا کے ایک امید سوز عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہے، یہ اس واقعہ کو نظر انداز کرتی ہے، کہ انسان کے آیندہ فعل لازمی نہیں کہ اسکے گذشتہ افعال کے مشابہ ہوں، اور یہ کہ ان کی تبدیلی کا امکان ہر وقت رہتا ہے، یہ صحیح ہے کہ کوئی گذشتہ فعل ان حالات میں جو اسوقت تھے، مختلف نہ ہو سکتا تھا، لیکن مستقبل کا معاملہ اس سے الگ ہے، اگر ہم اس قول کی کہ "یہ مختلف ہو سکتا تھا" اہمیت کو بہت کم کرنے اور اسکو اس واقعہ سے قبل کے واقعات کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار سمجھنے پر مجبور ہیں، تو ہمارا یہ عزم کہ "ہم مختلف بنیں گے" ایک بالکل مختلف معنی رکھتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ فاعل میں ایک نیا ذہنی رویہ پیدا ہو چکا ہے، اس طرح اگر بعینہٖ وہی خارجی حالات دوبارہ پیدا ہوں تو داخلی حالات مختلف ہوں گے، اور اس طرح نئے انجام کی گنجائش نکل آوے گی، لہذا مستقبل میں بدی کے بجائے نیکی کا انتخاب ہو سکتا ہے، ہم کسی ناقابلِ تغیر نظامِ عمل کے پابند نہیں، جس وسیع کل میں تمام واقعات ہمارے نزدیک نہ ٹوٹنے والے رشتے میں منسلک ہیں، وہ سکونی دنیا نہیں، اس میں حرکت ہوتی ہے، تغیر ہوتا ہے، اور زندگی ہے، ذہنی دنیا کو معین طور پر متعلق و مربوط کہنے سے نئے تجربات اس دنیا میں سے اسی حد تک خارج ہوتے ہیں، جس حد تک کہ ایک ایسا ہی تخیل جس کا ذی فکر انسان فطرت پر اطلاق کرتے ہیں، اس فطرت میں سے نئے واقعات کو خارج کرتا ہے،

دوم۔ قسمت ذات کی کار فرمائی کو بھی نظر انداز کرتی ہے، اور انسانی زندگی کو خارجی قوتوں کا کھیل سمجھتی ہے، اس کے نزدیک کائناتی عمل ذاتی تقدیر کو معین کرتا ہے، اس تعیین میں وہ شعور کی باطنی دنیا کو ملحوظ نہیں رکھتی، قسمت فرض کرتی ہے، کہ انسانی تقدیر انسانی فعل کے بغیر معین ہوتی ہے، جبریت اس کو انتخاب کا نتیجہ سمجھتی ہے، کسی شخص کی تقدیر اسکی فطرت اور اسکے افعال کے بغیر معین نہیں ہوتی اگر کل جزو کو معین کرتا ہے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ یہ تعیین جزو کی شرکت کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہ خیال رکھنا چاہئے کہ دنیا اور ذات کا کمیتی مقابلہ یعنی ایک کو بہت بڑا، اور دوسری کو بہت چھوٹا کہنا گمراہ کن ہے، ہر عقیدے کے مطابق فرد تمام اشخاص و اشیا کے مقابلہ میں بہت چھوٹا ہوتا ہے، لیکن جہانتک کسی خاص ذات کی تقدیر کا تعلق ہے، یہ ذات جیسی کچھ ہے، اور جو کچھ وہ کرتی ہے یہی سب سے بڑا عنصر ہے، اس میں کلام نہیں کہ ہم ایک کائناتی قوت کے تابع ہیں، لیکن قسمت اس واقعہ کو ملحوظ نہیں رکھتی، کہ یہ قوت بعض غایات کو صرف ہمارے تفکر اور ارادے کے ذریعہ سے حاصل کرتی ہے، یہ بھی اکثر بھلا دیا جاتا ہے، کہ نفس اختیاریت ایک دوسری قسم کی قسمت میں تحویل ہو جاتی ہے، اگر بلا محرک انتخاب اور اندھا دھند ارادے کی قوت فی الواقع موجود ہوتی، تو ہم بجا طور پر شکایت کر سکتے تھے، کہ اسی حد تک ہماری زندگی بدترین قسم کی قسمت یعنی بخت واتفاق کے حوالے ہو جاتی ہے،

قسمت کے مطابق ہماری تقدیر کو ایسی قوتیں معین کرتی ہیں، جو ذات سے باہر ہیں، اگر یہ عقیدہ اخلاقی جد و جہد کے لئے مہلک ہے، اور جمود و خمود یا عوارض حالات کی غلامی کو پیدا کرتا ہے، تو جبریت اس سے بالکل مختلف ہے، یہ ذات کو انسانی زندگی کی تعیین کے لئے ایک کارکن اور اہم عنصر سمجھتی ہے، تحریف بیا سی و عمل صرف اس وقت مفقود ہو سکتی ہے، جب ہم اپنے مستقبل کے متعلق کامل و مکمل علم رکھتے ہوں، اس صورت میں زندگی اپنی دلچسپیوں کو یقیناً کھو دے گی، کیونکہ ہم اپنے تجربات کو مستقبل کے ہاتھوں سے چھین قبل از وقت اس کے مالک بن جائیں گے، لیکن جبری عقیدے کے مطابق ہماری جیسی محدود ہستیوں کے لئے

زندگی ہمیشہ ایسی چیزوں کی رازکشائی کو باقی رکھے گی، جو ابھی نامعلوم ہیں، ان میں ان غایات کے حصول کا شوق باقی رہے گا، جو ابھی حاصل نہیں ہوئیں، اور تجربہ میں نہیں آئیں، جب ہم کسی شکار کا تعاقب کرتے ہیں، تو ہماری دلچسپی اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی، کہ ہمارا راستہ پہلے ہی سے معین و مقرر ہے، یا یہ کہ ہم سے قبل اور بہت سے لوگ اس کو طے کر چکے ہیں، جب ہم خود اس کو پہلی مرتبہ طے کرتے ہیں، تو اس میں ندرت کی تمام دلکشیاں موجود ہوتی ہیں، یہی حال زندگی کا ہے، مستقبل میں جو کچھ ہے، وہ ہر قدم پر ایک نیا تجربہ ہوتا ہے، ہم کو خود اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا کسی درجۂ کمال تک علم نہیں، یہی وہ چیزیں ہوتی ہیں، جن کو ہمیں دریافت کرنا پڑتا ہے، ہم کیا کچھ حاصل کر سکتے ہیں، اور جو کچھ ہم حاصل کرتے ہیں، اس کی قیمت کیا ہوتی ہے، ان تمام باتوں کا علم ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتا، جب تک کہ ہم کوشش نہیں کرتے، یہ خیال رکھنا چاہئے، کہ خواہش اور کوشش ہماری فطرت کے عنصری اور ضروری حصے ہیں، ان کی تشفی صرف زندگی کے ختم ہونے سے ہوتی ہے (باقی)

تذکرۂ طاہر

یعنی

سوانح خود نوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم

(۵)

جدید علم کلام کی سرسید مرحوم نے بنیا د ڈالی

بہر حال مجھ کو متعدد مرتبہ سرسید مرحوم سے جلوت و خلوت میں ملنے کا اور اُن کے حکیمانہ و فلسفیانہ اقوال اور مذہبی خیالات سے مستفید ہونے کا، اور ان کے تالیفات و مضامین پر غور و خوض کرنے کا موقع ملا، اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ یورپ کے علوم جدیدہ کے مقابل میں سرسید مرحوم نے ایک جدید علم کلام کی بنیاد ڈالی، اور انگریزی خواں تعلیم یافتہ گروہ کو ہاویۂ کفر و ارتداد میں گرنے سے بچا لیا، اور دین الفطرۃ اسلام کے وقار قائم رکھنے کی جو سعی ان کے دست و قلم و زبان سے وقوع میں آئی، اسکی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کو ان کے مقاصد صحیحہ میں بڑی حد تک کامیابی ہوئی دنیائے علم اور عالم اسلامی میں ہمیشہ ان کو ممتاز درجہ حاصل رہے گا، اور آیندہ نسلیں ہمیشہ انکے مساعی جمیلہ کی فخر کیساتھ شکر گذار رہیں گی،

سرسید مرحوم کی تالیفات و مذہبی خیالات پر رائے

مگر میں صاف دلی کیساتھ اپنے علم و فہم کے مطابق بلا اندیشہ لومۃ لائم کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان کی لاجواب تالیفات اور مضامین نافعہ سے مسلمانوں کو دینی اور دنیاوی فوائد تو بے شمار حاصل ہوئے، مگر سچ یہ ہے کہ جیسی چاہئے تھی، اُن سے حقیقی مقاصد اسلام

کی تکمیل نہیں ہو سکی، اور نہ یہ اسوقت ممکن تھا، ؎

از حکمت و منطق نہ کشاید در عرفاں ... ایں با ہمہ آرایش افسانۂ عشق است

جو لوگ علوم مذہبی سے واقف ہیں، اور جن کے دل و دماغ میں غور و تحقیق اور صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا مادہ قدرت نے ودیعت کر رکھا ہے، وہ سرسید مرحوم کے حکیمانہ اقوال اور فلسفیانہ خیالات سے بلاشک و شبہہ عظیم فوائد اور بہترین نتائج اخذ کر سکتے ہیں، اور حق و صداقت کی صراطِ مستقیم سے بھٹک نہیں سکتے، مگر جو لوگ علوم مذہبی میں دستگاہ نہیں رکھتے، اور سطحی خیالات والے ہیں، اور جن کا زیادہ وقت صرف مغربی علوم جدیدہ اور فلسفۂ مغرب کے مطالعہ میں گذرا کرتا ہے، وہ سرسید مرحوم کے تالیفات و خیالات سے استعدر تو ضرور فائدہ حاصل کر سکتے ہیں، کہ نام کے مسلمان رہیں، اور دائرۂ اسلام سے خارج نہ ہوں مگر اسلام جیسے دین الفطرت اور مجموعۂ حق و صداقت سے کامل فائدہ نہیں اٹھا سکتے،

سرسید مرحوم اور قدمائے متکلمین کے طرز استدلال و بحث کا فرق

اس لیے قدمائے متکلمین نے جب فلسفۂ یونانی کے مقابلہ کے لئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، اور اس کے ذریعہ سے مسائل فلسفہ کو مسائلِ مذہبی سے تطبیق دینے کی کوشش کی تو انھوں نے دین الفطرۃ اسلام کی برتری کو مدنظر رکھکر اسکے اصول و احکام کو مقدم رکھا اور ان کے ضمن و تحت وائرہ میں مسائلِ فلسفہ بیان کر کے ان کی تطبیق یا تردید یا مشکوک ٹھہرانے میں مساعی جمیلہ سے کام لیا، اس طرز بیان و استدلال و بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ اصول و احکامِ مذہبی کا تفوق و احترام دلوں میں قائم رہا، اور کوئی شخص راہِ راست اسلام سے گمراہ نہیں ہوا، برخلاف اس کے سرسید مرحوم نے مسائل فلسفہ کو بلند رکھکر ان کے ضمن و تحت وائرہ میں اسلامی اصول و احکام بیان کر کے ان کی تطبیق و تردید وغیرہ میں سعی موفور کی اس طرز بیان و استدلال و بحث کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ جلد بھٹک جانے والی طبیعتیں اور موجودہ شاندار مغربی تمدن و سائنس کی ترقی سے مرعوب ہو جانے والے قلوب راہ راست اسلام کو چھوڑنے اور کفر و ارتداد کی غار میں گرنے سے رک گئے، مگر با این ہمہ وہ اصول و احکام صادقۂ ایمانی کے لذت آشنا ہونے

سے کوسوں دور پڑے رہے۔ ؎

کسے کز لذتِ طاعت بود محروم من ضامن که بگذارند در جنت و لے با داغ حرمانش

جہاں تک میں نے غور کیا سرسید مرحوم کی تالیفات و مضامین کا میں نے یہی اثر اپنے دل پر پایا، مگر خدا ے عز وجل کا بڑا فضل میرے حال پر یہ تھا، کہ حضرت والد محترم کے فیض صحبت و تربیت سے مطالعۂ کتاب و سنت کا ذوق میرے دل میں سرایت کر چکا تھا، گو وہ عارضی طور پر فلسفیانہ خیالات سے متاثر ہو کر کچھ دنوں کے لئے دب گیا تھا، مگر مٹا نہیں تھا،

دیوان سرنوشتم چوں نسخہ ہاے اصلی ہرچند بد نوشت است اما غلط ندارد

چنانچہ اس زمانہ میں بھی جسکو میں ایک قسم کے فسق و الحاد کے زمانہ کے نام سے تعبیر کیا کرتا ہوں، حضرت والد مرحوم کی تالیفات اور ائمۂ ہدی یعنی علامہ ابن تیمیہؒ امام غزالی، امام فخر الدین رازی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی وغیرہ کی تصنیفات اور علماء عصریہ میں حکیم الامۃ جمال الدین اسد آبادی مفتی محمد عبدہٗ علامہ جسر طرابلسی خیر الدین پاشا وزیر تونس کی تالیفات اور حضرت علامہ شبلیؒ کے فیض صحبت نے مجھ کو خضر راہ کا کام دیا، اور خدا ے ارحم الراحمین نے مجھ کو ورطۂ ہلاکت و ضلالت سے نکلنے کی توفیق عطا فرمائی، اور بہت جلد مغربی فلسفہ کی ملحدانہ دلفریبی تمدن جدید کی ملمع سازی، مؤرخین یورپ کے طرز خیالات کی بے اعتدالی اور مؤرخانہ رنگ آمیزی اور اشاعت تہذیب کے پیرایہ میں مذاہب کی بیخ کنی اور قلیل التعداد اقوام کی حمایت کے پردہ میں توسیع حکومت کی ہوس رانی، امن و امان قائم رکھنے کے نام سے مغربی مدبرانہ چالاکی، اور مختلف اقوام میں تفرقہ اندازی کا راز مجھ پر کھل گیا،

خود را نہ پرستیدۂ عرفاں چہ شناسی کافر نشدی لذتِ ایماں چہ شناسی

الحمد للہ کہ اب میں تحقیقی طور پر نہ تقلیدی طور پر مغربی فلسفیانہ خیالات و مغربی طرز و روش سے کنارہ کش ہو کر دنیا میں صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب کو مجموعۂ حق و صداقت اور ترقی یافتہ

مکمل تہذیب سمجھتا ہون، اور اس کے دین الفطرۃ ہونے پر دل سے یقین کرتا ہوں اور اتباعِ کتاب و سنت ہی کو صراطِ مستقیم اور میزانِ قسط جانتا ہوں، اور اسی پر قائم ہوں۔ واللہ ولی التوفیق و الیہ المرجع و المآب ۔

زترتیبِ نظامِ آفرینش چون نہ آگہ، حوادث را ز تاثیرِ نجوم آسمان بینی

زگر در غبتِ خاطر فروشو دیدۂ فطرت اگر خواہی کہ حسن خار و گل یکسان بینی

برآ از پردۂ صورت قدم در راہ معنی زن کہ در ہر منزلے سرّے ز اسرارِ نہان بینی

خیالاتِ گذشتہ پر افسوس، گذشتہ خیالات وحالات کی ندامت اب تک میں اپنے قلب میں محسوس کیا کرتا ہون، اور غایتِ عجز و الحاح کے ساتھ اپنے خالق فاطر السموات والارض وحدہٗ لاشریک لہ کے سامنے سربسجود اور دست بدعا ہون، کہ وہ مجھکو اور میری اولاد و احفاد کو کتاب و سنت کی صراطِ مستقیم پر قائم رکھے، اور استقامت بخشے اور میرے سیئات کو حسنات سے بدل دے' انّ الحسنات یذھبن السّیئات ذٰلک ذکریٰ للذاکرین ،

سرسید مرحوم کی کامیابی، بہر تقدیر سرسید مرحوم کو جو صدقِ عقیدت اسلام کے ساتھ تھی، اور جس نیک نیتی کے ساتھ انھوں نے علماے عصر کو حمایتِ اسلام کے اہم دینی فرض سے غافل پا کر اپنے علم و دانش وخیال کے مطابق اسلام کی تائید و حمایت اور قوم کی دنیاوی ترقی میں اپنی عمرِ عزیز صرف کی، یہ اسی کی برکت تھی کہ کالج کو ایک قلیل مدت میں وہ عظمت و مرکزیت حاصل ہوئی، جس کی امید عام مخالفت کو دیکھتے ہوئے بمشکل ہو سکتی تھی، مسلمانوں میں رفتہ رفتہ اشتراکِ عمل کی روح اور اپنے قومی تنزل کا احساس پیدا ہونے لگا، علماے اسلام کو بھی علومِ مشرقیہ کی حفاظت و احیار کا خیال پیدا ہوا، اور اسلام کی حمایت، اور مسلمانوں میں روشن ضمیری پھیلانے کی طرف ان کو خاص طور پر توجہ ہوئی، اور اس طرح ندوۃ العلماء کی بنیاد پڑی، دین الفطرت اسلام کا ایک بڑا رکن یعنی دنیاوی ترقی جس پر اسلام اور

ایک بڑا ارکن یعنی دنیاوی ترقی جس پر اسلام اور مسلمانوں کی عظمت و وقار کا مدار تھا، اور جس کو مدت دراز سے علمائے ملت نے اپنے دائرہ سعی و عمل سے متروک و خارج سمجھ رکھا تھا، سرسید مرحوم نے اسکی ضرورت کو قوم کے ذہن نشین کیا، غرض سرسید مرحوم نے اپنے مساعی جمیلہ کا نیک ثمرہ بہت کچھ اپنی زندگی ہی میں پا لیا، اور جو باغ انھوں نے قوم کے ہونہار بچوں کو جمع کرکے لگایا تھا، اس کو پھولتے پھلتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا،

نواب محسن الملک بہادر مرحوم کا خط راقم الحروف کے نام

سرسید مرحوم کی وفات کے بعد بست و ششم جنوری ۱۸۹۹ء میں نواب محسن الدولہ محسن الملک مولوی مہدی علی خان بہادر مرحوم آنریری سکریٹری محمڈن کالج نے مجھ کو خط میں لکھا کہ آپ کا نام نامی ٹرسٹیوں کی فہرست میں نہیں ہے، اگر آیندہ کوئی جگہ خالی ہوئی، تو مجھے یقین ہے، کہ سید محمود صاحب اور دیگر ٹرسٹی آپ کے غالباً خواہش کریں اور میں اسکی تحریک کرونگا، اور جب تک وقت آئے میں آپ کی خدمت میں مطبوعہ کاغذات کالج کے اور ضروری اطلاعیں متعلق ترقی کالج کے عرض کرتا رہوں گا، مگر واقعہ یہ ہے، کہ بعض اتفاقی موانع کی بنا پر باوجود غایت دلچسپی کے میں ٹرسٹی شپ قبول کرنے سے پہلو تہی کرتا رہا، یہانتک کہ کالج کا ایک نیا مذہبی دور شروع ہوا، اور نواب وقار الملک بہادر مولوی مشتاق حسین صاحب مرحوم نے آنریری سکریٹری شپ کا عہدہ قوم کی متفقہ آواز سے متاثر ہو کر قبول فرمایا، نواب صاحب مرحوم کی ذات اقدس روشن خیالی آزاد طبعی مذہبی پابندی اور تقوی کے لحاظ سے بہت اعلیٰ اور ارفع درجہ رکھتی تھی، ان کے آنریری سکریٹری کالج ہونے سے بہت سی بدگمانیاں اور شبہات جو سرسید مرحوم کی پارٹی اور کالج کی طرف سے علما و قوم اور زمیندار لوگوں کے دلوں میں تھیں، دور ہو گئیں، نواب صاحب بہادر مرحوم کے مبارک عہد میں مجکو کالج کے ٹرسٹی ہونے کی عزت حاصل ہوئی، چونکہ اب وہ پہلی سی مجبوریاں بھی باقی نہیں رہی تھیں، اسلئے بزرگان قوم کی بخشی ہوئی عزت اور خصوصاً نواب صاحب بہادر مرحوم کی تعمیل ارشاد سے روگردانی کرنا ایک

قسم کا کفران نعمت تھا، اور میرے بس کی بات نہ تھی، میں نے دلی شکرگذاری اور احسان مندی کیساتھ اس عزت کو قبول کیا، بعد ازاں دوازدہم مارچ ۱۹۰۵ء میں مجھ کو سنٹرل اسٹینڈنگ کمیٹی کے ممبر ہونیکی عزت بخشی گئی،

۱۹۰۴ء میں جب ایجوکیشنل کانفرنس کا مشہور اجلاس لکھنؤ میں زیر صدارت مسٹر بیک منعقد ہوا تو اس میں نواب صاحب اور تمام رؤسا وارکین نے نواب محسن الملک کی تحریک پر خاکسار کو صدارت استقبالیہ کمیٹی کی عزت بخشی، اسی اجلاس میں میں نے اپنی دو متوفی لڑکیوں کی یادگار میں تین ہزار روپیہ کے صرف سے دو پختہ بورڈنگ ہاؤس تعمیر کرائے، جب اس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا آغاز ہوا، اور ہز ہائینس سر آغا خان بالقابہ کا ڈپوٹیشن لکھنؤ میں آیا، تو ہز ہائینس غریب خانہ پر تشریف لائے، اور یونیورسٹی کمیٹی میں میں نے پندرہ ہزار روپیہ یکشت پیش کیا،

رکنیت ندوۃ العلماء، ترک وطن کرکے لکھنؤ چلے آنے کے بعد حضرت علامہ شبلی مرحوم نے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے رکن بنائے جانے کی تحریک کی، اور مجلس انتظامیہ نے مجکو منتخب کرکے رکن ہونے کی عزت بخشی چنانچہ چند سال تک میں نے دلی جوش و توجہ کے ساتھ ندوہ کے مذہبی و تعلیمی خدمات میں حصہ لیتا رہا،

ندوہ کے نظام عمل میں نقائص کا ظہور۔ کچھ مدت گذرنے کے بعد عملی تجربہ نے مجھ پر یہ امر واضح اور منکشف کر دیا، کہ ندوہ کے نظام کار (کانسٹی ٹیوشن) میں چند ایسے نقائص عظیمہ پیدا ہوگئے ہیں، جو اس کو مقاصد مہمہ کی بنیاد ہی کو متزلزل کئے دیتے ہیں، یہ صورت حال محسوس کرکے میں نے بعض مشاہیر ارکان و اعضائے مجلس ندوہ سے اس معاملہ میں بالمشافہ اور بذریعہ خط و کتابت مشورہ کیا، اور اپنے محترم دوست جناب مولوی عزیز مرزا صاحب مرحوم سابق سکریٹری آل انڈیا مسلم لیگ و رکن انتظامی ندوۃ العلماء کے قلم سے خطوط لکھواکر بیرونی ارکان کو اصل حالات سے مطلع کیا،

انجمن اصلاحِ ندوہ کی تاسیس و آغاز دعوت: جب تقریبًا دو تہائی ارکان انتظامیہ ضرورتِ اصلاح پر متفق ہوگئے، تو بعض اجزائے صالحہ کے ذریعہ سے انجمن اصلاحِ ندوہ کی بنیاد ڈالی، انجمن کے اولین اجلاس نے فیصلہ کر دیا، کہ اس انجمن کے صدر جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم وکیل لکھنؤ وسابق وزیر بھوپال ہوں[1] اور راقم الحروف سکریٹری ہو،

جب عام طور پر لوگوں کو ندوہ کے نظام کار کے نقائص کا علم ہوا، تو ہندوستان کے مختلف صوبوں شہروں بلکہ قصبات و دیہات تک میں تقریبًا پچاس جلسے مسلسل مطالبۂ اصلاح کی تائید میں منعقد ہوئے انجمن اصلاحِ ندوہ نے اپنے کاموں کا جو پروگرام طے کیا تھا، اس میں یہ تجویز بھی تھی، کہ معاملاتِ ندوہ کے متعلق ایک عام کانفرنس منعقد کیجائے، اور تمام ملک سے نا یبینِ ملت کا مجمع فراہم کرکے ان کے سامنے اس مسئلہ کو پیش کیا جائے، چونکہ دہلی کو قدیم سے علوم اسلامیہ کا مرکز اور دار السلطنت ہند ہونے کا شرف رہا ہے اسلئے قدرتی طور پر ادھر توجہ ہوئی، اللہ تعالیٰ نے بزرگانِ کرام دہلی کے دلوں کو اس مقصدِ عظیم کی طرف متوجہ فرمادیا، عالیجناب مسیح الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب دہلوی مرحوم نے بمعیت بزرگانِ دہلی، اوائل اپریل ۱۹۱۴ء میں ایک جلسۂ عام کرکے اس مشکل کو خود بخود حل فرمادیا چنانچہ دہم مئی ۱۹۱۳ء کو ایک عظیم الشان کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی، اور آل انڈیا مسلم لیگ علیگڈھ کانفرنس مسلم یونیورسٹی کمیٹی حمایتِ اسلام اور خود ندوۃ العلماء کے اجلاس جن ملکی جماعتوں سے مرکب ہوا کرتے ہیں، اُن سے زیادہ جامع اور اوسع اجتماع کے ساتھ اس کانفرنس میں بزرگانِ قوم وملت نے شرکت فرمائی، اور نو اصحاب کی ایک کمیٹی کو منتخب کیا کمیٹی نے ندوہ کے تنزل کے اسباب وعلل دریافت کرکے ایک دستور العمل مرتب کیا، اور تمام وہ طریق عمل بھی قرار دیئے، جن پر کاربند ہوکر ندوہ ندوہ بن سکتا ہے، مگر افسوس اس وقت بدقسمتی سے کچھ ایسے اسباب غلط فہمی اور سوء ظن کے

[1] جناب مولوی نظام الدین حسن صاحب مرحوم نے بست وسوم ستمبر ۱۹۳۱ء مطابق بست محرم شب جمعہ ۱۳۵۰ھ میں وفات پائی، اللھمّ اغفرہ وارحمہ،

جمع ہوگئے، کہ بزرگانِ ندوہ نے کمیٹی کی برادرانہ گذارشوں پر مطلق توجہ نہ فرمائی، اور پورا ایک سال کا زمانہ اسی جد و جہد میں بسر ہو گیا، ہمارے ہر سوال کے جواب میں اغماض اور ہمارے ہر عجز کے سامنے بے نیازی تھی، بایں ہمہ کمیٹی کا رویہ برابر آشتی اور صلح پر مبنی رہا، دہم مئی کے اجلاس کے بعد سے علانیہ مخالفت اور انعقادِ مجالس عام کی کوششیں بند کر دی گئیں، یہانتک کہ رسالہ الہلال میں جو مسئلۂ اصلاح کے خاص محرکین میں تھا کمیٹی کے قیام کے بعد کوئی مضمون اس میں شائع نہیں ہوا، پھر بھی اربابِ کار نے نظر توجہ سے دریغ فرمایا:- ع

ادھر سے عجز ادھر سے رکھائیاں ہی رہیں،

ندوہ کے جانب سے جلسۂ عام کا اعلان

اسی اثنار میں ارکانِ ندوہ نے جلسۂ عام کے انعقاد کا اعلان کیا، خواہ اس اعلان کا مقصد کچھ ہی رہا ہو، مگر ہم اس ارادہ کے منت گذار ہیں کہ آخر کار یہی اعلان ہمارے مقصد یک سالہ کے ظہور کا وسیلہ بنا، اس اعلان نے ارکانِ انجمن اصلاح کو یکایک اس نئے سوال کی طرف متوجہ کر دیا، کہ اس موقع پر ان کو کونسا طریقۂ عمل اختیار کرنا چاہئے، اس پر غور و مشورہ کے بعد حضرت محترم جناب مولانا ابو الکلام صاحب آزاد کلکتہ سے لکھنؤ تشریف لائے، تاکہ اس مسئلہ کا آخری قطعی فیصلہ کیا جائے، بالآخر یہ رائے قرار پائی، کہ جس طرح ان کی بے نیازی کی انتہا نہیں، اس طرح ہمارے عجز و سوال کی بھی کوئی حد نہیں ہونی چاہئے، اور اگر اس میں بھی ناکامی ہو، تو پھر مجبوراً جلسۂ عام میں شریک ہو کر پبلک طور پر مطالبۂ اصلاح کو پیش کیا جائے، اور اجتماعی قوت کے ذریعہ سے موانعِ تبولیتِ اصلاح کو ایک آخری اور قطعی شکست دیجائے، چنانچہ ایک مراسلہ جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی خدمت میں بھیجا گیا، اور ان کو توجہ دلائی گئی، کہ اگر جلسۂ سالانہ سے پہلے امور مختلفہ کے متعلق ہم متحد ہو سکیں، اور جلسۂ عام میں اختلافات کے اختتام اور حصول مقصد اصلاح کا اعلان کر سکیں تو ندوۃ کے لئے یہ ایک مژدۂ حیات ہوگا ورنہ جلسہ کے اندر شدید معرکۂ اختلاف گرم ہونا، ندوہ کی بقیہ زندگی کا خاتمہ ہوگا اور ہمارے نزدیک مقصد ہی کا کام

انجمن اصلاح ندوہ کی کامیابی خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہ استدعا، پایۂ اجابت کو پہنچی، ہماری صدائیں بے اثر نہ رہیں، ہمارا عجز و نیاز رائگاں نہیں گیا، ہمارا سوال محروم جواب نہ رہا، ہماری نیتوں کی صداقت وعدم صداقت کا جو فیصلہ نتیجۂ کار اور عاقبت امر کے ہاتھ میں تھا، بالآخر مشتبہ نہیں رہا، تلک الدار الآخرۃ نجعلھا للذین لا یریدون فی الارض علوا و لا فسادا والعاقبۃ للمتقین، اور انجمن اصلاح اور ندوۃ العلماء کے وکلاء و ناظمین کی ایک ایسی مشترک صحبت تمام متنازع فیہ مسائل پر غور کرنے، اور کسی ایک متفقہ نقطہ تک پہنچنے کیلئے قرار پائی جس میں نصف تعداد ارکان ندوہ کی، اور نصف تعداد ارکان انجمن اصلاح ندوہ کی ہو اس میں حسب ذیل ارکان انجمن اصلاح کے جانب سے شریک ہوئی، مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب دہلوی مرحوم مولنا مولوی ابو الکلام صاحب آزاد، بابو نظام الدین صاحب امرتسری، ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب راقم الحروف سکریٹری انجمن، کچھ شک نہیں کہ اگر نیتیں صاف اور قلوب حق پرست ہوں، تو جن مناقشوں میں عمریں صرف ہوجایا کرتی ہیں، وہ ایک لمحۂ تفکر میں رفع ہوسکتے ہیں، یہ صحبت مغرب کے بعد سے گیارہ بجے شب تک رہی، مبادلۂ خیالات و مباحث کے بعد تقریبًا تمام مسائل اصلاح حل ہوگئے اور اصلاح ندوہ کے متعلق جس قدر اہم مطالبات تھے، اُن سب کو بزرگان ندوہ نے منظور فرمالیا، ؎

بعد از ہزار سعی ثواب و مجاہدت — زنار زاہد و بت ترسا بما رسید،

وَالحمدُ للہ الذی ھدانا لھذا وکنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ،

اس موقع پر میں خصوصیت کے ساتھ ان احباب ذوی الاحترام کا تشکرانہ ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا، جن کی مساعی جمیلہ سے انجمن اصلاح کے مقاصد کی تکمیل اور جن کی مدد و توجہ سے راقم الحروف کو کامیابی نصیب ہوئی، سچ یہ ہے کہ اگر جناب مولانا مولوی مسعود علی صاحب ندوی اور جناب حکیم عبد الولی صاحب مرحوم لکھنوی کی عملی سعی و ہمدردی، اور جناب مولنا مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کی معنوی اعانت، جناب مولنا ابو الکلام صاحب آزاد کی مخلصانہ اور حق پرستانہ کوشش، اور جناب مسیح الملک

حکیم اجمل خانصاحب دہلوی کی غایت دلسوزی کے ساتھ چارہ سازی، اور جناب رئیس الاحرار مولانا محمد علی صاحب کی دلی جوش کے ساتھ مدبرانہ ایثار نفسی اور بیش بہا امداد شریکِ کار نہ ہوتی، تو کامیابی دشوار بلکہ قریبًا محال تھی، اسی طرح اگر جناب مولینا مولوی حکیم سید عبدالحیٰ صاحب مرحوم ناظم سابق ندوۃ العلماء عہدۂ نظامت کو قبول فرماکر رفعِ نزاع میں کوشش نہ فرماتے، تو تمام سعی وجہد رائگاں جاتی، اب میں اس تذکرہ کو اس مصلح حکیم اور مرشد خبیر کے ذکر و دعا پر ختم کرتا ہوں، جسکو ندوہ کے ساتھ روح وجسد کا سا تعلق رہا ہے، جس نے اپنی زندگی کی بہترین فرصتوں اور قوتوں کو ندوہ کی راہ میں وقف کر رکھا تھا، جسکی فکر حکیم اور رائے مستقیم نے قیام دارالعلوم اور اصلاحِ نصاب کو اصلاح دینی کا اصل اساس سمجھ کر سب سے پہلے اس عملِ جلیل کی بنیاد ڈالی، اور احیائے امت مرحومہ کی جس حقیقتِ کبری کو باوجود محسوس کرنے کے حکیم الامۃ جمال الدین اسدآبادی مرحوم اور مفتی محمد عبدہ مرحوم عمل میں نہ لا سکے، اسکو حضرت علامہ شبلی مرحوم نے عملًا نمایاں کرکے دکھا دیا،

مگر افسوس ہے کہ باایں ہمہ بدبختانہ طور پر ندوۃ العلماء اس کے فیض بخشی حیات سے محروم رہا، اور اس قتیلِ ندوہ اور فداے اصلاح دینی کے خدماتِ عظیمہ سے مستفید نہ ہوسکا،

اولاد، زوجۂ اولی کے بطن سے تین لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ اور ان تینوں نے میرے سامنے وفات پائی، زوجۂ ثانیہ سے آٹھ لڑکیاں اور تین فرزند پیدا ہوئے، سب سے بڑا ابوالفضل عزیزی سید امیر حسن خان سلمہ اللہ تعالی ۱۳۱۰ھ میں ولادت ہوئی، دوسرا عزیزی ابوالفتح سید شمس الحسن خان سلمہ اللہ تعالی ۱۳۲۲ھ میں پیدا ہوئے، اور بی اے ال ال بی تک تعلیم پائی، شعر و سخن کا سلیقہ رکھتے ہیں اور تیسرا عزیزی ابوالفیض سید انور حسن سلمہ اللہ تعالی ۱۳۲۶ھ میں پیدا ہوا،

تصانیف، راقم الحروف کے حسب ذیل تالیفات ہیں،

حظیرۃ التقدیس، موارد المصادر للصادر والوارد، فطرت الاسلام، المدنیۃ فی الاسلام، شریعت الاسلام

سیرۃ الاسلام، رسالۂ دیندار و دنیا دار، اسلام اور اس کے طریقۂ عبادت، تعلیم و تربیت، تذکرۂ بزم سخن، خرمن گل، نالۂ دل، اغراض و مقاصد کانفرنس، خطبۂ صدارت متعلق تعلیم نسوان، انتظام خانہ داری، خطبۂ تعلیم مسائل الاسلام قلمی، گلگشت گلستاں باب اول قلمی، مضامین و تراجم قلمی، خطبۃ البیان متعلق اسلامیہ کلب بمبئی، خطبۃ البیان نمبر ۲ متعلق ندوۃ العلماء، مآثر صدیقی ۴ جلد، غیر مطبوعہ فارسی و اردو کلام، بعض مضامین جو مختلف رسا[ل]
میں شائع ہوئے،

(باقی)

الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق و شام مصر اور ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست اخلاق و زہد، عدل، اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر،

مولینا شبلی کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گرانما[یہ] کتاب کے بیسیوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، [دار المصنفین] معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کا[نپور] کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ مطلا[؟] ضخامت ۳۱۲ صفحے قیمت سے ؍

سیرۃ النعمان

امام ابوحنیفہ کی سوانحعمری اور ان کے اجتہادات اور مسائل، فقہ حنفی کی تاریخ اور اسکی تدوین کے حا[لات]
فقہ حنفی کی خصوصیات، علم حدیث، علم فقہ کی تاریخ اور اسلامی قانون پر تبصرہ، حجم ۲۴۲ صفحے، قیمت :- ؏ ؍

"منیجر"

حیدرآباد دکن کے
اردو اخبارات اور رسائل

از جناب سید تمکین صاحب کاظمی منشی فاضل، ایف آر اے ایس، ایم آر اے ایس

(۳)

سنہ ۱۹۲۶ء میں جامعہ عثمانیہ کی طرف سے اساتذہ کی امداد سے سینیر طلبائے جامعہ نے مجلہ عثمانیہ سہ ماہی جاری کیا، جو آدھا اردو آدھا انگریزی تھا، یہ رسالہ ابتک نہایت عمدگی سے جاری ہے،

سنہ ۱۹۲۶ء میں کتب خانہ مسجد چوک کے منتظمین نے رسالہ تجلی سہ ماہی جاری کیا، اور اسکی ادارت محمد سردار علی صاحب کے تفویض کی گئی، باوجود مولوی غلام محمد صاحب کی مالی اعانت کے مرتب کی ناتجربہ کاری اور عدم قابلیت کی وجہ سے رسالہ بند ہوگیا، یہ رسالہ بھی نہایت مفید اور جب تک بعض خاص محققین لوگوں کے مشورے سے نکلتا رہا، بڑی اچھی طرح نکلا،

سنہ ۱۹۲۶ء ہی میں مسٹر پی انبا داس راؤ وکیل نے آئین دکن جاری کیا، یہ قانونی ماہوار رسالہ سنہ ۱۳۰۲ف سے مولوی فدا حسین کی ادارت میں جاری تھا، مولوی صاحب کے انتقال کے بعد سے بند ہوگیا تھا، جسے انبا داس صاحب نے لے کر پھر جاری کیا،

سنہ ۱۹۲۷ء سے نرسنگھ راؤ دبیر نے ایک ہفتہ وار اخبار رعیت جاری کیا، جو سنہ ۱۹۲۹ء تک باضابطہ نکلتا رہا، مگر سنہ ۲۹ء میں بعض خاص وجوہ سے حکماً بند کر دیا گیا، مگر پھر سنہ ۱۹۳۴ء میں دوبارہ اس کا اجرا ہوا، جو ابتک جاری ہے۔

سنہ ۱۹۲۷ء ہی میں مولوی سید وقار احمد ایم اے اور مولوی حبیب اللہ رشدی ایم اے نے نظام گزٹ ہفتہ وار جاری کیا، یہ فرزندان جامعہ عثمانیہ کا پہلا اخبار ہے، جو ابتک جاری ہے،

اور عمدگی سے نکل رہا ہے،

۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر غلام جیلانی صاحب نے ایک روزنامہ دکن گزٹ کے نام سے جاری کیا جو دو ایک ماہ تک نکلتا رہا،

۱۹۲۸ء میں منیر الدین صاحب نے ایک ہفتہ وار اخبار الحکایت کے نام سے جاری کیا جو بہت جلد بند ہو گیا،

۱۹۲۹ء میں اخبار مشیر دکن کے ایک مترجم نے ایک دو ورقہ اخبار روزنامہ سرسری کے نام سے دو روز کے لئے جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں حکیم گنگا پرشاد صاحب نے دکن پنچ کے نام سے ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں محمد صالح نے ورزش جسمانی کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں مولوی حکیم شمس اللہ صاحب قادری نے ایک سہ ماہی رسالہ تاریخ کے نام سے جاری کیا، جو اپنی نوعیت کا بہترین رسالہ تھا، مگر دو تین سال کے بعد افسوس ہے کہ بند کر دیا گیا،

۱۹۲۹ء ہی میں مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی نے مجلہ مکتبہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا جس کے مدیر عبد القادر صاحب سروری تھے، افسوس ہے کہ دو تین سال کے بعد یہ رسالہ بھی بند ہو گیا،

۱۹۲۹ء ہی میں انجمن ترقی اردو نے ایک رسالہ سائنس جاری کیا، جو اب تک نکل رہا ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں حیدرآباد نیچر کے نام سے ایک رسالہ جاری ہوا جو بہت جلد بند ہو گیا،

۱۹۲۹ء ہی میں نور اللہ نوری نے مشاعرہ کے نام سے ایک ماہوار رسالہ صرف دو اشاعتوں کی حد تک نکالا،

۱۹۲۹ء ہی میں رسالہ ارشاد ایک ماہوار مذہبی رسالہ مولوی یوسف الدین صاحب نے جاری کیا، جو اب تک نکلتا ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں انٹرمیڈیٹ کالج اورنگ آباد سے مولوی عبدالحق بی اے کی سرپرستی میں رسالہ نورس جاری ہوا،

۱۹۲۹ء ہی میں مولوی احمد عارف نے روزنامہ صبح دکن جاری کیا،

۱۹۲۹ء ہی میں ایک ماہوار رسالہ کشافہ (بوائز اسکاوٹ) جاری ہوا،

۱۹۲۹ء میں بیگم ابوبکر خان صاحب خویشگی نے ہجولی ماہوار جاری کیا جو ایک سال کے بعد بند ہوگیا،

۱۹۲۹ء ہی میں صادقہ قریشی صاحبہ نے سفینۂ نسواں ماہوار جاری کیا، جو اب اختر قریشی صاحب کی ادارت میں کامیابی سے نکل رہا ہے،

۱۹۲۹ء میں مولوی عبدالرحمن صاحب نے روزنامہ "منشور" جاری کیا، جو اب تک موجود ہے،

۱۹۲۹ء ہی میں امام بیگ صاحب رونق نے ایک نیم مذہبی رسالہ خلیق جاری کیا، جو اب تک نکلتا ہے،

۱۹۳۰ء سے متعلقہ ضلع ناندیڑ سے حکیم غفران احمد صاحب نے الاعظم ہفتہ وار جاری کیا، جو ۱۹۳۳ء میں حیدرآباد منتقل ہوگیا، مگر بعض وجوہ سے ۱۹۴۵ء میں حکماً بند کر دیا گیا،

۱۹۳۰ء میں ایک انجمن اشاعت القرآن قائم ہوئی، اور ایک ماہوار رسالہ ترجمان القرآن کے نام سے نکالا گیا، جو مولوی ابوالاعلیٰ مودودی کی ادارت میں اب تک نہایت عمدگی سے نکل رہا ہے،

۱۹۳۲ء میں عبدالرزاق صاحب بسمل نے ایک ماہوار رسالہ کاشتکار جاری کیا، جس کا آدھا حصہ اردو اور آدھا تلنگی اور مرہٹی ہوتا تھا، یہ زرعی رسالہ تھا،

۱۹۳۲ء ہی میں اکبر وفاقانی بی اے نے حسن کار کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار جاری کیا، جو نہایت کامیابی کیساتھ ۱۹۳۶ء تک جاری رہکر بند ہوگیا،

۱۹۳۳ء میں عبدالرزاق صاحب بسمل نے شہاب نام سے ایک ماہوار رسالہ جاری کیا، جو

اب تک جاری ہے،

سنہ ۱۹۳۳ء ہی میں طلبائے سٹی انٹرمیذیٹ کالج حیدرآباد نے ایک رسالہ الموسیٰ جاری کیا.

سنہ ۱۹۳۵ء میں انٹرمیڈیٹ کالج ورنگل کے طلبہ نے ورنگل کالج میگزین کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا.

سنہ ۱۹۳۶ء میں روزنامۂ پیام قاضی عبد الغفار صاحب نے جاری کیا؛

سنہ ۱۹۳۶ء میں داستان گو کے نام سے ایک ماہوار سلسلہ افسانوں کا علی احمد بی اے نے شروع کیا، چونکہ اسکی باضابطہ اجازت نہیں لی گئی تھی، اسلئے یہ پرچہ بند کرادیا گیا،

سنہ ۱۹۳۶ء ہی میں مئی سے نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل کے فرزند ارجمند مونس احمد صاحب نے ایک ماہوار رسالہ آئینۂ ادب کے نام سے جاری کیا، جو ابھی تک جاری ہے،

اس طرح حیدرآباد دکن سے سنہ ۱۸۵۰ء سے سنہ ۱۹۳۶ء تک (۴۶) اخبار اور (۹۵) رسائل جاری ہوئے جنمیں سے ذیل کے اخبار اور رسالے اب تک موجود ہیں،

روزنامۂ رہبر دکن، روزنامۂ صبح دکن، روزنامہ صحیفہ، روزنامہ مشیر دکن، روزنامۂ منشور، روزنامۂ پیام، اخبار رعیت ہفتہ وار، اخبار نظام گزٹ ہفتہ وار، اتالیق ماہوار، ارشاد ماہوار، واعظ ماہوار، سفینۂ نسوان ماہوار، تحقیق ماہوار، شہاب ماہوار، آئینۂ ادب ماہوار،

حیدرآباد سے بعض گمنام اشخاص نے بعض عجیب وغریب رسائل اور اخبارات بھی جاری کئے جو دو دو تین تین اشاعتوں سے آگے نہ بڑھ سکے، چونکہ ان میں سے بعض کے سنینِ اجرا مل نہ سکے اسلئے ان کے نام بھی چھوڑ دیئے گئے ہیں، اور بعض ایسے اخبارات جو محض ذاتی منفعت اور اڈیٹری کے "نام" کی خاطر ایک آدھ پرچہ نکال کر بند کر دیئے گئے، ہمارے پاس بھی موجود ہیں، مگر ہم نے عمداً ان کو نظر انداز کر دیا ہے، مثلاً القمر، ندیم وغیرہ،

اردو کے اخبارات اور رسائل کے علاوہ انگریزی، تلنگی، مرہٹی بھی حیدرآباد سے نکلتے رہے اور اب بھی دو ایک حیدرآباد فارمر (انگریزی) نظام دیکھئے (تلنگی) جاری ہیں، مگر یہ ہمارے موضوع سے علحدہ تھے، اسلئے ہم نے انہیں نظرانداز کر دیا ہے،

ان اخبارات اور رسائل کے علاوہ بعض سالنامے بھی مستقل نکلا کرتے ہین، مثلاً رہبر دکن اور صبح دکن، منشور، اور نظام گزٹ کے سالگرہ نمبر، رہبر دکن کا سالنامہ مجلہ تحقیقات علمیہ عثمانیہ یونیورسٹی کا سالنامہ، سٹی کالج کا سالنامہ وغیرہ،

حیدرآباد کے صحافتی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کے لئے (۱۴۱) اخبارات اور رسائل کی تعداد کچھ زیادہ خوش آیند نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ امر ہے کہ آج کل حیدرآباد سے صرف (۶) روزنامے (۲) ہفتہ وار اخبار، اور (۷) ماہوار رسائل جاری ہیں، اس تعداد میں بعض سرکاری جرائد، مثلاً جریدۂ اعلامیہ، پولیس گزٹ وغیرہ کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ پرچے صحافتی شان کے نہیں، بلکہ اشتہارات، اعداد اور احکامات کی حد تک محدود ہین، حیدرآباد جیسے مدینۃ العلم کے لئے (۷) ماہوار اور سہ ماہی رسائل کی تعداد کچھ بھی نہیں، ان میں سے دو تین کالج کے آرگن ہین، دو ایک مذہبی ہیں، اور ایک آدھ تعلیمی رسالہ ہے، صرف دو رسائل شہاب اور آئینۂ ادب علمی ادبی رسائل کہلائے جا سکتے ہیں، مگر افسوس ہو کہ اس معیار پر یہ دونوں بھی پورے نہیں اترتے، پابندی اشاعت کے علاوہ اور کوئی خوبی ان مین نہین، مضامین، ترتیب، تنقیدات، شذرات، کوئی چیز بھی ان میں نظر نہیں آتی، اوّل الذکر رسالہ میں نثری حصہ زیادہ رہتا ہے، مگر بے کار، اور آخرالذکر رسالہ تقریباً گلدستہ بن رہا ہے، کاش ان دونوں رسائل کے مدیران رسائل کو حقیقی معنی میں علمی ادبی بناتے،

حیدرآباد کے مشہور ادیب اور پرانے انشاپرداز مولانا سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر

دیوانی و مال حیدرآباد کی علمی و ادبی خدمت میں سرگرم رہنے کے علاوہ اپنی جیب سے ماہوار خاص رقم اس سلسلہ میں صرف کرتے ہیں، کاش مولینا موصوف ایک ایسے علمی و ادبی معیاری رسالہ کے اجرا کی طرف توجہ فرمائیں، جو حیدرآباد کے شایانِ شان ہو، اور معیاری کہلا سکے[لہ]،

[لہ] اس مضمون کی ترتیب میں تاریخ بستان آصفیہ مؤلفہ مانک راؤجی، اور دکن میں اردو مؤلفہ مولوی نصیر الدین اور عہد عثمانی میں اردو کی ترقی مؤلفہ ڈاکٹر زور سے بھی مدد لی گئی ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر الذکر دونوں کتابوں میں سنین کی غلطیاں ہیں، انھیں میں نے حتی الامکان درست کیا ہے، مگر پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ میرے لکھے ہوئے سنین صحیح ہیں، کیونکہ اکثر اخبارات اور رسائل مجھے میسر نہیں ہوئے، صرف بعض کتابوں اور لوگوں وغیرہ سے نام اور سنہ اجرا وغیرہ لیا گیا ہے، اس طرح یہ (۱۴۱) اخبارات اور رسائل کی فہرست پیش کی جا رہی ہے، چونکہ مولوی نصیر الدین ہاشمی نے صرف (۴۸) اخبارات اور رسائل کا ذکر کیا ہے، اور ڈاکٹر زور نے بھی فقط (۴۸) اخبار اور رسائل گنائے ہیں، اسلئے یہ فہرست ان دونوں فہرستوں سے بہت زیادہ ہے،

استاد احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار

زیب النسا بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف

شاہ اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی شہزادی زیب النسا بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں ان میں ایک اور تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، یہ استاد احمد معمار کے پوتے، اور ہیئت کی مشہور درسی تصنیف تصریح شرح تشریح الافلاک کے مصنف ملا امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ نواب سید علی حسن خان مرحوم (بھوپال ہوس لکھنو) کے کتب خانہ میں نظر سے گذرا،

رسالہ کی زبان فارسی ہے، اور اس میں اکثر عربی اور بعض فارسی اشعار سے مثالیں دیگئی ہیں، مصنف نے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس نے اپنی طالب علمی میں یہ رسالہ لکھا تھا، اور یونہی پڑا تھا جب اس کی خبر شہزادی کو معلوم ہوئی، تو اس نے اس کو دربار میں پیش کرنے کا حکم دیا، اس حکم کی تعمیل میں ۱۰۸۱ھ میں یہ رسالہ صاف کیا گیا

دیباچہ کی عبارت یہ ہے،

حمد منزہے رامنرد کہ ذات وصفاتش از لوث تشبیہ وتمثیل بے نیاز است ،..........

اما بعد چنیں گوید افقر عباد اللہ الغنی امام الدین الریاضی بن لطف اللہ المہندس اللاہوری ثم الدہلوی کہ درخلال از منۂ تحصیل وآونۂ اکمال وتکمیل قواعد چند کہ اساس علم بیان رفیع البنیان است تحریر نمود ولیکن بسبب اشتغال بعض امور مامورہ نقل آن از مسودہ بمبیضہ بمقتضائے وقت نمی نمود

ثانی بحال، چون سنہ الف و مائتہ سبع ہجری مطابق سنہ سی و چہار امیر کبیر بسیار بخش، کم پذیر، اورنگ زیب بہادر عالمگیر، این معنی بعرض جناب عالیان مآب بادشاہزادۂ ذو القدر الرفیع فیض جہانیان ملکۂ دوران حافظ قرآن قرۃ العین خلیفۃ الرحمٰن نواب قدسیہ القاب زیب النساء بیگم سلمہا اللہ تعالیٰ وابقی اظلال برافتہا علی العالمین خصوصا سید الحکم جہان مطاع عالم مطیع شرف صدور عزہ ورود بخشید کہ آن را مرتب و مہذب سازد تا بشرف مطالعہ لامعۂ طبع مشرق باشراقات انوار الٰہی مظہر شود، فان وقع فی حیز القبول فھو منتھی المقصود واقصی المامول، لھذا سمعا وطاعۃ بانیان ایں امر وامتثال این حکم پرداختہ مہذب و مدون ساختہ بہ بیانیہ موسوم نمود

اس نسخہ کی کتابت ۱۱۴۵ھ میں ہوئی ہے،

مصنف کے الفاظ "بسبب اشتغال بعض امور ماموره" سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس کو کوئی بادشاہی عہدہ بھی ملا ہوا تھا۔

"س"

مقالات شبلی حصہ چہارم

مولانا شبلی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ضخامت :- ۲۰۰ صفحے، قیمت :- ۱۲؍

مقالات شبلی حصہ پنجم

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے، جو اکابر اسلام کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد، اور زیب النساء کی سوانح عمری وغیرہ جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں، ضخامت ۱۴۰ صفحے، قیمت ۱۰؍

"منیجر"

تلخیص وتبصرہ

نائجیریا کے مسلمان

شمالی نائجیریا میں مسلمانوں رئیسوں کی حکومت ہے لیکن "زیرسایہ حکومت برطانیہ" مشہور مشنری رسالہ مسلم ورلڈ (اپریل ۱۹۳۲ء) کے ایک مقالہ نگار نے اس قانون پر غصہ کا اظہار کیا ہے جسکی رو سے نائجیریا کے شمالی صوبوں میں مسیحی تبلیغ ممنوع قرار دی گئی ہے، نیز اس نے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا سبب بھی اسی قانون کو قرار دیا ہے، تاہم اس مضمون میں جو معلومات مسلمانوں کے متعلق فراہم کی گئی ہیں، وہ ذیل میں پیش کی جاتی ہیں :-

نائجیریا مغربی افریقہ کا ایک وسیع صوبہ ہے، جس کا رقبہ برطانیہ عظمیٰ کے رقبہ کا چوگنا ہے، معدنیات میں ٹن اور لوہا زمانہ قدیم سے آمدنی کے بڑے ذرائع ہیں، افریقہ کے اکثر حصوں کی طرح نائجیریا میں آمدنی کے قدرتی وسائل بہت زیادہ ہیں، لیکن ابھی تک اُن سے بہت کم فائدہ حاصل کیا گیا ہے، وہاں کے باشندوں کی تمدنی حالت نہایت پست ہے، اگر اہل یورپ نے بیشتر ان قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے، وہاں غلامی کا انسداد قانونی طور پر ۱۹۱۶ء میں ہوا، کانوں کی وجہ سے جنوبی صوبوں میں ریلوے لائنیں زیادہ ہیں، تجارت کی جو چیزیں باہر بھیجی جاتی ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں، :- تاڑ کا گودا، تاڑ کا تیل، سپاری، روئی کی پھلیاں، قہوہ، کھال اور چمڑے، مہوگنی کے لٹھے، اور ٹن، نائجیریا کی آبادی ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق (۱۹۱۳۰۰۸۵۶) ہے، اس میں سے (۹ ۹ ۶ ۸ ۳۱۴) باشندے شمالی صوبوں میں رہتے ہیں، تقریباً پوری آبادی نائجیریا کے ملکی باشندوں کی ہے، غیر ملکی باشندے جو وہاں آباد ہوگئے ہیں، صرف (۲۷۳۱) ہیں، اور ایسے

غیر ملکیوں کی تعداد جنھوں نے بود و باش اختیار نہیں کی ہے (۱۱۷۰) ہے، شمالی نائجیریا میں سب سے زیادہ آبادی کانو، سوکوٹو، باوچی، اور بورنو کے صوبوں میں ہے، اور انہی صوبوں میں مسیحی تبلیغ مسدود ہے،

شمالی نائجیریا میں زیادہ تر مسلمان آباد ہیں، بقیہ بت پرست ہیں، عیسائی بہت کم ہیں، یعنی پوری آبادی میں ایک فی صدی کا پانچواں حصہ، اگرچہ بہت سے مسلمانوں میں مذہب کی صحیح روح پائی جاتی ہے، تاہم عوام کے اندر یہ روح موجود نہیں، جس طرح بت پرست پتھر اور درخت وغیرہ کو پوجتے ہیں، اسی طرح ان مسلمانوں نے قرآن کو بھی ایک بت بنا لیا ہے، چنانچہ ان کا عقیدہ ہے، کہ اگر کوئی شخص قرآن پر جھوٹی قسم کھائے گا تو ضرور مر جائے گا، نیز جس روشنائی سے قرآن کی آیتیں لکھی جائیں اسے اگر کوئی پی لے، تو ہر بیماری سے شفا پائے گا، عورتیں بے نقاب نکلتی ہیں، اور نماز کی بھی کچھ زیادہ پابندی نہیں ہے، مسلمانوں کی یہ ڈھیل مسیحی تبلیغ کے لئے بہت اہم ہے، کہا جاتا ہے کہ ہر مسلمان اپنے مذہب کا مبلغ ہوتا ہے، لیکن نائجیریا میں یہ مقولہ ایک بہت محدود معنی میں صحیح ہے، برخلاف اس کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی حیثیت سے نائجیریا میں اسلام کے کارنامے بہت نمایاں ہیں، اسلام ہی نے وہاں کے وحشی قبائل کو متمدن بنایا، اس نے لوگوں کے مطمحِ نظر کو وسیع بنایا، ٹولیوں کو متحد کر کے ایک قوم بنائی، اور کسی حد تک لکھنے پڑھنے کو رواج دیا، علاوہ بریں مردم خوری، شراب نوشی اور دوسرے برے رسوم کو ممنوع قرار دے کر اوس نے بعض علاقوں میں حبشیوں کی تمدنی حیثیت حقیقۃً بلند کر دی ہے،

اسلام کی ترقی مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کا نتیجہ نہیں ہے، ابتداء میں لوگ بجبر مسلمان بنائے گئے، لیکن آج اسلام غیر شعوری طور پر محض معاشرتی تعلقات کی وجہ سے پھیل رہا ہے، بت پرست جب مسلمانوں سے ملتا ہے، تو دیکھتا ہے، کہ وہ دماغی قوت اور قابلیت میں اس سے بڑھے ہوئے ہیں، وہ اکثر لکھ پڑھ سکتے ہیں، دنیا کے حالات سے زیادہ واقف ہیں، اور ان کے مکانات اسکے مکانات سے بہتر ہیں، وہ یہ بھی دیکھتا ہے، کہ اُن کا مذہب کسقدر عالمگیر ہے، ان تمام باتوں کے اثر سے وہ مسلمان ہو جاتا ہے، مسلمان اکثر بت پرست عورتوں

سے شادیاں بھی کرتے ہیں، اس ذریعہ سے بھی مذہب کی اشاعت ہوتی ہے،

مسلمانوں کے ہر شہر میں ایک مدرسہ ہے، بچے اس میں بہت ابتدائی عمر میں جاتے ہیں، اور انھیں قرآن شریف پڑھنا سکھایا جاتا ہے، اسکے بعد انھیں وضو وغیرہ کے طریقے بتائے جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ طریقۂ تعلیم ناقابلِ اطمینان اور ناکافی ہے، تاہم اسکی وجہ سے تقریباً تین فی صدی مسلمان لکھ پڑھ سکتے ہیں، جو بت پرستوں کی تعلیمی حالت کے مقابلہ میں بہت غنیمت ہے،

سب سے بڑھکر یہ کہ نائجیریا میں اسلام کی وجہ سے اتحاد قائم ہو گیا ہے، اور اس اعتبار سے جنوب جہاں بت پرستوں کی آبادی ہے، اور شمالی اسلامی ریاستوں میں بہت نمایاں فرق ہے،

زبانوں کی کثرت کے لحاظ سے شمالی نائجیریا گویا بابل کا مینار ہے، تنہا اس ایک علاقہ میں دو سو سے زیادہ زبانیں بولی جاتی ہیں،

تعلیمی حالت بہت پست ہے، تقریباً اٹھانوے فی صدی آبادی بالکل جاہل ہے، برخلاف اس کے جنوبی نائجیریا میں جہاں زیادہ تر بت پرست آباد ہیں، تعلیم زیادہ پھیلی ہوئی ہے، اسکی ایک وجہ یہ ہے کہ شمالی صوبوں میں عیسائی مشن کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے، علاوہ اُن حلقوں کے جہاں بت پرستوں کی آبادی ہے، اور جنوبی صوبوں میں ان کی تبلیغی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ شمالی نائجیریا میں حکومت صرف (۴۴۰۰۰) پونڈ سالانہ تعلیم پر صرف کرتی ہے، حالانکہ جنوبی نائجیریا میں (۱۳۴۰۰۰) پونڈ سالانہ صرف کئے جاتے ہیں، لیکن شمالی نائجیریا کے سرکاری مدرسوں میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہے، یعنی صرف (۱۵۰۰) مسلمان اپنے بچوں کو سرکاری مدرسوں میں جہاں پرنسپل یورپین ہوتے ہیں، بہت کم بھیجتے ہیں، کیونکہ حبشی فطرتاً قدامت پرست ہوتے ہیں، نیز وہ یہ دیکھتے ہیں، کہ سرکاری مدرسوں میں بچوں کا وقت زیادہ صرف ہوتا ہے، اور کھیتی باڑی کے لئے انھیں وقت کم بچتا ہے، اسی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو اسلامی مدارس میں داخل کرتے ہیں، جہاں صرف صبح اور شام ایک ایک گھنٹہ پڑھائی ہوتی ہے، ۱۹۲۵ء میں اس وسیع علاقہ میں صرف

تیس سرکاری مدارس تھے، اور ایک سو تین مشنری مدارس تھے، اسکے مقابلہ میں اس سال اسلامی مدارس کی تعداد (۱۸۰۳۰) تھی، جن میں (۳۴۹۰۲) اساتذہ تعلیم دیتے تھے، اسوقت اسلامی مدارس کا شمار (۱۱۴۳۰) طلبہ کی تعداد (۱۶۳۳۷۰) اور اساتذہ کی (۳۵۰۹۳) ہے، شمالی ناٹجیریا میں جتنے بچے تعلیم پارہے ہیں، ان میں اٹھانوے فی صدی سے زیادہ اسلامی مدارس کے طلبہ ہیں،

"ع ز"

تاتار کی اسلامی صحافت

ایشیا کے ان مسلمانوں میں جنھوں نے اپنی داخلی اصلاح و ترقی اور اپنے حالات سے دنیا کو عموماً اور عالم اسلام کو خصوصاً باخبر رکھنے کے لئے اپنی مستقل صحافت کی ضرورت محسوس کی، تاتاری سب سے آگے ہیں،

تاتار کی جدید تاریخ میں اخبار ترجمان کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تاتاری زبان کا یہ سب سے پہلا اخبار تھا، اس نے تاتاری مسلمانوں کی بڑی مفید خدمات انجام دیں، اس کا بانی اور اڈیٹر تاتار کا مشہور مدبر و مصلح اسمٰعیل بک غصیری نسکی تھا، یہ پہلا شخص ہے جس نے پہلی مرتبہ عام موتمر اسلامی کے انعقاد کی دعوت دی، یہ اخبار آج سے نصف صدی پیشتر نکلا تھا، ابتدا میں ہفتہ وار تھا، پھر ترقی کرکے روزانہ ہوگیا، اس کا ایک صفحہ روسی زبان میں ہوتا تھا، اس سے روس اور قرب وجوار کی دوسری قوموں کو تاتاری مسلمانوں کی حالت سے پوری واقفیت ہوگئی، ترجمان نے سب سے بڑی خدمت اصلاح تعلیم کی انجام دی، اس نے تاتاریوں کو پرانی اور فرسودہ تعلیم اور طریقہ تعلیم کو بدل کر جدید تعلیم کو جو صحیح اسلامی تعلیم و تربیت سے قریب تر ہو اختیار کرنے پر آمادہ کیا، اور ایک نئے طرز کی بڑی درسگاہ قائم کی، جس سے صدہا تاتاری نوجوان مستفید ہوئے، تاتاری حروف اور رسم الخط میں مفید اصلاحیں کیں، اور ان پرانے حروف تہجی کی جگہ جن کی تحریر میں بڑی پیچیدگیاں تھیں نئے اور آسان حروف کو داخل کرکے ترجمان کے ذریعہ سے ان کی اشاعت کی، تاتاریوں کا یہ مصلح اور محسن اعظم برسوں اپنی قوم کی خدمت انجام دیکر ۱۹۱۴ء میں انتقال کرگیا، اس کے انتقال کے بعد دو سال تک اخبار ترجمان نکلتا رہا، پھر بعض

ایسے واقعات پیش آگئے کہ بند کر دینا پڑا،

ترجمان کے بعد مختلف مقامات سے تاتاریوں کے متعدد اخبارات و رسائل نکلے، دو بھائیوں محمد شاکر اور محمد ذاکر نے "اورنبرگ" سے ایک بڑا اخبار "وقت" کے نام سے نکالا، ایک اور مشہور تاتاری عالم مفتی ضیاء الدین[1] نے "شوریٰ" نام اخبار نکالا، یہ دونوں اخبار تاتاری صحافت کا بہترین نمونہ تھے،

"قازان" سے دو اخبار "یولدوز" (ستارہ) اور "کویاش" (آفتاب) نکلے، ایک ممتاز تاتاری لیڈر عیاض اسحاقی[2] نے ماسکو سے "وطن" نکالا، جنگ عظیم کے بعد مشرق اقصیٰ اور یورپ سے تاتاری زبان کے بہت سے اخبارات و رسائل نکلے،

امام احمدی اور ڈاکٹر احمد زمی نے ۱۹۲۰ء میں "خربین" سے "آزاک شرق" (مشرق اقصیٰ) ایک رسالہ نکالا، جو ترقی کر کے ۱۹۲۳ء میں روزانہ اخبار بن گیا "آزاک شرق" کے علاوہ خربین سے اور متعدد اخبارات و رسائل نکلے سنہ ۱۹۳۰ء میں تاتار کے قائد اعظم اور ان کے مذہبی اور سیاسی رہنما شیخ عبد الحئی قربان علی نے جاپان سے چینی زبان میں ایک ماہانہ رسالہ "ینی یاپون مخبری" نکالا، یہ نہایت بلند پایہ رسالہ ہے، اس میں زیادہ تر تاتار کے مہمات مسائل پر مضامین ہوتے ہیں، اس کے بعد علی الترتیب جاپان، مشرق اقصیٰ کی تاتاری قوموں اور عالم اسلام کی خبریں ہوتی ہیں، اس رسالہ کی اشاعت ہزاروں کی تعداد میں ہوتی ہے، اسوقت یورپ سے دو تاتاری اخبار نکلتے ہیں "ینی ملی یول" اور "یاش ترکستان" (ترکستان جدید) پہلا عیاض اسحاقی کی ادارت میں نکلتا ہے، اور دوسرا ختقانی اوغلی کی،

ان اخبارات و رسائل کے علاوہ پولینڈ کے تاتاری النسل مسلمانوں کے ادیبوں کی ایک جماعت پولینڈ کے پایہ تخت وارسا سے سالانہ تاتاری جنتری نکالتی ہے، "م"

---

[1] یہ وہی ہیں جن کا پچھلے سال انتقال ہوا [2] یہ آجکل جاپان میں خدمت اسلام کر رہے ہیں،

مصر اور حبشہ

مندرجۂ بالا عنوان سے ہیبرٹ جرنل میں ڈاکٹر رینڈل ہیرٹ نے مصر اور حبشہ کے درمیان ان روابط و تعلقات پر روشنی ڈالی ہے، جو زمانہ تاریخ سے پہلے اون دونوں میں قائم تھے، اوس کی تلخیص ذیل میں درج کیجاتی ہے،

ایک زمانہ ایسا گذرا ہے کہ جب کہ حبشہ میں مصریوں کی نوآبادی تھی یہاں وہ مصری بحری سیاح آباد تھے، جو سونا، ہاتھی دانت، تیل اور نادر پودوں کی تلاش میں آئے، چنانچہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے، کہ نیل ازرق اپنے منبع سے لیکر بحر قلزم تک مصریوں کے زیر نگیں تھا، نیل ازرق ہی دریائے نیل تھا جو اس زمانہ میں بھی مصر کی زرخیزی اور شادابی کا مخزن تھا،

بحر ہند میں جو جزیرہ سقوطرہ کے نام سے آباد ہے، اور جس کو یونانی ڈی اوس کورو ڈیس (Dioscorodes.) کہتے تھے، اس کے نام سے ظاہر ہے کہ وہ مصری نوآبادی تھی، جہاں اس کے باشندے مصری مذہب کے پیرو تھے، سقوطرہ کے معنی رع کا میدان ہے، رع آفتاب کے خدا کو کہتے ہیں (سقوطرہ اصل میں سقوطا رع ہے)

ممفس کا ایک حصہ بھی اسی نام سے منسوب تھا، جس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ اس کی بنیاد بھی مذہبی حیثیت سے ڈالی گئی،

یہ امر واقعہ ہے کہ مصری بحری سیاح بحر احمر سے ہو کر بحر ہند میں سینکڑوں میل زمین کی طرف نکل جایا کرتے تھے، تو پھر یہ بھی یقینی ہے، کہ جنوبی عرب کے ساحل اور افریقہ کے اس ساحل سے بھی ہو کر گذرتے تھے، جسکو آج ہم سومالی لینڈ کہتے ہیں،

سومالی لینڈ مصریوں کی زبان میں پنٹ (Punt) کے نام سے موسوم تھا، اور یہ بھی نوآبادی

کے ساتھ کہا جاسکتا ہے، کہ پنٹ (Punt) مصری نوآبادی تھی، حبشہ کے نقشہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک علاقہ سوکورا (Socora) کے نام سے منسوب ہے، جو یا تو سوکوترا (Socotra) ہے، یا سوکرا (Socra) ہے، سوک (Soc) مصری زبان میں سوکھٹ (Sokhet) کا صیغہ تذکیر ہے، جس کے معنی میدان کے ہیں، اس سے ظاہر ہے کہ مصری حبشہ میں ضرور آباد ہوئے،

اشانتی لینڈ (Ashanti-land) میں چند دریا ایسے ہیں جن سے موجودہ زمانہ میں بھی برطانوی باشندوں نے سونا نکالنے کی کوشش کی ہے، ان میں جو اہم دریا ہے اس کا نام انکوبرا (Ankobra) ہے، یہ مصری نام ہے، جس کے معنی زاغ کے دل کی زندگی ہے، یہ بعض متاخر فراعنہ کا لقب بھی ہوگیا تھا، انکوبر (Ankober) حبشہ کے قدیم پایۂ تخت یا اس کے کسی ایک بہت ہی مشہور شہر کا بھی نام تھا، حبشہ کی تاریخوں اور سیاحوں کے سیاحت ناموں کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انکوبر (Ankober) کے معنی بھی سنہرا شہر تھا، اگر یہ امر واقعہ ہے، تو ہم کو تسلیم کرنا پڑے گا، کہ مصری یہاں ضرور آباد ہوئے۔

ایک تحقیق اور ہے، اہل حبشہ کے ایک کھانے کا نام ٹف (Teff) ہے، یہ روٹی پر سیاہ مرچ چھڑکا ہوا ہوتا ہے، اصل میں یہ مصری لفظ (Tehefa) ہے، جو غذا کی عام اصطلاح ہے، اگر مصریوں نے حبشہ میں اناج کو رواج دیا، تو وہ اصلی معنوں میں حبشہ کو متمدن بنانے والے تھے، کیونکہ تمدن کی ابتدا ہر جگہ اناج کے کھانے ہی سے ہوتی ہے، اس سے ایک بات اور پیدا ہوتی ہے، اس کھانے کے نام کے ابتدائی حروف (Teh) ہیں، جس کا تلفظ کرنا آسان نہیں، لیکن یہ خالص حبشہ کی زبان کا حرف ہے، اور حبشہ کی اس جھیل کے نام کا پہلا لفظ ہے، جس سے دریائے نیل ازرق نکلتا ہے، ڈاکٹر میر جس نے حبشہ میں دس سال تک تبلیغی کاموں میں زندگی بسر کی ہے، اس حرف کا نام (Tzana) لکھتا ہے، دوسرے لوگ اسکو (Tana) بھی لکھتے ہیں، بحر قلزم کی طرف دریائے نیل کے بازو پر یونانیوں نے

(Zoan) کے نام سے ایک نو آبادی قائم کی، اس کا متصل علاقہ عبرانی میں (Zoan) اور عربی میں ساان کہلاتا ہے، ان دونوں شہر کا نام (Tchan) تھا، اس کے ابتدائی حروف یونانی اور عبرانی حروف میں بدلتے رہے،

ایک بات اور، ایک زمانہ میں پورا بحر خزر (Caspian sea) مصریوں کے زیر اقتدار تھا، اس علاقہ میں تیل کی کانیں جو ایک حصول دولت کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہیں، مصری نام سے منسوب تھیں، اس علاقہ یا اس کے پایہ سلطنت کا نام باکو ہے، جو تیل کے معنی میں مصری لفظ ہے، حبشہ میں بھی ایک علاقہ کا نام باکو (Bako) ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ یہ بھی تیل کا ایک مرکز ہوگا، جہاں اگر مصری تیل نکالا کرتے ہوں گے، یہاں اب بھی تیل پایا جاتا ہے، اور اگر حکومت تیل نکالنے کے لئے کوئی باضابطہ کام شروع کرے، تو زمین کی سطح سے قریب ہی تیل برآمد ہوسکتا ہے، اگر مذکورہ بالا نام کی توجیہ صحیح ہے، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب سے بہت ہی پہلے مصریوں نے حبشہ میں کان کنی کا کام اسی طرح شروع کیا تھا جس طرح انھوں نے بحر خزر کے علاقہ میں کیا،

سطور بالا سے حبشہ پر مصریوں کے اثرات عیاں ہیں، ان روایات کی موجودگی میں موجودہ مصری حکومت کو حبشہ سے متعلق کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہئے، اس کا بتانا ہمارا کام نہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ ایک زمانہ میں مصر حبشہ کے مستقبل سے متعلق گہری دلچسپی لیا کرتا تھا، "ص ع"

انقلاب الامم

ڈاکٹر لیبان کی مشہور کتاب قوموں کی ترقی و تنزل کے قوانین نفسی کا خلاصہ جسکو پڑھکر یہ معلوم ہوسکتا ہے، کہ دنیا میں قومیں کیونکر بنتی اور بگڑتی ہیں، طبع دوم قیمت ۱۲ ضخامت ۱۶۲ صفحے،

"منیجر"

سلطنت عثمانیہ کی بعض دستاویزات

ٹرکش ہسٹوریکل کمیشن نے حال میں سلطنت عثمانیہ کی قدیم سرکاری دستاویزات دو جلدوں میں شائع کی ہیں، ایک جلد میں وہ دستاویزات ہیں، جو گیارہویں صدی ہجری کے استنبول کے حالات اور معاشرت سے متعلق ہیں، اور دوسری جلد میں وہ جنکا تعلق تیرہویں صدی ہجری سے ہے، پہلی جلد میں ۱۵۹۲ء سے ۱۶۸۹ء تک کی دستاویزات ہیں، اور دوسری میں ۱۷۸۶ء سے ۱۸۲۹ء تک کی، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان عہدوں میں استنبول کی معاشرتی، اقتصادی اور صنعتی زندگی کا کیا حال تھا، مثلاً پہلی جلد کی دستاویز نمبر ۲۹ سے معلوم ہوتا ہے، کہ غلطہ کے مسلمانوں نے ایک عرضداشت باب عالی میں اس مضمون کی بھیجی تھی، کہ وہاں کے عیسائی اپنے گھروں میں علانیہ مسلمانوں اور دوسری قوموں کے ہاتھ شراب فروخت کرتے ہیں، لوگ اُن کے گھروں پر مجتمع ہو کر شراب پیتے ہیں، اور بہت شور و غل مچاتے ہیں، جس سے مسجد کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہے، اس بنا پر استدعا کی گئی تھی، کہ شراب کا علانیہ فروخت کرنا ممنوع قرار دیا جائے، چنانچہ یہ درخواست منظور کر لی گئی،

دستاویزات نمبر ۵۲ و ۵۳ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا ذکر ہے، اور دکھایا گیا ہے، کہ اس معاملہ میں کسقدر بے عنوانی پھیلی ہوئی ہے، لہذا عیسائیوں اور یہودیوں، اور قزلباشوں کو استنبول میں اس کاروبار کی قطعی طور پر ممانعت کر دی گئی،

دوسری جلد کی دستاویز نمبر ۲ میں استنبول کی عورتوں کے لباس کا ذکر ہے، اُس زمانہ میں عورتیں

دستنے باریک کپڑے کا فراجہ استعمال کرتی تھیں، کہ اندر کا لباس نظر آتا تھا، فراجہ ایک قسم کی بالائی پوشش تھی، جو اور سب کپڑوں کے اوپر پہنی جاتی تھی، اس دستاویز میں یہ حکم درج ہے کہ "اگر اب سے کوئی درزی یا لباس فروش ایسے باریک کپڑے کا فراجہ بنانے کی جرأت کرے گا، جس سے عورتوں کا اندرونی لباس نظر آئے، تو اُسے اوسکی دوکان کے سامنے پھانسی دیدی جائے گی"

دستاویز نمبر ۹ میں سونے اور چاندی کی چیزوں کے متعلق احکام ہیں، جو محل سلطانی اور دوسرے عہدہ داروں کے محلوں میں استعمال ہوتی تھیں، لکھا ہے کہ "باوجودیکہ ازروے شریعت سونے چاندی کا استعمال صرف صرف تلواروں، اور عورتوں کے زیورات میں جائز ہے، اور باقی ہر طرح حرام ہے، تاہم مختلف قسم کے برتن سونے چاندی کے بنائے جاتے ہیں، اور اس سے ٹکسال میں سکوں کے لئے سونے چاندی کی بہت کمی واقع ہو رہی ہے خصوصاً جنگ کے اوقات میں جب کہ سونے چاندی کے سکوں کی فراوانی بہت اہم ہوتی ہے، لہذا حکم دیا جاتا ہے کہ (ایک قلیل مقدار کے علاوہ) محل سلطانی کے تمام طلائی اور نقرئی ظروف شاہی ٹکسال کے حوالہ کر دیئے جائیں، اور تیس روز کے اندر وزیروں اور دوسرے عہدہ داروں کے محل کے بھی سونے چاندی کے تمام برتن ٹکسال میں بھیج دے جائیں، جو کوئی بھی اس حکم کی خلاف ورزی کرے، اس پر اللہ اور اس کے رسول کی لعنت ہو"

ایران میں تعلیمی ترقی

ایران کی وزارت تعلیم نے جو سالانہ رپوٹ بابت ۳۶-۱۹۳۷ء شائع کی ہے، اس سے وہاں کی تعلیمی ترقی کا اندازہ ہوتا ہے، اعداد و شمار حسب ذیل ہیں،

۱- جدید اسکیم کے مطابق دارالسلطنت میں ابتدائی مدارس میں (۴۴) درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۱۱) نئے ابتدائی مدارس (۹) جدید ثانوی مدارس کے درجے، (۱) بہت چھوٹے بچوں کا مدرسہ، اور (۵) مخصوص موسیقی کے درجے کھولے گئے،

۲- صوبوں میں ابتدائی مدارس میں (۲۷۰) درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۱۱۸) مدرسے چھوٹے بچوں کیلئے جدید طرز تعلیم کے کھولے گئے، ثانوی مدرسوں میں (۴۳) جدید اور اونچے درجوں کا اضافہ کیا گیا، (۵) ابتدائی نارمل اسکول، (۲) چھوٹے بچوں کے مخصوص مدرسے، (۸) محل، اور (۲) کتب خانے قائم کئے گئے،

۳- بالغوں کی تعلیم کے لئے طہران میں (۹۱) اور صوبوں میں (۶۵۹) درجے کھولے گئے،

۴- ۳۵-۱۹۳۴ء میں تمام ملک میں اتنے مدرسے قائم ہوئے :- لڑکوں کے لئے ابتدائی مدارس (۶۹۰) لڑکیوں کے لئے (۱۴۳) لڑکوں کے لئے ثانوی مدارس (۴۶)، لڑکیوں کے لئے (۱۸)

۵- ۳۵-۱۹۳۴ء میں داخلہ کی تعداد :- ابتدائی مدارس میں (۸۵۲۱۵) لڑکے اور (۴۲۳۴۴۳) لڑکیاں ثانوی مدارس میں (۶۷۷۰) لڑکے، اور (۱۰۰۱) لڑکیاں،

بلند پروازی کا اثر دماغ پر

فضائے آسمانی میں جسقدر بلندی پر جائے، آکسیجن کی مقدار کم ہوتی جائے گی، حال میں یہ تجربہ کیا گیا ہے، کہ اس کمی کا اثر دماغ پر کیا پڑتا ہے، معمولوں کو ریاضی کے چند سوالات دیدئیے گئے تھے، سولہ ہزار فٹ سے اوپر جانے کے بعد ان کا دماغ سست ہونے لگا، اور وہ اُن سوالات کو پوری طرح حل نہ کرسکے، پھر جب ٹیوب کے ذریعہ سے آکسیجن کی کافی مقدار ان کو بہم پہونچائی گئی تو ان کی دماغی قوت از سر نو عود کر آئی اور وہ سوالات انھوں نے آسانی سے حل کر لئے،

جامعۂ ازہر میں انگریزی تعلیم

ازہر میں ایک نیا قانون نافذ ہونے والا ہے، جس کی رو سے کلیہ اصول الدین واقع شبرا میں غیر ملکی زبانوں کی تعلیم داخل نصاب کر دی جائے گی، کیونکہ اس کالج کے فارغ التحصیل طلبہ تبلیغ کا کام کرتے

ہیں، اور اُن کو مختلف زبانوں سے واقفیت کی ضرورت پڑتی ہے۔ شیخ الازہر نے یہ فیصلہ کر لیا ہے، کہ چونکہ انگریزی اور فرانسیسی زبانیں تمام اسلامی ممالک میں استعمال ہوتی ہیں، اسلئے اس کالج میں ان دونوں زبانوں کی تعلیم جاری کر دی جائے،

ایک عجیب گھڑی

کارخانوں اور دفتروں کے بعض ملازمین جب کبھی اپنے کام پر دیر کرکے پہونچتے ہیں، تو وہ کبھی کبھی اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دفتر کی گھڑی کی سوئی پیچھے ہٹا کر اپنا آنا صحیح وقت پر درج کریں، ایسے لوگوں کی گرفت کے لئے ایک عجیب وغریب گھڑی ایجاد کی گئی ہے، جو امریکہ میں رائج بھی ہو گئی ہے، یہ گھڑی ایک چھوٹے سے بکس کے اندر بند رہتی ہے، بٹن دبانے سے فوراً دن، تاریخ، گھنٹہ، اور منٹ کاغذ کی ایک چٹ پر جو مشین کے اندر لگی ہوئی ہے، درج ہو جاتا ہے، اور یہ چٹ خود بخود سامنے سے ہٹ کر اندر کی طرف چلی جاتی ہے، اس کے بعد اس چٹ کا ایک سادہ حصّہ بکس کے سوراخ کے سامنے آجاتا ہے، اسی حصّہ پر ملازم یا مزدور اپنے دستخط کر دیتا ہے،

تقریر کی اصلاح

امریکہ کی نارتھ وسٹرن یونیورسٹی میں ایک شعبہ تقریر کی اصلاح کا کھولا گیا ہے، طلبہ اپنی تقریر اور گفتگو کو فونوگراف کی پلیٹوں میں بھر کر اس کے نقائص کا تجزیہ اور اصلاح کرتے ہیں، یہ طریقِ اصلاح کامیاب ثابت ہو رہا ہے،

"ع ۔ ن"

ادبیات

جذبِ اثر

از جناب نواب جعفر علی خانصاحب اثر لکھنوی

پی کے آپے میں رہے کوئی یہ مقدور نہین — مئے منصور ہے، افشردۂ انگور نہین

گلۂ دوست بجا نہیں اے دلِ رنجور نہین — دردمندانِ محبت میں یہ دستور نہین

جرم ٹھہرا ہے ترے عہد میں اقرارِ وفا — نام مٹ جائے محبت کا تو کچھ دور نہین

ہائے وہ آنکھ ٹپکنے لگی حسرت جس سے — ہائے وہ دل کہ جسے ضبط کا مقدور نہین

آشنائے غمِ الفت نہ کسی کو پایا، — نرگستاں ہے یہاں دیدۂ پرنور نہین

بدگماں سے کوئی اتنا نہیں کہنے والا — عشق خوددار ہے خودسر نہیں مغرور نہین

لٹ رہا ہے چمن اور آہ نہیں کر سکتے — پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی مجبور نہین

جس طرح شب سے عیاں نورِ سحر ہوتا ہے؛ — بختِ خوابیدہ بھی جاگ اٹھے تو کچھ دور نہین

ذرّے ذرّے سے یہ آہنگِ حقیقت ہے بلند — خودفروشوں کے لئے رایتِ منصور نہین

آہ کے ساتھ گئی لذتِ دردِ جگری، — حسرت اے دل کہ تمنا کوئی مشکور نہین

دعوی ظرف جنھیں ہے کوئی ان سے کہدے — ہم کو اندازۂ سرمستیٔ منصور نہین

یہ سمجھ لے کہ ہوا درخورِ بزمِ ساقی — شب کا میخوارا اگر صبح کو مخمور نہین

دل میں آراستہ کر انجمنِ شوق اثر — پئے آغوشِ نظر جلوہ مستور نہین

بیانِ حقیقت

از حکیم الشعراء جناب امجد حیدرآبادی

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا
جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا،

تیرے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے
اپنے آپ کو میں نے تجھ سے کب جدا پایا،

آنکھ بند ہونے پر دید کی تمنا ہے،
آنکھ رکھ کے کیا دیکھا زندگی میں کیا پایا

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہیں
بارہا اسے کھویا اور بارہا پایا،

سانس جسکو کہتے ہیں ایک پھانس ہے دل میں
زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا،

علم ایک نقطہ ہے، اور کچھ نہیں لیکن
نقطۂ نظر اک کا، ایک سے جدا پایا،

ہم تو صاف کہدیں گے مل گیا خدا اسکو
جس نے اس خدائی میں بندۂ خدا پایا،

حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب پائے بوسی کا
رکھدیا قدم پر سر جب انہیں خفا پایا،

جستجو ہی اے امجد رازِ کامیابی ہے،
جس نے جا بجا ڈھونڈا، اُسنے جا بجا پایا،

فغانِ روشن

از

جناب روشن صدیقی

پردۂ رازِ غمِ عشق اوٹھایا نہ گیا،
بے کسی سے بھی مرا حال سنایا نہ گیا،

کردیا دفترِ ہستی تو پریشاں دل نے
مگر اک خوابِ پریشاں کو بھلایا نہ گیا،

کبھی اے جنبشِ دامانِ تصور! مجھسے
شمعِ احساسِ جدائی کو بجھایا نہ گیا،

سرحدِ عشق سے آگے نہ بڑھی وحشتِ عشق
حُسن آزاد کو دیوانہ بنایا نہ گیا،

کھو گیا ایک ہی سجدے میں مرا ذوقِ سجود
جھک گیا سر ترے در پر تو اٹھایا نہ گیا

عشق اک داغ سہی دامنِ ہستی پہ، مگر
دونوں عالم سے بھی یہ داغ مٹایا نہ گیا

کر دیا دل کو تو مدہوشِ محبت لیکن
اُن نگاہوں سے بھی پھر ہوش میں آیا نہ گیا

کس کس عنواں سے بھلانا انھیں چاہا تھا روشن
کسی عنواں سے مگر اُن کو بھلایا نہ گیا،

رنگِ تغزل

از

جناب سید عبد العلی صاحب تجر الٰہ آبادی

جب تجھ سے حسیں کو پائیں گے ہم
پھولے پھر کیوں سمائیں گے ہم،

رنجش میں بھی لطف پائیں گے ہم
روٹھے گا کوئی منائیں گے ہم،

آجا تیری دلبری کے صدقے
سب ناز ترے اٹھائیں گے ہم،

پیارے ہو حسین و خوبرو ہو
دنیا سے تمھیں چھپائیں گے ہم،

تیری ہی تلاش میں کسی دن
اپنے کو بھی ڈھونڈ لائیں گے ہم،

آوارہ مزاج رنگ و بو ہیں
پھولوں کی ہنسی اڑائیں گے ہم،

تو یاد رکھ اے ستانے والے
اک روز تجھے ستائیں گے ہم،

اس عہدِ شباب میں بھی اے تجر
کیا عیش و سکوں نہ پائیں گے ہم،

مطبوعات جدیدہ

الازہار المربوعہ فی رد الآثار المتبوعہ | مؤلفہ مولینا ابو المآثر حبیب الرحمن صاحب اعظمی صدر مدرس مفتاح العلوم، مئو ضلع اعظم گڈھ، ص ۱۵۲، پتہ:- حافظ محمد صادق محلہ بہادر شہید متصل بیلی کوٹھی، بنارس،

بعض اہل حدیث اور فقہائے مذاہب میں ایک مدت سے یہ بحث چلی آرہی ہے، کہ تین طلاقیں جو ایک ساتھ دی جائیں، وہ ایک کے حکم میں ہیں، اور اسلئے رجعی ہیں، یا تین ہیں، اور ان سے طلاق بائنہ پڑتی ہے جس میں رجوع نہیں، پہلا مسلک اہلحدیث کا ہے، اور دوسرا عام فقہائے مذاہب کا، اہل حدیث کے مسلک کے سب سے پرجوش حامی امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم ہیں، ہندوستان میں بھی حضرات اہل حدیث یہی مذہب رکھتے ہیں، اور ہندوستان اور مصر میں اس پر سرگرم بحثیں ہوئی ہیں، آج کل مئو اور بنارس کے بعض علماء نے ہر دو طرف سے اس پر پرزور تحریریں لکھی ہیں، حنفی مصنف نے پہلے اس مسئلہ پر ایک مختصر رسالہ الاعلام المرفوعہ کے نام سے لکھا تھا، اسکے جواب میں ایک اہلحدیث عالم نے الآثار المتبوعہ لکھا، اب پھر حنفی فاضل مولینا حبیب الرحمن صاحب نے الازہار المربوعہ لکھکر جواب الجواب دیا ہے، اور فریق کے ایک ایک دعوی اور دلیل پر بہ تفصیل ردّ و قدح کی ہے، اور اس ضمن میں احادیث و آثار کی بڑی چھان بین کی ہے، مسئلہ کا فیصلہ تو فریقین جانیں، لیکن جو بات یہاں کہنی ہے، وہ یہ ہے کہ اس بحث میں ہمارے ہندی دوست مصر کے مشہور حنفی مصری عالم شیخ نجیب سابق شیخ ازہر سے بہت آگے نکل گئے ہیں، جنھوں نے اسی بحث پر ایک رسالہ الابحاث فی التطلیقات الثلاث لکھا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے، کہ عقلیات کے علاوہ نقلیات میں بھی ہندوستان

کا علم بحمد اللہ مصر سے زیادہ ہے، احناف میں جو لوگ اس ضروری مسئلہ سے آگاہ ہونا چاہیں، ان کے لئے اس رسالہ کا پڑھنا نہایت ضروری ہے، ابھی اس رسالہ کا یہ پہلا حصہ شائع ہوا ہے، دوسرا حصہ ابھی قدر دانوں کی توجہ کا منتظر ہے، حضرات اہل حدیث کو بھی اس رسالہ کو پڑھنا چاہئے، تاکہ فریق مخالف کے پورے دلائل پڑھ مطلع ہو سکیں۔ "س"

تفسیر سورۂ کوثر، مؤلفہ مولینا حمید الدین فراہی، مترجمہ مولینا امین احسن اصلاحی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۳ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت نہایت نفیس، قیمت :- ہر، پتہ دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ،

مولینا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے کلام اللہ کی تفسیر و تاویل میں جو ملکۂ راسخہ اور حقائق و معارف قرآنی کے فہم و تدبر میں جو شرح صدر عطا فرمایا تھا، ان کے دوسرے تفسیری رسائل کی طرح یہ رسالہ بھی ان کی ان تمام تفسیری خصوصیات کا حامل ہے، سورۂ کوثر کی تفسیر میں عموماً مفسرین "کوثر" سے مراد جنت کی نہر یا خیر کثیر "شَانِئَكَ" سے مراد متعین شخص اور "اَبتَر" سے مراد مقطوع النسل لیتے ہیں، لیکن مولینا کے نزدیک یہ سورہ فتح مکہ کی بشارت عظمیٰ اور خانہ کعبہ کے جلال و عظمت کی تصویر ہے، اس روشنی میں ان کے نزدیک "کوثر" سے مراد خانۂ کعبہ "شَانِئَكَ" سے مراد قریش، اور "اَبتَر" سے مراد مخذول و مقہور ہے، اسکی تائید میں انھوں نے کلام عرب، حدیث و آثار، محل نزول، اور ماقبل و مابعد کی سورتوں کے ربط سے مذہبی اور عقلی دلائل پیش کئے ہیں جن کی دلنشینی کا اندازہ صرف ان کے دیکھنے سے ہو سکتا ہے، پھر اس تفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے نماز اور قربانی کی حقیقت، دونوں کی باہمی مناسبت، ماقبل و مابعد کی سورتوں سے اس کے تعلق، تمام امتوں پر امت مسلمہ کی فضیلت سورہ کے محل نزول، فتح مکہ کی بشارت، امت مسلمہ کے لئے رضوان الٰہی کی بشارت، نبوت محمدی کی دائمی دلیل، حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ کا وعدہ، اور اوسکی تصدیق وغیرہ بڑے عالمانہ اور دقیق مباحث پیدا کئے ہیں، اور ان میں جو جو نکتہ آفرینیاں، اور دقیقہ سنجیاں کی ہیں، ان کا اندازہ پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے، کہ بے اختیار ذوق سلیم وجد کرنے لگتا ہے، یہ تفسیر کلام الٰہی کے شائقین کے لئے عموماً اور مولینا کے بادۂ حقیقت کے ذوق شناسوں

کے لئے خصوصاً ایک نعمت ہے، لائق مترجم کے انشاء پرداز قلم نے لطف بیان کو پوری طرح قائم رکھا ہے، اور مطلب کو اس طرح ادا کیا ہے، کہ لوگ عام طور سے ان بلند مباحث کو سمجھ سکیں،

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش، خالدہ ادیب خانم، مترجمہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب،

تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۸ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت:- عار، پتہ، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی۔

۱۹۳۵ء میں مشہور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم نے جامعہ ملیہ میں "ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش" کے موضوع پر آٹھ خطبے دیئے تھے، یہ کتاب انہی خطبات کا ترجمہ ہے، ان میں عثمانی سلطنت کے دور تاسیس سے لیکر قیام جمہوریہ تک ترکوں کی تاریخ کے تمام پہلوؤں پر نہایت عالمانہ تبصرہ ہے، پوری کتاب فاضل خطیبہ کی دقتِ نظر اور سیاسی بصیرت کا آئینہ ہے، ان خطبات کی ایک حیثیت ترکی قوم اور عثمانی سلطنت کی تاریخ ہے جس میں اس کے سیاسی انقلابات و حوادث، تمدنی اور ادبی ارتقاء، مذہبی تغیرات اور اس کے اثرات و نتائج کے حالات ہیں، دوسری حیثیت مشرق و مغرب کی کشمکش ان کے سیاسی اور تمدنی تعلقات اور اسکے ذہنی اور مادی نتائج پر تبصرہ کی ہے، جس سے ہندوستان کے موجودہ دور انقلاب میں بہت کچھ سبق مل سکتا ہے، کہ یہ اس قوم کی داستان ہے جو ابھی تھوڑے ہی دنوں پہلے ان مراحل سے گذر چکی ہے، جو ہندوستان کو درپیش ہیں، اگرچہ غلام اور آزاد قوم کی حیثیت سے دونوں کے حالات میں بہت فرق ہے، پھر بھی بہت کچھ اشتراک پایا جاتا ہے، ضمناً ان خطبات میں سیاست، مذہب اور تہذیب و معاشرت وغیرہ کے بہت سے ایسے مسائل آگئے ہیں، جو ہندوستانیوں کے سامنے بھی ہیں، ممکن ہے یہ تمام خیالات بجنسہ قابل قبول نہ ہوں، لیکن ان سے فائدہ ضرور اٹھایا جاسکتا ہے، سبب یہ ہے کہ خانم موصوفہ نے مغربی تعلیم پائی ہے، اور مغربی تمدن کے ماحول میں زندگی بسر کی ہے، اسلئے وہ اسی نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھتی ہیں، اسلامی مسائل کی جو تشریح انھوں نے کی ہے، اس سے ان مسائل سے انکا بیگانہ پن بالکل نمایاں ہے، ترجمہ کی خوبی کے لئے ڈاکٹر عابد حسین صاحب کا نام کافی ہے،

کتابچہ نمبر ا، از آقا سید محمد علی سابق پروفیسر نظام کالج تقطیع اوسط ضخامت ۴۲ صفحات

کاغذ بہتر کتابت و طباعت اوسط قیمت عہ ربتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

یہ کتابچہ آقا سید محمد علی مؤلف فرہنگ نظام کے چھ ریڈیو لکچروں کا مجموعہ ہے، پہلے چار لکچروں میں فارسی شاعری کے آغاز سے عہد سامانی تک کی چارسو سالہ تاریخ پر تبصرہ ہے، کہ قبل از اسلام کی پہلوی شاعری کیسی تھی، پھر اسلامی دور میں اس نے عربی شاعری کے اثر سے کیا قالب اختیار کیا، کن کن شعراء نے اسے سنوارا، کن کن درباروں نے اسکی سرپرستی کی، اور رفتہ رفتہ اسنے کتنی وسعت حاصل کی، اس تبصرہ میں متعدد فارسی شعراء اور قدردان فرمانرواؤں وغیرہ کا تذکرہ آگیا ہے، شاہنامہ پر فاضل خطیب نے جو بحث کی ہے، اس کے بعض مقدمات اگرچہ قیاسی ہیں لیکن لائق غور ہیں، اگر ان لکچروں کو ایران کے قاچاری اور ہندوستان کے مغلی عہد تک وسعت دیدیجاتی، تو فارسی شاعری کی اجمالی تاریخ پر مختصر کتاب ہو جاتی، چھٹے لکچر میں ہندوستانی زبان کے رشتے یعنی اجزار بیان کئے گئے ہیں، اگرچہ اردو ہندی اتحاد کی یہ کوشش مبارک ہے، لیکن اس کیلئے عربی اور آریائی الفاظ میں لفظی اور معنوی اشتراک دکھانیکی سعی نہ علماً صحیح ہو اور نہ عملاً مفید، چھٹا لکچر غالب کی فارسی شاعری پر ہے،

سید البشر مرتبہ جناب ابوسعید عبدالرحمن صاحب فریدکوٹی، تقطیع اوسط ضخامت ۵۰ صفحات

کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۲ر کے ٹکٹ، پتہ، ابوسعید عبدالرحمن صاحب فریدکوٹ اسٹیٹ پنجاب

اس رسالہ میں فاضل مؤلف نے بائبل سے نبی آخر الزمان صلعم کے ظہور کی پچاس پیشینگوئیاں جمع کی ہیں، ان میں سے کچھ نہایت صاف و صریح ہیں، اور کچھ مجمل، جن میں آنے والے نبی کے محض علامات اور نشانیاں اور کچھ حالات بتائے گئے ہیں، لائق مؤلف نے دلائل اور شواہد سے ثابت کیا ہے، کہ ان کا مصداق ذات پاک مصطفوی کے علاوہ اور کوئی نبی ہو ہی نہیں سکتا،

مرثیہ اندلس (جلد اول) از جناب عبد الحفیظ صاحب نعیمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۵۶ صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت باختلاف جلد ھر اور ۱۲ر، طلبہ کے لئے مہر کی رعایت،

پتہ:۔ عبد الغفار خاں محلہ قرولان چوپلہ روڈ بریلی،

یہ مرثیہ درحقیقت اندلس کے اسلامی فتوحات اور یہاں کی اسلامی حکومت کے عروج و زوال کی تاریخ ہے، چنانچہ اس حصہ میں اندلس کی فتح اور عبد الرحمٰن اول کے عہد کے حالات ہیں، لیکن اس کے نام سے شبہ ہوتا ہے، کہ اندلس کی اسلامی حکومت کے خاتمہ کے حالات ہیں، اسلئے آخری جلد کا نام مرثیہ اندلس رکھنا چاہئے تھا، اس کتاب کا ماخذ زیادہ تر اخبار الاندلس ہے، شاعری کی حیثیت سے اوسط درجہ کی کتاب ہے، بعض بعض حصے نہایت پرجوش اور شاعری کے معیار کے مطابق ہیں، لیکن ہر جگہ یکسانی نہیں ہے، بعض بعض حصے محض منظوم واقعہ بن گئے ہیں کہیں کہیں اشخاص اور مقامات کے نام غلط یا مسخ ہو گئے ہیں، مجموعی حیثیت سے کتاب لائق قدر ہے، کہ اس سے ہندوستانی میں اندلس کی ایک منظوم تاریخ ہو جائیگی، اور اس سے غزل کے علاوہ دوسرے مفید منظومات کا شوق شاعروں میں پیدا ہوگا،

جامع النحو، مولفہ مولوی حکیم محمد احمد صاحب معلم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر تقطیع اوسط ضخامت .. صفحات کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۸ر پتہ حکیم محمد احمد صاحب مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ،

عربی صرف و نحو کی درسی مشکلات کو حل کرنے کیلئے ہندوستانی میں عربی صرف و نحو پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں، انہی میں یہ رسالہ بھی ہے، اسمیں مولوی محمد احمد صاحب معلم نے نحو کے قاعدوں کو آسان اور عام فہم انداز میں مرتب کر دیا ہے، اس سے طلبہ کم سے کم مدت میں نحو سیکھ سکتے ہیں،

مصری افسانے، مترجمہ جناب مولوی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت ۸ر پتہ مجتبائی پریس قاضی منزل میرٹھ،

مصر کے مشہور اہل قلم مصطفےٰ لطفی منفلوطی دور جدید کے ان لوگوں میں ہیں، جو اپنی قومی روایات کے تحفظ کیساتھ ترقی چاہتے ہیں، اس لئے ان کے بیشتر افسانے اصلاحی ہوتے ہیں، مصری افسانے ان کے پانچ سبق آموز افسانوں کا ترجمہ ہے، "ذوفرزرکا عاشق" "شہیدان محبت" "نقاب اٹھ جانے کے بعد" "عذاب" "شہزادہ اندلس" بعض بعض میں حسن و عشق کی بھی چاشنی ہے، ترجمہ نہایت شستہ ہے، بعض ترجموں میں دوسرے مترجمین سے توارد ہو گیا ہے، "م"

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۰۷ جون سنہ ۱۹۳۷ء

معارف

مجلسِ دار المصنفین کا علمی ماہوار رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۳۹	ماہ ربیع الاول ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۷ء	عدد ۶

مضامین

۳۰ اپریل ۱۹۳۷ء کو کلکتہ سے ایسوسی ایٹڈ پریس نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے کتبخانہ مین ایک عجیب و غریب عربی کتاب کے واحد نسخہ کے وجود کی خبر دی ہے جس کا پتہ شمس العلماء ہدایت حسین صاحب نے لگایا ہے، اس کتاب کی صنعت یہ ہے کہ چند جدولون میں الفاظ لکھے ہوئے ہین، اگر ایک جدول کے الفاظ داہنے سے بائین پڑھیے تو ایک خاص علم کی کتاب ہوجائے گی اگر اوپر سے نیچے پڑھیے تو دوسرے فن کی کتاب ہوگی اگر ایک جدول کے الفاظ چھوڑ کر پڑھئے تو تیسرے فن کی کتاب ہوجائیگی، یہ بھی خبر ہے کہ فاضل موصوف کتاب کے اس یگانہ نسخہ پر کوئی تحقیقی مضمون کلکتہ مین پڑھین گے،

اس سلسلہ میں یہ جاننا دلچسپ ہوگا کہ اس کتاب کے قلمی نسخے جابجا ملتے ہیں، ابھی اس کا ایک قلمی نسخہ اسلامیہ اسکول اٹاوہ مین دیکھا ہے، اس سے بھی بڑھکر یہ ہے کہ یہ پرانے زمانہ میں ہندوستان مین عنوان الشرف کے نام سے چھپ بھی چکی ہے، اور اس کا مطبوعہ نسخہ دیسنہ لائبریری (ضلع پٹنہ) مین موجود ہے،

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اردو میں "ہماری زبان کا نام" کے عنوان سے جو تقریر کی گئی تھی وہ اخباروں میں شائع ہوچکی ہے، اس تقریر میں دلائل کے ساتھ یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی اس عام اور مشترک زبان کا موزوں نام "ہندوستانی" ہے، جو اس زبان کے مختلف پرانے ناموں میں سے ایک مشہور نام ہے، جہاں تک اخباروں کی تحریروں اور اشخاص کی اطلاعون اور گفتگوون کا تعلق ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

اس تجویز کے ہمدردوں اور معاونوں کی خاصی کثرت ہے، یہ تقریر مستقل رسالہ کی صورت میں الگ بھی چھپ چکی ہے، جن صاحب کو ضرورت ہو وہ ایک آنہ کا ٹکٹ بھیجکر دفتر دار المصنفین سے منگوا سکتے ہیں،

ہندوستان میں بہار پہلا صوبہ ہے، جہاں ایک انگریز حاکم کی بد دماغی اور جہالت سے ہندوستانی رسم الخط عدالتوں سے برطرف ہو کر ہندی رسم الخط حکماً جاری کیا گیا تھا، اور تقریباً باون برس تک یک تحت ہندوستانی رسم الخط یہاں قانوناً ممنوع رہا، ہندوستانی زبان جاننے والے جنمیں مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس سے سخت تکلیف مین مبتلا رہے، ان کو عدالت کے ہر حکم اور نوشتہ سے واقفیت کے لئے ایک ہندی داں کی تلاش ناگزیر ہوتی تھی، یہی حاکم جب بدل کر صوبہاے متحدہ میں گئے تو وہاں بھی انھون نے اردو ہندی کے جھگڑے کا بیج بویا،

بہار کے ہندوستانی جاننے والے اور خاص طور سے مسلمان ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ ممانعت کسی طرح دور ہو اور ان کو بھی اپنے رسم خط میں لکھنے کی اجازت مل جائے، آخر نصف صدی کے بعد چند سال ہوے کہ بڑی کوششوں کے بعد صرف پٹنہ کمشنری کے لئے یہ اجازت حاصل ہو سکی، اب نئے آئین کے تحت مین اس صوبہ میں جو وزارت قائم ہوئی ہے اس نے پورے صوبہ میں نہ صرف ہندوستانی رسم خط کی اجازت دیدی ہے، بلکہ یہ لازمی کر دیا ہے کہ ہر عدالتی کاغذ مین ایک ہی عبارت دونوں رسم خط میں لکھی جایا کرے کہ تاکہ دونوں میں ایک جاننے والے بھی سرکاری حکم سے آسانی کے ساتھ باخبر ہو سکین، امید ہے کہ اس تجویز کو دوسرے صوبوں میں بھی قبول کیا جائے گا، تاکہ ہر خط کے جاننے والوں کو یکساں آرام پہنچے،

ہم لوگ ابھی تک اردو اور ہندی کے جھگڑوں میں پھنسے ہیں، اس سلسلہ میں پٹنہ ہائیکورٹ کا ایک فیصلہ ذکر کے قابل ہے، تاکہ دوسرے صوبوں میں بھی وہ نظیر کا کام دے، پٹنہ ہائیکورٹ نے چند سال ہوے یہ فیصلہ

صادر کیا ہے کہ پٹنہ ہائیکورٹ کی زبان ہندوستانی ہے، اور ہندوستانی کی تشریح یہ کی گئی ہے کہ وہ زبان جو عام طور سے یہاں بولی جاتی ہے، اور جو یہاں کی عدالتوں میں اب تک مروج ہے، یہ فیصلہ بالکل بجا اور درست ہے،

ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہندوستانی زبان و ادب کے ایم اے کے درجے جب سے کھلے ہیں، انگریزی تعلیم یافتوں کو اپنی زبان سے جو بیگانگی تھی وہ نسبۃً کم ہو رہی ہے، اور اس زبان کے طالب علموں کی تعداد سال بسال بڑھ رہی ہے، ہم کو ایک یونیورسٹی کا حال معلوم ہے، جہاں پچھلے سال گیارہ طالب علم تھے، اور امسال چھبیس تھے، اور ان کی واقفیت کا معیار بھی ہر سال بڑھ رہا ہے،

لیکن یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ وہی شہر آگرہ، لکھنؤ، دہلی جو ہندوستانی زبان کے مرکز ہیں اس زبان کی اعلیٰ تعلیم و سند سے محروم ہیں، شیراز کے پیر دانا کا یہ شکوہ شاید ہمیں کے حسب حال ہو،

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن ہرچہ کرد آں آشنا کرد

مقالات

خطبۂ صدارت

شعبۂ علوم و فنونِ اسلامی،

جو آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر ۲۷ر مارچ ۳۶ء کو بمقام اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی میں پڑھا گیا،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قدرشناسانِ علم و فن!

ممنون ہوں کہ علماء اور اہلِ علم کی اس مجلس میں اس کرسی پر بٹھا کر آپ نے علم و فن کے ایک خدمت گذار کی عزت اور آبرو بڑھائی،

اسلامی علوم و فنون کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگا کر علم و ہنر کے چند قیمتی موتیوں کو نکال کر قدردانوں کے سامنے پیش کرنا میرے جیسے سست بازو کا کام نہیں، بہرحال مجھے آپ کے سامنے نذرانہ کیلئے کچھ پیش کرنا ہے، وہ درِ شہوار ہوں یا خزف ریزے،

سب سے پہلے تو ہم کو اس خوشی کا اظہار کرنا ہے، کہ مدت کے بعد ہمکو اپنی بھولی ہوئی دولت یاد آئی ہے، ورنہ زمانہ کے انقلاب سے یورپ کے نئے علوم و فنون نے ہماری آنکھوں میں وہ خیرگی پیدا کردی تھی، کہ ہمارا اپنا مطلعِ انوار ہماری نگاہوں سے چھپ گیا تھا، علم و فن کسی قوم کی ایسی وراثت نہیں، جو کبھی چھن نہ سکے، مختلف قوموں نے باری باری سے علم و فن کی خدمت کی ہے، اور جب اسکی ہمت ہار گئی، تو دوسری باہمت قوم نے آگے بڑھکر اس فرض کو ادا کیا، اسی طرح دنیا کے آغاز سے آجتک یہ دولت بڑھتی ہی رہی ہے، گھٹی نہیں، اس نے خزانوں کے گھر بدلے ہیں، اکی ای ہوئی مقدار کبھی ہاتھ سے نہیں گنوائی ہے،

سب جانتے ہیں کہ مذہبی علوم کے علاوہ دوسرے ادبی اور عقلی علوم مسلمانوں نے دوسری قوموں سے حاصل کئے، اور اپنے عروج کے دور میں ان کو بڑھا کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا، پھر زمانہ نے پلٹا کھایا، اور ذرا تن آسانی کی راہ سے علم و فن کے مسافر نے یورپ کے ظلمتکدہ میں قدم رکھا، اور اپنی تیز مشعل سے ہر گوشہ کو روشن کرتا گیا،

مسلمانوں کو یہ فخر ہے، کہ انھوں نے اپنے دینی علوم کی جس طرح ترتیب و تدوین کی کلیات بنائے اصول وضع کئے، جزئیات اور فروع کی تفصیل کی اور انہیں سے ہر صنف پر تصنیفات کا ڈھیر جس طرح لگا دیا وہ مذہبی قوموں کی تاریخ میں بے نظیر کارنامہ ہے، اسلام کے معلم اور ہادی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے پیرووں کے ہاتھوں میں قرآن نام ایک کتاب دی تھی، اور یہی اسلام کے کتبخانے کی سب سے پہلی کتاب ہے، یہ کتاب تبیاناً لکل شیئ تھی، اس تبیان کی تفصیل ہمارے وہ سارے دینی علوم ہیں، جو اب ہمارے کتبخانوں کی زینت اور ہمارے مذہبی مدرسوں کے نصاب درس ہیں،

غور کرنے والوں کو یہ نظر آئے گا کہ ہر قوم کے سامنے ایک مرکزی تخیل رہتا ہے، جو اس کے ہر علم و فن اور شعر و ادب کا مرکز ہوتا ہے، مسلمان قوموں کا یہ تخیل ان کا قرآن ہے، انھوں نے جس علم و فن کی خدمت کی اسکی تحریک کا جذبہ شوق دراصل قرآن پاک ہی کے کسی جز کی خدمت کا ذوق اور جوش تھا، قرآن پاک کی آیتوں کی تشریح کی گئی تو علم تفسیر بن گیا، حامل قرآن کی قولی اور عملی تشریحوں کو جمع کیا گیا، تو علم حدیث پیدا ہوگیا، قرآن کے اعتقادی تعلیمات کی علمی تشریح کی گئی، اور اس پر عقلی دلائل، اور رد و قدح یکجا کئے گئے، تو علم کلام نے جنم لیا، قرآن کے قانونی مسائل پر جو بحثیں کی گئیں، انھوں نے علم فقہ کا جامہ پہن لیا، قرآن پاک کے لفظوں سے کسی مسئلہ کے سمجھنے کے جو اصول بنائے گئے، ان کا نام اصول فقہ ہوگیا، رسول کی تشریحات پر روایتوں اور سندوں کی حیثیت سے جو گفتگو شروع ہوئی، وہ اصول حدیث کا ماخذ قرار پائی، اور ان کے راویوں کی تاریخی اور اخلاقی گفت و شنید نے اسماء الرجال کا دفتر تیار کر دیا، قرآن پاک کے لفظوں کے صحیح مخرج، طرز ادا، وقف و سکون نے تجوید و قرات کا فن پیدا کیا، ان لفظوں کی صحیح

لفظوں کے جاننے پہچاننے اور ان کے صحیح اعرابوں کو معلوم کرنے سے صرف و نحو وجود میں آئی، قرآن کے لفظوں لغتوں اور محاوروں کی دریافت کیلئے علم ادب اور علم لغت کی ترتیب ہوئی، غرض اسلامی علوم و فنون کا ہر خط دراصل اسی نقطہ سے شروع ہوا، اور کبھی کبھی آگے بڑھکر ایسا بھی ہوا کہ وہ اپنے مرکز سے دور نکل گیا، یا مرکز سے ہٹ گیا ہے،

دخیل علوم، یعنی علم و فن کا وہ سرمایہ جو دوسری قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں کو سپرد ہوا، اگلے مسلمانوں نے ان کو بھی اپنے اسی مرکز سے ملا کر دنیا کو دکھایا، مسلمانوں میں دخیل علوم میں سے سب سے پہلے طب کا فن آیا، طب سے کیمیا کی طرف توجہ ہوئی، چنانچہ عقلی علوم میں سے بنی امیہ کے دور میں یہی دو فن مسلمانوں میں داخل ہوئے، امیر معاویہ کے زمانہ میں ابن اثال نے یونانی سے طب کی بعض کتابوں کے ترجمے کئے، مروان کے زمانہ میں ماسرجویہ یہودی نے سریانی سے ایک طبی سفینہ (کناش) کا ترجمہ عربی میں کیا، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسکو اپنے زمانہ میں شائع کیا، اور خالد بن ولید بن معاویہ نے کیمیا اور طب کو عربی میں فروغ دیا، اور ہشام کے کاتب ابو جبلہ سالم نے ارسطو کی کتابوں کو عربی قالب میں ڈھالا،

عباسیوں کے زمانہ میں سب سے پہلے ایرانیوں کے اثر سے نجوم کے فن نے منصور عباسی کے دربار میں جگہ پائی، نجوم نے ریاضیات اور فلکیات کی طرف رُخ پھیرا، اور مامون کے عہد میں جہمیہ کی تحریک نے فلسفہ کی داغ بیل ڈالی، اور سلطنت کے دور دراز حصوں میں کم از کم وقت میں زیادہ سے زیادہ قطع مسافت کے خیال نے اسی زمانے میں مختصر اور اچھے راستوں کی دریافت کا شوق پیدا کیا، جس نے بعد کو جغرافیہ کا ہیولیٰ تیار کرلیا، غرض اسلام میں عقلی علوم و فنون نے اسی طرح رفتہ رفتہ مسلمانوں میں اشاعت پائی، اور تیسری صدی کے وسط سے مسلمانوں میں ان فنون کے اہلِ کمال پیدا ہونے لگے، عام اندازہ یہ ہے، کہ مسلمانوں میں اہلِ تحقیق تیسری صدی ہجری سے لیکر ساتویں صدی تک گذرے ہیں، یعنی اسوقت تک رہے، جبتک چنگیزیوں کی شمشیر نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ نہ بجا دی، اور ایران و خراسان و عراق میں اہلِ علم کے قتل عام کا بازار نہ گرم ہوا

محقق طوسی المتوفی سنہ ۶۷۲ھ اور علامہ ابن تیمیہ المتوفی سنہ ۷۲۸ھ موسم بہار کا دور اختتام ہیں، اس کے بعد شاذ و نادر ہی اہلِ تحقیق پیدا ہوئے، اور اگر ہوئے تو وہ نوادر اور مستثنیات کے حکم میں ہیں، اور اس کے بعد سے جو دور شروع ہوا، وہ اہلِ تقلید کا ہے، یعنی اون لوگوں کا جن کا کام اگلوں کی تحقیقات کی نقل اور تکرار رہے، اور ان میں سے جو لوگ ممتاز ہوئے، انھوں نے اگلوں کی تصانیف کی شرحیں کیں، یا حاشیے اور تعلیقات لکھے یا ان کی اچھی اچھی کتابوں کی تلخیص اور اختصار کیا،

میں ایک مثال دیدوں، شیخ عبد القادر جرجانی المتوفی سنہ ۴۷۱ھ نے معانی و بیان میں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ دو کتابیں لکھیں، جو حقیقت میں اس فن کے مباحث کا جوہر اور مغز ہیں، اور جاحظ المتوفی سنہ ۲۵۵ھ سے لیکر ثعالبی المتوفی سنہ ۴۲۹ھ تک اس فن کے جو مسائل پیدا ہوئے تھے، اون کو محیط ہے، امام رازی المتوفی سنہ ۶۰۶ھ نے الایجاز فی دلائل الاعجاز میں شیخ کی دونوں کتابوں کو جن میں حد درجہ تفصیل و تطویل تھی، نچوڑ لیا، سکاکی المتوفی سنہ ۶۲۶ھ نے مفتاح العلوم کی تیسری قسم میں اس کا خلاصہ کرکے شامل کر لیا، خطیب قزوینی المتوفی سنہ ۷۳۹ھ نے تلخیص المفتاح میں مفتاح کا خلاصہ کر لیا، سعد الدین تفتازانی المتوفی سنہ ۷۹۳ھ نے اس کی مطوّل اور مختصر دو شرحیں لکھیں، اور معانی و بیان کو منطق کے قریب کر دیا، اور عصام الدین اسفرائنی المتوفی سنہ ۹۴۱ھ نے اطول کے نام سے معانی و بیان کو بالکل منطق یعنی ذوقی چیز کو عقلی بنانے کی ناکام کوشش کی، اس کے بعد ان پر حواشی لکھے جانے لگے، نتیجہ یہ ہوا کہ اسوقت سے لیکر آجتک ہمارے ہاں کے عربی درسیات میں مختصر المعانی، مطوّل اور اطول کے سوا معانی اور بیان کے فن میں قدماء کی ہر چیز آنکھوں سے اوجھل ہو گئی، اور اسوقت تک سامنے نہیں آئی جبتک مفتی عبدہ مرحوم کی کوشش سے دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغۃ مصر میں نہ چھپیں، اور دار العلوم ندوۃ العلماء نے انکو اپنے نصاب درس میں داخل کرکے انکو ہندوستان کے مدرسوں میں روشناس کیا،

اسی طرح دوسرے فنون کا حال ہے،

ہندوستان میں اسلامی علوم و فنون کا رواج متاخرین کے دور میں ہوا، لودھیوں کے زمانہ

تک ہندوستان میں اہل ترکستان کے اثر سے صرف فقہ اصول فقہ اور علم کلام کا رواج تھا، اور اسی کا نام علم و دانائی تھا جدال و مناظرہ انہی فنون میں ہوتا تھا، انہی کو پڑھکر علما، قاضی اور مفتی اور محتسب کے شاہی عہدے پاتے تھے۔ دینیات میں تفسیر بیضاوی و مدارک کے کچھ اجزا اور حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح یا مشارق الانوار کا درس ہوتا تھا، سب سے پہلے شیخ عبد الحق محدث دہلوی حرمین محترمین سے کتب احادیث کا تحفہ ہندوستان لائے اور شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادہ نے صحاح ستہ کے فیض سے ہندوستان کو معمور کیا، ان کتابوں کا شاہ عبد العزیز کے زمانہ تک یہ حال تھا کہ مولینا سید نذیر حسین صاحب محدث دہلوی کی زبانی مولوی حکیم سید عبد الحئی صاحب مرحوم (سابق ناظم ندوۃ العلماء) اپنی طالب علمی کے زمانہ (۱۳۱۲ھ) کا یہ قصہ سناتے ہیں کہ اس زمانہ میں تفسیر کبیر رازی کا ایک نسخہ صرف شاہی کتب خانہ میں تھا، شاہ صاحب کو جب ضرورت ہوتی تھی، تو بڑے اہتمام سے اسکو شاہی کتب خانے سے منگواتے تھے، بخاری شریف کا یہ حال تھا، کہ درس کے پورے حلقہ میں ایک یا دو نسخے ہوتے تھے، ان کے اجزاء توڑ توڑ کر طالب علموں میں تقسیم ہوتے تھے، اور ہر ایک سبق الگ الگ جزو سے باری باری سے ہوتا تھا،

ہندوستان کے پورے دور میں عربی کا ایک بھی کامل شاعر یا ادیب جو عربوں کے نہج و طرز پر شعر یا نثر لکھتا ہو، پیدا نہیں ہوا اس کی وجہ یہ تھی کہ نثر میں مقامات حریری جیسی بے مزہ کتاب اور نظم میں دیوان متنبی جیسے عجمیانہ شاعری کا دیوان عربی طالب علموں کے سامنے رہتا تھا، اس پورے دور میں قاضی عبد المقتدر دہلوی المتوفی ۷۹۱ھ نظم میں، اور شاہ ولی اللہ دہلوی نثر میں ایسے ہوئے ہیں، جن کے نام دوسرے اسلامی ملکوں کے ارباب فصاحت و بلاغت کے ساتھ ساتھ بے تکلف لئے جا سکتے ہیں

حماسہ ابو تمام جو عربی شاعری کا صحیفہ ہے، ہندوستان میں مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری المتوفی ۱۳۰۴ء سے پہلے نامعلوم تھا، ان کے زمانے سے یہ کتاب درس میں داخل ہوئی، اور مدرسوں میں عام ہوئی، اسی کا نتیجہ ہے، کہ مولینا فیض الحسن صاحب اور ان کے شاگردوں میں مولینا شبلی اور مولینا حمید الدین فراہی وغیرہ نے

عرب کے ذوق کو ہندوستان میں زندہ کیا، فلسفہ و منطق کا آغاز گو ہندوستان میں پہلے سے تھا، لیکن سکندر لودھی کے عہد میں شیخ عبد اللہ تلنبی، اور مولینا عزیز اللہ سنبھلی کے دم سے ان کا رواج ہوا، یہ دونوں بزرگ ملتان سے ادھر آئے تھے، ان سے پہلے منطق میں شرح شمسیہ اور علم کلام میں شرح صحائف کے سوا کچھ اور نہ پڑھا جاتا تھا، اس کے بعد اکبر کے زمانے میں حکیم فتح اللہ شیرازی نے یہاں معقولات کو فروغ دیا، شاہجہان اور عالمگیر کے زمانے میں ملا عبد الحکیم سیالکوٹی، اور میر زاہد ہروی نے منطق و فلسفہ کا درس عام کیا، اور انہی کے تلامذہ سے شاہ ولی اللہ، فرنگی محل اور خیرآباد کی درسگاہوں میں متاخرین کے معقولات اور شروح وحواشی کی بہار آئی (حکیم فتح اللہ شیرازی المتوفی ۹۹۷ھ کے شاگرد ملا عبد السلام لاہوری، اور ان کے شاگرد ملا عبد السلام اودھی، ان سے ملا قطب الدین سہالوی، اور ملا قطب الدین سہالوی سے ملا قطب الدین شمس آبادی، ملا امان اللہ بنارسی، اور قاضی محب اللہ بہاری نے اور ملا قطب الدین سہالوی کے صاحبزادہ ملا نظام الدین نے ملا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، مگر ملا نظام الدین کے وارث ملا بحر العلوم ہوئے، بحر العلوم سے خیرآباد کا علمی خاندان چلا، میر زاہد کا فیض شاہ عبد الرحیم صاحب دہلوی کو، اور ان سے شاہ ولی اللہ صاحب کو، ان سے شاہ عبد العزیز صاحب کو پہنچا، اور ان سے ملک میں عام ہوا)

متاخرین کے ان شروح وحواشی نے اصل فن کا خون کر دیا، چنانچہ اس عہد کی دماغی پیداوار زیادہ تر لفظی مباحث، اعتراضات، شکوک اور رد و بدل ہیں، اس دور میں اسلامی علوم و فنون میں سوائے نقل و تقلید اور بحث و مناظرہ کے ایک ذرہ اضافہ نہیں ہوا، اس دور کے مستثنیات میں حافظ ابن حجر عسقلانی امیر اسمعیل یمانی، صالح بن مہدی مقبلی یمانی، ابن خلدون مغربی، مقریزی مصری، شاہ ولی اللہ دہلوی اور بحر العلوم فرنگی محلی ہیں، کچھ اور بھی نام ہوں گے، مقصود استقصا نہیں،

اسلامی علوم و فنون کا اصلی سرمایہ وہی ہے، جو قدما نے ہمارے لئے ترکہ چھوڑا، اور جسکو ہمارے بزرگوں نے سینوں سے لگا کر رکھا، اس کارنامے کو فخراً بیان کیا جا سکتا ہے، کہ مسلمانوں نے علوم و فنون کی

جتنا تحریری سرمایہ دنیا کو دیا، اور جس طرح کتبخانوں میں ان کو محفوظ رکھا، اس میں کوئی دوسری قوم انکی برابری نہیں کرسکتی، جس کثرت سے اسلامی ملکوں میں کتابیں لکھی گئیں، اور کتب خانے قائم ہوئے، وہ اس خزان کے دور میں بھی بہار کے موسم کا پتہ دیتے ہیں، مسلمانوں کے زمانہ میں نہ تو چھاپے خانے تھے، اور نہ ریل اور ڈاک کی آسانیاں تھیں، پھر بھی اہلِ شوق کی کوششوں سے "وراقین" و وراقۃ کے ذریعہ سے ہر کتاب کے اس کثرت سے نسخے فراہم ہوتے تھے، کہ آج بھی اس پر حیرت ہوتی ہے، کتاب مشرق کے ایک گوشہ میں لکھی جاتی تھی، اور چند روز میں مغرب کے دوسرے گوشہ میں پہنچ جاتی تھی، کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے، کہ ابوالفرج اصفہانی المتوفی ۳۵۶ھ کی کتاب الاغانی لکھی تو مشرق میں گئی، اور سیف الدولہ ہمدانی کو ہدیہ دی گئی، مگر اس کا سب سے پہلا نسخہ اسپین کے خلیفہ حکم المتوفی ۳۶۶ھ کی خدمت میں پیش ہوا، اور خلیفہ اس اولیت پر فخر کرتا تھا،

ہندوستان کا یہ کارنامہ فخر بھی یاد رکھنے کے قابل ہے، کہ شاہجہانی عصر کے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی نے علم کلام اور معقولات پر جو شرح وحواشی لکھے، وہ لکھے تو ہندوستان میں مگر ان کی نقلیں عثمانی سلاطین کے پاس تحفۂ شاہی کے طور پر قسطنطنیہ جاتی تھیں، یہی سبب ہے کہ ان کی تصانیف قسطنطنیہ سے شائع ہوئیں،

اسلامی علوم وفنون کی کتابوں پر تین سب سے بڑے سخت وقت گذرے ہیں، جن میں بزرگوں کا بڑا اندوختہ تلف ہوگیا، یا اخلاف کے ہاتھوں سے نکل گیا، سب سے پہلا وقت تو وہ ہے، جب ساتویں صدی میں چنگیز خاں وہلاکو کے ہاتھوں سے خراسان اور بغداد کے کتب خانے تباہ ہوئے، دوسرا وقت وہ تھا جب نویں صدی میں اسپین میں اسلامی حکومتوں کا خاتمہ ہوا، اور تیسرا وقت وہ ہے، جب موجودہ یورپ کی تعدی نے اسلامی علوم وفنون کے ذخیروں پر پہلے فوجی قبضہ کرکے پھر خرید خرید کر یورپ کے کتبخانوں میں منتقل کردیا، جو کچھ اسوقت ہمارے پاس ہے، وہ یا مصر کے سرکاری کتب خانے میں یا دمشق یا حلب کے بعض مکتب خانوں میں یا قسطنطنیہ کے دو تو نہ کتبخانوں میں ہے،

حرمین میں جو کتابیں تھیں، وہ گذشتہ فتنہ میں تباہ ہوئیں، مدینہ منورہ میں گو کئی کتب خانے ہیں، مگر متولیوں کی غفلت سے تباہ و برباد ہیں، صرف دو کتبخانے ذکر کے قابل رہ گئے ہیں، ایک شیخ الاسلام کا کتبخانہ جس کی نادر کتابیں ترکوں نے مدینہ چھوڑتے وقت شام میں منتقل کر دیں، اور شام کے تخلیہ کے وقت وہ صندوقوں میں بھری ہوئی تلف ہو رہی تھیں، کہ کتب خانہ کے ترک متولیوں اور امیر فیصل کی کوششوں سے جو بچیں وہ واپس آسکیں، دوسرا وہاں کا کتب خانہ مدرسہ محمودیہ کا کتب خانہ ہے، جو سلطان محمود عثمانی کی یادگار ہے، اس کے کتب خانہ کو ۱۹۲۶ء میں جب میں نے دیکھا، تو یہ حال تھا، کہ بڑی مشکل سے متولیوں نے اس کے بند دروازوں کے قفل کھولے، لیکن فہرست میں دیکھ کر جس نادر کتاب کو مانگا، معلوم ہوا، کہ ترک اسکو اپنے ساتھ لیگئے،

ابھی اس بڑی جنگ کے بعد جب عراق انگریزوں کے ہاتھ آیا تو دجلہ فرات کی روانی انگلش چینل کی موجوں میں مل گئی، اور کتابیں یورپ کے کتب فروشوں کی دوکانوں میں بہ بہ کر آنے لگیں، کہتے ہیں کہ اسپین کا بچا کچا سرمایہ اسکوریال لائبریری میں ہے، اور ایشیاے وسطی کا ذخیرہ روس کے کتب خانوں میں منتقل ہو گیا ہے،

۱۸۵۷ء کے انقلاب میں لکھنؤ اور دلّی کے شاہی کتب خانوں پر جو آفتیں آئیں، وہ مورخوں کی نگاہوں سے اب تک پوشیدہ ہیں، اور شاید ہمیشہ کے لئے رہیں، کچھ حصہ تو انگلستان کو منتقل ہو گیا، کچھ فوجی افسروں اور سپاہیوں میں بٹ گیا، پھر انھوں نے قدردانی سے انگلستان کے قومی کتب خانوں کے سپرد کر دیا یا بیچ کے طور پر بیچ ڈالا اور کتابیں کہیں سے کہیں پہونچ گئیں، اور اب بھی اس قسم کے مال غنیمت کا پتہ یورپ کے کتب خانوں میں ملتا ہے،

جرمن ڈاکٹر اسپرنگر نے جو اس زمانہ میں بعض سرکاری عربی مدرسوں کے انچارج تھے، اور جنھوں نے اودھ کے شاہی کتبخانوں کی فہرست تیار کی تھی، اس قسم کے سرمایہ کو بڑی حفاظت سے اپنے ملک میں پہنچا دیا، اودھ کے سرکاری کتب خانہ کی کتابیں آج بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں،

اودھ کے شاہی کتب خانوں کی پردرد کہانی مولینا شبلی مرحوم نے ایک چشمدید گواہ مشہور فارسی شاعر خواجہ عزیز الدین لکھنوی کی زبانی مجھ سے بیان فرمائی تھی، خواجہ صاحب کہتے تھے، کہ فرنگی محل کے پل سے لیکر نخاس تک کتابوں کا آسنا ڈھیر بکھرا ہوا تھا، کہ آنے جانے والے کتابوں کو روندکر آتے جاتے تھے، اور سُنا ہے کہ گورنمنٹ نے ان کو نیلام کر دیا، اور کتابیں ردّی کے بھاؤ بکیں، بہرحال اتنا شکر ہے کہ بریلی سے حافظ الملک رحمت خاں اور لکھنؤ سے شاہان اودھ کی کچھ کتابیں رام پور چلی گئیں، جو آجتک وہاں سرمایۂ افتخار ہیں لکھنؤ میں مولوی ناصر حسین صاحب کے خاندانی کتب خانے کی بنیاد بھی لکھنؤ کے شاہی کتب خانوں کی غارت شدہ کتابوں سے پڑی، اس زمانہ میں خان بہادر مولوی مفتی محمد قلی خاں موسوی نیشاپوری کنتوری المتوفی ۱۲۶۰ھ صدر الصدور تھے، انھوں نے غدر کے زمانے میں گورنمنٹ کی نیلام کی ہوئی کتابیں خریدلیں، ٹونک کا سرمایہ بھی غنیمت ہے، جو وہاں کے ایک عالم رئیس کی محنت کا نتیجہ ہے،

بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس نے اس افراتفری کے زمانہ کے بعد کتابوں کو خریدنا شروع کر دیا، اور اس طرح اچھا خاصہ ذخیرہ ہندوستان کے اندر رہ گیا تاہم اس کے رجسٹ مولویوں کو یہ واقعہ ہے کہ نادر کتابوں کو کوڑیوں کے مول خریدنے اور یورپ اور امریکہ کے شائقوں کے ہاتھوں بیچنے کا چسکا پڑا، اور یہ کاروبار اتبک جاری ہے،

نواب عماد الملک مرحوم کا یہ کارنامہ بھلانے کے لائق نہیں کہ انھوں نے سرکار آصفیہ کو ان پراگندہ موتیوں کو اپنے خزانۂ عامرہ میں بحفاظت جمع کرنے کی توجہ دلائی، اور کتب خانہ آصفیہ کا وجود ہوا جس کی بدولت دکن کا بڑا سرمایہ محفوظ رہا، دوسری طرف پٹنہ کے مولوی خدابخش خاں مرحوم نے اپنی ساری کمائی کو انھی جواہرات کے خریدنے اور جمع کرنے میں خرچ کر ڈالا اور آج پٹنہ کا مشرقی کتبخانہ ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کی یادگاروں کا نادر مجموعہ ہے، علیگڈھ بھی ایک ایسے ہی شائق رئیس بن رئیس کا مسکن ہے جنکے حبیب گنج میں لکھنؤ، لاہور، دہلی اور دکن کے انمول موتی ہیں،

کتابیں کہاں سے کہاں اور کیونکر پہونچیں ان کی دو دلچسپ کہانیاں آپ کو سناتا ہوں،

دار المصنفین کے کتب خانہ میں شرح نہج البلاغۃ لابن ابی الحدید کا ایک عمدہ قلمی نسخہ ہے، اسکے پہلے صفحہ پر جو اس کی سرگذشت مختلف مالکوں کے قلم سے ثبت ہے، وہ یہ ہے، کہ یہ نسخہ کوئی ایرانی فاضل میر صفی الدین سنہ ۱۰۰۳ھ میں کسی بادشاہ کے لئے ہدیہ لائے، پھر سنہ ۱۰۲۱ھ میں محمد قلی قطب شاہ والی دکن کے کتب خانہ کی ملکیت ہوا، پھر کوئی امیر الدولہ عماد الملک اس کے مالک بنے، اس کے بعد سنہ ۱۱۹۳ھ میں کسی طرح شمس الدولہ منیر الملک مسٹر ہنری ونسٹرٹ بہادر تہور جنگ کے قبضہ میں آیا، اس سے یکم مئی سنہ ۱۸۰۲ء کو وہ کسی انگریز بودم کے قبضہ میں کلکتہ آیا، وہاں سے محمد آباد ضلع اعظم گڑھ کے علم دوست رئیس ڈپٹی مولوی عبد الغفور صاحب مرحوم کی ملکیت بنا، اور اب وہاں سے وقف ہو کر دار المصنفین کے کتب خانہ میں آیا ہے،

زیب النساء بنت عالمگیر کے دربار کے عالم معین بن ولی قزوینی جنھوں نے شہزادی کے حکم سے امام رازی کی تفسیر کبیر کا ترجمہ فارسی میں زیب التفاسیر کے نام سے کیا تھا، سنہ ۱۰۸۶ھ میں شہزادی کی اجازت سے حج و زیارت کو حرمین گئے تھے، اس مقدس سفر کی یادگار میں انیس الحجاج نام ایک مختصر کتاب لکھی تھی، جس میں بڑا حصہ سفر کے حالات کا اور کچھ مناسک حج کا ہے، اس میں بندر سورت، مخا، جدہ، اور امیر مکہ شریف برکات، اور ترکی والی، اور محمل وغیرہ کے جلوسوں کی قلمی تصویریں ہیں، اس کا ایک ناقص حصہ برٹش میوزیم لائبریری میں ہے، اسپرنگر نے اودھ کے شاہی کتب خانہ میں اس کے ایک ایسے نسخہ کا ذکر کیا ہے جو کسی دوسری کتاب کے ساتھ ایک جلد میں شامل تھا، اور اس کے اوراق کچھ غیر مرتب تھے، اور جس میں تصویریں تھیں، ابھی حال میں ۱۵ر جمادی الثانی سنہ ۱۳۵۵ھ کو اس کا ایک نسخہ مونگیر کے ایک دیہات سے دار المصنفین کے کتب خانے میں خرید اگیا، جس پر گو مہریں نہیں، تاہم اسپرنگر کے بیان کا حرف حرف صادق آتا ہے، اور تعجب ہے کہ کہاں اودھ کا شاہی کتب خانہ اور کہاں مونگیر کا ایک دیہات، شاہی کتب خانوں کی اکثر کتابوں کی یہ انقلابی تاریخ ہر بڑے کتب خانے کے نسخوں کی لوح پر ثبت نظر آتی ہے،

بہر حال ہر شر میں خیر کا پہلو بھی ہوتا ہے، ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما در و باشد، (باقی)

عالمگیر کا علمی ذوق

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

(۲)

پھر بھی عالمگیر کا دربار شعراء سے خالی نہ تھا، وہ ان کے اشعار سنتا، اور موقع بموقع اپنے جود وسخا سے فیضیاب کرتا تھا، اور ان کی استعداد و لیاقت کے مطابق عہدے دیتا تھا، وہ مفت خوری کا قائل نہ تھا، اور نفس شاعری کو ذریعۂ معاش ٹھہرانا پسند نہ کرتا تھا، یہی سبب ہے کہ اوسنے اپنے دربار کے شعراء کو بھی ملکی منصب دیکر روزی کمانے کا ذریعہ عطا کیا، نفس شاعری کا منصب اس نے جاری نہیں کیا،

اس عہد کے قابلِ ذکر شعراء کے حالات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں،

۱۔ موسوی خان میرزا معزالدین محمد فطرت،

میر محمد زمان مشہدی کا نواسہ تھا، عین شباب کے زمانہ میں اپنے باپ مرزا فخر دسے خفا ہوکر اصفہان چلا آیا، جہاں آقا حسین خوانساری سے علوم و فنون کا استفادہ کیا، بہت ہی ذہین و فہیم تھا، اسلئے علوم عقلیہ میں یکتائے روزگار ہوا، ۱۰۸۵ھ میں ہندوستان آیا، تو اورنگ زیب نے اس میں ذاتی اور نسبی جوہر دیکھ کر اپنے لطف و کرم سے مالا مال کیا، شاہ نواز خاں کی لڑکی یعنی شاہزادہ محمد اعظم کی خالہ سے اسکی شادی انجام پائی اور وہ عظیم آباد کا دیوان مقرر ہوا، لیکن وہاں کے ناظم سے اس کا اتفاق نہ رہا، اسلئے واپس بلا لیا گیا، ۱۰۹۹ھ میں موسوی خان کے خطاب سے سرفراز ہوا، اور دیوان تن مقرر ہوا، ایک سال بعد تمام دکن کا دیوان ہوا،

سنہ ۱۱۰۱ھ میں فوت ہوا،[51]

میرزا معزالدین بہت ہی خوددار اور نازک مزاج تھا، ایک موقع پر عالمگیر کو اس سے رنجش پیدا ہوگئی، تو وہ تھوڑے دنوں تک شاہی التفات سے محروم رہا، مگر وہ بھی اپنی خودداری کے باعث بے نیاز رہا جب لوگوں نے سمجھایا کہ بادشاہ سے اپنی تقصیر کی معافی مانگو، تو اس نے ایک معروضہ لکھا جس میں یہ شعر تھے،

در طلب ما بے زبانان آتش پروانہ ایم ۔۔۔ سوختن از عرض مطلب پیش من آسان تر است

شد از غرور غلامی زبان عرض خموش ۔۔۔ مرا براہ خطا این صوابہا انداخت،

از موج فیض بحر کرم را قرار نیست ۔۔۔ اہل سوال بیہودہ ابرام می کنند،

عالمگیر نے اس درخواست کو پڑھا تو یہ لکھا،

بے زبانی می کشاید بندہائے سخت را ۔۔۔ در قفس طوطی ز منقار سخنگوئے خود است

لیکن:-

ہیچ مردے در پئے اصلاح خوئے خویش نیست ۔۔۔ ہر کرا دیدم در آرایش خوئے خود است

"بموجب حدیث السلطان ظل اللہ ہرگاہ سلطان عصر با نوکران خود التجا مطلب او کند او جواب باین خوبی می دہد، از اخلاق بعید است کہ التفات بحال او نشود"۔[52]

موسوی خاں شعر گوئی میں یکتائے زمانہ تھا، مآثر الامراء میں اس کا ذکر اس طرح ہے،

"بہ ہشیاری طبع رسا و ذہن عالی در علوم عقلیہ یگانہ روزگار گردید ..... چو طالعش مانند استعداد بلند بود مشمول عواطف عالمگیری گردیدہ مناصب سر عزت برافراخت ...... در خوش خیالی و نازک تلاشی بے انباز و بہ انشا پردازی و دخت آفرینی ممتاز بود، در اوائل مشق شعر فطرت تخلص میکرد"[53]

[51] مآثر الامراء جلد ۳ ص ۶۲۳ نیز مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۶ [52] وقائع عالمگیر ص ۳۰ [53] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۰۱ھ۔

آخر موسوی دل نشین او افتاد [1]

شیخ ناصر علی سرہندی، صاحب مآثر الکرام اس شاعر شیرین مقال کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں

"شیر نیستان سخوری است و مرد میدان معنی گستری، ذوالفقار کلکش بہ تسخیر قلمرو بیان پرداختہ

و نصرت طبعش آفتاب سخن را از افق عربی راجع ساختہ سرخوش گوید،

در ملک سخن بود جہانگیر علی   در مشرب دل دلی علی، پیر علی،

با شعر علی نمی رسد شعر کسے   زانسان کہ خط کس بخط میر علی،

عالمگیر نے ناصر علی کو ۱۰۹۰ھ میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن تھوڑے دنوں کے بعد بعض اسباب کی بنا پر وہ گوشہ نشین ہو گیا ۱۱۰۶ھ میں عالمگیر نے اسکو اپنے عنایات واکرام سے پھر مالا مال کیا، منصب خطاب خلعت خاصہ اور شمشیر عطا کر کے الہ آباد کا ناظم مقرر کیا [2]

نعمت خان عالی، عالی تخلص تھا، اور میرزا محمد علی نام حکیم فتح الدین شیرازی کا لڑکا تھا، میرزا محمد ہندوستان ہی میں پیدا ہوا لیکن صغر سنی میں باپ کیساتھ شیراز چلا گیا، اور وہیں کسب کمال علم کیا، ہندوستان آیا تو ملا شفیعائی یزدی کے سامنے بھی زانوے تلمذ تہ کیا، یہاں آکر طب کا آبائی پیشہ اختیار کیا پھر اورنگ زیب نے اپنے ملازمان خاص میں داخل کر لیا، اورنگ زیب نے جب حیدر آباد فتح کیا، تو اس نے یہ تاریخ لکھی،

از نصرت پادشاہ غازی،   گردید دل جہانیان شاد،

آمد بقلم حساب تاریخ،   شد فتح بجنگ حیدر آباد،

اورنگ زیب نے خوش ہو کر اسکو خلعت وانعام عطا کیا، [3]

---

[1] مآثر الامرا، جلد ۳ صفحہ ۹۲۳، کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی صفحہ ۱۲۶ پر ملاحظہ ہوں، [2] دفتر ثانی صفحہ ۱۲۲ پر کلام کے نمونے دئے ہوئے ہیں، [3] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۹۸ھ،

سنہ ۱۱۰۲ھ میں اسکو نعمت خاں کا خطاب ملا، اور باورچی خانہ کا داروغہ مقرر ہوا، آخر عہد میں اورنگزیب نے اسے مقرب خاں کے خطاب سے سرفراز کیا، اور جواہر خانہ نگین دولت کا داروغہ بنایا، شاہ عالم کے زمانہ میں دانشمند خاں ہوا، اور شاہنامہ لکھ رہا تھا کہ زندگی کو خیرآباد کہا، وقائع نعمت خاں عالی، مثنوی عشق، خوانِ نعمت، سخن عالی اسکی منظوم تصنیفات ہیں، وقائع نعمت خاں میں عالمگیر کی ہجو ملیح لکھی ہے، احمد علی سندیلوی اپنے مخزن الغرائب میں لکھتے ہیں،

"نہایت شوخ و بے باک و حاضر جواب و لطیفہ گوے بودہ بملازمت محی الدین اورنگزیب عالمگیر بادشاہ سرفرازی داشت چوں آن بادشاہ نیجے قابل دوست و جوہر شناس بود آنرا بمنصب بکاولی امتیاز بخشید و نعمت خاں کرد، او حق نمک ولی نعمت خود نگاہ نداشتہ ہجو ملیح کرد"[1]

اورنگزیب نعمت خاں عالی کی دریدہ دہنی سے واقف تھا لیکن اس سے وہ قصداً اغماض کرتا تھا، ایک بار کامگار خاں نامی ایک امیر کی شادی کے موقع پر نعمت خاں عالی نے ایک ہجو لکھی تو اول الذکر نے اورنگزیب سے اسکو تنبیہ کرنے کی درخواست کی لیکن اورنگزیب نے کہا،

"خانہ زاد سادہ لوح (کامگار خاں) می خواہد کہ مارا ہم دریں رسوائی شریک سازد کہ اوہر چہ خواہد درباب ماگوید، وبنویسد، وشہرۂ عالم سازد، وبیشتر ہم درباب ما مقرر نہ بود[2] آملانی باضافہ

[1] مخزن الغرائب قلمی نسخہ محولہ دار المصنفین اعظم گڈھ، [2] یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے، جب کہ فتح دکن کے موقع پر تاخیر ہوئی تو بعض امرا نے اورنگزیب سے واپس جانے کی درخواست کی، اورنگزیب واپس جانے کے خلاف تھا اس موقع پر نعمت خاں عالی نے چڑھ کر کہا،

بنشستہ چناں تو ی کہ برداشتنش کارے دگرے نیست خدا بردارد

عالمگیر ہنس پڑا،

انعام شدہ کہ دیگر از تکاب نکنند، باوجود ایں خود کمی نکردہ زبان بریدن وگردن زدن مقدور نیست، بادسوخت، و بادساخت، رفیق کا بیر افقک وکا یفار قبک[1]۔

میر غلام علی آزاد اس کے بارے میں لکھتے ہیں، کہ

"حاوی فنون وافر بود وجامع علوم متکاثر، میرزا محمد در نظم و نثر قدرت عالی دارد خصوص در وادی نثر طلسم حیرت می بندد"

مآثر الامراء کا مصنف اسکو ہمیشہ ہاجی کے نام سے یاد کرتا ہے اور لکھتا ہے،

"ہیچ کیے از زبانش نرستہ"[2]

عاقل خان رازی، میر عسکری نام تھا، خوات کا رہنے والا تھا، شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، اور شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ دکن میں ضلع دار مقرر ہوا، ایام شاہزادگی میں اورنگ زیب کی ایک کنیز (یکے از پرستاران خاص) کا انتقال ہوگیا، جس سے اورنگ زیب روز "تازہ بتازہ اور نو بنو" گانے سنکر محظوظ ہوا کرتا تھا، اس کے انتقال پر ملال پر اورنگ زیب بہت ہی غمگین ہوا، غم غلط کرنے کے لئے دوسرے روز شکار میں چلا گیا، میر عسکری بھی ساتھ تھا، تنہائی میں میر عسکری نے پوچھا کہ اندوہ وملال کی شدت میں شکار کھیلنے کے کیا معنی ہیں، اورنگ زیب نے جواب میں یہ شعر پڑھا،

نالہائے خانگی دل را تسلی بخش نیست ‏ ‏ ‏ در بیابان می توان فریاد خاطر خواہ کرد

میر عسکری نے یہ شعر سنکر عرض کیا، کہ

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود ‏ ‏ ‏ ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

---

[1] وقائع عالمگیر از نبی احمد سندیلوی ص۶۶۔ [2] مآثر الامراء جلد سوم ص۴۹۵، اس کے اہاجی کے نمونے مخزن الغرائب میں ملاحظہ ہوں، کلیات نعمت خان عالی کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن میں ہے، کچھ کلام کے نمونے مآثر الکرام دفتر ثانی ص۱۳۵ پر بھی درج ہیں،

اورنگ زیب نے شعر سنا تو اس پر رقت طاری ہوگئی، اور اسکو بار بار پڑھتا تھا[1]

میر عسکری اپنے شعر و شاعری کے لحاظ سے اپنے زمانہ میں بہت مشہور ہوا، حضرت برہان الدین رازی کا معتقد تھا، اس لئے رازی تخلص کرتا تھا، جب اورنگ زیب دکن سے دارا سے لڑنے چلا، تو قلعۂ دولت آباد میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑا، میر عسکری اس شہر کا نگہبان ہوا، اورنگ زیب جب سریر آرائے سلطنت ہوا تو اسکو عاقل خاں کا خطاب دیا، اور دوآبہ کا فوجدار مقرر کیا، لیکن چند مہینے کے بعد صحت کی خرابی سے خانہ نشین ہوگیا اس مدت میں اسکو ۵۰، روپئے ماہوار ملتے رہے ۱۰۷۲ھ میں پھر ملازمت شاہی میں منسلک ہوا، اور داروغۂ حرم خاص مقرر ہوا، جس پر بہت ہی معتمد امیر مامور ہوتا تھا، اس زمانہ میں اورنگزیب کے عنایات و اکرام سے برابر فیضیاب ہوتا رہا، ۱۰۸۰ھ میں اسکو ایک شاہی خلعت عطا کیا گیا اور ڈاک چوکی کا داروغہ مقرر ہوا، لیکن اس عہدہ سے مستعفی ہوا، ۱۰۸۷ھ میں اس کا ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہوا، ۱۰۹۰ھ میں بخشی دوم کے عہدہ پر مامور ہوا، ۱۰۹۱ھ میں اس کو دہلی کی صوبہ داری سپرد کی گئی، جس عہدۂ جلیلہ پر اپنی وفات تک فائز رہا، مآثر عالمگیری کے مصنف کا بیان ہے، کہ عاقل خان کی خدمات، دیانت داری، اور اخلاص کیوجہ سے عالمگیر اسکی خودرائی و خودآرائی سے چشم پوشی اور عمدہ و اہم خدمات اسکے حوالے کرتا تھا[2]

ظفر نامۂ عالمگیری، ایک دیوان، مرقع تصنیف رازی، اور چند مثنویاں، نغمات العشق ثمرات الحیواۃ، شمع و پروانہ، اور مہر و ماہ، اسکی یادگاریں ہیں، ظفر نامہ عالمگیری میں عالمگیری عہد کے واقعات، جنگ بیجاپور سے میر جملہ کی وفات تک درج ہیں، مرقع تصنیف رازی میں مولانا جلال الدین رومی کی طرز پر ایک مثنوی لکھی، ثمرات الحیواۃ اسکے مرشد، شیخ برہان الدین رازی کی تصنیف ہے، اس نے اسکو ترتیب دیا، شمع و پروانہ میں رتن سین اور پدماوت کا قصہ ہے، مہر و ماہ میں ایک ہندوستانی قصہ منظوم ہے، مصنف[3] مآثر عالمگیری کا

---

[1] مرآۃ الخیال ص ۲۶۱، [2] اوپر کے تمام واقعات مآثر عالمگیری سے لئے گئے ہیں، [3] ہمیشہ بہار از کشن چند اخلاص بحوالہ فہرست مخطوطات کتب خانہ شاہ اودھ مرتبہ اسپرنگر ص ۴۴-۱۴۳،

بیان ہے، کہ مثنوی مولینا روم کے دقائق کو حل کرنے میں وہ اپنے کو یکتا خیال کرتا تھا[1]

مراۃ الخیال کا مصنف اسکی شاعری کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"وصاف رنگینی کلامش را خامہ از قلم نرگس و سیاہی از دوات لالہ باید شنگرف از رنگ گل وحمرہ

از آواز بلبل شاید از رشک نسخہ مہر و ماہش ماہ و آفتاب در رو ساختن و از مشاہدہ رنگینی و نزاکت سخنش

گل و بلبل در رنگ باختن دیوانش عالمے است پر از یوسف طلعتان معانی دلنشین و سواد اعظمی از

سینہ ہا، ان حروف منقش دو در رشتہ بازار سطورش متاع در دانہ ہا، انبار و بر تختہ دوکان صفحہ اش گلہائے

مضامین رنگین گلزار، گلزار، ہر سطرش زلف معشوقی سراپا ناز و ہر نقطہ اش داغ دل عاشقی

خانہ برانداز"[2]

ملا محمد سعید اشرف ماژندرانی، ملا محمد صالح ماژندرانی کے لڑکے اور ملا محمد تقی مجلسی کے نواسے تھے،

عالمگیر کے اوائل حکومت میں ہندوستان آئے، ان کی استعداد و قابلیت کو دیکھکر عالمگیر نے ان کو زیب النساء

کا اتالیق مقرر کیا، ۱۰۸۳ھ میں زیب النساء سے اجازت لیکر اصفہان واپس گئے، پھر واپس آئے تو شہزادہ

عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ عظیم آباد میں رہے، شہزادہ انہیں بہت ہی محبوب رکھتا تھا، با وجود کبرسنی

کے انہیں اپنے پاس برابر بٹھائے رہتا تھا، آخر عمر میں بیت اللہ کی زیارت کو جا رہے تھے مگر مونگیر پہنچکر

انتقال کر گئے، یہیں ان کی قبر بھی ہے، ان کی نسبت صاحب مآثر الکرام رقمطراز ہیں،

"صاحب جودت بود، و شاعر والا قدرت طبع چالاکش معانی تازہ بہم می رساند، و عجائب

گلہا در جیب و دامن سامعہ می افشاند ..... دیوان ملا سعید اشرف بمطالعہ درآمد انواع شعر قصیدہ

و غزل و مثنوی و قطعہ و غیرہا دارد، و ہمہ جا حرف بقدرت می زند،"[3]

روشن ضمیر، ایران کا مشہور شاعر تھا، عالمگیر کے زمانہ میں ہندوستان آیا، اور شاہی

---

[1] مآثر عالمگیری واقعات ۱۱۰۸ھ ہجری [2] مراۃ الخیال ص۲۶۱ [3] مآثر الکرام دفتر ثانی ص۱۱۶

منصب داروں میں مقرر ہوا،[1] خافی خان لکھتا ہے:-

"روشن ضمیر کہ از روشن ضمیران صاحب کمال و مستعدان آن زمانہ گفتہ می شد، و در نظم فارسی و اشعار ہندی مشق او بجائے رسیدہ بود کہ امیر خسرو ثانیش تواں گفت"[2]

تذکرہ مراۃ الخیال کا مصنف، روشن ضمیر کا ذکر بہت ہی عزت و احترام کیساتھ کرتا ہے:-

"آسمان فضل و کمال را بدر منیر عالی قدر بلند مکان میرزا روشن ضمیر از اعاظم مستعدان و اکابر عالی فطرتان روزگار بودہ، چنانکہ در عربی و فارسی لطائف خسروی بظہور آوردہ، و در علم ہندی از نغمات آن فن گذرانید، علماے ہند اکثرے پشت دست ورو سے امید در پیش می نہادند، در علم لاحل موسیقی بجاے رسید کہ استادان ماہر نسبا گردیش مباہات می نمودند، گویند بچہار دہ ہزار نواہا سے قبایں سامعہ نواز اہل صحبت گردیدہ بود، در اکثرے ازان مقامات تصنیفات عربی و فارسی و ہندی ساخت و باہزاراں تر زبانی علم بلند آوازگی برافراخت"[3]

اورنگزیب عالمگیر نے جب کلام پاک حفظ کیا، تو اس موقع پر روشن ضمیر نے یہ تاریخ لکھکر گذرانی،

محی الدینی و مصطفےٰ حافظ تو، صاحب سیفی و مرتضیٰ حافظ تو،

تو حامی شرع و حامی تو شارع تو حافظ قرآن و خدا حافظ تو،

عالمگیر نے خوش ہو کر اسکو انعام میں سات ہزار روپئے عطا کئے،[4]

جب اورنگ زیب شہزادہ شجاع سے لڑ رہا تھا، تو اس نے مندرجۂ ذیل تاریخ لکھ کر پیش کی،

اسے حرز تو سورۂ تبارک بادا، پیوستہ ترا تارج و تبارک بادا،

---

[1] ید بیضا قلمی نسخہ دار المصنفین، [2] خافی خاں جلد دوم ص ۵۰۰، [3] تذکرۂ مراۃ الخیال ص ۲۲۸،
[4] مراۃ الخیال ص ۲۲۹،

جستم زپی شگون فتحت تاریخ　　دل گفت شود فتح مبارک بادا

۱۰۶۹

اورنگزیب کو یہ تاریخ بہت پسند آئی، اس نے انعام میں پانچہزار روپے مرحمت کئے،[1]

ہندی میں اس کا تخلص نیمی تھا، بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہیں کرسکتا تھا، لیکن ہندی کے اشعار کہنے میں اعلیٰ مہارت رکھتا تھا، پارجاتک جو موسیقی میں ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے، اس کا ترجمہ اس نے فارسی زبان میں کیا،[2]

باذل رفیع خان مشہدی خواجہ شمس الدین حافظ سے نسبی تعلق رکھتا تھا، اس کا خاندان مشہد سے ہندوستان شاہجہاں کے زمانہ میں آیا، اس کا چچا میرزا محمد طاہر، وزیرخاں عالمگیر کے زمانہ میں برہان پور، اکبرآباد اور مالوہ کا صوبہ دار رہا، رفیع خاں باذل شاہجہان آباد میں پیدا ہوا، جوان ہوا تو دامن دولت عالمگیری سے وابستہ ہوکر سرکار بانس بریلی کا حاکم مقرر ہوا، مآثر الکرام میں اس کے شعر و شاعری کا بیان اس طرح لکھا ہوا ہے،

"نیکے قوت بیانے دارد، و بہ اقتضاء تخلص خود فراوان جواہر زواہر بذل و ایثار می نماید، حملۂ حیدری در قریب نود ہزار بیت مشہور عالم است"[3]

التفات خاں نقد صفاہانی طاہر نام میرزا محمد طاہر تھا، اصفہان کا رہنے والا تھا، عالمگیر کے عہد میں ہندوستان آیا، مخلص خاں کے ذریعہ سے شاہی ملازمت اور منصب حاصل کیا، اور التفات خاں کے خطاب سے سرفراز ہوا، بیڑ کا جو مضافات اورنگ آباد میں واقع ہے، فوجدار مقرر ہوا، صاحب مآثر الکرام لکھتے ہیں،

"ذکی الطبع بود و نثر مستعدانہ می نوشت، و بشابۂ قدرت داشت کہ سہ کاتب در حضور او

---

[1] خافی خاں جلد دوم ص ۸۵، [2] مقالات شبلی ادبی جلد دوم ص ۸۵ نیز ید بیضا از غلام علی آزاد بلگرامی، [3] رفیع خاں کے مفصل حالات تذکرہ مراۃ الخیال ص ۲۰۰ - ۲۲۰ پر ملاحظہ ہوں، [4] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۱۹۱،

باسباب کتابت می نشستند، ہر سہ را عبارت خود می فرمود، و فقرۂ لاحق برائے ہر کدام بے تامل می گفت و ربط کلام از دست نمی داد، و با وصف آن خود ہم دراں حالت مشغول کتابت می بود[1]"

فضلاء: فتاوی عالمگیری کی جامعیت و معنویت اس بات کا ثبوت ہے، کہ عالمگیر کا عہد باکمال علماء و فضلاء کے لحاظ سے نہایت ممتاز تھا، مگر افسوس ہے کہ ان علماء کے تفصیلی حالات کہیں نہیں ملے، جن علماء و فضلاء کے حالات دستیاب ہو سکے، ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

ملا جیون: شیخ احمد نام تھا، امیٹھی ضلع لکھنؤ کے رہنے والے تھے، اصول فقہ میں عالمانہ نظر رکھتے تھے، نور الانوار اصول میں اور تفسیر احمدی قرآن پاک کی احکامی آیتوں کی تفسیر میں ہے، عالمگیر کے استاد تھے، اور وہ ان کے ساتھ بہت ہی تعظیم و توقیر کے ساتھ پیش آتا تھا تذکرۂ علمائے ہند میں انکا ذکران الفاظ میں ہے،

"قوت حافظہ بغایتے داشت کہ قصیدہ شنیدن یکبار یاد دلی گرفت، و عبارت کتب درسیہ بلا معاینۂ کتاب زبانی می خواند، اولاً قرآن مجید حفظ کردہ کتب درسیہ از علمائے عصر خود تحصیل نمودہ، فاتحہ فراغ بخدمت ملا لطف اللہ ساکن کوڑہ جہان آباد خواند، پس ازان بحضور محی الدین اورنگ زیب بادشاہ باریاب شدہ، بادشاہ موصوف بتعظیم و توقیر تمام پیش آمدہ بحلقۂ تلامذۂ وے در آمد و تا زندگی پا از جادہ ادبش بیرون نہ نہاد، ہمچنین اولاد بادشاہ موصوف مراعی آدابش بودند، ملا ممدوح الذکر عمر عزیزش را بافادہ درس و تصنیف صرف نمودہ[2]"

۱۱۳۰ھ میں انتقال ہوا،

قاضی محب اللہ بہاری، موضع کڑا، علاقہ بہار شریف (پٹنہ) کے رہنے والے تھے، اور تحصیل علم

[1] مآثر الکرام دفتر ثانی ص ۲۰۳، [2] تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵،

سے تھے، ملا قطب الدین شمس آبادی اور دوسرے علماے روزگار سے تعلیم پاکر دکن گئے جہاں عالمگیر نے شاہی ملازمت میں منسلک کر لیا، لکھنؤ اور حیدر آباد میں قاضی رہے، پھر عالمگیر نے اپنے پوتے رفیع القدر بن شاہ عالم کی تعلیم کے لئے مامور کیا، شاہ عالم کے زمانہ میں قاضی القضاۃ کا عہدہ تفویض ہوا، اور فاضل خاں کے خطاب سے سرفراز ہوئے ۱۱۱۹ھ میں انتقال ہوا، اور محلہ چاند پورہ بہار شریف میں مدفون ہوئے،

منطق میں سلم العلوم و افادات اصول فقہ میں مسلّم الثبوت، جزء لایتجزیٰ کے بیان میں الجوہر الفرد اور رسالہ مغالطۂ عامۃ الورود، ان کی تصانیف ہیں، ان کی استعداد و قابلیت مصنف تذکرہ علماے ہند کے صرف ایک جملہ سے ظاہر ہوگی،

"بحرے بود از بحار علوم و بدرے بود بین النجوم"[1]

مولوی عبد اللہ سیالکوٹی، ملا عبد الحکیم سیالکوٹی کے صاحبزادے تھے، علاوہ علم و فضل کے صاحب عرفان بھی تھے، اور اپنے اخلاق و افعال میں اسلام کا بہترین نمونہ سمجھے جاتے تھے، عالمگیر کو ان سے ملنے کا بہت اشتیاق رہتا تھا، ۱۰۷۰ھ میں حسن ابدال سے پیام شوق ملاقات لکھ بھیجا، دونوں کی ملاقات لاہور میں ہوئی، عالمگیر ملکر بہت ہی محظوظ ہوا، رخصت کرتے وقت خلعت خاص، دو سو اشرفیاں اور ایک ہاتھی عطا کیا،[2] ملا عبد اللہ اور ان کے شاگردوں کو عالمگیر نے فتاوی عالمگیری کے فارسی ترجمہ کے لئے حکم بھی دیا،[3]

ملا محمد عوض وجیہ، شاہی لشکر کے محتسب اور احکام شرع کے سخت پابند تھے، مصنف مآثر عالمگیری کا خیال ہے کہ ان کا ایسا محتسب کوئی دوسرا نہیں ہوا، خدمت احتساب سے علٰحدہ ہونے کے بعد بقیہ عمر درس و تدریس میں بسر کی، ان کے فضل و کمال کا ہر صاحب علم کو اعتراف تھا،[4]

بختاور خان، عالمگیر کا بہت ہی محبوب ملازم تھا، داروغہ خواصان تھا، لیکن فن انشاء و تاریخ دانی

---

[1] تذکرۂ علماے ہند ص ۱۶۷ [2] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۷۰ھ [3] مراۃ العالم۔ ایٹ جلد ۲ ص ۱۶۰ [4] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۸۱ھ

میں بہت اچھی عبارت رکھتا تھا، مرأۃ العالم اسکی بہت ہی مشہور تصنیف ہے، لیکن اسکے دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسکی متعدد تصنیفات و تالیفات تھیں، مثلاً چہار آئینہ جس میں جنگ جانشینی، اور اورنگزیب کی فتح و کامرانی کے احوال لکھے ہیں، سنائی کے حدیقہ کی تلخیص فرید الدین عطار کی منطق الطیر اور مولینا رومی کی مثنوی کا انتخاب بھی کیا تھا، پھر روضۃ الاحباب اور تاریخ الفی کا ایک مختصر ملخص بھی لکھا تھا، سواد اعظم کے عنوان سے ایک مجموعۂ نظم بھی تیار کیا، ایک بیاض کلام نظم و نثر اساتذہ سے ترتیب دی جس کا نام دلکشا، اور تاریخی نام مجموعۂ شعرہائے رنگیں رکھا، ریاضۃ الاولیاء میں اولیاء کے احوال لکھے، آئینہ بخت اسکی ایک تاریخی تصنیف ہے جس میں بابر کے وقت سے شاہجہان کے عہد تک مختصر حالات اور عالمگیر کی دہ سالہ حکومت کے واقعات بتفصیل درج ہیں[1]

اپنے علمی ذوق کی بنا پر علماء و شعراء کو بے حد عزیز رکھتا تھا، اور اہل کمال و ہنر کا ہمیشہ معاون و مددگار رہا، شعراء نے اس کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اس کا جب انتقال ہوا تو اورنگ زیب کو بے حد افسوس ہوا، اس کا جنازہ عدالت گاہ میں منگوا کر خود نماز پڑھائی، اور کچھ دور جنازہ کے ساتھ پاپیادہ گیا، پھر اس کے نام پر فاتحہ پڑھنے اور خیرات و مبرات جاری کرنے کیلئے احکام صادر کئے[2]

---

[1] برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۱۲۱ و معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ ص ۲۰ اس کتاب پر ایک مضمون معارف نمبر ۴ جلد ۲۹ میں نکل چکا ہے، منشی احمد علی شوق مرحوم سابق مہتمم کتبخانہ رامپور کا خیال ہے کہ بختاور خاں نے ابتداء صرف بابر سے عالمگیر کے حالات لکھے، اور اوس کا نام آئینہ بخت رکھا، پھر اسی کو وسعت دیا، اور اوس کو مرأۃ العالم سے موسوم کیا، اور اس کا تاریخی نام آئینہ بخت باقی رکھا، لیکن برٹش میوزیم کی فہرست مخطوطات کے مرتب نے اس تالیف مرأۃ العالم کو شیخ محمد بقا (۱۰۹۴ھ - ۱۰۲۶ء) کی تالیف قرار دیا ہے، الیٹ اسکو بختاور خاں ہی کی طرف منسوب کرتا ہے، مآثر الامراء کا مصنف بھی اس کتاب کو بختاور خاں ہی کی تصنیف سمجھتا ہے،

[2] مآثر عالمگیری واقعات ۱۰۹۵ھ،

ہمت خاں میر عیسیٰ، اسلام خان بدخشی کا لڑکا تھا، عالمگیر نے ایام طفلی میں اوس کی تعلیم و تربیت اپنی زیر نگرانی کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جوان ہو کر مجمع فضل و کمال ہوا، مآثر الکرام میں اس کا ذکر ان الفاظ میں ہے،

"از سر آغاز نشو و نما یعنی در سن صبا بعنایت و الطاف خلد مکان سر فراز بود، و بنوازش تربیت آن شاہ ستودہ شیم ممتاز مجموعہ بود در قابلیت و کمال، نسخہ بود از فضائل خصائل پیوستہ ملاذ علما، دقیقہ طراز و مرجع سخن نہان نکتہ پرداز، سلیم النفس نیک ذات کریم الاخلاق خیر خواہ کائنات، ارباب علم و ہنر از سر آب در محفلش باریاب و کامیاب، طبع موزوں داشت[۱]"

ہندی میں بھی شاعری کرتا تھا، میرن تخلص تھا[۲]،

ملا شفیعائی یزدی، ایران سے فضل و کمال حاصل کر کے شاہجہاں کے وقت میں ہندوستان آئے، شاہجہان نے ان کی استعداد و لیاقت دیکھ کر مورد لطف و کرم بنایا، اپنے لڑکوں کی تعلیم کے لئے مامور کیا، ہزاری منصب سے سرفراز ہوئے، پھر بخشی گیری دوم کا عہدہ اور دانشمند خان کا خطاب عطا ہوا، ترقی کر کے میر بخشی گری اور سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب پر فائز ہوئے، عالمگیر نے انھیں اپنے عہد میں پنجہزاری کا منصب عطا کیا، اور قلعۂ شاہجہان آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے، ۱۰۸۱ھ میں فوت ہوئے،

مآثر الامراء کا مصنف ان کی سوانح کے سلسلہ میں لکھتا ہے:-

"آن امیر ستودہ شیم از کبار فضلاے زمانہ بود، بنیک نفسی و نیک اندیشی مشہور، بس از دو تا حال از نوئینان بلند مقدار کسے کہ فضیلت را با مارت جمع کردہ باشد، در عرصۂ روزگار نشانہ[۳]"

سید سعد اللہ، شیخ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، بتیس سال تک اپنے نانا سے درس لیتے رہے، علوم عقلی و نقلی، ریاضی و سلوک حاصل کر کے بیت اللہ کی زیارت کو گئے، جہاں بارہ سال تک تعلیم و تعلم کا سلسلہ

[۱] مآثر الامراء جلد ۳ صفحہ ۹۳۶، [۲] ایضاً، [۳] ایضاً جلد ۲ صفحہ ۳۲،

جاری رکھا، شریف مکہ اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آتا تھا، بعض ناخوشگوار واقعات کی بنا پر ہندوستان آئے، اور بندر سورت میں قیام پذیر ہوئے، عالمگیر کو جب ان کے فضل و کمال کا حال معلوم ہوا، تو ان کی مدد معاش کے لئے دو گاؤن اور ایک مکان خانقاہ کے لئے دیئے، اورنگزیب کو ان کی ذات سے بہت عقیدت تھی، دست خاص سے ان کو خط لکھا کرتا تھا،[۱]

خافی خان نے منتخب اللباب جلد دوم میں عالمگیر کے عہد کے بعض اولیا و بزرگان دین کے حالات لکھے ہیں، جو صوری و معنوی حیثیت سے مجمع فضل و کمال تھے، اور جنسے عالمگیر روحانی حیثیت سے بہت زیادہ وابستہ تھا، اکثر ان کی زیارت کے لئے بہ نفس نفیس حاضر ہوتا تھا، ان کا ذکر یہاں پر مناسب نہیں معلوم ہوتا،

ہندو فضلا و شعرا، عالمگیر کی سرپرستی نہ صرف مسلمان فضلا، و شعرا تک محدود رہی، بلکہ اوس نے ہند و اہل علم و کمال کو بھی اپنی فیاضیون کا رہین بنایا، ہندی کا مشہور رزمیہ شاعر یعنی بیر رس کا بادشاہ بھوشن کوی کا بھائی چنتامنی کوی اورنگ زیب ہی کے سایہ عاطفت میں بڑھا، اسی کے توسل سے بھوشن کوی مغل دربار میں دہلی پہنچا، اور وہان عرصہ تک رہا، گئی اپنی ہسٹری آف ہندی لٹریچر میں لکھتا ہے، کہ سخت گیر اورنگ زیب ہندوون کے فن اور علوم کا دلدادہ نہ تھا، لیکن (ہندی کے ہندو) شعرا، دربار کی اعانت اور سرپرستی سے قطعاً محروم نہیں رہے، اور بہت سے شاعر اورنگ زیب اور اس کے بیٹے بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ رہے"، اسی حقیقت کو مولانا شبلی اس طرح واضح کرتے ہیں "عام خیال یہ ہے، کہ ہندوؤن کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانون نے بھاشا زبان پر جسقدر اس کے زمانہ میں توجہ کی، پہلے نہیں کی"[۲]

عالمگیر کے مسلمان درباریوں میں علاوہ روشن ضمیر کے[۳] دانا اور عبدالجلیل بلگرامی بھاشا کے بہت ہی ممتاز شعرا تھے، اسی طرح ہندو درباریون میں فارسی کے بہت ہی قابل قدر ادبا، شعراء اور مورخین تھے جو شاہی

---

[۱] خافی خان جلد ۲ ص ۶۰۵، [۲] مقالات شبلی حصہ دوم ص ۳۳، [۳] اسکی نسبت غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا میں لکھتے ہیں، کہ نظم ہندی بسیار خوب گفتہ

ابر لطف و کرم سے برابر سیراب ہوتے رہے، ان میں سے چند کے احوال ملاحظہ ہوں[1]،

واثق کھتری، امرائے عالمگیری میں سے ایک کا وکیل تھا، اس کے نظم و نثر اور ادب فارسی کی یہ دھوم تھی، کہ ان کوشن کر شہنشاہ عالمگیر جو خود ایک بلند پایہ ادیب تھا، احسنت و آفریں کہتا تھا،

رائے بندرابن، رائے بہارا مل کا بیٹا تھا، بہارا مل نے سنہ جلوس شاہجہانی میں حسن خدمات کے صلہ میں رائے کا خطاب پایا تھا، داراشکوہ نے اسکو اپنا دیوان مقرر کیا، اس کے بیٹے بندرابن کو عالمگیر نے تربیت دیا، اور رائے کا خطاب بخشا، لب التواریخ کے نام سے اپنی ایک بہترین یادگار چھوڑی ہے،

ایسر داس، قوم کا ناگر اور پٹن کا باشندہ تھا، ۳۰ سال کی عمر تک قاضی شیخ الاسلام ابن عبدالوہاب کی خدمت میں تحصیل علم کرتا رہا، شاہی ملازمین میں منسلک ہو کر جودھپور کا امین مقرر ہوا، اس نے میدان جنگ میں کارنمایاں انجام دیا، تو دو بست و پنج صدی افسر مقرر ہوا، فتوحات عالمگیری اوس کی ایک علمی یادگار ہے،

بھیم سین کایستھ، شاہی ملازمت میں بندیلہ کے حاکم کے ساتھ منسلک تھا، دکن کی لڑائیوں میں بہت ہی کار آمد ثابت ہوا، تو عالمگیر نے راؤ کے خطاب کے ساتھ تین ہزار فوج کا افسر بنایا، پھر قلعہ نالدرک کا قلعہ دار ہوا، دلکشا نام سے عہد عالمگیری کی ایک تاریخ لکھی،

سوجان رائے کھتری، پٹیالہ کا رہنے والا تھا، خلاصۃ التواریخ کے نام سے ایک نہایت صحیح اور مفصل تاریخ ابتدائے عالم سے لیکر شہنشاہ اورنگ زیب کے عہد تک لکھی، اور عالمگیر کے نام سے معنون کی،

خوشحال چند، عالمگیر کے شاہی دربار کا دیوان تھا، تاریخ نادر الزمانی خوشحال کی بہترین تصنیف ہے،

---

[1] یہ تمام حالات علامہ سید سلیمان ندوی کے مختصر مقالہ مضمون "مسلمانوں کے عہد میں ہندوؤں کی علمی و تعلیمی ترقی" سے ماخوذ ہیں،

اس عہد میں ہندوؤں کے علوم و فنون کو فارسی زبان میں منتقل کرنے کی جو کوشش کی گئی، وہ عالمگیر کو بدنام کرنے والے اصحاب و مورخین کے لئے بصیرت افروز ہے، امیرزا خان بن فخرالدین محمد نے شاہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تحفۃ الہند تصنیف کی جس کا موضوع ہندوؤں کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے[۱]، ابوسعید الحسینی الرضوی الشیرازی نے ۴۲ سنہ جلوس عالمگیری مطابق ۱۱۱۰ھ میں ہند و علوم ہیئت و نجوم پر نظام النجم کے نام سے ایک کتاب لکھی[۲]، شیخ فقیر اللہ نے ہندی موسیقی پر ۱۰۷۳ھ میں "راگ درپن" کے نام سے ایک رسالہ لکھا، شیخ فقیر اللہ عالمگیری علما و امرا میں تھا سیف خاں لقب تھا، موسیقی کا بڑا ماہر تھا، رسالہ ہذا فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل کا ترجمہ ہے، جس میں بہت سے فوائد اضافہ کئے ہوئے ہیں[۳]، اس عہد کی دو اور عجیب کتابیں ہیں، مت اچھرا، اور رد الکفر، دونوں ہندوؤں کے رسوم و عقائد پر ہیں، پہلی کتاب ایک ہندو کی لکھی ہے جس کا مقصد سنسکرت نہ جاننے والے ہندوؤں کو ان کے مذہب سے آگاہ کرنا ہے، اس کا لکھنے والا لعل بہاری ولد کاہید سنگھ ہے، جو بھوجپور ضلع شاہ آباد قنوج کا رہنے والا تھا، اور اورنگ زیب کے درباری امیر اللہ وردی کا متوسل تھا لعل بہاری نے اس کتاب کے دیباچہ میں عالمگیر کو جن الفاظ اور خلوص و عقیدت سے یاد کیا ہے، وہ ہندوؤں کے پڑھنے کے لائق ہے[۴]، دوسری کتاب رد الکفر ایک نومسلم کی لکھی ہوئی ہے، جس میں ہندوؤں کے عقائد پر تبصرہ کیا ہے[۵]،

مورخین اورنگ زیب کے درباری مورخین کی تعداد زیادہ نہیں، وقائع و اخبار نویسوں کے علاوہ صرف ایک درباری مورخ منشی محمد کاظم تھا جس نے عالمگیر کی حکومت کے دہ سالہ واقعات عالمگیر نامہ میں لکھے منشی

۱؎ اس کتاب پر مولینا شبلیؒ کا مضمون مقالات شبلی ادبی جلد دوم میں ملاحظہ ہو، ۲؎ اس کا ایک قلمی نسخہ دار المصنفین اعظم گڑھ میں موجود ہے، ۳؎ مآثر الامرا جلد دوم ص ۴۰۴، ۴؎ اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ جامعہ ملیہ لائبریری دہلی میں موجود ہے، اس پر علامہ سید سلیمان صاحب ندوی کا ایک مضمون معارف نمبر ۶ جلد ۲۳ میں ملاحظہ ہو،

۵؎ ایضاً

محمد کاظم مرزا محمد امین منشی مصنف پادشاہ نامہ کا لڑکا تھا، اس کے ادب و انشاء کے چند نمونوں کو دیکھ کر عالمگیر نے اسے اپنے عہد کے حالات لکھنے کے لئے مامور کیا، لیکن دس سال کے واقعات وہ لکھنے پایا تھا، کہ عالمگیر نے دربار کے محکمۂ تاریخ نویسی کو تخفیف کر دیا، اس کی خاکسار طبیعت پسند نہیں کرتی تھی، کہ اس کے مفاخر و مکارم کی داستان گوئی کے لئے ایک سرکاری بزم قائم کرے، عالمگیر نامہ کے مقدمہ میں ہے:-

"وچوں بندگان حضرت اعلیٰ خاقانی بمقتضائے دانش خدا داد و فطرت بلند و علو ہمت و وسعت حوصلہ ابقاء آثار ظاہر را در جنب محو ان وقعتے نہ نہادہ بتاسیس مآثر باطن بیشتر توجہ داشتند بعد از تدوین واقعات دہ سالہ حکم حقیقت شیم صادر شد کہ گذارندۂ داستان مفاخر و مکارم محمد کاظم مصنف کتاب مستطاب عالمگیر نامہ من بعد وقائع را بقید کتاب در نیاورد و لہذا او ہم بدان قدر اکتفا نمودہ[2]"

"مآثر عالمگیری کا مصنف بھی اپنے دیباچہ میں اسی بات کو ظاہر کرتا ہے،

"واضح باد کتاب بلاغت نصاب والا خطاب عالمگیر نامہ متضمن وقائع دہ سالہ دولت ابد طراز.... ابو المظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ غازی نگاشتہ خامۂ بدائع نگار مرزا محمد کاظم سر آمد سخن سنجان نادر کار است و چوں خدیو عالم صورت و معنی و واقف اسرار بلندی و پستی را تاسیس بنائے باطن مقدم بر اظہار آثار ظاہر بود راقم از تسوید ممنوع شد"،

مگر آزاد اہل قلم جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، اس عہد کی تاریخ برابر لکھتے رہے، ان میں سے بعض ہندو مورخوں نے اپنی تاریخیں عالمگیر کے نام سے معنون کیں، اور ان کو بہ تقریب ہدیہ دربار میں لیکر حاضر ہوئے[3]،

---

[1] مرزا محمد امین کا ذکر گذشتہ مضمون میں آچکا ہے، [2] مقدمہ عالمگیر نامہ ص ۔ [3] عہد عالمگیری میں تاریخ نویسی" کے عنوان کو جناب سید ریاست علی صاحب ندوی رفیق دار المصنفین کا ایک مستقل مضمون معارف نمبر ۶ جلد ۳۰ میں ملاحظہ ہو،

مدارس

برنیر نے شہزادوں کی ابتدائی تعلیم کے متعلق اورنگ زیب کی زبانی ایک دلچسپ اور پر مغز تقریر نقل کی ہے[1] جس سے اورنگ زیب کا تعلیمی نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے، لیکن برنیر کا بیان عموماً سنجیدہ اور وقیع نہیں ہوتا اسلئے ہم اسکو نظر انداز کرتے ہیں، خصوصاً جب ہم یہ دیکھتے ہیں، کہ اورنگزیب نے یہ تقریر اپنے ایک استاد ملا محمد صالح سے کی تھی، جسکا نام ہمعصر موقر تاریخوں میں کہیں نہیں آتا،

عالمگیر کو جو علم و ہنر سے شغف تھا، اس کا اقتضاء یہ تھا کہ وہ اپنی سلطنت میں اسکی ترویج ہر ممکن صورت سے کرے، چنانچہ اسنے تمام شہروں اور قصبوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے، لائق اساتذہ مقرر کئے، اور طلبہ کو وظائف دیئے، عالمگیر نامہ کے مصنف کا بیان ہے،[2]

> و از آنجا کہ توجہ خاطر دانش مآثر بترویج مراتب فضل و تائیں معالم علم در رتبۂ قصوی دارد در جمیع بلاد و قصبات ایں کشور وسیع فضلا و مدرسان را بوظائف لائقہ از روزیانہ و املاک موظف ساختہ بشغل تدریس و تعلیم محصلان علوم گماشتہ اند، و برائے طلبۂ علم در ہر محلی و ناحیۂ وجوہ معیشت در خور مرتبہ و حالات و استعداد مقرر داشتہ و ہر سالہ بدیں وجہ نیز از خزائن احسان پادشاہانہ مبلغہائے معتد صرف می شود، و از فیض کرمت و افضال شہنشاہ ابر کف دریا نوال طالبان علم و کمال سمت افزونی پذیرفتہ فشرح البال و مرفہ الحال بکسب و تحصیل علوم اشتغال می ورزند، و برکات و دعائے اجابت اثر آن گروہ سرمایۂ بقاء این دولت آسمانی شکوہ می گردد،[3]

گجرات میں جو مدارس قائم ہوئے، اور وہاں کے طلبہ کو جو سہولتیں پہنچائی گئیں، اس کا حال مرآۃ احمدی میں اس طرح درج ہے،

---

[1] دیکھو وقائع سیر و سیاحت ڈاکٹر برنیر مترجمہ سید محمد حسین ص ۲۹۵ . [2] عالمگیر نامہ ص ۱۰۸۶ - ۱۰۸۵ [3] انگریز مورخوں نے بھی اس کی شہادت دی ہے کہ اورنگزیب نے زراعت کو ترقی دیا، باضابطہ سڑکیں بنوائیں، اور بے شمار مکاتب و مدارس قائم کئے، (کین - مغل امپائر)

"بنام کرمت خاں دیوان صوبہ صادر شد، چوں حکم مقدس معلی در جمیع صوبجات ممالک محروسہ شرف نفاذ یافت کہ در ہر صوبہ مدرس تعیین نمایند و طلبہ علم از میزان تا کشاف خوان باتصواب صدر صوبہ موافق تصدیق بخزرسان وجہ علوفہ از تحویل خزانچی خزانہ آن صوبہ می دادہ باشند، ودیں والاسہ نفر مدرس در احمد آباد و پٹن و سورت و چہل و پنج نفر طلبہ علم اضافہ در صوبہ احمد آباد مقرر شد" [۱]

اسی عہد میں شیخ محمد اکرام الدین نے ایک لاکھ چوبیس ہزار روپئے کے خرچ سے ایک مدرسہ کی عمارت بنوائی، عالمگیر نے اس مدرسہ کے اخراجات کے لئے موضع سوندرہ پرگنہ سانولی و موضع سبھیلہ عملہ پرگنہ کرامی وقف کیا، اور ساتھ ہی ساتھ دو روپیہ یومیہ محتاج طلبہ کے لئے بھی مقرر کیا، [۲]

---

[۱] مراۃ احمدی ص ۳۰۹ تاریخ فرح بخش مصنفہ محمد فیض بخش (مترجمہ ولیم ہوئی) سے نریندر ناتھ لا نے نقل کیا ہے کہ اورنگزیب میزان کے پڑھنے والے طلبہ کو ارتسب پڑھنے والے کو ۲ ار شرح وقایہ اور فقہ پڑھنے والوں کو ۸ ر روزینہ دیا کرتا تھا

[۲] مراۃ احمدی جلد اول ص ۲۷۲، اورنگزیب نے گجرات کے بوہروں کی تعلیم کے لئے بھی اساتذہ مقرر کئے، تاکہ اون کی صحیح تعلیم ہو، اون کے ماہانہ امتحان کے نتائج براہ راست اس کے پاس بھیجے جاتے تھے، (مراۃ احمدی جلد اص ۲۷۷، ۲۷۸) برنیر کے بیان کے مطابق اورنگزیب نے فرنگی محل لکھنؤ میں بھی ایک مدرسہ قائم کیا،

مقدمہ رقعات عالمگیر

اس میں رقعات پر مختلف حیثیتوں سے تبصرہ کیا گیا ہے، جس سے اسلامی فن انشاء، اور شاہانہ مراسلات کی تاریخ ہندوستان کے صیغۂ انشاء کے اصول نہایت تفصیل سے معلوم ہوتے ہیں، ضخامت ۱۰۴ صفحے، قیمت للعہ

"منیجر"

آزادی کا اخلاقی مفہوم

از

جناب پروفیسر مقصود ولی الرحمن صاحب ام اے

(۴)

۱۲- مزید اعتراضات کا جواب،

پچھتاوے اور ملامتِ ذات کے احساسات کو جبری عقیدے کے مطابق ناقابلِ توجیہ سمجھا جاتا ہے، بعض فلاسفہ کے نزدیک تو یہ احساسات جبریت کے خلاف برہانِ قاطع ہیں لیکن اگر یہ احساسات اخلاقیات کے لئے لازمی ہیں، تو کیا جبریت میں یہ جون کے توں باقی نہیں رہتے؟ جس طریقے سے زندگی کی ایک خاص صورت خواہ وہ ذہنی ہو یا جسمانی، ترقی پذیر ہوئی ہے، اور اس کی توجیہ سے اس زندگی کی اصلی ذاتی قیمت و وقعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا جسم انسانی کے شستِ ارتقاء کے نظریے کی وجہ سے اس جسم کے حسن میں ذرہ برابر بھی کمی واقع نہیں ہوئی، اسی طرح جبریت کے عقیدے کے مطابق بدکار اتنا ہی بدکار رہتا ہے، اور نیکوکار اتنا ہی نیکوکار، قیمت کے متعلق ہماری تصدیقات میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، بدکار اپنے عمل کو اچھا نہیں کہہ سکتا، وہ مجبور ہے کہ اپنی سیرت پر نفرین کرے، اگر وہ اخلاقاً روشن طبع ہے، تو وہ اپنے برے ماضی کو ناپسند کریگا، اور گذشتہ اور موجودہ ذات کی طرف سے بے اطمینانی تغیر کی ایک شرط ہے، جب تک کہ وہ موجود رہتی ہے، اسوقت تک گویا دوسری پیدائش کا ایک اصول برابر کارگر رہتا ہے، جس کی وجہ سے ایک حقیقی توبہ، بدی سے اجتناب اور نیکی کا انتخاب ممکن ہوتا ہے، لیکن یہ احساس صرف ہماری

زندگی کے تسلسل حال کے ماضی پر، اور مستقبل کے حال و ماضی پر انحصار ہیں اور ان کی وجہ سے کام کرتا ہے، اگر یہ انحصار نہ ہو، اگر میں آج کل گذشتہ سے، اور کل آیندہ آج سے مختلف ہوں، تو ماضی کے جن تاسفات کا میں آج پھل پاتا ہوں، ان کے مہیا کئے ہوئے محرکات اصلاح ذات، کوشش کی روزافزوں کامیابی جو عادت کا نتیجہ ہوتی ہے، اور ایک بہتر مستقبل کا یقین جو اس کوشش میں جان ڈالتا ہے، یہ سب ناممکن ہو جاتے ہیں"

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جبری نظریہ کے مطابق بدی کا مسئلہ جاسۂ اخلاقی کے لئے مکروہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس عقیدے کو تسلیم کر لینے سے ہم مجبور ہو جاتے ہیں، کہ بدترین جرائم کو عالمی نظام کا لازمی عنصر سمجھیں، لہذا کہا جاتا ہے کہ خدا کو اخلاقی اور جسمانی بدی کا بار برداشت کرنا چاہئے، لیکن کیا یہ صورت انسانی ارادے کے کسی عقیدے کو بھی تسلیم کرنے سے پیدا نہیں ہوتی؟ یہ صحیح ہے کہ کوئی شخص بھی خود اپنے اعمال کی براہ راست اور فوری ذمہ داری سے نہیں بچ سکتا، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ خالق عالم بھی اس عالم کا جسکو اس نے پیدا کیا ہے، ذمہ دار ہے، استدلال کی خاطر ہم مطاع الکل کے اس تخیل کو تسلیم کئے لیتے ہیں، جو زمانۂ ماضی کی دینیاتی دنیا میں بہت مقبول رہا ہے، اور جو اب بھی عوام کے تفکر میں عام طور پر مسلّم ہے، اس تخیل کے باوجود یہ نتیجہ لابدی ہے کہ اگر ایسی ہستی انسانوں کو آزاد پیدا کرنے کا فیصلہ کرے، تو وہ اپنے اس فیصلے کے تمام عواقب و نتائج کی ذمہ داری سے اگر بچ سکتی ہے، تو صرف اس صورت میں کہ وہ عین اُن صفات سے دست بردار ہو جائے، جن کو مذہبی تفکر اس کی ماہیت میں داخل کرتا ہے، غیر محدود طاقت و علم اور محدود ذمہ داری کے تخیلات میں سخت تضاد ہے، کوئی نظریہ بھی اس تضاد کو تشفی بخش طریقے سے حل نہیں کر سکتا، پھر ایک ایسی ہستی کے متعلق کیا کہا جائے گا، جو ان تمام صفات سے متصف ہو کر بھی ایک ایسی دنیا پیدا کرتی ہے، جس میں بخت و اتفاق کا عنصر موجود ہے، اور جس میں اس اتفاق کے حسن اتفاق بننے کا اتنا ہی امکان ہے جتنا کہ سوئے اتفاق بننے کا،[1] پھر انسانی تجربے کے گھنے جال میں سے طبعی اور اخلاقی بدی کا سلسلہ دور

[1] مترجم کا مصنف کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں،

کو الگ الگ کرنا بھی ناممکن ہے، دنیا کو اخلاقی بدی کے بار سے ہلکا کرنا، مسئلہ بدی کے حل، یا اس کو آسان کرنے کے ہم معنی نہیں، جن بدترین جرائم کو اختیاریت آزاد ارادے کی طرف منسوب کرتی ہے، وہ اُن تکلیفوں اور ذلتوں کی وسعت و مدت کے سامنے جو اور وجوہ سے پیدا ہوتی ہیں، ہیچ ہوجاتے ہیں چنانچہ کوئی شخص بھی اتنا خبیث نہیں ہوسکتا، دنیا میں دردناک اور کریہ امراض پھیلا کر اسکو عمداً اور بالتواتر بدی میں مبتلا کرے، انسانی انتخاب میں جو بدی نظر آتی ہے، وہ دراصل ایک بڑے مسئلہ کا جزو ہے،

لیکن اسکو نہ بھولنا چاہئے کہ اختیاریت کے عقیدے کا اطلاق دونوں سمتوں میں ہونا چاہئے، اگر دینی بنا پر خدا کو انسانوں کے برے انتخابات کے بار سے ہلکا کرنے کے لئے اختیاریت میں بنا ڈھونڈی ہے، تو انسان کے اچھے انتخابات بھی اس کی طرف منسوب نہیں کئے جانے چاہئیں، اگر انسانی فعل کے سب کچھ ہونے یا کچھ نہ ہونے کو خدا کی طرف منسوب کرنے میں کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے، تو نیکی کے بدی پر غالب ہونے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہم مذہبی بنا پر مقدم الذکر ہی کا انتخاب کریں گے، یہ بات کہ ہم میں جتنی نیکی ہے، اس کا سرچشمہ بالآخر وہ طاقت ہے، جو ہم نہیں، ایک ایسا واقعہ ہے، جس کو ہر زمانے کے اچھے اور برُے آدمیوں نے کسی نہ کسی ڈھنگ میں تسلیم کیا ہے، جب ہم ان بدبخت ہستیوں کی شومئ قسمت پر غور کرتے ہیں، جن کے لئے بدی وراثتہً مقدر ہوچکی ہے، اور جن کے لئے ایک افسوسناک ماحول نے اس پیشے اور انتخاب کو یقینی بنا دیا ہے، "تو ہم روشنی اور مدد کے لئے اس سرچشمہ کے متعلق کیا کہہ سکتے ہیں، جس نے ہم کو ایسے ہی انجام سے بچایا ہے، ہمارا عمیق ترین شعور گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتا ہے "ہمارے لئے نہیں، ہمارے لئے نہیں" اب رہ گیا وہ مذہبی سوال، جو یہاں اس بحث میں پیدا ہوتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم کو خدا اور دنیا کے ساتھ اس کے تعلق پر ہر طریقے سے فکر کرنا سیکھنا چاہئے، ہم کو یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ خدا اپنے تمام انتخابات متقابل محرکات کی موجودگی میں کرتا ہے، یا یہ کہ وہ مجوزہ دنیا کے سامنے اسی طرح کھڑا ہوتا ہے، جس طرح ایک کاریگر اپنی بنائی ہوئی چیز کے سامنے،

جیسا کہ پہلے دکھایا جاچکا ہے، جبریت اس کا عقیدہ نہیں، یہ ہر اُس شخص کو بدی سے نجات پانے کی امید

والی ہے جو سیکھنے کے قابل ہے، اور زندگی کے تجربوں سے عقل حاصل کر سکتا ہے، ہمت صرف اسوقت ٹوٹتی ہے اور اخلاقی قوت صرف اسوقت غائب ہوتی ہے، جب ذات پر قسمت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے، اس کے برعکس جبریت اخلاقی زندگی کے بعض اہم عملی پہلوؤں پر زور دے کر محرک عمل مہیا کر سکتی ہے، عمل پر لازمی تعلق کے اصول کے اطلاق کا ایک نتیجہ یہ ہے، کہ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر بعد کا فعل ماقبل کے افعال سے اس طرح ملا ہوا ہے، جس سے عادت کی اہمیت بالکل نمایاں ہو جاتی ہے، ہر بعد کے انتخاب میں اس شخص کی تمام گذشتہ زندگی بروئے کار آتی ہے، لہذا موجودہ اخلاقی عمل کا مفہوم اور گہرا ہو جاتا ہے، میں جو کچھ آج کرتا اور سوچتا ہوں، وہ میرے کل کے کرنے اور سوچنے کے لئے بہت گہرے اثرات رکھتا ہے، اگر یہ صحیح ہے، کہ کوئی معلول بغیر علت کے نہیں ہو سکتا، تو یہ بھی صحیح ہے، کہ کوئی علت بغیر معلول کے نہیں ہو سکتی، لہذا کسی جادو کے زور سے نہیں، بلکہ بالکل طبعی اور لازمی طریقے سے یہ خیال ترازو کے اس پلڑے کو جھکا سکتا ہے جس میں موجودہ انتخابات تولے جا رہے ہیں، یہی یقین کہ ہم اس طرح معین ہوتے ہیں، بہ ذات خود ہم کو بدی سے روک کر نیکی اختیار کرنے میں مدد دیکتا ہے، اس تعلیم کے عمرانی نتائج بھی کچھ کم وقیع نہیں، اس طرح ہر عمرانی فعل ایک نئے معنی کسب کر لیتا ہے، عمرانی تعلقات کی ذمہ داری سے کون بچ سکتا ہے؟ ہمارے افعال خالی خولی ہماری طرف عود نہیں کرتے، بلکہ انسانی تاریخ کے اس بڑے جال میں یہ تمام افعال ایک ایسی طاقت سے کام کرتے ہیں جس کی صحیح وسعت کو ہم جانچ نہیں سکتے، لیکن ان کو ناگزیر سمجھنا ہی پڑتا ہے،

۱۴- ذمہ داری سزا،

مندرجۂ بالا تمام بحث میں ہم نے آزادی کی ایک نئی تاویل کی ہے، جس کے نہ صرف نظری، بلکہ عملی مقاصد بھی مقتضی تھے، یہ صحیح ہے کہ تعلیم، سزا، حکومت، عمرانی جد و جہد، وغیرہ تمام معاملات میں عوام کا تفکر جبریت کے مطابق ہوتا ہے، لیکن بہ لحاظ صورت یہ اختیاریت کے قریب ہوا کرتا ہے، یہ صورت حال کچھ شعور کے فتووں کی غیر ناقدانہ تخمین کا نتیجہ ہے، اور کچھ بعض ان نظریات کا جو قانون اور دینیات میں عرصے

سے جاری ہیں، لہذا معلوم یہ ہوتا ہے کہ عوام کا تفکر خود اپنے سے متناقض ہے، اب اخلاقی نظریہ یا تو نا قابل بحث تنازع کو تسلیم کرے، یا ان کو دوبارہ شکل دینے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کرے، اخلاقی تفکر کا یہ کام نہیں کہ تجربے کی ٹھوس زمین کو چھوڑ کر ہوا میں معلق ہو جائے، عملی معاملات میں فہم عامہ کی تصدیقات کی تردید بھی اس کا مقصد نہیں اعمال کی نئی صورتوں کی تخلیق بھی اس کا اولیں وظیفہ نہیں، بلکہ اس کا اصلی کام پہلے سے موجودہ صورتوں کی توجیہ ہے، اخلاقی نظریہ کسی چیز کو مٹاتا نہیں، بلکہ اس کی تاویل کرتا ہے، زیر بحث سوال میں یہ فہم عامہ کی اختیاریت کے مرکزی معنوں کی تردید نہیں کرتا، اور آزادی اور ذمہ داری کے لئے حقیقی اخلاقی مفہوم کے تحفظ کے یہی معنی ہیں، ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ جبری نظریے کے مطابق اخلاقی آزادی ایک بے معنی نصب العین نہیں، بلکہ ایک حقیقی واقعہ ہے، جس کے ساتھ واضح معنی شریک ہو سکتے ہیں، آزادی ایک غیر معین ارادے کے ہم معنی نہیں، یہ ایسے ارادے کے مساوی ہے، جسکو فہم و بصیرت نے معین کیا ہے، اب ذمہ داری کے مسئلے پر مختصر بحث باقی ہے۔

صفائی کی خاطر ہم اس بحث کو اخلاقی مسئولیت، یا ذمہ داری کے بجائے طبعی مسئولیت کے تخیل سے شروع کر سکتے ہیں، ان معنوں میں مسئولیت عمیم الاطلاق ہے، چنانچہ ان ہی معنوں میں ہم ایک شہر میں گندے پانی کے استعمال کو وبا پھیلنے، اور کسی ملک کی آب و ہوا، وہاں کے باشندوں کی خصوصیات کا ذمہ دار کہتے ہیں، اسی طرح فصل کی خرابی کسی خاص قسم کی گھاس کے نکلنے کی طرف منسوب کیجاتی ہے، مجنوں اپنے شدائد کا جواب دہ ہوتا ہے، اور احمق اپنی بدتہذیبی کا، اس استعمال میں اس اصطلاح کے معنی صرف یہ ہوتے ہیں کہ زیر بحث شخص یا چیز بعض حالات یا واقعات کا بلا واسطہ سرچشمہ ہے، یہ ظاہر ہے کہ اخلاقی ہستیاں بھی ان ہی معنوں میں اپنے افعال کے جواب دہ ہوتی ہیں، یعنی ان کو ان افعال کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے، اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی قابل غور ہے کہ باہم لازما مربوط واقعات کی دنیا میں کوئی چیز بھی اپنی فطرت و ماہیت کے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتی، گندا پانی معاف نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح بیماری پیدا کرنے والی ہوا بحث

نہیں کہلاتی، جو گھاس فصل کو خراب کرتی ہے، اسکو نکال کر پھینک دیا جاتا ہے، مجنون پاگل خانے میں بند کر دیا جاتا ہے، اور احمق کو اس کی حماقت کی سزا ملتی ہے، جن لوگوں کو اندیشہ ہو کہ ذمہ داری کی نئی تاویل اخلاقی نظام کی بیخ کنی کرے گی، ان کو طبعی مسئولیت کے نقطۂ نظر سے بھی مطمئن رہنا چاہئے، سوسائٹی اپنے افراد کو ان کے افعال کے مطابق جانچتی ہی رہے گی، جو شخص عمرانی بدی پھیلائے گا، اسکو بدی کا سرچشمہ ہی کہا جائیگا اور وہ اپنے افعال کا جواب دہ رہے گا،

لیکن اس بات سے سب اتفاق کرین گے، کہ اخلاقی ذمہ داری میں اُس جواب دہی یا مسئولیت کے علاوہ اور بہت کچھ شامل ہے جس پر اب تک غور ہو چکا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو انسان اور درخت یا حیوان کی ذمہ داری میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، وہ کونسا عنصر ہے، جس سے اخلاقی ذمہ داری مرکب ہوتی ہے، ہم یہاں فہم عامّہ کے جواب کو تسلیم کر سکتے ہین لیکن یہ خیال رکھنا چاہئے، کہ فہم عامّہ کو مجبور کرنا چاہئے، کہ وہ ان معنوں کو محض بیان کرنے کے علاوہ ان کی توضیح بھی کرے، فہم عامہ کا جواب بلاشبہہ یہ ہوگا، کہ انسان صرف اس وجہ سے اخلاقاً ذمہ دار ہے، کہ وہ آزاد ہے، اور یہ صحیح بھی ہے، بہ شرطیکہ ان اصطلاحات کے صحیح معنی لئے جائیں، لیکن اس موقع پر پھر ہم کو ایک آزاد شخص کے تمیزی نشان کی تلاش کرنی پڑتی ہے، ہم کو ایک ایسی خصوصیت درکار ہے، جو آزاد انسان، اور غیر آزاد اشیا یا اشخاص، مثلاً درخت، حیوان، مجنون، احمق اور بچے میں مابہ الامتیاز ہو، یہاں فہم عامہ بلا تامل انسان کی عقل، اور اس کی تدبر کرنے والی اور ذی عقل فطرت کی طرف اشارہ کرے گی، جن کی وجہ سے وہ تصورات کو وصول کر سکتا ہے، اور تربیت سے متاثر ہو سکتا ہے، اور جن کی وجہ سے وہ خود اپنی رہنمائی کرنے والا فاعل بن سکتا ہے لیکن اس کا مطلب ہے، کہ انسان کے افعال غایت کے تصور کے مطابق یعنی محرکات کا نتیجہ ہوتے ہین، اور یہی اسکے افعال کو معین کرتے ہیں، ہم سے کہا جاتا ہے کہ مجنون اور احمق ذمہ دار اس وجہ سے نہیں ہوتے، کہ وہ تربیت پذیر نہین وہ تصورات کو وصول نہیں کر سکتے، اور محرکات ان کی تعیین نہیں کر سکتے، پھر اس پر بھی اتفاق کیا جائیگا،

کہ تربیت پذیری، اور محرکات سے رہنمائی کی یہ قابلیت ہی ذمہ داری کے درجے کو معین کرتی ہے یہی بچپن میں نقد
افزوں ذمہ داری کے مختلف درجون کی نشان دہی کرتی ہے، یہی ذمہ داری کے ان درجون کی پیایش کرتی
ہے جو ہم مختلف سقیم یا فاسد اصناف کی طرف منسوب کرتے ہیں، اور قانونی نقطۂ نظر سے بھی یہی ذمہ داری
کا معیار ہے، اس اصول میں کوئی استثناء نظر نہیں آتا، یا لوجانوروں کے ساتھ جو سلوک ہم کرتے ہیں، اس
میں انسانی ذمہ داری کی دلچسپ شبیہ دکھائی دیتی ہے، ان کو ہم ان کے عقل اور تربیت پذیری کے درجے
کی مناسبت سے ذمہ دار سمجھتے ہیں،

لیکن اس کے بعد بھی کہا جائے گا کہ امتحانی نکتہ تو ابھی جوں کا توں باقی ہے، کیا ہم انسانی افعال
کو لازمی اور جبری کہنے کے باوجود انسان کو ذمہ دار گردانیں گے، ؟ اس کا جواب فہم عامّہ کی تصدیقات کے
مطابق بھی غیر مشتبہ ہے، اور فہم عامّہ کی انہی تصدیقات کی روشنی میں ہم یہاں بحث کر رہے ہیں، اس میں
شبہہ نہیں کہ ہم ایک شخص کو اس کے لازمی اور جبری افعال کا ذمہ دار گردانتے ہیں، بشرطیکہ یہ لزوم جبر خود
اس کی فطرت کی طرف سے ہو، نہ کسی اور خارجی طاقت کی طرف سے، اور یہ کہ یہ فطرت محرکات کے تعینی اثرات
کی وجہ سے قابلِ اصلاح ہو، معمولی انسانوں کے عام افعال میں یہ شرائط بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں، ایک گرم
مزاج اور زود رنج باپ اپنے بچے میں گرم مزاجی اور زود رنجی کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ وہ بچہ خود اس کا اوتار ہے
لہذا وہ اس تمام حالت کو ایک ایسے موروثی میلان کا بالکل طبعی اور لازمی اظہار خیال کرتا ہے جس کے خلاف
خود اس نے تمام عمر جہاد کیا ہے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ بچہ کو پوری طرح ذمہ دار گردانتا
ہے، تجربے سے باپ نے اس گرم مزاجی اور زود رنجی کی برائیوں اور حماقتوں کو معلوم کر لیا ہے، اور وہ
بچے کو اس کے کسی اور فعل کے مقابلہ میں اس فعل کا زیادہ ذمہ دار گردانتا ہے، کیونکہ اسکو یقین ہو کہ
تربیت و تادیب بے اثر نہ رہے گی، یہ خیال غلط ہے کہ اگر ہم کسی فعل کو لازماً معین یا معلومہ حالات میں ناقابل
تغیر سمجھتے ہیں، تو اس کی مسئولیت ختم ہو جاتی ہے، واقعہ یہ ہے، کہ ہم اپنے آپ کو حسین اور

افعال کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں، جو خود ہماری فطرت کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں، اور جن کو ہم خود اپنی سیرت کے کسی تعین کرنے والے عنصر کی طرف منسوب کر سکتے ہیں، بہ قول گرین "اگر کسی شخص کا فعل اس کی سیرت کو نہیں، بلکہ بلا محرک ارادے کی کسی ناقابلِ توجیہ قوت کو ظاہر کرتا ہے، تو کیا وجہ ہے کہ اسکو اس پر شرم آئے، یا وہ خود اپنے آپ کو ملامت کرے" جن مثالوں میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ، فہم عامہ یا قانونی عدالتوں کے نزدیک بہت کم ہوتا ہے، وہ وہ ہوتی ہیں، جن کو فاعل کی اپنی سیرت متعین نہیں کرتی، یا جن میں کسی خرابی کی وجہ سے اس سیرت پر محرکات کا اثر نہیں ہو سکتا، آزادی کا جو عقیدہ آزادی کو خود تعیینی کے ساتھ متحد قرار دیتا ہے، اس کی تائید میں قوی ترین دلائل میں سے ایک یہ واقعہ بھی ہے، کہ اس کے ذریعے سے ہم اخلاقی ذمہ داری کے واقعات کی تاویل روزمرہ زندگی کی صحیح اخلاقی تصدیقات کے مطابق کر سکتے ہیں، یہ تصدیقات جس نظریے کی طرف منسوب کی جاتی ہیں، گو اُن کے مطابق یہ غلط ہوتی ہیں لیکن عملاً ان کی صحت غیر مشتبہ ہے،

سزا کے اخلاقی پہلو، زیرِ بحث مسئلے کے تعلق سے، اتنے اہم ہیں، کہ اس موقع پر ان کا ذکر بھی ضروری ہے، اگر سزا کسی شخص کے لئے کوئی اخلاقی قیمت رکھتی ہے، اور وہ محض عمرانی حفاظت کا طریقہ نہیں ہے، تو اُن پیچیدہ ذہنی حالات میں بہ صورت تعیینی عنصر اس کے داخل ہونے کے امکان ہی سے اسکے حدود مقرر ہو جاتے ہیں، جن سے فاعل کے آیندہ افعال صادر ہونے والے ہیں، جزا و سزا کا جواز صرف اسی لئے ہے، کہ اس کی وجہ سے محرکات بروے کار آتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم اس سے قبل دیکھ چکے ہیں، اختیاری عقیدے کے مطابق یہ دونوں اسی حد تک بے اثر ہیں، جس حد تک کہ اختیاریت صحیح ہے، مختصر یہ ہے کہ متعین و مجبور ارادہ ہی وہ ارادہ ہے، جو اخلاقی تعلقات میں کام آسکتا ہے،

لیکن ظاہر ہے کہ سزا کی ایک صورت مندرجۂ بالا بیان سے مستثنیٰ ہے، اور وہ یہ انتقامی سزا ہے جس سے مظلوم کی تشفی ہوتی ہے، اور جس میں نتائج و عواقب ملحوظ نہیں رہتے، اگر سزا بدکار کی اصلاح

سوسائٹی کی حفاظت میں کارگر نہیں ہوتی، تو اس کا مقصد ہی فوت ہوجاتا ہے، اور وہ محض بیکار اور غیر انسانی بن جاتی ہے، سزا سے انتقامی عناصر کو خارج کر دینے کا روز افزوں میلان اخلاقی ترقی میں بہت اہم ہے، اس سزا میں یہ انتقامی عنصر داخل ہے، وہ ہر شخص کے لئے انسانیت سے معرا کرنے والی ہے، اسلئے زمانۂ وحشت کی اور چیزوں کی طرح اسکو بھی مٹ جانا چاہئے، انسانی فعل کی جبری توجیہ کے بہترین اثرات میں سے ایک اثر یہ بھی ہے، کہ اس سے اپنے ابنائے جنس کی ہمدردی پیدا ہوتی ہے، عمل کے گہرے سرچشموں کا سمجھنا ہر حقیقی و صحیح رحم کے لئے اتنا ہی ضروری ہے، جتنا ہر عادلانہ ممانعت کے لئے، اگر اس رحم میں انسان کی برائیاں اور حماقتیں بھی شامل ہوں، تب بھی یہ خطرناک یا مشفقانہ رحم نہیں بنتا کیونکہ یہ نہایت وضاحت کے ساتھ اس بات کو پیش نظر رکھتا ہے، کہ عمرانی نظام میں ایسے مؤثر محرکات کام کر رہے ہیں، جو بدی کو روک سکتے ہیں، اس لئے وہ ایک ہاتھ تو کمزوروں اور خطاکاروں کے ساتھ ہمدردی کی طرف بڑھاتا ہے، اور دوسرا ان کی سخت روک تھام کی طرف،

۱۴- جبریت کا خیال زندگی کی طرف،

آخر میں آزادی اور ذمہ داری کی اس تاویل کے عملی نتائج پر غور کرنا بہتر ہوگا، جو ہم نے گذشتہ اوراق میں پیش کئے ہیں، یہ بلاشبہہ صحیح ہے، کہ کوئی محتاط فکر کرنے والا شخص کسی نظرئیے کے فوری عملی اثر کو اس کی نہائی صداقت کا معیار نہیں مانتا، ہم کو اس سے انکار کرنے میں بھی تامل نہ ہونا چاہئے، کہ تاریخی حیثیت سے عقلی غلطی نے بعض اوقات بڑے اچھے نتائج پیدا کئے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ خطا صواب کے برابر مفید ہے، اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ انسانی ارتقا کے ایک خاص درجے میں کسی مسئلے میں عقیدے کی غلطی دوسری مروجہ غلطیوں اور علم کی مجموعی حالت کے ساتھ ایسا اچھا توازن رکھتی تھی، کہ صداقت و صواب نہ رکھ سکتے تھے، پھر اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ غلطی نفس اپنے نقائص اور کمزوریوں کی وجہ سے نہایت عمدہ عملی محرک بن گئی، اعلیٰ قسم کی شہادت کے لئے یہ محرکات بالکل غیر مؤثر ہوجاتے ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ غلطی کی آخری خوبی کے خلاف

ہمارے اتفاقات واذعانات صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک کا ایمان ہے، اور اسکی تائید میں کافی شہادتیں ہیں، کہ صواب کو جاننا اور اس پر عمل کرنا بہتر ہے، لیکن قصہ یہ ہے کہ اختیاریت نے جبریت کو اس کے مفروضہ عملی نتائج کی بنا پر رد کیا ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اس مناقشے کا بھی فیصلہ کر لیا جائے، اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے، کہ اخلاقیات میں ہم نظریہ عمل پر بحث کرتے ہیں، لہذا اگر یہ معلوم ہو جائے، کہ یہ نظریہ ایسا ہے جس کے مطابق انسان زندگی بسر نہیں کرسکتا، یا یہ اعلیٰ اخلاقی جد وجہد کے لئے مہلک ہے، تو پھر یہ نظریہ مہلک طور پر عیب ناک ہو جاتا ہے، اب سوال دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ انسانی عمل کی اس تاویل کے نتائج کیا ہیں؟ ایک عقیل اور فہیم شخص اس کے مطابق کیسے زندگی بسر کریگا؟ بلاشبہ وہ کوئی نامناسب خاطر جمعی، یا فخر محسوس نہ کریگا، اگر وہ اپنے آپ میں کوئی اچھی، یا قیمتی چیز پائے گا، تو وہ یہ بھی معلوم کرلے گا، کہ ان کا سرچشمہ خود اس کا پیدا کردہ نہیں بلکہ وہ عالمی نظام کی کسی گہرائی میں پوشیدہ ہے، بصیرت کی ہر خلقی قوت، سیرت کی ہر اطمینان بخش و مسرت انگیز میزان، عروج پانے کا ہر ہیجان ہر جگہ اس چیز کی شناخت کرے گا، جو اس کے لئے ایک تحفہ ہے، پھر احول کی ان ہزاروں قوتوں کو بھی وہ ایسا ہی سمجھے گا، جن سے اس نے اپنی تقدیر بنائی ہے، اسلئے جب وہ اپنا مقابلہ اپنے اس ہمنشین سے کرے گا، جس کو غلطی نے اندھا بنا دیا ہے، اور جو بدی کا غلام ہے، تو اسکو معلوم ہوگا، کہ اس تحفے کی غیر موجودگی میں وہ بھی اتنا ہی مصیبت زدہ ہوتا، اگر وہ اس بدی کو، جو وہ اپنے آپ میں پاتا ہے اسی نگاہ سے دیکھتا ہے، تو اس کا یہ عقیدہ اس بدی کی سنگینی کو کم نہیں کرسکتا، اور نہ حصول کمال کی کوشش میں اس کی وجہ سے کوئی کمی واقع ہوسکتی ہے، وہ اس دردانگیز تربیت وتادیب کو جو خود اس کی اپنی حماقت اور خطاکاری کا نتیجہ ہے، اپنی صلاح وفلاح کی لازمی شرط سمجھے گا، اور اس کو ہر قیمت پر خریدنے کے لئے تیار ہوگا، اپنے ہمنشینوں کے ساتھ اسکو گہری ہمدردی ہوگی، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ وہ ایسی فطرتوں کے حامل ہیں جن کو خود انھوں نے منتخب نہیں کیا ہے، اور اگر اس ہمدردی کی وجہ سے وہ زندگی کے طربیہ و حزنیہ پر ہنستا اور روتا ہے، تو اس کی ہنسی طنز سے اور اس کا رونا تلخی سے پاک ہوگا، لیکن ایک ہردم تیار ہمدردی کی وجہ سے وہ

نہ تو منصفانہ مطالبوں کو پورا کرے گا، اور نہ اپنے ہمنشینوں کی ذمہ داریوں کو کم کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ امید و بیم کے مناسب محرکات ہی ان کو ان کی بہترین کوششوں پر ثابت قدم رکھ سکتے ہیں، اگر اس سے انصاف کرنے یا سزا دینے کو کہا جائے گا، تو وہ نہ رحم کھائے گا، اور نہ کمزوری دکھائے گا، وہ ہاتھ باندھکر کسی خارجی قسمت کی طرف سے فیصلہ صادر ہونے کا انتظار نہ کرے گا، کیونکہ اسکو معلوم ہے کہ اسکے دل میں ارادہ فعل کی حرکت بیکار نہیں ہے، اور یہ کہ اپنی طاقت اور اپنے علم کے مطابق اسکو بھی اس دنیا کے ڈرامے میں اپنا پارٹ کرنا ہے، آخری بات یہ ہے کہ ایسا شخص نوع انسان کے مستقبل کی طرف سے مایوس نہ ہوگا، کیونکہ وہ گذشتہ زمانہ کی ترقی کو دیکھ چکا ہے، وحشیانہ زندگی سے جو بہیمانہ زندگی سے یونہی سی مختلف تھی اس نے آہستہ آہستہ تمام وقعت حاصل کی ہے، اس نے علم حاصل کیا جس سے جہالت اور توہمات کا خاتمہ ہوا، اس نے ہمدردی پیدا کی جو انانیت اور نفرت کی ہلاکت کا باعث ہوئی، اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں غیر متزلزل شجاعت کا اظہار کیا، اس نے اعلی غایات کے حصول کی کوشش میں بلند نظری کا ثبوت دیا، ان تمام اکتسابات و کمالات کے بعد اب وہ یقین کرسکتا ہے، کہ جو طاقت اس طرح انسانی نوع میں کام کرتی رہی ہے، وہ اور زیادہ بلند نتائج پر ختم ہوگی،

(نئی کتاب)

مقالات شبلی جلد ششم تاریخی

یعنی

یہ حصہ مولانا شبلی مرحوم کے اون تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جسمیں اسلامی حکومتوں کی تمدن و تہذیب علم وفن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دئیے گئے ہیں، حجم ۲۴۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

کتبخانۂ حبیب گنج کے فنِ تاریخ کے چند نوادر

از

جناب عبدالغفور صاحب بی اے آنرز لندن ایم اے ایم ایس سی علیگ

نواب صدر یار جنگ بہادر کا کتبخانہ نوادر کتب کا انمول ذخیرہ ہے، ان میں سے چند تاریخی نوادر پیش کئے جاتے ہیں۔

۱۔ دول الاسلام معہ ذیل دول الاسلام للامام ذہبی، یہ نسخہ امام ذہبی کی ضخیم تصنیف تاریخ الاسلام کا اختصار ہے، جو مصنف نے خود تیار کیا تھا، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں کہ یہ کتاب مختصر تالیف ہے، اسکی ترتیب سنہ کے لحاظ سے ہے، اور ۷۴۰ھ تک کے حالات اس میں درج ہیں، اس کے بعد سخاوی کی ذیل ہے، جو ۷۴۱ھ سے ۹۰۱ھ تک ہے، یہ ذیل بھی اصل کتاب کی طرح مختصر ہے، اور اس کا نام ذیل التام بذیل الاسلام رکھا گیا، دول الاسلام دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے ۱۳۳۷ھ میں شائع ہو چکی ہے، یورپ کے علمی حلقوں میں بھی کچھ عرصے سے امام ذہبی کی تصنیفات بالخصوص تاریخ الاسلام سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا جارہا ہے، تاریخ الاسلام کی ۱۲ اور بقول بعض ۲۰ جلدیں تھیں، اور آج کل اس کے ناقص اور غیر مکمل اجزا مغربی اور مشرقی کتب خانوں میں منتشر پڑے ہیں، ڈاکٹر اسپیز استاذ علوم عربیہ علیگڑھ نے جامع ایا صوفیہ کے قابل قدر نسخوں کی طرف توجہ دلائی، اور ۱۹۳۲ء کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں سمو گی کے قلم سے ایک مضمون نکلا تھا، جس میں تاریخ الاسلام کے مختلف پریشان اجزاء کو یکجا کرکے شائع کرنے کی تجویز پیش کی تھی،

حبیب گنج کا نسخہ آغاز سے خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک ناقص ہے، خط عربی عتیق اور کاغذ عربی ہے، ۳۶ھ کے حالات کے بعد چند اوراق الحاقی ہیں، اس کے بعد اختتام کتاب تک اصل کاتب کے ہاتھ سے منقول ہے،

اخیر میں کاتب لکھتا ہے، ما وجد بخط الحافظ ابی عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد الذہبی رحمۃ اللہ من ذیل علی کتاب دول الاسلام، چونکہ یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ سے لکھے ہوئے نسخے سے نقل کیا گیا ہے اسلئے بہت اہم ہے، کتابت یوم السبت ۱۰ جمادی الآخر ۹۰۱ھ کو ختم ہوئی،

مولانا موصوف نے فہرست میں لکھا ہے، کہ یہ کتاب مولانا شبلی مرحوم کی عنایت سے دستیاب ہوئی۔

۲- النور السافر من القرن العاشر- اس کتاب میں مصنف نے قرن دہم کے علما، صلحا، ادبا، فرمانروا اور امرا کا ذکر ہر ایک کے سنہ وفات کے ضمن میں کیا ہے، آغاز ۹۰۱ھ سے کیا ہے، اسلامی دنیا کی عالمگیری کا دلچسپ مرقع ہے، اور شامی و حجازی، مصری و یمنی، رومی و ہندی، مشرقی و مغربی سب ممالک کے مشاہیر و اہل کمال کا ذکر درج کیا ہے، ہر ایک کے ضمن میں ان کی حکایات عجیبہ اور دلچسپ چٹکلے کتاب کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں، مثلاً ۹۷۴ھ کے حالات میں سلطان سلیمان آل عثمان کی وفات کا ذکر کیا ہے، اور اس حادثہ پر ایک مرثیہ بھی تحریر کیا ہے، کتاب کے متن میں کہیں کہیں مصنف کے آبا و اجداد کے سنہ وفات اور سوانح حیات کا حال بھی آیا ہے، ہندوستان کی تاریخ کے لحاظ سے چند امور اہم پائے گئے، اولاً صفحہ ۴۵ پر دسویں صدی کے پانچویں سال میں ایک ہالۂ عظیمہ کا ذکر ہے، جو سورج کے گرد نمودار ہوا اور چاشت کے وقت سے ظہر اور عصر کے درمیانی وقت تک رہا، اس کے بعد غائب ہو گیا، شہر احمد آباد پر ایک علحدہ باب لکھا ہے اس میں سلطان محمود شاہ ابن مظفر شاہ کا حال ہے جو احمد آباد میں فوت ہوا، اس شہر کے متعدد علما و ادبا کے حالات زندگی زیب قرطاس کئے گئے ہیں، اور چونکہ ان میں سے بیشتر مصنف کی حیات میں ہو گذرے ہیں اس لحاظ سے یہ تذکرہ تاریخی لحاظ سے بہت وقیع ہے، بقول پروفیسر عبد العزیز میمن اس کا ایک نسخہ کتب خانہ فرنگی محل میں بھی موجود ہے، مصنف کا نام شیخ عبد القادر بن شیخ العیدروس الہندی، متوفی ۱۰۳۸ھ بخط نسخ مؤلف نے اس کتاب کی تصنیف سے ۱۰۱۲ھ سنہ ہجری میں فرصت پائی ہے، سنہ کتابت ۱۰۹۳ سنہ ہجری۔

۳۔ اقبالنامۂ جہانگیری، یہ معتمد خان امیر عہد جہانگیری کی مشہور تاریخ ہے، اور تینوں جلدوں کا مکمل نسخہ ہے، اسکی پہلی اور دوسری جلدیں بقول ریو اور ایتھے کمیاب ہیں، تیسری جلد تصحیح کے بعد کلکتہ سے شائع ہو چکی ہے، اس کا اردو ترجمہ دار الترجمہ حیدر آباد نے چھاپا ہے، یہ نسخہ خوشخط فارسی جلی قلم سے لکھا گیا ہے، عنوانات مطلا و لاجوردی، اول سے آخر تک تمام اوراق سنہری جدولوں سے گھرے ہوئے ہیں، ابتداء کے ورق تو بالکل مطلے ہیں، ہر ہر سطر کو سونے سے معمور کیا گیا ہے، اسکی تذہیب و آرایش شاندار اور عظیم القدر ہے، اس نسخہ کی ایک خاص چیز جو دوسرے قلمی نسخوں میں نہیں پائی جاتی شجرہ سلاطین مغلیہ ہے، جو قبل آغاز کتاب لکھا ہوا ہے، ہر ایک نام زرین حلقے میں ہے، حاشیہ کے نام بھی حلقہ زریں میں تحریر کئے گئے ہیں،

۴۔ تذکرۃ الخوانین مؤلفہ شیخ فرید بن شیخ معروف صدر سرکار بھکر، یہ نسخہ بیحد کمیاب اور نادر الوجود ہے، اسے شیخ فرید بھکری نے عہد شاہجہانی میں ترتیب دیا، اور نواب شایستہ خاں کی خدمت میں پیش کیا تھا، ہندوستان یا یورپ کے کسی کتب خانے میں اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے، پروفیسر عبد اللہ چغتائی نے پچھلے سال رسالہ اسلامک کلچر میں اس کے ایک نسخے کا ذکر کیا تھا، جو مولوی عبد الحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے پاس ہے، نیز اسی ضمن میں یہ بھی لکھا تھا، کہ نسخہ مذکور ناقص الآخر ہے، بفضل خدا حبیب گنج کا نسخہ مکمل ہے، خط شکستہ جلی شیخرفی آمیز، شروع میں امرائے عہد اکبری، جہانگیری اور شاہجہانی کی مکمل فہرست ہے، کتاب کو تین باب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلے میں امرائے اکبری، دوسرے میں جہانگیری اور تیسرے میں شاہجہانی، مورخین کرام مآثر الامرا کو امرائے مغلیہ کے حالات کا بہترین ماخذ قرار دیتے ہیں، مگر فرید بھکری اس مصنف مآثر سے بھی ایک صدی پیشتر گذر چکا ہے، اور عہد شاہجہانی کے حالات تو وہ عینی مشاہدے سے لکھتا ہے، تذکرہ میں جابجا خود دیکھے ہوئے حالات اور اپنے اوپر گذرے ہوے واقعات بیان کرتا ہے، اس لحاظ سے تاریخی نقطۂ نگاہ سے تذکرۂ امرا مآثر الامرا سے بہت اہم ہے، ابو الفضل کے خاندان کی تاریخ لکھتے ہوئے تحریر کرتا ہے، کہ آج ابو الفضل یا اسکے بھائیوں کی اولاد میں سے ایک فرد بھی موجود

نہیں، ان کی وکلش منازل جو اکبرآباد میں تھیں سلسلۂ عالیہ اعتماد الدولہ کے قبضہ میں آگئی ہیں، ع

بقا بقاے خدا یست و ملک ملک خدا،

ابوالفضل فیضی اور صدرالصدور کے باہمی مناظروں میں دو دلچسپ حکایات ایسی لکھی ہیں، جو دوسری کسی تاریخ میں نہیں ملتیں، اگرچہ مصنف مآثر شاہ نواز خان نے فرید بھکری کی طرز تحریر کو غیر مورخانہ بتایا ہے، مگر دونوں کتابوں کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ صاحب مآثر نے کس قدر حالات حرف بحرف فرید بھکری سے لئے ہیں، کاش کہ جو محنت اور کوشش مآثر کے چھپوانے اور ترجمہ کرنے میں صرف کی گئی ہے، اس کا عشر عشیر بھی اس کتاب پر کی جاتی، تو تاریخ ہند کی اچھی خدمت سرانجام دی جاسکتی تھی، اس نسخے کی کتابت سنہ ۱۲۵۹ھ کی اور کاغذ نیم رنگ قدرے کرم خوردہ آب رسیدہ ہے،

۵- تذکرۃ الامرا کیول رام ولد رگھوناتھ داس قوم بانیہ اگروال متوطن قصبہ کاسہ صوبہ شاہجہان آباد، کتاب کا تفصیلی نام احوال امرایان سلطین و راجہ ہائے نامی از ابتدائے جلوس حضرت اکبر شاہ و جہانگیر و شاہجہان و عالمگیر ہے، پہلے مسلمان امرا کا باب، پھر ان ہندو امراء کا جن کو خطاب راجگی عطا ہوا، اسکے بعد ان ہندو اعیان کا جنکو کوئی خطاب نہیں ملا، ہر باب ترتیب حروف تہجی سے ہے،

اپنے متعلق مصنف لکھتا ہے، کہ میرے آبا و اجداد نے بادشاہان ہندوستان اور اس خاندان خلافت نشان کے امراکی نمک خواری سے نشو و نما پائی، اپنے ماخذوں میں اکبرنامہ، اقبال نامہ، توزک جہانگیری بادشاہ نامہ، عمل صالح، عالمگیر نامہ، مآثر عالمگیری وغیرہ گنتا ہے، نیز لکھتا ہے کہ اس میں بعض ایسے خواتین کا حال درج ہے، جو کم مرتبت تھے، اور اس لئے اُن کا ذکر مآثر عالمگیری میں نہیں آیا، اپنی علمی کاوش کے متعلق لکھتا ہے کہ ہر ایک امیر کی قوم، نسبت وطن، منصب خطاب، خدمت اور سال وفات کی تحقیقات کے لئے ہر قسم کی کوشش کی گئی ہے، سنہ تالیف ۱۱۸۴ھ اور کتابت ۳۶ سنہ جلوس شاہ عالم غازی، مطابق سنہ ۱۱۹۰ھ کی ہے یعنی تصنیف سے چھ سال بعد، الیٹ نے اس کتاب کا سنہ تصنیف ۱۱۹۴ھ لکھا ہے، جو غلط ہے، درحقیقت

یہ نسخہ مآثر الامرا مصنفہ شاہ نواز خان کی تعزنانی کا ہے، اس کتاب کے نسخے عجائب خانہ لندن اور انڈیا آفس میں بھی موجود ہیں،

۲۰- احوال جنگ پانی پت، مابین احمد شاہ درانی و بھاؤ مرہٹہ مؤلفہ متصدی نواب شجاع الدولہ وزیر الملک

یہ نسخہ خط شکستہ شجر فی آمیز میں لکھا گیا ہے، کاتب سید محمد حسین حیدری مقام جگ ہمراہ اردوے معلی در ۱۱۹۹ھ تمام شد،

اس کا مصنف کاسی راجہ پنڈت تھا، جو میدان جنگ میں شجاع الدولہ کی طرف سے احمد شاہ درانی اور بھاؤ کے پاس سلام و پیام پہنچاتا تھا، کتاب کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے، کہ لڑائی کے دوسرے روز بھاؤ کی نعش ملنے کے وقت وہ شجاع الدولہ کے ہمراہ تھا، اور حسب الحکم شجاع الدولہ اس نے بھاؤ کی لاش کو منڈل اور گنگا جل سے غسل دے کر ہندوؤں کی رسم کے مطابق جلایا، اس کتاب کا انگریزی ترجمہ لفٹنٹ کرنل جیمز براؤن نے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے میں ۱۷۹۱ء میں شائع کیا، اور ۱۹۲۶ء میں اسکو دوبارہ پروفیسر راونسن نے مع دیباچہ، حواشی، اور ضمیموں کے علمی دنیا سے روشناس کرایا، دیباچے میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں، کہ اصل نسخہ فارسی تباہ و برباد ہو گیا، علمی دنیا کو مولوی صاحب موصوف کی علم دوستی کا شکور ہونا چاہئے، کہ ایسی نادر روزگار تاریخ غارتگری زمانہ کے ہاتھوں سے بچالی گئی، اصل فارسی اور انگریزی ترجمہ کے مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ مترجم سے کہیں کہیں فروگذاشت ہو گئی ہے، فارسی نسخہ میں ایک نقشہ احمد شاہ ابدالی کے لشکر گاہ کا دیا ہوا ہے، وہ انگریزی نسخے میں موجود نہیں ہے، فارسی نسخہ کے اخیر میں مصنف لکھتا ہے کہ میں نے یہ تاریخ جنگ پانی پت سے انیس سال بعد لکھی ہے، مگر انگریزی ترجمے میں یہ درج ہے، کہ یہ حالات ان واقعات کے مدت مدید کے بعد تحریر میں لائے گئے، سالوں کی تخصیص نہیں کی گئی،

یہ نسخہ جنگ پانی پت کی بیحد دلچسپ، محققانہ اور عینی مشاہدہ پر مبنی تاریخ ہے، مصنف خود مرہٹہ برہمن تھا، لیکن دل سے شجاع الدولہ کا طرفدار تھا، جانبین کے حالات بے تعصبانہ اور غیر جانبدارانہ طریقے پر لکھے ہیں، بھاؤ کے قتل کے حالات کے لئے تو شاید اس سے زیادہ مستند کوئی اور شہادت نہ ہوگی، ابراہیم خاں افسر گاردی

نے جس دلسوزی سے حق نمک خواری ادا کیا، اسکو موثر الفاظ میں بیان کیا ہے، مولینا حبیب الرحمن خانصاحب کو خود بھی جنگ پانی پت کی متعدد روایات یاد ہیں، امید ہے کہ اگر ان کو کبھی موقع ملا، تو اپنے اس بیش بہا ذخیرہ سے جو انھوں نے تاریخی حکایات کا فراہم کر رکھا ہے، علمی دنیا کو بہرہ اندوز ہونے کا موقع دینگے

۶۔ تغلق نامہ امیر خسرو، یہ کتاب جو فہرست میں جہانگیر نامہ ملا حیاتی کاشی کے نام سے درج ہے تحقیقات جدیدہ کی رو سے تغلق نامہ کا وہ ناقص نسخہ ہے، جو شہنشاہ جہانگیر کے پاس موجود تھا، اگر یہ نظریہ صحیح ہے، تو یہ نسخہ اس قیمتی تالیف کا یکتا نسخہ ہے، کچھ عرصہ ہوا سید ہاشمی صاحب نے تغلق نامہ کو طبع کرا دیا ہی، چونکہ یہ نسخہ مختلف مشاہیر علم کی طرف سے علمی دنیا کے سامنے کئی بار پیش کیا جا چکا ہے، اس لحاظ سے اس پر زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے،

مذکورۂ بالا نسخوں کے علاوہ فن تاریخ میں اور بہت سی مفید کتابیں ہیں، ایک تزک بابری جو آگرہ کالج کے مشہور و معروف شاہی نسخے کی نقل ہے، اس کے علاوہ فارسی ترجمہ تاریخ یمینی اور تاریخ نگارستان احمد بن عبد الغفار قزوینی کے اچھے نسخے کتب خانے میں موجود ہیں،

ہندوستان کے دو قدیم گمنام شاعر

میر مسیحی سبزواری؟

اور

میر سید علی سالک سبزواری؟

از جناب محمد عبد الوہاب صاحب مسلم بی اے حیدر آباد دکن،

ہندوستان میں مغلوں سے پہلے کی اسلامی وادبی وعلمی تاریخ بیحد تاریکی میں ہے، ابھی دو سال ہوئے کہ مطہر کڑہ کا نام معلوم ہوا ہے، اب ہمارے دوست مولوی عبد الوہاب صاحب مسلم کو میر مسیحی سبزواری اور میر سید علی سالک سبزواری دو شاعروں کے فارسی دیوان ہاتھ آئے ہیں، لیکن ان کا حال نہیں ملتا، اگر ناظرین میں سے کوئی صاحب نظر ان پر روشنی ڈالیں تو علم کی خدمت ہوگی،

مسلم صاحب کا خط حسب ذیل ہے:۔

"س"

محترمی و معظمی، السلام علیکم

میں نے عرصہ ہوا آپکو سالک اور مسیحی سبزواری کے دو نایاب دیوانوں کے متعلق توجہ دلائی تھی، اور آپنے اپنے گرامی نامہ میں ان کے نام اور تفصیلات پوچھی تھیں، علالت اور عدیم الفرصتی کے باعث کچھ نہ لکھ سکا، تذکرے کئی دیکھے، لیکن کہیں پتہ نہ چلا، کہ یہ کون ہیں، اور قدن شاہ بادشاہ جسکی مدح میں مسیحی سبزواری نے قصیدے لکھے ہیں، کون تھا، بہر حال حسب ارشاد ان دونوں کے نام فی الحال بھیجتا ہوں،

۱- میر مسیحی سبزواری، ۲- میر سید علی سالک سبزواری،

میر مسیحی، میر مسیحی نے سلطان علاء الدین قدن شاہ کی مدح میں قصائد لکھے ہیں، اور سید علی سالک نے سلطان سکندر کی شان میں، دونوں دیوانوں میں قصائد کے بعد غزلیں ہیں، مسیحی اکثر جگہ سلمان ساوجی، انوری اور ظہیر وغیرہ کا ذکر کرتا ہے، مثلاً

این مطلع ار صبا ببرد جانب عراق، لبیک زو ز تربت سلمان برآورد،

اس کے علاوہ بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے، کہ قدن شاہ ہندوستان کا بادشاہ تھا، اور شاعر ہندوستان آیا تھا، بادشاہ جاہل بھی نہ تھا، (اگر ہم علاء الدین خلجی کو تصور کریں)

بعد از ہزار سال کہ دوران سفر کشد، چو من یکے کجا ز خراسان برآورد،

در ہند اگر چہ ہست سخنگوے بے قیاس، کا قبال شان گرفتہ بدیوان برآورد،

یارب چہ کم شود چو منے گر زمجلست، سرخ و سپید تنگہ بداماں برآورد،

من خوش شدم کہ شاہ نصیحت و ظاہر است، کیں نکتہا بطبع سخندان برآورد

اسیر کردہ خوبان ہند شد دل من صبا حدیث مسیحی بہ سبزوار رسان،

اکثر اشعار میں قدن سلطان اور علاء الدین کے نام اور عرف آئے ہیں، مثلاً

سپہر لطف و جہان کرم قدن سلطان کہ بر یمین و یسارش روند فتح و ظفر،

شہ ستارہ حشم بادشاہ علاء الدین مدار مرکز دانش جہان امن و امان

ایک سفر کے متعلق لکھا ہے،

یعنی کہ رسید از سفر آں شاہ کہ تیغش، ہر لحظہ برآورد دمار از سر کفار

ایک اور شعر ملاحظہ ہو،

میکشد در ہوس زلف ورخت خاطر ما بہ سواد ختن و مملکت بنگالہ،

میر سید علی سالک، دوسرا شاعر میر سید علی سالک سبزواری ہے، جو سلطان سکندر ثانی کی مدح کرتا ہے، مگر یہ سلطان سکندر ثانی علاء الدین قطعاً نہیں، بلکہ سلطان سکندر لودی ابن بہلول لودی ہے، داخلی شہادت ملاحظہ ہو،

شمار بود ز تاریخ نہ صد و یک سال — کہ فتح و نصرت سلطان کامگار آمد،

بتاریخ بُد نہ صد و چار ده، — کہ شد فتح نلور بہ اقبال شہ

آخری شعر ایک جنگ نامہ (مثنوی) سے لیا گیا ہے، جسمیں اجی راج راجہ نلور کی شکست کا حال ہے،

نلور چو دارائے دوران رسید، — اجی راج ہمہ مرگ خود را بدید

سالک کے چند شعروں سے ثابت ہوتا ہے کہ اوس کا چچا پہلے سبزوار سے ہندوستان آیا تھا، اور بادشاہ نے اسکو جاگیر دی تھی، اسکے بعد سالک آیا، اور اس نعمت سے سرفراز ہوا، سالک کہتا ہے،

سالک،
چو عم من از گردش روزگار — بہند آمد از خطۂ سبزوار،
شہنشاہ دانی مبارک بنام — بسادات محمود کرد احترام،
چو با شاہ آن میر کرد اختیار — شده جاگرچہ ملک آن بختیار
چہل سال افتاد آن قریہ طرح — حکایات آنرا نگفتم بشرح

بہلول،
شہنشاہ ہم کرد اعطا مرا — برسم پدر داد طغرا مرا
شہا جاگرچہ ملک نیبو ع نیست — اگر ملک گوئید ز شروع نیست

دونوں دیوان ایک ہی کاتب نے لکھے ہیں، اور ۹۲۳ھ درج ہے،

میں نے چند نوٹس اس سے قبل لئے تھے، لیکن وہ اسوقت خدا جانے کہاں غائب ہوگئے، اسلئے سرسری مطالعہ کے بعد آپکی خدمت میں یہ چند سطور ارسال ہیں، میرا خیال ہے کہ میر سید علی سالک کا پیشرو احمد سلطان علاء الدین بن محمد شاہ بن مبارک شاہ بن خضر خاں کا متوسل تھا، جو ۸۴۹ھ سے ۸۵۵ھ تک حکمران رہا، اسی طرح سالک سلطان سکندر لودی کا متوسل تھا، جسکی حکومت ۸۹۴ھ سے ۹۲۳ھ تک رہی، ان دونوں شاعروں کے کچھ حالات معلوم ہوسکتے ہیں، لیکن ان کی شہادت کوئی نظر سے نہیں گذری، اگر آپ مدد فرمائیں تو بہت ممنون ہونگا،

تذکرۂ طاہر

یعنے

سوانح خودنوشت

حسام الملک نواب سید محمد علی حسن خان طاہر مرحوم -

(۶)

شعر و سخن، اگرچہ میں نہ کوئی اصطلاحی شاعر ہوں، اور نہ سخن طرازی اور سخن سنجی کا مجھکو دعوی ہے، لیکن بدو فطرت سے طبع موزوں ضرور ساتھ لایا ہوں، اور ابتداے تعلیم سے ذوق شعر و سخن کی چاشنی کا لذت آشنا ہوں اسلئے برسوں کوچۂ شعر و سخن کی خاک اُڑانا پڑی، اور جلوت و خلوت میں تب و رد اسی سوز و ساز اور ہجوم ناز و عرض میں زندگی کے دن کاٹنا پڑے، اسی عالم جوش و خروش اور مشغلۂ شعر و سخن میں غزلیات و اشعار فارسی و اردو کا ایک بڑا ذخیرہ مرتب ہوگیا تھا، جو شاید دو کلیات ضخیم کے برابر ہوتا، مگر اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی، کچھ زمانہ گذرنے کے بعد جب دل ان رنگ رلیوں سے پھیکا پڑا، تو وہ مجموعۂ غزلیات و اشعار بھی تاراج دست تغافل اور نذر آتش کردیا گیا، ع

این دفتر بے معنی غرق مے ناب اولی

خدا جانے کس طرح ابتدائی عمر کے معدودے چند اشعار اور غزلیں فارسی اور اردو کی بعض اوراق میں لکھی ہوئی پڑی رہ گئی تھیں ان کو بعض اعزہ نے ترتیب دے کر فارسی غزلیات و اشعار کا مجموعہ بنام خرمن گل، اور غزلیات و اشعار اردو کا مجموعہ بنام نالۂ دل طبع کرا کے شائع کرادیا، سچ یہ ہے کہ فارسی اور اردو کلام دونوں محتاج نقد و

نظر و انتخاب تھے، مگر افسوس ہے کہ مجھ کو ان پر نظر ثانی کرنے کی نوبت نہیں آئی انکی اشاعت کے بعد جو کلام جمع ہوا وہ حسب ذیل ہے

فارسی کلام،

بشگفت از تجلی تو لالہ زارِ ما، ۔۔۔ نورِ یقیں ستارۂ صبحِ بہارِ ما

مارا ز نورِ مصطفوی سینہ روشن است ۔۔۔ ایں بس چراغِ راہ بہ شبہائے تارِ ما

الٰہی عشوہ ہائے دلربائی دہ بیانم را، ۔۔۔ حریفِ نرگسِ جادو نگاہاں کن زبانم را

زعشقِ مصطفےٰ آں بلبلِ گلزارِ توحیدم ۔۔۔ خس و خار است از بالِ ملائک آشیانم را

لبِ خاموش ما را رنگ تاثیرے کرامت کن ۔۔۔ ز اشکِ سرمہ آلودِ بتاں ترکن زبانم را

چو گل در باغِ ہستی فرصتِ یک خندہ می باشد ۔۔۔ نسیمِ صبح می گوید کہ بر بندید محملہا

رسیدن کے توانم منتہائے حسن را یا رب ۔۔۔ کہ در ہر جلوہ اش باید نمودن قطعِ منزلہا

در شیوۂ تسلیم چہ دخل است ریا را، ۔۔۔ از گردِ ہوس پاک کنم روئے دعا را

گفتم بہ چمن تا صفتِ آں کفِ پا را ۔۔۔ گلبرگ بہ حسرت نگرد برگِ حنا را

بر چہرہ پریشان کن ایں زلفِ دوتا را ۔۔۔ زنجیرِ مجنبان دلِ دیوانۂ ما را

تا دل نہ کشاید نہ دہد جلوۂ معانی، ۔۔۔ بے بادۂ صافی نتواں جست صفا را

روشن ز نورِ عالمِ فطرت بیانِ ما، ۔۔۔ یک اسمِ اعظم است زبان در دہانِ ما

رسوائے دردِ عشق کسے ایں چنیں مباد ۔۔۔ باید شنید از لبِ دشمن فغانِ ما

بے صرفِ عمر وصل میسر نمی شود، ۔۔۔ ذوقِ فنا ست زندگیِ جاودانِ ما

طاہر زمانِ ماضی ما خوش شش زحال بود ۔۔۔ اے کاش رو کند بقفا کاروانِ ما

ہزار جلوۂ در آغوش کردۂ ما را، ۔۔۔ شہیدِ نازم و گل پوش کردۂ ما را،

نیست عرق کہ دیدۂ بر تن پر گزند ما ۔۔۔ چشم تریم و می چکد اشک ز بند بند ما

ہر ستمے کہ میکنی بر دلِ دردمندِ ما ۔۔۔ عذرِ ستم گماں کند طبعِ وفا پسندِ ما

آبادیِ حق است بہ ویرانیِ دلہا　　جمعیتِ دلہاست پریشانیِ دلہا

لبریزِ دل از کینہ زبان پُر ز نیایش　　ہمسایۂ کفر است مسلمانیِ دلہا

مرقدِ ابرار شد بت خانۂ اسلامِ ما　　کفر می خندد بہ توحیدِ دلِ ناکامِ ما

بے خلشِ مقصدِ دل جلوۂ ذوقے ندہد　　سنگ در رہ فگن خار بدیوار طلب

جمعِ ضدّین محال است چہ دانے داند　　طالبِ حق نبود مردمِ دینار طلب

دیدۂ روزنِ دیوار چہ بیند زاہد　　چشمِ بیدار چہ جوئی دلِ بیدار طلب

ز حسنش چشمِ حیران است امشب　　چہ حیرتہا کہ عرفان است امشب

ز داغِ دل بہاران است امشب　　در آغوشم گلستان است امشب

چہ بر جانم گذشت از دردِ ہجران　　کہ جانم آفتِ جان است امشب

دمِ وداعِ تو تمکینِ عشق را نازم　　کہ اشک بر مژہ مائلِ چکیدن نیست

کو وعدۂ تو وعدۂ فردا شدنی نیست　　این عقدۂ لاینحلِ ما واشدنی نیست

صد پارہ دلم جامعِ مضمونِ وفا بود　　افسوس کہ این نسخہ بیکجا شدنی نیست

خوشم بسایۂ اقبالِ بیکسی طاہر　　نہ بندۂ کس و بے کس مرا خداوند است

در جلوہ طرازی نگر آن گلبدنے ہست　　بشگفتہ در آئینہ بہر سو چمنے ہست

شوخی و حیا را بہم آمیخت ز افسون　　این چشمِ تو مجموعۂ صد علم و فنے ہست

نگاہ شوق بود ترجمانِ حالتِ دل　　سوال از لبِ عاشق کمالِ بے ادبی است

خطا ز یار و ز من شکوہ جز تغافل نیست　　میانِ عاشق و معشوق نسبتِ وہبی است

نہفتہ فتنہ در آن چشمِ فتنہ زا خفت است　　دلِ ستم زدہ داند بلا کجا خفت است

ز بختِ خفتہ کہ سرگشتگی بطینتِ اوست　　بحیرتم کہ چسان خفتہ و کجا خفت است

دلم بہ یادِ تو کم از مریضِ بیکس نیست — کہ در امیدِ طبیب و غم دوا خفت است

زبان بہ فتنہ و جنگ است و دل بعیش گرائے — غنیم بر در و شہ در حرم سراخفت است

دلم بہ قسمتِ مرحوم سخت می لرزد — کہ رہزنان بہ کمین اند و رہنما خفت است

اشکے نہاں بگوشۂ چشمِ سیاہ کیست — شوخی زشرم عقدۂ نازِ نگاہ کیست

گر می کشد بہ عشوہ و گہ زندہ می کند — اعجاز آفریدۂ طرزِ نگاہ کیست

دامن کشیدنِ تو سزائے گناہ من — خندیدن و نگاہ نہ کردن گناہ کیست

آن قوم کہ عشقِ تو نوید ظفر اوست — فتحِ دو جہان یک ہوسِ مختصر اوست

آنکس کہ جمالِ تو بہشتِ نظر اوست — دل نیست گر حورِ بہشتی بہ بر اوست

بے روشنی دل نہ کشاید درِ عرفان — چشم و دلِ آگاہ نشیں رہگذر اوست

این شعبدۂ طرفہ ز دوران گردش چشم است — ہر دل بہ تماشا است کہ سوئیم نظر اوست

از طعنۂ واعظ ز طلب باز نہ گردم — زین گونہ بسے فتنہ بہر رہگذر اوست

ز تیرِ نیم کشِ ناز بسمل افتاد است — ہزار حسرت و یکدل چہ مشکل افتاد است

دلم بہ نرگسِ مستِ تو مائل افتاد است — ہزار میکدہ در گوشۂ دل افتاد است

نمک فروشِ بہ صبحِ چمن تبسم کیست — کہ خندہ بر لبِ گل نیم بسمل افتاد است

گداختند و صد شعلہ قطرۂ بچکید — کہ نامِ آن لبِ عاشقان دل افتاد است

زمانہ ایست کہ از بخت و چرخ نالہ کند — مگر ز کجروی خویش غافل افتاد است

نمیکنی بہ غلط ہم نگہ سوئے طاہر — بگو چہ شد چہ شنیدی چہ در دل افتاد است

در غمِ عشق او دلم از غمِ ماسوا گذشت — گشت دوائے دردِ دل درد کہ از دوا گذشت

دلق رہینِ میکدہ سر بسجود پائے خم — از لبِ جام بادہ پرس آنچہ بہ پارسا گذشت

من بہ کمالِ عشقِ خویش چون نہ زعقل بگذرم ـــ گر بکمالِ عشقِ خویش فلسفی از خدا گذشت

رفت شبابؔ ما ہنوز مست مئے شبانہ ایم ـــ بخت بہ راہ خفتہ ماند قافلہ بے درنگ گذشت

رمیدہ دل ز تو ابروے یار نزدیک است ـــ کمان کشیدہ بیا کہ این شکار نزدیک است

حیات عاشق دل خستہ گر وفا بکند ـــ وصال یار بعہد انتظار نزدیک است

بدیر و کعبہ مرو راہ گوشۂ دل گیر ـــ مقام دوست ازیں رہگذار نزدیک است

قرار عیش بہ فردا منہ چو وقت رسد ـــ بہوش باش غم روزگار نزدیک است

ندیم دوست اگر غیر شد چہ غم طاہرؔ ـــ مرنج گردش لیل و نہار نزدیک است

بہر صرف عمر عاشق یک رخ زیبا بس است ـــ گر بود مقصود قدر حسن یک شیدا بس است

حکمت و نفعِ مے و میخانہ از ساقی بپرس ـــ پیش مستان ناو نوش و شورش و غوغا بس است

روز و شب سرگرم کار خود دلِ دیوانہ ایست ـــ عشق از عقل است خالی این ہمہ افسانہ ایست

فلسفی عارف نہ گردد از طریق بحث و عقل ـــ در رہِ پُر پیچ عشقش عقل ہم دیوانہ ایست

عشقش پے شکستِ دلِ خود پرستِ ماست ـــ پنہاں ہزار فتح دریں یک شکست ماست

معشوق و شعر و طاعت حق برگزیدہ ایم ـــ ایں انتخاب طبع حقیقت پرست ماست

بہار عالم ہستی ز قامت یار است ـــ نہال خوش ثمرے آبروے گلزار است

فقیہ در طلب جاہ و محتسب مے نوش ـــ دریں زمان بکسے اعتماد بیکار است

نہ ہر مزاج بیک شیوہ و نہ ہر معشوق ـــ ہزار رنگ بہ یک شغل عشق درکار است

ز مژدہاے وصال تو خوشدلم لیکن ـــ بوعدہ تو و بخت خود اعتبارم نیست

کسے نہ کرد چو من جمع عشق و حکمت را ـــ ہزار حیف کہ مجنون بروزگارم نیست

غیر یک شاہد دگر منظور نیست ـــ شرک اندر عاشقی منظور نیست

سجدۂ پیش بتاں در شرعِ عشق واجب عینی است آن محذور نیست
اندکے صبر و تحمل بایدت یار خود آید بسویت دور نیست
صوفیِ ما کافرِ مومن نماست ہر اناالحق گوئی ہم منصور نیست

بہشتِ عشق وصال است و ہجر دوزخِ او میانِ ہجر و وصالش مقامِ اعراف است
زبد مذاقیِ زہاد عقدہا افتاد وگرنہ مسئلۂ عشق از ہمہ صاف است

فطرت اللہ اگر جلوۂ ایمانی نیست کفر را ہیچ تفاوت ز مسلمانی نیست
رخنہ ہائے عجبے در رہِ ملت افتاد کہ مسلمان ہمہ جمع اند مسلمانی نیست

باید عمل بحکم منان در سلوکِ عشق موقوفِ کار و مہر بہ حکم و ہدایتے است
ذکر پری و تذکرۂ حور پیش تو افسانہ مخالفِ عقل و درایتے است
عاشق کہ زندہ ماند شبِ ہجر کشتنی است بیداد دوست در حقِ او ہم رعایتے است

حسنت بہ ناز و عشوہ دلِ یک جہاں گرفت آوردہ حسنِ یوسف و حسن از جہاں گرفت
چوں دید چشم مست تو زاہد دمِ نماز سجادہ بر فگند و مے ارغواں گرفت
تا بوئے گل گراں نشود بر مشامِ تو ہر گل ز برگ پیشِ تو کف بر دہاں گرفت

ہر چہ خواہی ہست جز چیزے کہ در کار است نیست دوستی چیزے است در عالم کہ بسیار است نیست
گہ برد شوقم بسویش گہ کشد وہمم بہ پس طرفہ چشم نیم باز او کہ بیدار است نیست
چشم ظاہر بیں کجا و دیدۂ فطرت شناس نیست یک چیزے دریں عالم کہ اسرار است نیست
از علائق رستہ و وابستہ زلف نگار طاہر وحشت سرشت ما گرفتار است نیست

دارند شیخ و رند بوصفت بیاں صریح لیکن کسے نمی دہد از تو نشاں صریح
ہر دید دل خرامِ توانیسم گماں نبود میداشتم بہ دزد خیانت گماں صریح

جز من کسے نگشت خریدار جنس عشق، دارد زلب بکہ نقد نہان و زبان صرح

گو ز جلوۂ جوش بہاری خیزد، جنون ز گردش دامان یار می خیزد،

خدنگش بہ نازے کہ در دل نشیند ندز نہار لیلی بہ محمل نشیند،

خواستم سخت در آغوش کشم در شب وصل مگر افسوس کہ یار است چہ می باید کرد

جنون اے دل باندازنگاہ یاری باید، برائے شور و مستی ہم دل ہشیار می باید،

شدن با گلرخان ہم بزم واز قید خرد رستن نمی باید ولے در فصل گل یکبار می باید

ندارم اتفیاز بوسہ و دشنام سرستم، ہمی خواہم کہ ہاں می باید و بسیار می باید

نگار من بہر یک نیم نگہ صد نشتر اندازد زابرو ہر کجا شوخے است پیشش خنجر اندازد

ز نو ایجاد ہا ہر شب لطافت آفرین طبعش در آداب وصال و بوسہ طرح دیگر اندازد

گر آید در سلوک عشق عاقل ادیس شرط است ہر آن چیزے کہ دارد در سر خود از سر اندازد

زہے رندے کہ از ہشیاری مستی نماطاہر، بگیرد دامن ساقی و از کف ساغر اندازد

عاشق نبود کہ کافر و دیندار نباشد در مذہب او سبحہ و زنار نباشد

پابند علائق نبود خاطر آزاد، این مرغ بصد دام گرفتار نباشد

صد نالہ و صد گریہ و صد جذبہ بباید، رہ در دل معشوق بہ یکبار نباشد

آنکس کہ چو طاہر نبود بندۂ عشقش زنہار کہ از فرقۂ احرار نباشد

ہر چند گوشہ گیر چو عنقا شدم ز دہر اما اسیر کشمکش شہرتم ہنوز

طاہر کسے ز اہل وطن یاد ما نکرد شرمندۂ وطن نبود غربتم ہنوز

چو باد صبح گہ بر برگ گل گہ بر خار افتم جنون مست بہارم تا کجا خیزم کجا افتم،

خواہم کہ رسم کہنہ گیتی بر افگنم در مشرب جنون روشن دیگر افگنم

ہم عشق را بہ صیقل دانش دہم فروغ ہم عقل را بہ پاے جنوں سر در افگنم

در دیں ز وعظ بخرداں رخنہ ہا فتاد راز درون شرع سر منبر افگنم

زاہد بہ جستجوے در و من ز قرب عشق در خلد زیر سایۂ گل بستر افگنم

ترا با نامِ حق[1] کار است زاہد کار من با حق تو از اسلام می گوئی و من اسلام می خواہم

از اداے کم نگاہی مدعا فہمیدہ ام اشتعال انگیزی طرز حیا فہمیدہ ام

حسن ہم عشق است لیکن رنگ و نام دیگر است بجدت معنی ناز و ادا فہمیدہ ام

برہمن دارد بتے زاہد بدل صد بت نہاں ساۂ لوحی بیں کہ او را باخدا فہمیدہ ام

با غنای نفس نسبت نیست مال و جاہ را فقر را من سایۂ بال ہما فہمیدہ ام

در اول قدم سر و ساماں گذاشتیم صد شکر کار عشق بہ پایاں گذاشتیم

غیرت نداشت تاب فریب متاع جاہ جاگیر را بقبضۂ سلطاں گذاشتیم

انصاف از عدالت گیتی طمع مدار ما کار خود بہ صاحب دیواں گذاشتیم

طاہر ز بحث عقل پریشاں نیم فزود تحقیق ایں مقالہ بہ نسیاں گذاشتیم

در حضور و غیب دشوار است یکساں زیستن با تو نتواں بودن و ہم بے تو نتواں زیستن

شادی و غم در جہاں جز اعتبارے بیش نیست ہمچو گل باید بہ ہر یک فصل خنداں زیستن

جامۂ زہد ریائی چاک زن طاہر خوش است عارف حق بودن و بر وضع رنداں زیستن

خود مانہ پرستیدۂ عرفاں چہ شناسی کافر نشدی لذت ایماں چہ شناسی،

بیروں نہ نہادی قدمے از در خانہ آویزش خار سر داماں چہ شناسی

یک جرعہ ز سر چشمۂ فطرت نہ چشیدی گوہر شدن قطرۂ نیساں چہ شناسی

---

[1] نام حق نام کتابے ست در فقہ،

کلام اردو

کامل ہے اور اکمل سارا نظام تیرا ، فطرت ہے کام تیرا مصحف کلام تیرا ،

اعلیٰ ہے ذات تیری ارفع صفات تیرے فانی ہے سارا عالم باقی ہے نام تیرا ،

عارف سے رہے کیونکر انداز چھپا تیرا آئینۂ فطرت ہے خود جلوہ نما تیرا ،

پھولوں میں مہک تیری کانٹوں میں کھٹک تیری سب تجھ سے ہیں اور سب پہ جلوہ جدا تیرا

بغداد و دولت ہیں آشفتہ و سرگردان گم گشتہ دلوں میں کچھ لگتا ہے پتا تیرا ،

جس دل نے تجھے پایا سب کچھ ہی تو پھر پایا کونین سے مستغنی رہتا ہے گدا تیرا

بتخانہ میں ہندو بھی پڑھتا ہے کتھا تیری مسجد میں اگر مومن ہے حمد سرا تیرا ،

اک راز حقیقت ہے دنیا کی مصیبت بھی تسکین دلوں کی تو اور لب پہ گلا تیرا ،

طاہر کی دعا یہ ہے ہنگام اجل لب پر

بے ساختہ نام آئے اے یار خدا تیرا

جنکی قیمت نہ اپنے ضبط دل کی ان حسینوں میں کسی نے کچھ کہا اسکو کسی نے اور کچھ آنکا

یہ دشت عشق اور یہ حضرت دل دیکھئے کیا ہو کہ منزل ہے کڑی اور پڑ گیا ہے ساتھ نادانکا

تلاش دل نے شرمندہ کیا کیا اہل محفل سے

یہاں ڈھونڈھا وہاں ڈھونڈا ادھر تاکا ادھر جھانکا

عشق میں احساس خودداری بہت دشوار تھا آپ کے جور و تشدد سے وہ آساں ہو گیا

پایا تھا عشق نے دل مرحوم سے فروغ افسوس کیا چراغ محبت کا گل ہوا

تم نے کئے جو ظلم کسی نے خبر نہ لی ، میں نے کیا جو نالہ تو اک شور و غل ہوا

اُس شوخ سے بے سمجھے یوں دل نہ لگانا تھا چالوں پہ نظر رکھتے باتوں میں نہ آنا تھا

ہیں آج وہ بیگانہ کل تک میرے طالب تھے اک یہ بھی زمانہ ہے اک وہ بھی زمانہ تھا

آئینہ دیکھ کے دل تھام لیا کرتے ہیں — سیکھتے جاتے ہیں اب وہ بھی لگانا دل کا

عشق کی گرمی محفل دل مرحوم سے تھی — آپ کی جان سے دور آج بہت یاد آیا

خدا سمجھے دل بے خانماں کو — کسی کا راہبر رہزن کسی کا
تجھے اے سوزش الفت لگے آگ — جلیں ہم نام ہو روشن کسی کا
خرامِ ناز بھی کیا جانستاں ہے — کہ ہے ہر نقش پا مدفن کسی کا

اس سے کیا بحث کہ ہے جلوہ کسی کا کیسا — دیکھنا یہ ہے کہ ہے دیکھنے والا کیسا
سیر منظور ہے تو آئینہ لے کر دیکھو — تم تماشاے دو عالم ہو تماشا کیسا

جب نامۂ دلدار کو دیکھا اُسے دیکھا — تحریر دل آزار کو دیکھا اُسے دیکھا
عشاق میں آجاتے ہیں معشوق کے اوصاف — بیتاب دل زار کو دیکھا اسے دیکھا

خیال رُخ میں تار شمع ہر اک تار بستر تھا — ترا جلوہ فروغ طالع بیدار بستر تھا
زہے بخت مریض غم عیادت کو وہ آتے تھے — یہ سر رنجور بالش تھا یہ تن بیمار بستر تھا

میری چشم شوق ہی خود بن گئی میری رقیب — چھپ کے چلمن سے کسی کا جھانکنا جاتا رہا

نمک افشاں جو ذرا خندۂ قاتل ہوتا — بوسۂ تیغ لب زخم پہ بسمل ہوتا
جمع کرتا میری ویرانی کے ساماں جو فلک — ایک منجملۂ اسباب میرا دل ہوتا
تیری رفتار نہ کرتی جو قیامت برپا — دل وہ کافر ہے قیامت کا نہ قائل ہوتا
بے غرض پا کے وہ کرنے لگے خاطر طاہر — آرزو سے یہ کہاں مرتبہ حاصل ہوتا

جی بھر کے مزا دید کا حاصل نہیں ہوتا — افسوس کہ آنکھوں میں کوئی دل نہیں ہوتا
یہ معجزۂ حسن ہے یا زندہ کرامت — محبوب جہاں میں کوئی قاتل نہیں ہوتا

محشر وہم رفتار ترے در سے اٹھیگا — جو فتنہ اٹھے گا وہ اسی گھر سے اٹھیگا

تارے نظر آجائیں گے خورشید کو دن میں
پردہ جو ذرا بھی رخِ انور سے اٹھیگا

ترکِ مئے و صحبتِ زہاد
پارسائی میں ہیں عذاب بہت

کیا بھیڑ لگی ہے سرِ بازارِ محبت
ایک ایک پہ گرتا ہے خریدارِ محبت

مر کر بھی تو جاتا نہیں آزارِ محبت
مر مر کے جیا کرتے ہیں بیمارِ محبت

معلوم ہو گر لذتِ آزارِ محبت
خود بیچدے اپنے کو خریدارِ محبت

معشوق زباں سے تو کبھی ہاں نہیں کرتے
ہاں آنکھوں میں ہو جاتے ہیں اقرارِ محبت

چلتا ہے بات بات پہ واں نسخۂ جفا
ہے ورنہ ہر مرض کا جہاں میں صد علاج

لازم ہے صبر عشق میں طاہر دہ ہی نہیں
پرہیز اس مرض میں ہے سب سے بڑا علاج

مانگے جو دلِ فگار تعویذ
ہوں داغِ جگر ہزار تعویذ

بازو میں جو موجِ قلزمِ حسن
ہیں گوہرِ شاہوار تعویذ

بوٹا سا وہ قد ہے شاخِ برگل
اور غنچۂ نوبہار تعویذ

ہوا یہ حالِ دل فرقت کے صدمے اب تو سہہ سہہ کر
کھٹک ہوتی ہے تھم تھم کر کسک ہوتی ہے رہ رہ کر

کہوں کیا حالِ فرقت آنسوؤں کے بدلے نکلا ہے
کلیجہ ٹکڑے ہو ہو کر لہو آنکھوں سے بہہ بہہ کر

ہم اس انداز سے بیتاب ہو کر وصل میں بیٹھے
چھپا جاتا تھا خود با دل میں غضب کو جاگ جاگ کر

ساقی کے جلوہ کی ہیں یہ سب عشوہ سازیاں
نغمہ ہے کوئی نے میں نہ مستی شراب میں

ہستی ہے میری دو عدموں سے گھری ہوئی
میں خود ہوں ایک خواب میانِ دو خواب میں

واعظ کے دل کو ذوقِ محبت سے مس نہیں
گویا وہ ایک مردہ مگس ہے کتاب میں

آہ کرنا دلِ حزیں نہ کہیں
دم پہ بن جائیگی کہیں نہ کہیں

کھولنا روئے آتشیں نہ کہیں
آگ بھڑکیگی یہ کہیں نہ کہیں

لے ہی آئے گا جذبۂ الفت
ل ہی جاؤ گے تم کہیں نہ کہیں،

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا سوئے ماہ
میلی ہو چاند سی جبیں نہ کہیں

خوف ہو مانع تو پھر تم کیا کرو
دل نہ ہو بس میں تو پھر ہم کیا کریں

تجھ میں ہے اے نگہ ہوش ربا کیا کیا کچھ
غمزہ و شوخی و انداز و ادا کیا کیا کچھ،

عہد میں تیرے وفا پر ہے ہوس کو ترجیح
تھی کبھی قابلِ تعریف وفا کیا کیا کچھ،

غصہ و چشم نمائی و حیا لطف و کرم
کر گئے نیم نگہ میں وہ ادا کیا کیا کچھ،

بے ریائی سے ہوا اپنے میں رسوا زاہد
ورنہ حضرت نے بھی چھپ چھپکے کیا کیا کیا کچھ،

چلتے پھرتے گالیاں بے ادا اٹھتے بیٹھتے
اک نہ اک رہتی ہے وان ایجاد اٹھتے بیٹھتے،

معجزے قدرت کے ہیں یہ گلرخانِ دہر بھی
گل ہیں ہنستے بولتے شمشاد اٹھتے بیٹھتے

ہجر میں باعثِ تسکیں تو ہو اے جاں کوئی
ظلم بھی ہو تو اسے مان لے احسان کوئی

نظر آتا نہیں دل بچنے کا ساماں کوئی
خالی جاتا ہی نہیں ناوکِ مژگاں کوئی

کر دیا رندی کی شوخی نے حیا کو بے باک
رکھئے اب اپنے نگہباں کا نگہباں کوئی

ہیں جنوں میں بھی تو دلچسپی کے ساماں بہت
پا بزنجیر کوئی چاک گریباں کوئی

اے اجل ایک نظر دیکھ تو لینے دے مجھے
بال کھولے ہوئے آتا ہے پریشاں کوئی

ہے حسینوں ہی سے اس بزم جہاں کو رونق
گل گلزار کوئی شمعِ شبستاں کوئی

آپ طاہر سے جو واقف نہ ہوں میں بتلا دوں
پچھلی راتوں کو نکلتا ہے غزلخواں کوئی

خزاں کی یاد دلاتی ہے یہ بہار مجھے
ہوائے عیش بھی ہے اب تو ناگوار مجھے

اگر یہی ہے تلون تو شامِ وصل میں بھی
رہے گی کشمکشِ یاس و انتظار مجھے

ہوئے ہیں ضعف سے اجزائے جسم سب تحلیل ہر ایک ذرہ ہے اب مثل غبار مجھے

فضائے باغ ہے سب تذرِ دامن گلچیں خزاں سے کم نہیں یہ موسم بہار مجھے

جور بتاں کی کچھ تو مکافات چاہئے ان کافروں سے ترک موالات چاہئے

نیرنگی صفات ہے اک جلوۂ سراب عاشق ہمیشہ مست مئے ذات چاہئے

ماناکہ شیخ آپ ہیں مستجمع صفات للّہیت بھی قبلۂ حاجات چاہئے

ہائے کیا چیز چاہ ہوتی ہے ہر جگہ ایک آہ ہوتی ہے

شوخیوں سے ہے اضطراب عیاں دل کو خود دل سے راہ ہوتی ہے

مذہب عشق میں ہے ترک خودی آرزو بھی گناہ ہوتی ہے

پائمال نگاہ ناز ہے دل کیسی بستی تباہ ہوتی ہے

ہر قدم پر رہ محبت میں عقل ہی سنگ راہ ہوتی ہے

جلوہ افروزی جہان وجود اک فریب نگاہ ہوتی ہے

عشق میں بھی کبھی ہوس مگر سبب اشتباہ ہوتی ہے

جس سے کھلتے ہیں راز ہائے خفی وہ تو صرف اک نگاہ ہوتی ہے

جلوۂ رخ سے یہ دل ایسا پریخانہ بنے ہر جگہ رونق محفل میرا افسانہ بنے

بزم افروز اگر جلوۂ جانانہ بنے شعلہ اڑ اڑ کے ہر اک شمع سے پروانہ بنے

اثر انداز اگر نرگس مستانہ بنے ایک گھر بھی نہ ہوا ایسا جو مے خانہ بنے

وہ ہی کامل ہے جو سالک بھی ہو مجذوب بھی کہیں فرزانہ بنے اور کہیں دیوانہ بنے

دل بڑا اور قبضہ بتوں کا ہو خدا کی قدرت اے تری شان کہ یوں کعبہ صنم خانہ بنے

مے پرستی ہے ازل سے دل نازک کی سرشت یہ وہ شیشہ ہے جو ٹوٹے بھی تو پیمانہ بنے

تلخیص و تبصرہ

جسم انسانی کے اندر خارجی اشیا کی نقل و حرکت

اس موضوع پر ڈاکٹر فریڈریک ڈیمرا (F. Damrau) کا ایک دلچسپ مضمون رسالہ پاپولر سائنس بابت مئی ۳۲ء میں شائع ہوا ہے، جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے، کہ انسانی جسم کے اندر انواع و اقسام کی خارجی چیزیں کس آسانی کیساتھ نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں، نیز جدید فن جراحی کی بھی داد دینی پڑتی ہے، جو ان اشیاء کو برآمد کرنے میں کمال دکھا رہا ہے مضمون کا ملخص ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے،:-

چندسال ہوئے ایک مزدور کے انگوٹھے میں لکڑی کی ایک پھانس چبھ گئی، وہ جہاز کے ایک بڑے کارخانہ میں کام کرتا تھا، اور چونکہ اس قسم کے واقعات اُسے اکثر پیش آتے رہتے تھے اسلئے پھانس کو نکالنے کے لئے وہ اپنی واسکٹ کی جیب میں ایک چھوٹی سی سوئی رکھا کرتا تھا، چنانچہ اس مرتبہ بھی انگوٹھے سے پھانس کو نکالنے کے بعد اسنے سوئی جیب میں رکھ لی، وہ اسوقت جھکا ہوا تھا، اور اسے اپنے سینہ میں کوئی چیز تیزی کیساتھ چبھتی ہوئی محسوس ہوئی، اوس روز رات کو اس نے دیکھا کہ سوئی اسکی جیب سے غائب ہے، اور جلد پر ایک شوخ سُرخ دھبہ ہے، اکسرے سے معائنہ کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ سوئی سینہ کے عضلات کے اندر سے ہوتی ہوئی اس شخص کے قلب کی طرف جارہی ہے، قبل اس کے کہ وہ نکالی جا سکے اسکی نوک قلب کے بائیں خانہ میں داخل ہو چکی تھی، ڈاکٹروں نے آپریشن کر کے سوئی کو نکالنے کی کوشش کی، مگر وہ ہاتھ نہ آئی، آپریشن کے بعد مریض کو افاقہ ہو گیا، اگرچہ اکسرے سے دیکھا گیا، کہ سوئی اب قلب کے دوسرے پہلو سے نکل رہی ہے، ہفتہ میں اپنچ کے ایک قلیل حصہ کی رفتار سے حرکت

کرتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ پشت کی طرف بڑھی، اور آخر کار، ریڑھ کے قریب آکر رک گئی، وہاں سے آسانی کے ساتھ نکال لی گئی، وہ مزدور آج بھی زندہ ہے، حالانکہ لوہے کی سوئی اس کے سینہ اور قلب کے آرپار گذر گئی تھی،

یہ صرف ایک واقعہ ہے منجملہ بہتیرے اس قسم کے عجیب وغریب واقعات کے جو ڈاکٹروں کے تجربوں میں آچکے ہیں، ابھی چند روز کی بات ہے، کہ اسی طرح کا ایک واقعہ خود میرے مشاہدے میں آیا، بعض حیثیتوں سے یہ تمام دوسرے واقعات سے زیادہ عجیب وغریب ہے، کئی سال ہوئے ایک طبیب کی بچی کے پاس کھلونے کا ایک گھوڑا تھا جسکی ایال اصلی گھوڑوں کے بالوں کی تھی، جیسا بچوں کا قاعدہ ہے، وہ لڑکی کبھی کبھی کوئی بال توڑ کر چبایا کرتی تھی، ایک مرتبہ چباتے چباتے وہ اتفاق سے ایک بال نگل گئی، اس واقعہ پر تقریباً ۱۲ سال گذر گئے، جب وہ سترہ سال کی ہوئی تو ایک روز اسے اپنے پیر کے ایک انگوٹھے میں کچھ خارش محسوس ہوئی، اور جلد کے نیچے پھانس کی سی کوئی چیز نظر آئی، ایک سوئی لیکر اس نے اُسے نکالنا چاہا، اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی، کہ جس چیز کو وہ پھانس سمجھ رہی تھی وہ گھوڑے کی ایال کا ایک لمبا بال تھا، جو بغیر کسی درد یا خون کے آسانی کے ساتھ نکلا ہوا چلا آرہا تھا، تقریباً بارہ سال تک یہ بال اس کے جسم کے اندر ادھر ادھر پھرتا رہا، اور بالآخر پیر کے انگوٹھے میں جاکر ٹھہر گیا تھا،

خارجی اشیاء کا گوشت کے اندر داخل ہوکر یوں ادھر ادھر پھرتے رہنا کیونکر ممکن ہے،؟ وہ کیونکر جسم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک حرکت کرتی ہیں، انھیں کیا چیز حرکت میں لاتی ہے،؟ اس قسم کے سینکڑوں سوالات ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں،

عموماً ان چیزوں کی نقل وحرکت قدرتی راستوں سے ہوتی ہے، یعنی معدہ، رگیں اور شرائین، اور وہ راستے جن سے ہوکر ہوا پھیپھڑوں تک جاتی ہے، یہ چیزیں دوران خون کے راستوں میں بہت زیادہ تیزی سے حرکت کرتی ہیں، کیونکہ خون صرف نصف منٹ کی مدت میں پورے جسم کے اندر گردش کر لیتا ہے، جسم کے ٹھوس حصوں کے اندر سے گذرنے میں خارجی اشیا بالعموم عضلات اور اعصاب کی تہوں کے درمیان سے گذر جاتی ہیں، عضلات کا سکوڑ اور پھیلاؤ، قلب کی حرکت اور وہ حرکتیں جو سانس لینے اور ہاضمہ سے پیدا ہوتی ہیں، ان چیزوں کو ادھر ادھر پھراتی

رہتی ہیں لیکن اکثر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی، کہ یہ چیزیں اپنی نقل و حرکت میں بعض خاص طریقے کیوں اختیار کرتی ہیں،
مثلاً ایک درزن کپڑا سیتے وقت منہ میں متعدد سوئیاں لئے ہوئے تھی، اسی حالت میں اسے چھینک آئی، اور ایک
سوئی حلق کے نیچے چلی گئی، دس روز گذرنے کے بعد سینہ کی ہڈی کے تقریباً تین انچ نیچے جلد کے اندر سے سوئی ناک کے
کی طرف سے نمودار ہوئی، اس سوال کا جواب کوئی نہیں دے سکا، کہ سوئی ناک کی طرف سے کیوں باہر آئی،
مجھے ایک دوسرا واقعہ بھی یاد ہے، جس میں ایک سوئی حلق کے نیچے پہونچنے کے بعد ٹوٹ کر تین ٹکڑے ہوگئی
تھی، اور ہر ٹکڑا جسم کے مختلف حصوں سے نمودار ہوا، سوئی کے حلق کے اندر جانے کے ایک مہینہ بعد اس کا
پہلا ٹکڑا ڈاکٹروں نے آپریشن کرکے پیٹ سے نکالا، پھر چھ ہفتے بعد دوسرا ٹکڑا پیٹ کے بائیں جانب جلد
کے اندر سے خود بخود باہر آیا، اور اس کے تین ہفتہ بعد بقیہ ٹکڑا جو سوئی کی نوک کا حصہ تھا، سینہ کی ہڈی کے
نیچے ظاہر ہوا، سوال یہ ہے کہ وہ ٹکڑا جو سب سے زیادہ تیز تھا، سب سے زیادہ دیر میں جلد کی سطح تک
کیوں پہونچا،؟

اسی قدر حیرت انگیز اور واقعات بھی ہیں، کسی دھات کا ایک ٹکڑا ایک شخص کے گھٹنے کے قریب جسم کے
اندر داخل ہوگیا، اور سینہ کی جلد سے برآمد ہوا، دوسرا ٹکڑا حلق کے نیچے غائب ہوا، اور بائیں کان کی پشت پر نمودار
ہوا، تیسرا منہ کے ذریعہ سے جسم میں داخل ہوا، اور پنڈلی کے پاس سے باہر نکلا،

تھوڑے دن ہوئے ڈاکٹر وارتھن (W. J. Warthen) نے کتوں پر اس قسم کے تجربات
کئے تھے، کتوں کی رگوں میں دھات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے داخل کرکے وہ اکسرے کے ذریعہ سے دیکھتے
تھے، کہ ان میں سے ہر ٹکڑا کہاں کہاں جاتا ہے، انھوں نے دیکھا کہ تمام ٹکڑے کتوں کے قلب تک پہنچ
جاتے تھے،

انسانی جسم میں بندوق کی گولی بھی کبھی کبھی یوں ہی قلب تک پہنچ جاتی ہے، چند سال ہوئے کیلی
فورنیا میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا، دو لڑکے خرگوش کا شکار کھیل رہے تھے، ان میں سے ایک کی بندوق

بلا ارادہ چھوٹ گئی، اور گولی دوسرے لڑکے کی ران میں جا کر لگی، ہسپتال میں ڈاکٹروں نے ایکسرے سے ران کا معائنہ کیا، لیکن گولی کا کوئی نشان معلوم نہ ہوا، اس کے کچھ دنوں بعد لڑکے نے قلب میں درد کی شکایت کی، پھر ایکسرے کا معائنہ ہوا، تو معلوم ہوا کہ گولی خون کی نالیوں سے ہو کر قلب میں پہنچ گئی ہے، اسے وہاں سے نکالنے کے لئے ایک نہایت نازک اور خطرناک آپریشن ناگزیر تھا، جو بالآخر کامیابی کیساتھ ختم ہوا،

گذشتہ سال آسٹریلیا کا ایک لڑکا نو ہزار میل کا سفر کرکے ڈاکٹر جیکسن (C. Jackson) کے پاس فلاڈلفیا پہونچا، ڈاکٹر موصوف پھیپھڑوں سے خارجی اشیاء کو نکالنے کے لئے خاص شہرت رکھتے ہیں، اس لڑکے کے پھیپھڑے میں ایک چھوٹی سی کیل پہونچ گئی تھی، ڈاکٹر جیکسن نے سات منٹ کے اندر اس کیل کو پھیپھڑے سے نکال دیا، اور اس آپریشن میں یہ کمال دکھایا کہ ایک قطرہ خون بھی نکلنے نہ پایا،

ڈاکٹر جیکسن کا یہ کمال تیس سال کے متواتر تجربوں کے بعد حاصل ہوا ہے، انھوں نے اس سلسلہ میں ہزاروں آلات ایجاد کر ڈالے، تب کہیں جا کر وہ آلات تیار ہوئے جن کی مدد سے مذکورۂ بالا آپریشن کیا گیا، ان کا ایجاد کردہ برانکوسکوپ (Bronchoscope) جو اب دنیا کے ہر حصہ میں استعمال کیا جاتا ہے، ایک نلکی کی طرح ہے، جس کے سرے پر ایک چھوٹا سا برقی قمقمہ لگا ہوا ہے، یہ نلکی مریض کی حلق کے اندر ڈال دی جاتی ہے، اور پھر اس نلکی کے اندر سے لمبے اور نازک آلات جسم میں داخل کئے جاتے ہیں، جن کی مدد سے باریک سے باریک چیز بھی باہر نکالی جا سکتی ہے، وہ آلات اتنے نازک ہوتے ہیں، کہ سیفٹی پن (Safety pin.) کو بند کر سکتے ہیں، کسی دھات کے ٹکڑے کو کاٹ سکتے ہیں، موچنے کی طرح پکڑ سکتے ہیں، اور چمچہ کی طرح کسی چیز کو اٹھا سکتے ہیں،

ایکمرتبہ ڈاکٹر جیکسن نے ڈھائی منٹ کے اندر ایک پن جو شال میں لگائی جاتی ہے ایک عورت کے پھیپھڑے سے نکالی جہاں وہ بائیس سال سے پڑی ہوئی تھی، اسی طرح ایک دوسرے مریض کے پھیپھڑے سے تقریباً سات منٹ میں انھوں نے ایک پیچدار کیل نکالی تھی، جو تقریباً چالیس سال سے مستقل طور پر پھیپھڑے میں رکی ہوئی تھی، فلاڈلفیا کے ایک عجائب خانہ میں وہ تمام عجیب و غریب چیزیں رکھی ہوئی ہیں جنھیں ڈاکٹر جیکسن نے اپنے

مریضون کے جسموں سے نکالا ہے، اس ذخیرہ میں مندرجۂ ذیل چیزین شامل ہین، جوتے کے بٹن، زنجیر کی کڑیان، کارتوس کی ٹوپیاں، پنسل کی ٹوپیان، پیسے، تمغے، کیلیں، مچھلی پھنسانے کے کانٹے، بالوں میں لگانے کی پنیں اور مصنوعی دانت، چند سال ہوئے ڈاکٹر موصوف نے ایک پانچ برس کے بچے کی حلق سے پانچ کھلی ہوئی سیفٹی پنیں نکالی تھیں، جو ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں، لیکن ہر ایک کی نوک مختلف سمتوں میں تھی، اپنے کام کے سلسلہ میں انھیں سینکڑوں کھلی ہوئی سیفٹی پنیں بچوں کے پھیپھڑوں سے نکالنے کا اتفاق ہوا ہے،

چند روز ہوئے کناڈا میں اکسرے کے معائنہ سے ایک ایسا حیرت انگیز انکشاف ہوا جسکی مثال غالباً آج تک نہیں پائی گئی، ایک عورت کو مختلف دھاتوں کی چھوٹی چھوٹی چیزین نگلنے کی عادت تھی، ہسپتال میں اکسرے سے اسکے پیٹ کا معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس میں انواع و اقسام کی (۲۵۳۲) چیزیں جمع ہیں، مثلاً بٹن، پنین، سوئیان، کیلیں، پیسے وغیرہ وغیرہ، تقریباً ایک سال سے یہ تمام چیزیں جمع ہیں، معدہ میں پڑی ہوئی تھیں، اور حیرت یہ ہے، کہ عورت کو ان سے بظاہر کوئی خاص تکلیف نہ تھی،

اس سلسلہ میں اطبا یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ اس قسم کی بعض چیزیں جو ایک شخص کے جسم میں پہونچ کر مہلک ثابت ہوتی ہیں، دوسرے شخص کے جسم میں کیون بغیر کسی مضرت کے پڑی رہتی ہیں، مثلاً حال میں تیس سال کی عمر کے ایک قیدی کے متعلق یہ اطلاع موصول ہوئی ہے، کہ وہ صبح کا ناشتہ کیلوں سے کرتا ہے، اور دن کے وقت بجائے معمولی غذا کے کارتوس کھاتا ہے، اس نے بیان کیا ہے، کہ میں سات برس کی عمر سے مختلف دھات اور شیشہ کے ٹکڑے نگلنے کا عادی ہوں، اور لوگوں کے سامنے میں نے تولیں اور برقی قمقمے کھا ڈالے ہیں، لیکن مجھے ان کی وجہ سے کبھی کسی درد کی شکایت نہیں ہوئی، ڈاکٹروں نے اسکے بیان کو غلط سمجھ کر اسکے معدہ اور آنتوں کا معائنہ اکسرے سے کیا، تو معلوم ہوا کہ درحقیقت کیلیں اور کارتوس اندر موجود ہیں، یہ چیزیں دوسرے شخص کے لئے ہلاکت کا باعث ہوتیں لیکن غالباً اس کے جسم میں کوئی خاص بات تھی، جسکی وجہ سے اس پر کوئی مضر اثر نہیں پڑتا تھا،

اسی طرح بعض آدمی موچی کے سوجے، ڈبہ کھولنے کے اوزار، اور دھاگے کی گولیاں نگل گئے تھے، اور یہ سب چیزیں یا تو آپریشن کرکے نکالی گئیں، یا خود بخود فطری طور پر جسم سے خارج ہوگئیں، ایک مرتبہ ایک بچہ ریشم کے دھاگے کی ایک چھوٹی سی گولی جس میں ایک سوئی بھی تھی، گھونٹ گیا تھا، گولی تو جسم سے فطری طریقہ سے خارج ہوگئی، لیکن سوئی معدہ میں رک گئی، اور اکسرے سے دیکھنے کے بعد آپریشن کرکے نکالی گئی،

لیکن یہ ضروری نہیں ہے، کہ تمام چیزیں جو جسم کے اندر ادھر ادھر پھرتی رہتی ہیں، اکسرے سے نظر آجائیں، دھات کی چیزوں کے علاوہ بہتیری دوسری چیزیں بھی جسم میں داخل ہوجاتی ہیں، اور ان میں سے بعض مہینوں اور سالوں اندر نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں، اور اکسرے سے بھی معلوم نہیں ہوتیں، چنانچہ حال میں اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، چند لڑکے گھاس کی بالوں سے اس طرح کھیل رہے تھے، کہ ان میں سے ایک منہ کھول کر سامنے کھڑا ہو جاتا، اور دوسرے بالوں سے اس کے منہ کے اندر نشانہ لگاتے، اتفاق سے ایک بال ایک چار سال کے بچہ کے منہ میں پڑ گئی اور وہ بے اختیاری میں اُسے نگل گیا، لیکن وہ بال "غلط راستے سے اندر پہونچی"، اور اس کے پھیپھڑوں میں داخل ہوگئی، کچھ دیر کے بعد اُس بچہ کو شدید کھانسی شروع ہوئی، بخار بہت تیز آگیا، اور اس کی حالت تشویشناک ہوگئی، اس کے سینہ پر ایک جانب آماس اور سرخی نمودار ہوئی اور یہ دونوں چیزیں بڑھنے لگیں، تین ہفتے کے بعد وہ آماس خود بخود پھوٹا، اور اس میں سے گھاس کی ایک بال جو پورے پونے دو انچ لمبی تھی، باہر نکلی، یہ پھیپھڑے کی نلی کے راستہ سے اندر چلی گئی تھی، اور پھیپھڑے کے بیچ سے ہوتی ہوئی سینہ کی سطح تک پہونچی تھی، اس کے نکل جانے کے بعد بچہ کو صحت ہونے لگی، اور چند دنوں میں اصلی قوت پھر آگئی،

مندرجۂ بالا واقعات ایک عامی کی نظر میں الف لیلہ کے قصے معلوم ہوں گے، لیکن ایک طبیب کے لئے یہ واقعات تحقیق کا ایک پر اسرار میدان پیش کرتے ہیں،

"ع ز"

توسیع حیات کا امکان

امریکہ کے ایک نہایت مشہور سائنسدان ڈاکٹر شرمن (H. C. Sherman.) نے سالون کے تجربہ کے بعد یہ دعوی کیا ہے، کہ بعض مخصوص غذاؤں کے استعمال سے انسان زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے، یہ تجربہ دراصل خود انسانوں پر نہیں کیا گیا ہے، بلکہ چوہوں پر کیا گیا ہے، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ چوہوں اور انسانوں کا نظام تغذیہ بہت کچھ ملتا جلتا ہے، اور اس تجربہ کے جو نتائج چوہوں سے متعلق حاصل ہوئے ہیں وہی انسانوں پر بھی صادق آئیں گے، یہ خیال حقیقۃً کہاں تک صحیح ہے، اس کا فیصلہ مستقبل خود کردے گا فی الحال مضمون کی دلچسپی کا تقاضا یہ ہے، کہ اسکا خلاصہ ناظرین معارف کی ضیافت طبع کے لئے پیش کردیا جائے،

سنہ ۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر شرمن نے اپنے معمل میں تجربہ کے طور پر چوہوں کے ایک خاندان کو سفید نمک دودھ کا سفوف اور سرخ گیہوں کھلانا شروع کیا، اسوقت اس خاندان کی اولاد ترقی کرکے تقریباً (۹۰۰۰) کی تعداد تک پہنچ گئی ہے، اور گذشتہ اپریل میں ڈاکٹر شرمن نے امریکہ کی اکاڈمی آف میڈیسن (ACADEMY OF MEDICINE) کے سامنے یہ اعلان کیا ہے، کہ اگر انسان اپنی غذا کے انتخاب میں دانائی برتے تو اس کی مدت حیات میں دس فی صدی کی توسیع ہو سکتی ہے، جیسا کہ چوہوں پر تجربہ کرنے سے ثابت ہوا ہے یعنی انسان بجائے ستر برس زندہ رہنے کے ستتر برس تک پہونچنے کی توقع کر سکتا ہے،

توسیع حیات کے لئے ڈاکٹر موصوف نے جو اصول قائم کیا ہے، وہ بہت آسان ہے، اپنی غذا میں دودھ، ترکاریوں اور پھلوں کا تناسب زیادہ کر دیجئے، ان کے علاوہ غلہ کی چیزیں بھی کسی قدر ہوں، لیکن غذا باریک پسا ہوا نہ ہو، گوشت اور مٹھائیوں کی بھی ممانعت نہیں ہے، بشرطیکہ دودھ، ترکاریوں اور پھل کی مقدار کافی ہو، چوہوں پر سالون کے تجربہ کے بعد معلوم ہوا، کہ انکی غذا میں دودھ کے تناسب کا اضافہ کرنے سے ان کی مدت حیات میں بھی اضافہ ہو گیا، چونکہ چوہوں کا نظام تغذیہ انسان کے نظام تغذیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے اسلئے

یہی توقع انسان کی زندگی سے متعلق بھی کیا سکتی ہے، اور اہل سائنس کو اس نظریہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے

ایک چوہے پر غذا کا تجربہ تین سالوں میں مکمل ہوتا ہے، اسکی مدت حیات اوسطاً انسانی زندگی کا تیسواں

حصہ ہوتی ہے، اس اعتبار سے تین سال کی عمر کا چوہا تقریباً ویسا ہی کمیاب ہے، جیسا نوے سال کی عمر کا انسان

ڈاکٹر شرمن نے دو ہزار چوہوں پر ان کی پیدائش سے لیکر موت تک تجربہ کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ

مخصوص غذا کے استعمال سے انسان کی عمر میں بھی سات سال کا اضافہ ہو سکتا ہے، ان کا بیان ہے :-

"عام طور پر غذا میں دودھ کا تناسب بڑھا دینے سے زندگی کی مدت بڑھ جانی چاہئے، اکثر ممالک میں جنہیں

ہمارا ملک بھی شامل ہے، غلہ لوگوں کی غذا کا سب سے بڑا جزو ہے، اگر غلہ کی ایک معتدل مقدار کھائی جائے لیکن

اس طرح کہ غلہ باریک پسا ہوا نہ ہو، بلکہ برائے نام پسا ہوا ہو، تو اس سے عموماً فاسفورس، لوہے، تانبے، مینگنیز

اور وٹامن بی اور اسی کی ایک بڑی مقدار جسم میں پہونچے گی، لیکن اگر غذا میں دودھ پھل، ترکاریوں، اور انڈوں کا

تناسب زیادہ کر دیا جائے، تو جسم میں کالسیم، اور وٹامن، اے، سی، اور جی کی مقدار بڑھے گی، اور یہ اجزا زیادہ

اہم ہیں"، ل ڈ "ع ز"

لغات جدیدہ کا نیا اڈیشن

لغات جدیدہ پہلے پہل ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، اور ملک کے عربی خوان حلقہ میں بہت مقبول ہوئی، یہ اسکا

تیسرا اڈیشن ہے، جس میں جنگ عظیم کے بعد سے اب تک جو سیکڑوں، ہزاروں نئے الفاظ، اور اصطلاحات

عربی زبان میں پیدا ہو گئے ہیں، وہ سب جمع کر دیے گئے ہیں، اور اس طرح سے یہ موجودہ عہد تک کے تمام

جدید عربی الفاظ کی ایک مکمل ڈکشنری بن گئی ہے، شروع میں عربی کے جدید الفاظ و تراکیب کے عنوان سے

ایک مقالہ بھی ہے، جسکو مولوی مسعود عالم صاحب ندوی مدیر الضیاء نے مرتب کیا ہے، جدید اڈیشن کی تیاری میں

موصوف کی کوششوں کا بڑا دخل ہے، حجم ۳۰۰ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

آب ثقیل کی خصوصیت

ایڈنبرا یونیورسٹی (اسکاٹ لینڈ) کے ڈاکٹر جمیس کنڈال (G. E. Kendall) نے اعلان کیا ہے کہ آب ثقیل کے استعمال سے انسانی زندگی میں دس سال کا اضافہ ہو سکتا ہے، "آب ثقیل" کی دریافت کو صرف چھ سال گذرے ہیں، کیمیاوی تجزیہ سے معلوم ہوا ہے، کہ معمولی پانی کے چھ ہزار حصوں میں ایک حصہ "آب ثقیل" کا ہوتا ہے، جو دیکھنے میں معمولی ہی پانی کا سا معلوم ہوتا ہے، لیکن اور باتوں میں معمولی پانی سے مختلف ہوتا ہے، آب ثقیل کے دس گلاس معمولی پانی کے گیارہ گلاسوں سے وزن میں زیادہ ہوتے ہیں، معمولی پانی کی بہ نسبت آب ثقیل میں تین درجہ زاید ٹمپریچر پر ابال آتا ہے، اور سات درجہ زائد ٹمپریچر پر وہ منجمد ہوتا ہے، معمولی پانی میں کوئی ذائقہ نہیں ہوتا، آب ثقیل میں ایک خفیف شیرینی ہوتی ہے،

آب ثقیل کی دریافت کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ آب حیات ثابت ہوگا، یا زہر ہلاہل، یا ویسا ہی جیسا معمولی پانی، بعض تجربہ کرنے والوں نے اسکی قلیل مقدار پی، لیکن انھیں کوئی مضرت نہیں پہونچی، لیکن چوہوں کو جب اسکی مقدار نسبتہً زیادہ دی گئی، تو وہ مرگئے، اسی طرح جب مینڈکوں اور چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو آب ثقیل میں ڈالا گیا، تو وہ مرگئیں، ابھی تک متعین طور پر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ چیزیں "آب ثقیل" سے مرکیوں گئیں، لیکن ماہرین کیمیا کی سمجھ میں ایک اہم اشارہ آگیا ہے، انھوں نے دوران تجربہ میں دیکھا ہے کہ بہت سے کیمیاوی ردعمل "آب ثقیل" میں بہ نسبت معمولی پانی کے زیادہ آہستہ آہستہ واقع ہوتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آب ثقیل رفتار حیات

میں سستی پیدا کر دیتا ہے، یہی چیز ڈاکٹر کنڈال کے نظریہ کی بنیاد ہے، ان کا خیال ہے، کہ اگر آبِ ثقیل کی مناسب مقدار اختیاط کیساتھ استعمال کیجائے تو بہت ممکن ہے کہ جسم انسانی کی مشین کی رفتار کم ہوجائے، اور انسان زیادہ دنون تک زندہ رہ سکے، اس مشین کی رفتار کی سستی دماغ پر بھی اثر ڈالے گی، اور جوان عمر لوگ اپنی قوتِ عمل میں کمزوری محسوس کرین گے لیکن بوڑھوں کے لئے جو زندگی کی کشمکش سے علحدہ ہوکر اپنی بقیہ مدتِ حیات سکون کے ساتھ بسر کرنا چاہتے ہیں، آبِ ثقیل کا یہ اثر یقیناً مفید ثابت ہوگا، ڈاکٹر موصوف کو امید ہے کہ دس پندرہ برس میں آبِ ثقیل کا استعمال بوڑھوں میں عام ہوجائے گا، اسوقت سب سے بڑی دقت اسکے استعمال میں یہ ہے، کہ یہ ایک نہایت قیمتی چیز ہے، پہلے ایک چمچہ آبِ ثقیل کی قیمت تین سو ڈالر تھی، اور آج بھی تیس سو ڈالر میں صرف دو گلاس پانی خریدا جا سکتا ہے، موجودہ نرخ سے اگر سال بھر کے استعمال کے لئے کوئی شخص اسے خریدنا چاہے، تو ایک کروڑ پتی بھی دیوالیہ ہوجائے گا، اسکے اس درجہ گران قیمت ہونے کی وجہ یہ ہے، کہ مخصوص کیمیاوی طریقہ سے اسکے نکالنے میں مصارف بہت ہوتے ہیں، لیکن ڈاکٹر کنڈال کا خیال ہے کہ چند سالوں میں یہ مشکل بھی حل ہوجائے گی، اور قدیم کیمیاگروں کا "آبِ حیات" سستے داموں بکنے لگے گا،

امریکہ میں نیم پڑھے لکھوں کی تعداد

حال میں ولیم اسمتھ (W. Smith) صدر محکمۂ تعلیم بالغان نیویارک اسٹیٹ کے ایک بیان سے امریکہ کے اکثر باشندوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان کا ملک پڑھے لکھوں کے تناسب کے لحاظ سے دنیا کے ہر ملک سے بڑھا ہوا نہیں ہے، مثلاً فنلینڈ (Finland) کے ہر اس شخص کے مقابلہ میں جو اپنی زبان میں لکھ نہیں سکتا، چھ امریکن ایسے ملیں گے، جو اپنے دستخط بھی نہیں کر سکتے، ایسے لوگوں کی تعداد بھی جو مطبوعہ عبارت سے بمشکل مطلب نکال لیتے ہیں، توقع سے زیادہ نکلی، ماہرین کی ایک جماعت نے ان کی استعداد کا باقاعدہ طور پر امتحان لینے کے بعد جو معلومات حاصل کئے ہیں، وہ حیرت انگیز ہیں، گذشتہ سال امریکن لائبریری ایسوسی ایشن کے جلسہ میں یہ تخمینہ پیش کیا گیا تھا کہ ملک

کی نصف آبادی اتنی استعداد نہیں رکھتی، کہ کسی مطبوعہ مضمون کا مفہوم پوری طرح سمجھ سکے، اور حال میں شکاگو یونیورسٹی کے صدر نے اندازہ لگایا ہے کہ ملک کے نصف نوجوانوں میں جن کی عمریں ۱۶ اور ۲۴ سال کے درمیان ہیں، اتنی قابلیت نہیں ہے، کہ وہ بطور خود کتابوں سے کوئی تعلیم حاصل کر سکیں، ماہرین کے ان تخمینوں کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ امریکہ کے پانچ کروڑ باشندے صرف تھوڑا بہت لکھے پڑھے ہیں، لیکن ولیم اسمتھ نے اپنے محکمہ کے نمایندے کی حیثیت سے یہ پیشنگوئی کی ہے، کہ ۱۹۵۰ء تک نیویارک اسٹیٹ میں ایک شخص بھی ان پڑھ رہ نہ جائے گا، اونھوں نے اس پیشنگوئی کی تائید میں بیان کیا ہے، کہ اس ریاست میں ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۳۰ء تک بے پڑھے لکھوں کا تناسب (۵ء۱) فی صدی سے گھٹ کر (۷ء۳) فی صدی تک آگیا ہے،

یورپ میں مسلمانوں کی تعداد

ذیل کے اعداد و شمار ڈاکٹر ذکی علی کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں جو انگریزی رسالہ اسلام لاہور کی قریبی اشاعت میں نکلا ہے،

مشرقی اور جنوبی مشرقی یورپ،

البانیا میں (۷۵) فی صدی سے زیادہ مسلمان ہیں، جن کی مجموعی تعداد (۷۵۰۰۰۰) ہے،

یوگوسلاویا،	تقریبًا	(۱۷۵۰۰۰۰)
بلغاریا،	"	(۶۸۹۲۹۶)
رومانیا،	۱۹۲۴ء میں مسلمانوں کی تعداد کا اندازہ (۲۳۰۰۰۰) تھا،	
یونان	۱۹۲۸ء میں انکی تعداد تخمیناً (۱۰۰۰۰) تھی،	
پولینڈ اور لتھوانیا،	تقریبًا	(۱۲۰۰۰)
فن لینڈ	"	(۳۰۰۰)

ہنگری	تقریباً	(۳۰۰۰)
مغربی یورپ:۔		
فرانس	تقریباً	(۲۰۰۰۰)
برطانیہ عظمیٰ	"	(۳۰۰۰۰)
بلجیم	۱۹۲۹ء کی مردم شماری کے مطابق، (۵۰۰۰)	
ہالینڈ اور جرمنی،		(۶۰۰۰)
اٹلی		(۱۵۰۰)
اسپین	تقریباً	(۵۰۰۰)
سائپرس	۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق (۶۴۲۳۸)	
روڈس	تقریباً	(۱۲۵۰۰)

پھلوں کی جانچ کا برقی آلہ

امریکہ میں ایک برقی مشین ایجاد کی گئی ہے، جو بتا دیتی ہے کہ پھلوں کی اندرونی حالت کیسی ہے، جن پھلوں کا چھلکا دبیز ہوتا ہے، مثلاً چکوترے انکی اندرونی حالت کا صحیح اندازہ مشکل سے ہوتا ہے، اور اکثر باہر کے تاجروں کو مال کی خرابی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے، اس مشین کی ایجاد سے یہ شکایت رفع ہو جائے گی، کیونکہ اب باہر بھیجنے سے پہلے تمام پھل جانچ لئے جائیں گے، اگر کسی پھل میں کچھ بھی خرابی ہوئی، تو اس مشین میں ڈالنے کے بعد چھلکے پر فوراً داغ پڑ جائیں گے، اور یہ داغدار پھل اچھے پھلوں سے خود بخود علحدہ ہو جائے گا، یہ مشین ایک دن میں ہزاروں پھلوں کی جانچ کر لیتی ہے۔

"ع ز"